روئداد

ادارۂ معارف اسلامیہ

اجلاس اوّل

منعقدہ لاہور

۱۵ و ۱۶۔ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

مجلس عاملہ ادارۂ معارف اسلامیہ
نے شائع کیا۔

سنہ ۱۳۵۲ھ لاہور سنہ ۱۹۳۳ء

ڈالتے ہوئے ایک مختصر تقریر کی جس سے حاضرین کی معلومات میں مفید اضافہ ہوا۔

پانچ بجے اجلاس اول ختم ہوا۔ پروگرام میں اس کے بعد شام کے سات بجے تک یونیورسٹی لائبریری میں نمائش کے معائنہ کا وقت تھا۔ یہ نمائش جس میں مسکوکات اور مخطوطات کے نادر نمونے پیش کئے گئے تھے۔ خاص طور سے اجلاس ادارہ کے لئے ترتیب دی گئی تھی۔ [1] حاضرین جلسہ میں سے جن بزرگوں نے جاکر اسے دیکھا وہ وہ ان نفائس کی ندرت اور عمدگی کے قائل ہوئے جو وہاں دکھلائے گئے تھے۔

نمائش کو کامیاب بنانے کیلئے متعدد اصحاب نے پیہم کئی دن تک مسلسل کوشش کی، نہ صرف یہ کہ انہوں نے مختلف علمی ذخیروں سے نمائش کیلئے کتابیں اور تصویریں منتخب کیں اور مستعار لیں یا نمائش کے لئے مستعار دیں بلکہ ان کی فہرستیں مرتب کرنے اور ان کو ترتیب دینے کیلئے اپنا بہت سا وقت صرف کیا اور سخت محنت اٹھائی ان میں لالہ لبھو رام لائبریرین پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر حافظ محمود شیرانی اور ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی اور مولوی نذیر احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قلمی نسخے جو اس نمائش میں رکھے گئے۔ انکا بیشتر حصہ پروفیسر شیرانی اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ لیکن مسکوکات کا مجموعہ سارے کا سارا پروفیسر صاحب ممدوح کا تھا۔ اس میں ہزاروں سکے طلائی تھے۔ جن کی مناسب حفاظت کے لئے روزانہ اس کو نمائش میں لانے اور پھر شام کو گھر واپس لیجانے میں انہوں نے خاصی زحمت اٹھائی۔

اجلاس دوم

اجلاس دوم ۱۵ را پریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاء کالج لاہور میں بہ صدارت

---

[1] دیکھو اس نمائش کا حال لقلم پروفیسر شیرانی، اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۳ء

پروفیسر محمد شفیع صاحب وائس پرنسپل اورینٹل کالج منعقد ہؤا۔ اس میں صرف دو مضمون پڑھے گئے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) ڈاکٹر ہادی حسن صاحب پروفیسر علیگڑھ بہ عنوان "ظہیر الدین نیشاپوری"

(۲) ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب پروفیسر شاہ پور کالج بہ عنوان "عربوں کا سیاسی اور معاشرتی نظام" (دیکھو روئداد حصہ انگریزی)

اجلاس سوم

اجلاس سوم ۱۶ اپریل کی صبح کو دس بجے لا کالج میں بہ صدارت ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج منعقد ہؤا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے

(۱) شمس العلما مولانا مولوی عبدالرحمن دہلوی بہ عنوان "مناصب اکبری اور انکی تنخواہیں" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

(۲) مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی بہ عنوان "سسلی میں مسلمانوں کا تمدن" (دیکھو روئداد حصہ اُردو)

(۳) پروفیسر محمد شفیع صاحب ایم۔اے بہ عنوان "آل میکال" (دیکھو روئداد انگریزی)

(۴) ڈاکٹر حسین الہمدانی سورتی بہ عنوان "رسائل اخوان الصفا" (بزبان عربی) دیکھو روئداد۔

اجلاس کے اختتام پر صدر جلسہ نے سب مضامین پر مفید تبصرہ کیا اور پڑھنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔

اجلاس چہارم

تین بجے سہ پہر بہ صدارت شمس العلماء مولانا مولوی عبدالرحمٰن صاحب دہلوی

اس اجلاس میں جو مقالات پڑھے جانے والے تھے انکی تعداد زیادہ تھی اور وقت کم تھا۔ لہذا بیس منٹ سے زیادہ کسی مضمون کو وقت نہ دیا جاسکا۔ ہمیں اس بات کا بیحد افسوس ہے خصوصاً اس لئے کہ جملہ مضامین نہایت دلچسپ تھے اور حاضرین شائق تھے۔ کہ ہر مضمون بہ تمام و کمال پڑھا جائے۔ اس اجلاس کے مضامین حسب ذیل تھے

(۱) سید محمد عبداللہ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل بہ عنوان "تنبیہات ابوالقاسم علی بن حمزہ البصری" (دیکھو روئداد حصہ انگریزی)

(۲) پروفیسر ایم۔ ایف قریشی ایم۔ اے بہ عنوان "مسلمانوں میں علم طبیعات کی ابتدا اور ابن الہیثم"، (دیکھو روئداد حصہ انگریزی)

(۳) مولوی سید سعید انصاری اعظم گڈھی بہ عنوان "عربی علم اللغۃ کی تاریخ" دیکھو روئداد)

(۴) ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی بہ عنوان "کمال الدین بہزاد مصور" (دیکھو روئداد)

۵ بجے اجلاس ختم ہؤا اس کے بعد مینارڈ ہال میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور کی طرف سے ادارہ کے جملہ ممبران و مندوبین کے اعزاز میں ٹی پارٹی ہوئی جس میں لاہور کے اکثر عمائد شریک تھے۔

اجلاس پنجم

اجلاس پنجم شام کو ساڑھے سات بجے لا کالج میں بہ صدارت ڈاکٹر محمد سعید اللہ صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور منعقد ہؤا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے۔

(۱) ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب پروفیسر مشن کالج دہلی بہ عنوان "خاندان ترکمانان قراقویونلو" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

(۲) پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی بہ عنوان "فارسی زبان میں بچوں کے

تعلیمی نصاب" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

اجلاس کے اختتام پر دو رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوئے پہلا رزولیوشن ڈاکٹر اظہر علی صاحب نے پیش کیا۔جس میں تحریک ہوئی کہ لالہ لبھورام صاحب لائبریرین، پروفیسر حافظ محمود خانصاحب شیرانی، اور ماسٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے نمائش کو کامیاب بنایا۔ دوسرے ریزولیوشن کی تحریک سیکرٹری ادارہ نے کی جس میں حضرات مندوبین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا گیا۔

مجلس عاملہ پنجاب یونیورسٹی کی ممنون ہے۔کہ انہوں نے ازراہ نوازش ادارہ کے افتتاحی اجلاس کے لئے ہیلی ہال کے استعمال کی اجازت دی۔

(محمد اقبال سیکرٹری ادارہ معارف اسلامیہ)

فہرست ممبران مجلس عاملہ

(۱) آنریبل شیخ سر عبدالقادر (صدر)

(۲) ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور

(۳) پروفیسر محمد شفیع۔ اورینٹل کالج لاہور

(۴) پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی۔ اورینٹل کالج لاہور

(۵) خواجہ عبدالوحید سیکرٹری اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ لاہور

(۶) ملک عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا۔

(۷) پروفیسر محمد اقبال۔ اورینٹل کالج۔ لاہور (معتمد و خازن)

فہرست ممبران استقبالیہ کمیٹی

(۱) ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ایم۔اے۔ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا (صدر)
(۲) پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی۔
(۳) آنریبل شیخ سر عبدالقادر صاحب
(۴) پروفیسر محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور
(۵) پروفیسر محمد شفیع صاحب اورینٹل کالج۔ لاہور
(۶) خانصاحب پروفیسر قاضی فضل حق صاحب
(۷) خواجہ عبدالوحید صاحب
(۸) ملک برکت علی صاحب ایم اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ لاہور
(۹) مولوی غلام محی الدین صاحب ایڈوکیٹ لاہور
(۱۰) چودھری عبدالکریم صاحب مجسٹریٹ لاہور
(۱۱) خواجہ فیروز الدین صاحب بیرسٹر۔ لاہور
(۱۲) خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب انسپکٹر آف سکولز لاہور
(۱۳) مولوی عبدالباسط صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۱۴) میاں محمد اسلم صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۱۵) خانصاحب میاں امیرالدین صاحب سب رجسٹرار لاہور
(۱۶) ڈاکٹر سر محمد اقبال
(۱۷) ڈاکٹر محمد صدرالدین صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور
(۱۸) صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

(۱۹) آنریبل سر ظفر علی جج ہائی کورٹ لاہور
(۲۰) شیخ فیاض الدین صاحب رئیس لاہور
(۲۱) پروفیسر عبد الحمید صاحب۔ گورنمنٹ کالج لاہور
(۲۲) آنریبل سر شہاب الدین پریذیڈنٹ پنجاب کونسل،
(۲۳) نواب احمد یار خانصاحب دولتانہ۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ لاہور
(۲۴) نواب شاہ نواز خاں صاحب رئیس ممدوٹ
(۲۵) خاں بہادر سردار حبیب اللہ خاں صاحب ایم۔ ایل۔ سی۔ لاہور
(۲۶) پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب گورنمنٹ کالج لاہور
(۲۷) مولوی ظفر اقبال صاحب۔ پروفیسر ٹریننگ کالج لاہور
(۲۸) قاضی ظہیر الدین صاحب ایم اے۔ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۲۹) مولوی سید مرتضی حسین صاحب پروفیسر خالصہ کالج امرتسر
(۳۰) ڈاکٹر برکت علی صاحب قریشی۔ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور
(۳۱) ڈاکٹر سعید اللہ صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۳۲) میاں نظام الدین صاحب رئیس لاہور
(۳۳) پروفیسر عابد علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور۔
(۳۴) خاں غلام محمد خانصاحب گورنمنٹ پنشنر ٹمپل روڈ لاہور
(۳۵) شیخ سراج الدین صاحب آذر۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج پسرور
۳۶ پروفیسر علم الدین سالک ایم۔ اے اسلامیہ کالج لاہور
۳۷ پروفیسر سید عبد القادر صاحب۔ اسلامیہ کالج لاہور
۳۸ میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) رئیس لاہور
۳۹ نواب نثار علی خاں صاحب قزلباش۔ رئیس لاہور

لاہور کا ایک مُہندِس خاندان

جس نے

تاج اَور لالؔ قلعہ بنایا

ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی اُن کا سُراغ نہیں لگتا، اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا، گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ کی کچھ کچھ روشنی یہاں پھیلنے لگی، پھر بھی بادشاہوں کے ایوان تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا، شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی، مگر اس کی روشنی اتنی مدھم ہے کہ خود ان کی صورتیں بھی اس سے پہچان میں اچھی طرح نہیں آتیں، روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں، مگر ان سے بھی تبرکات اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اگر مُلّا بدایونی، شاہ عبدالحق دہلوی اور آزاد بلگرامی نہ ہوتے تو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ بھی ہم کو معلوم نہ ہو سکتا۔

لاہور کے جس مہندس خاندان کا حال آج ہم کو سنانا ہے، افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اس کے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا، حالانکہ ان کی بنائی ہوئی عمارتیں تاج آگرہ لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار رہیں، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن

باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ کمال دکھایا ہے، کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی ان کا نام نشان نہیں ملتا،

شاہجہان کی تاریخوں میں اس کے سال ششم میں روضۂ تاج محل کے بننے کا پورا حال، ایک ایک چیز کی پیمائش کے ساتھ لکھا ہے، مگر جن نادرہ کار مہندسوں، نقاشوں اور طراحوں نے اس کا خاکہ کھینچا، اور جن معماروں نے ان کو بنا کر تیار کیا ان غریبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکے اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی ان کا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے،

اس خاندان کے بعض ارکان کے نام مصنف کی حیثیت سے بعض کتب خانوں کی فہرستوں میں مذکور ہیں، مگر ان میں بھی نام کے سوا کچھ اور نہیں، اور نہ ان افراد کے باہمی تعلق کا ذکر ہے، بلکہ ان کی حیثیت بیگانہ افرادِ انسانی کی ہے،

دیوانِ مہندس کا نسخہ

پورے دو برس ہوئے کہ ایک کرمفرمانے بنگلور سے مجکو اطلاع دی کہ ان کے پاس مہندس نام ایک شاعر کا فارسی دیوان ہے اور دریافت کیا کہ کیا آپ اس شاعر سے واقف ہیں، میں نے لکھا کہ آپ وہ نسخہ مجھے بھیج دیں تو میں اپنی رائے ظاہر کروں، موصوف نے بڑی مہربانی فرما کر نسخۂ مذکور میرے پاس بھیج دیا، میں نے اس شخص کی تلاش میں اکثر تذکرے دیکھے، لیکن اس میں کچھ پتہ نہ چلا[1]، مگر خوش قسمتی سے خود اس دیوان میں شاعر کی مثنوی مل گئی، جس میں اس نے اپنے خاندان کا مختصر حال خود لکھا ہے، اس کو پڑھ کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ معماروں اور انجنیروں کی طرف سے پہلی آواز تھی جس میں تاج اور لال قلعہ کے بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا،

---

[1] بعض تذکروں میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے ضمن میں مہندس کا نام مذکور ہے، س

اس مثنوی سے نہ صرف شاعر کے، بلکہ شاعر کے باپ اور بھائیوں کے حالات بھی معلوم ہوئے، اور اس کے دوسرے قصائد اور اشعار سے یہ بھی قیاس میں آیا کہ اس باکمال خاندان کی گمنامی کا سبب کیا ہو سکتا ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مُہَندِس ہے، مُہَندِس کے معنی علم ہندسہ جاننے والے یعنی انجنیر کے ہیں۔ اور اس کا یہ دیوان، چند قصیدوں، بعض مثنویوں اور بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے، اور یہ سب فارسی میں ہیں،

دیوان کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے نہیں ملا۔ زیر نظر نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحوں پر حاوی ہے، دیوان کے حصۂ غزل کے خاتمہ پر تاریخ اتمام "۶ شہر ذی الحجہ سنہ ۴۷ھ بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہے اور دیوان کے خاتمہ پر اس کتاب کی خریداری کی تاریخ لکھی ہے،

"بتاریخ بستم رمضان المبارک سنہ ۱۱۵۷ھ دیوان مہندس خرید شد بسرکار
نواب ابراہیم خان بہادر"

اور کتاب کے اندر بعض تاریخی قطعات ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ سنہ ۱۰۶۶ھ کی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ "۶ شہر ذی الحجہ سنہ ۴۷" ہجری سنہ ہے تو وہ یقیناً سنہ ۱۱۴۷ ہجری ہے، ورنہ میرا شبہ اس بنا پر کہ یہاں صرف سنہ ۴۷ لکھا ہے اور سیکڑہ نہیں لکھا ہے، یہ ہوتا ہے کہ یہ سنہ ہجری نہیں، بلکہ سنۂ جلوس ہے۔ اب سنہ ۱۰۶۶ کے بعد اور سنہ ۱۱۵۷ کے بیچ میں ایسا بادشاہ جس کو جلوس کا سینتالیسواں سال نصیب ہوا ہو، اورنگ زیب عالمگیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، سنہ ۴۷ جلوس عالمگیری سنہ ۱۱۱۵ھ کے مطابق ہے،

اس نسخہ کے صفحہ اول پر عمدہ جلی نستعلیق سے "این کتاب سرکار نواب بہادر۔۔۔" لکھا ہے، باقی حروف کٹ گئے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی تقطیع پہلے بڑی

تھی، جلد بندی کے وقت کچھ حاشیہ کاٹ دیا گیا ہے، اس کے نیچے "ایں کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خان (بکتاب خانہ ؟) داخل شد" اس پر ایک مہر بھی تھی جو کسی نے مٹا دی ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس بن چکے' اور وہ اپنے باپ کا نام احمد معمار بتاتا ہے' معمار' احمد کا پیشہ ہے، نام کا جزو نہیں، اس کے ایک قطعہ میں اس کا شاہی لقب" نادر العصر" مذکور ہے، اس شاعر کی بعض اور تحریریں بھی ہم کو دستیاب ہوئی ہیں جن میں وہ اپنے باپ کو لزوماً "استاد احمد لاہوری" لکھا کرتا ہے، اب ان ٹکڑوں کے جوڑنے سے احمد کا پورا نام و لقب "نادر العصر استاد احمد معمار لاہوری" ثابت ہوتا ہے،

نادر العصر استاد احمد معمار لاہوری

اس نادر العصر کے حالات کا سراغ مجکو تاریخ کی کتابوں میں کہیں نہیں ملا، البتہ محمد صالح کنبوہ نے عمل صالح میں جو شاہجہان کی معاصر تاریخ ہے، شاہجہان آباد کے عمارات و قلعہ کی تعمیر کے بیان میں اس کا نام ان لفظوں میں لیا ہے،

"از شب جمعہ بیست و نہم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس مطابق یک ہزار و چہل و ہشت ہجری در زمان محمود و آوان مسعود استاد احمد سر آمد معماران نادرہ کار بسرکاری غیرت خاں صوبہ دار آنجا و صاحب اہتمام ایں کار مطابق طرحے بدیع و نقشے تازہ کہ بہ ہیچ وجہ نظیر آں در شش جہت دنیا بنظر نظارگیان نیامدہ بود، رنگ ریختہ" (جلد ۳ صفحہ ۲۵، کلکتہ)

مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی (اسلامیہ کالج لاہور) جن کو تاج اور ہندوستان کی

ف۔ اس مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح ناظم آثار قدیمہ سرکار نظام مولوی غلام یزدانی صاحب نے کی ہے، یہ سنہ لفظوں میں چہل و ہشت کے بجائے "ہشتاد و چہل" چھپ گیا ہے، جو قابل تصحیح ہے۔

روئداد

ادارۂ معارف اسلامیہ

اجلاس اوّل

منعقدہ لاہور

۱۵ و ۱۶ - اپریل ۱۹۳۳ء

مجلس عاملہ ادارۂ معارف اسلامیہ
نے شائع کیا ۔

۱۳۵۲ھ لاہور ۱۹۳۳ء

اسلامی عمارتوں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، ان کو مین نے اس معمار کے نام سے مطلع کیا تھا، اور تلاش حال کے لئے آمادہ کیا تھا، اونھوں نے پہلے تو لاعلمی ظاہر کی، پھر کچھ دنون کے بعد مجھے انھون نے لکھا کہ اُن کے پاس شاہجہانی و عالمگیری عہد کے امرا کے خطوط کا کوئی ناقص اور بے نام و نشان پرانا مجموعہ ہے، اس کے ایک خط میں نواب جعفر خان کو سرائے باغ اور قلعہ حسن ابدال کی تعمیر کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلہ مین استاد احمد معمار کا ذکر ان لفظون مین آیا ہے،

"۔ ۔ ۔ بدرگاہ سلاطین سجدہ گاہ معروض داشتہ حقیقت حسن سلوک وکاردانی محمد مومن مذکور واستاد احمد معمار کہ در طراحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تمام و دستی بکمال دارد"

عمدۃ الملک نواب جعفر خان ہمیشہ سے شاہجہان کا مقرب خاص تھا، مختلف مناصب جلیلہ کے بعد سنہ ۱۹ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۵ھ میں پنجاب کا صوبہ دار اور سنہ ۲۱ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۷ھ میں شاہجہان کا وزیر ہوا تھا، اور پھر ۱۰۷۴ھ میں عالمگیر نے اس کو وزیر بنایا، اور ۱۰۸۱ھ میں اس نے وفات پائی، یہ خط غالباً پنجاب کی صوبہ داری یا وزارت کے عہد میں اس کو لکھا گیا ہوگا، کیونکہ جیسا آگے معلوم ہوگا کہ اس کے دو برس کے بعد احمد وفات پاچکا تھا، سرسید مرحوم نے اپنی قابل قدر تصنیف آثار الصنادید میں استاد احمد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ "یہ اپنے فن مین "بے نظیر" اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے"،

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد عہد شاہجہانی میں "سرآمد معماران نادرہ کار" تھا، اور اس کو عمارتوں کا نقشہ اور خاکہ بنانے اور تعمیرات کے دوسرے کامون مین کمال دستگاہ حاصل تھی،

تاج محل کے حالات میں بعہد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے، اس کے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں، اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں، شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے، اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت۔ اور اس کے ایک ایک کاریگر کے نام مع تعین تنخواہ لکھے ہین، جو زیادہ تر سنی سنائی حکایتون اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ مین کاریگرون مین سب سے پہلا نام استاد عیسیٰ "نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم" لکھا ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے اور سب مین نامون کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس مین پندرہ کاریگرون تک کو ساکن روم و بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے، جامعہ علیگڈھ ندوہ اور دار المصنفین چارون کے نسخون مین یہ شتر گربگی بتغیر موجود ہے، بہرحال "استاد نادر العصر" تک تو نام صحیح ہے جو اسی احمدؒ معمار کا شاہی لقب تھا، مگر اس مین عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم کا نام اضافہ ہے، یا یہ کہ "استاد نادر العصر" اور "عیسیٰ ساکن روم" دو نام ہین، جو ایک مین مل گئے ہین، اس کتاب تاج مین امانت خان شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخون اور تذکرون کے علاوہ خود تاج کے کتبون مین ہے، جن کاریگرون کی فہرست دی گئی ہے، اور جو تنخواہین لکھی گئی ہین، وہ تمامتر محتاج ثبوت ہین، لیکن تعجب ہے کہ تاج کے مورخینِ حال نے اُن کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا ہے، بہرحال تاج کے معمارون مین سے جو نام اب سب سے زیادہ اہم سند رکھتا ہے، وہ یہی نادر العصر استاد احمدؒ ہے، جس کا نام اس مضمون مین سب سے پہلی دفعہ پیش کیا جا رہا ہے،

لطف اللہ کے بیان سے اُس کے باپ احمدؒ کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہوتے ہین مثلاً یہ کہ احمدؒ معمار آجکل کا کوئی اناڑی راج نہ تھا، بلکہ وہ باقاعدہ ہندسہ (انجینیرنگ) ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، یونانی ریاضیاتِ فلکی کی سب سے اونچی کتاب مجسطی کا ماہر تھا،

اور اقلیدس میں خواجہ نصیر طوسی کی کتاب تحریر اقلیدس کا عالم تھا، لطف اللہ ایک مثنوی میں اپنے خاندانی حالات کا ذکر ان لفظوں مین کرتا ہے،

شاہجہان داور گیتی ستاں — روشنیِ دودۂ صاحب قِراں
عرش بریں قبۂ اخرگاہ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہ اوست
احمدِ معمار کہ در فنِ خویش — صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آن — آگہ اشکال و حوالات آن
حال کواکب شدہ معلوم او — سرِّ مجسطی شدہ مفہوم او
از طرفِ داورِ گردوں جناب — "نادرِ عصر" آمدہ او را خطاب
بود عمارت گرِ آن بادشاہ — داشت دران حضرتِ فرخندہ راہ

ان اشعار سے نادر العصر احمد معمار شاہجہانی کے فضل وکمال کا پورا اظہار ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہجہان کا مشہور عمارت گر تھا، اب اس کے بعد وہ اشعار آتے ہیں جن مین اس عظیم الشان حقیقت کا انکشاف ہے، جو اب تک مستور و مخفی تھی یعنی یہ کہ یہی وہ ممتاز ہستی ہے، جس نے ممتاز محل کا روضہ اور دہلی کا لال قلعہ تعمیر کیا، کہتا ہے،

اگرہ چو شد مضرب رایاتِ شاہ — بس کہ برو بود عنایاتِ شاہ
کرد بحکم شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہِ انجم سپاہ — شاہجہان داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر

ان دو کے علاوہ عہدِ شاہجہانی کی دوسری عمارتین بھی اس نے بنائی تھیں چنانچہ کہتا ہے،

این دو عمارت کہ بیان کردہ ام — در صفتش خامہ روان کردہ ام

یک ہنر از گنجِ ہنرہائے اوست　　　یک گہر از کانِ گہرہائے اوست

اس کے بعد اس کی وفات کا ذکر کیا ہے

چون نبود عالمِ فانی مستقر　　　کرد سوی عالمِ فانی سفر

اس مثنوی کے شروع میں شاہجہان کا ذکر زمانۂ موجودہ میں کیا گیا ہے

عرش بریں قبۂ خرگاہِ اوست　　　رشکِ فلک سُدۂ درگاہِ اوست

اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی شاہجہان کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور اسی کے عہد مین تاج محل اور قلعہ دہلی کی تعمیر کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے' اس سے زیادہ ثبوت اور کیا درکار ہے ،

استاد حامد

استاد احمد کے ساتھ اوس کے بھائی استاد حامد کا نام بھی ذکر کے قابل ہے' یہ بھی معماری' ہندسہ' اور دیگر علوم ریاضی میں سربرآوردہ تھا' اور قلعہ کی تعمیر میں احمد کا شریک تھا' سرسید مرحوم اپنی قابل قدر کتاب آثار الصنادید مین قلعہ شاہجہانی کے بیان مین لکھتے ہین کہ :-

"اچھی سے اچھی ساعت دیکھ کر استاد حامد اور استاد احمد معمارون نے کہ اپنے فن میں اپنا نظیر نہین رکھتے تھے' اور ہندسہ وہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشکِ ارزمیدس تھے اس قلعہ کی بنیاد رکھی" (طبع اول ص۳ باب دوم)

طبع دوم" میں یہی عبارت ان لفظون مین ہے :-

"استاد حامد اور استاد احمد جو اپنے فن مین یکتا تھے' اس قلعہ کو بنواتے تھے'

(طبع دوم نامی پریس ص۲۸)

دہلی کے بڑے بوڑھون کی زبانی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ جامع مسجد دہلی بھی اسی استاد حامد نے جس کا مشہور نام " استا حامد " ہے' بنائی ہے اور اس کے بنانے

میں اُس کا دوسرا شریک "اُستا ہیرا" تھا،

استاد حامد کا نام قلعہ دہلی کے بعد جو ۱۰۵۸ھ میں بنا، مانڈو کے ایک سیاحتی کتبہ میں جس کی تاریخ سنہ ۱۰۶۱ھ ہے، جیسا کہ آگے آئیگا، لکھا ہُوا ملتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ تک زندہ تھا، دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقفکار (سید مرتضیٰ علی صاحب ہیڈ کلرک دفترِ کمانڈر اِن چیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہُوا ہے کہ یہ استاد حامد اور استاد احمدؒ دونوں بھائی تھے، استاد حامد کے نام سے "کوچہ اوستا حامد"[1] دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے، اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے، اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں، الغرض یہی وہ دو کاریگر ہیں جنھوں نے قلعۂ معلی اور اس کے حیرت انگیز عمارات دیوانِ عام و دیوانِ خاص غسلخانہ اور دوسرے محلّات شاہی بنائے اور اُس کی تعمیر میں ایک تیسرا نام احمد کے بیٹے لطف اللہ کا شامل ہے، جس کا ذکر آگے آئیگا،

استاد احمدؒ کی تاریخ وفات

اِس دیوان کے آخر میں استاد احمد معمار کی وفات کی دو تاریخیں بھی درج ہیں،

(۱)

در زمانِ سعید شاہجہان　　شاہِ عالم پناہ جم مقدار
نادر العصر رفت و گفت خرد　　شد بفردوس احمد معمار

(۲)

آن نادر عصر زینت دہر　　چون رفت بسوئی ملک سرمد
تاریخِ وفات او خرد گفت　　محمود العاقبت شد احمد

[1] واں کے بغیر اُستا حامد

ان دونون قطعون کے ہر چوتھے مصرع سے ۱۰۵۹ھ کے اعداد نکلتے ہین، روضہ کی تعمیر ۱۰۵۰ھ مین یعنی احمد کی وفات سے نو برس پیشتر ختم ہو چکی تھی، اور دہلی کا قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ مین تکمیل پایا تھا۔ ممکن ہے کہ استاد احمد روضہ کو ختم کرکے قلعہ کی تعمیر مین شامل ہوا ہو، یا روضہ کا اصلی تعمیری کام ختم کرکے شروع ہی سے قلعہ کی تعمیر مین مصروف ہوا ہو،

احمد معمار کی تین اولادین

استاد احمد نے ان تعمیری یادگارون کے علاوہ اپنی تین جسمانی یادگارین بھی چھوڑیں، اور ان کو بھی تعمیر و ہندسہ و ریاضیات کی بہترین تعلیم دی، اور غالباً اوس کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ ریاضیات کی اعلیٰ درجہ کی جو کتابین اب تک صرف عربی زبان مین ہین، اون کو فارسی مین منتقل کیا جائے، تاکہ وہ علوم فارسی دانون کی دسترس مین آسکین، چنانچہ سنہ ۱۰۵۰ھ مین یعنی جس سال روضہ تمام ہوا ہے، اور قلعہ دہلی کی تعمیر جاری تھی، اس نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ کو عبد الرحمان صوفی کی صور الکواکب کے ترجمہ کا حکم دیا،

لطف اللہ کی جس مثنوی کے کچھ ابتدائی اشعار اوپر نقل کیئے گئے ہین، اُس مین احمد معمار کی وفات کے ذکر کے بعد اُس کے ان تین باکمال فرزندون کے نام لئے گئے ہیں

بس سہ پسر ماند زمرد سترگ	زان سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

دیوان کے اس نسخہ میں رشیدی کی جگہ کاتب نے "رشد" لکھا ہے مگر اس کی تصنیفات مین اس کے نام کے ساتھ "رشیدی" لکھا ملتا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس لفظ کو اسی طرح پڑھنے سے شعر صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر عطاء اللہ کی تعریف مین کہتا ہے،

نادر عصر خود و مشہورِ شہر	عالم و علّامہ و دانائے دہر

مردِ ہنر پرور و استادِ فن | فاضل و دانشور و حبرِ زمن
مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او | گنجِ ہنرہاست تصانیفِ او
نثرِ وی از آبِ روان پاک تر | نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گہر

اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاراللہ شاعر بھی تھا اور غالباً اس کے نام کے بعد "رشیدی" اس کا تخلص ہے، اس کے بعد شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے تمامتر اپنے اسی بڑے بھائی سے تعلیم پائی ہے،

منکہ سخن پرور و دانش ورم | بندۂ آن حبرِ سخن پرورم
منکہ ربودم زجہان گوئے علم | از چمنش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدم آگہِ سرِّ نہان | از دمِ او یافتہ ام قوّتِ جان

اس کے بعد لطف اللہ اپنے کو احمد معمار کا منجھلا بیٹا بتاتا ہے اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے،

ثانیِ آن ہر سہ برادر منم | ہندسہ یکفن بود از صد فنم
گرچہ مُہنْدِس لقبم از شہ است | نامِ مَنْ دِلْ شُدہ لطف اللہ است

لطف اللہ اپنا نام اور مُہنْدِس شاہی خطاب بتاتا ہے، اور یہی اس کا تخلص بھی ہے، اس کے بعد اپنے سب سے چھوٹے بھائی کا نام لیتا ہے،

ثالثِ آن ہر سہ بہادر بسال | آمدہ نوراللہ صاحب کمال

پھر کہتا ہے کہ ہم تینوں بھائی معمار اور انجنیر ہیں،

ما ہمہ معمار و عمارت گریم | ما ہمہ استاد و سخن پروریم

اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی نوراللہ کی نظم و نثر کی تعریف کرتا ہے، اور تعمیری مہارات فن کی بنا پر معمار کا موروثی لقب اسی کے لئے مخصوص کرتا ہے،

لیک بو قصر کلامش عجب — زان شدہ معمار مر او را لقب
گرچہ کم است سالِ وی از سالِ من — بیش بود حالِ وی از حالِ من
نثر وی از نظم گہر بار تر — نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نورِ سخنش پر ضیا — طبع ز لطفِ سخنش پر صفا
گنجِ ہنر آمدہ در مشت او — ہفت قلم راندہ سہ انگشت او
گرچہ منم بے سخن استادِ فن — آن یک و این یک بود استادِ من

اسی آخری شعر کا شاید یہ مطلب ہے کہ مین سب سے چھوٹے بھائی کا استاد ہون، اور بڑا بھائی میرا استاد ہے، اس مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے،

گرچہ مرا ہست مُہَنْدِس لقب — ہندسہ زان ہر سہ برادر طلب

اس سے ثابت ہوا کہ ہندسہ اور عمارت گری کے فن مین یہ تینون بھائی مہارت رکھتے تھے۔

الغرض احمد معمار کے ان تین باکمال بیٹون کے نام بہ ترتیب یہ ہیں،

۱- عطاء اللہ رشیدی نادر العصر،
۲- لطف اللہ مہندس،
۳- نور اللہ معمار

افسوس ہے کہ ان تین بھائیون مین سے اب تک جو کچھ ہم کو معلوم ہے وہ صرف بڑے اور منجھلے کے متعلق، اور سب سے چھوٹے نور اللہ معمار کے حال پر معلومات کی کوئی مزید روشنی نہیں پڑتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے باپ احمد معمار کی طرح صرف معمار ہی رہا اور اسی لئے معمار کے لقب سے وہ ممتاز ہے، وہ کسی کتاب کا مصنف نہیں ہے، باقی دو بھائی مختلف کتب ریاضی کے مصنف ہیں،

عطاء اللہ رشیدی

عطاء اللہ رشیدی کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ علم حساب مین دو کتابون کا مصنف ہے، جن مین سے ایک کا نام بیج گنت اور دوسرے کا نام خلاصۂ راز ہے، بیج گنت سنسکرت کا لفظ ہے "ویجا گنیتا" جس کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہین، یہ سنسکرت مین بھاسکر چاریا کی تصنیف ہے عطاء اللہ نے فارسی مین اس کا ترجمہ کیا، اس کتاب کے نسخے برٹش میوزیم او میونک یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریریون مین ہین، اس مین مصنف اپنا نام "عطاء اللہ رشیدی بن احمد نادر" بتاتا ہے، رسالہ کا آغاز اس شعر سے ہے،

اوّل ز ستایشِ الٰہی گویم ۔۔۔ پس نعت رسول اد کماہی گویم

یہ شعر میرے خیال مین فیضی کے جواب مین ہے، فیضی نے سنسکرت کی حساب کی مشہور کتاب لیلاوتی کا جو ترجمہ اکبر کے زمانہ مین کیا ہے اس کے آغاز مین یہ شعر لکھا ہے، جو سراسر خوشامد ہے،

اوّل ز ثنائی بادشاہی گویم ۔۔۔ وانگہ ز ستایشِ الٰہی گویم

رشیدی نے گویا اس کے جواب مین لکھا ہے،

اوّل ز ستایش الٰہی گویم ۔۔۔ پس نعت رسول اد کماہی گویم

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتبخانہ کا نسخہ (۱۵۵ ریاضی) میری نظر سے گذرا ہے اس کے دیباچہ مین ہے:-

اما بعد می گوید بندۂ محتاج بخداوند قادر؛ عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بتوفیق الٰہی در سنہ اربع و اربعین و الف ہجری مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحب قرانی بر اورنگ سلطنت و جہان بانی، کتاب جبر و مقابلہ ہندوی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکراچارج صاحب لیلاوتی را کہ در علم حساب کشافی است بحقائق رائقہ و مفتاحے است بدقائق فائقہ

و محتوی است بر فوائد بلند و مطالب ارجمند کہ در لیلاوتی مذکور نیست و در ہیچ نسخہ فارسی و عربی مسطور نہ، از زبانِ ہندی بفارسی آوردم و دیباچہ کتاب را بکتابہ دعائے دولت حضرت خاقانی، وارثِ ملک سلیمانی، مرتقی مدارجِ عز و جلال . . . . ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قرانِ ثانی، شاہجہان نامی بادشاہ غازی . . . . . .

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب جو لیلاوتی کے مصنف بھاسکر اچاریہ کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے شاہجہان کے آٹھوین سالِ جلوس ۱۰۴۴ھ مین مکمل ہوئی ہے، برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی کی لائبریریون کی فہرستون مین اس نسخہ کا مختصر حال درج ہے، کتبخانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن مین بدر الحساب کے نام سے "بیج گنت" کا ایک ترجمہ مذکور ہے، کتابت کا سال ۱۱۰۰ھ ہے، مگر مترجم کا نام نہین لکھا ہے، معلوم نہین یہی عطار اللہ رشیدی کا ترجمہ ہے، یا کوئی اور، کتبخانہ مین اس نسخہ کا ۱۹۲ (ریاضیات فارسی) ہے،

عطار اللہ رشیدی کی دوسری کتاب خلاصہ راز کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتبخانہ مین ہے، اس مین اوس نے اپنا نام یہ لکھا ہے، "عطار اللہ بن استاد احمد معمار" اس کا آغاز اس شعر سے ہے،

شکر بے حد بو احدِ ازلی حمد بے حد بفردِ لم یزلی

رسالہ کا موضوع حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ ہے، زبان فارسی نثر ہے، اور رسالہ کی تقسیم دس بابون پر ہے، رسالہ کے دیباچہ مین شاہجہان بادشاہ اور شاہزادہ دارا شکوہ کی ستایش ہے، اور رسالہ شاہزادہ کے نام سے معنون ہے، دارا شکوہ کا قتل ۱۰۶۷ھ مین وقوع مین آیا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ

رسالہ اس تاریخ سے پہلے تالیف پاچکا تھا،

عطار اللہ رشیدی جیسا کہ اس کے بھائی لطف اللہ نے اپنی مثنوی مین لکھا ہے شاعر بھی تھا، اور رشیدی تخلص کرتا تھا، مگر اوس کا کوئی شعر ہم تک نہین پہنچا ہے، بجز اس کے لطف اللہ کے ہاتھ کی ایک کتاب صُورِ صوفی کا جو اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری مین ہے اس کے آخر مین ایک صفحہ پر عطار اللہ کے قلم کی ایک مشق ہے، جس مین آفتاب اور سہا کے تناسب سے کچھ نقرے لکھے ہین، اور آخر مین یہ شعر درج ہے،

عطار اللہ کر گر ناشش نیٔ ہیچ   زغیرت ہیچ افند در جسم و ہیچ

لطف اللہ مہندس

احمد معمار کے دوسرے بیٹے لطف اللہ مہندس کی اس وقت متعدد یادگارین دنیا مین باقی ہین، اور کہنا چاہئے کہ یہی وہ سپوت ہے جس کے ذریعہ اس کے باپ کا نام دنیا کو معلوم ہوسکا، سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب مین جو ۱۲۱۸ھ کی تصنیف ہے مہندس کے بیٹے امام الدین ریاضی کے تحت مین مہندس کا ذکر ان لفظون مین کیا ہے،

" مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشان ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند، و مہندس تخلص میکردند، و در علم ریاضی مثل این ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودہ اند" (نسخۂ قلمی دار المصنفین صـ ۱۵۳)

اور سفینۂ خوشگو مین ہے،

" خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک و دار الخلافۃ شاہجہان آباد تجویز و صوابدید او بنا یافتہ"

یہی فقرہ حسین قلی خان کے نشتر عشق مین ہے،

اس کی چھ تصنیفات کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں، جن کے نسخے اس وقت ہندوستان اور یورپ کے کتبخانوں مین موجود ہیں، لیکن ان تصانیف کے علاوہ اس کی عجیب و غریب یادگار اس کا ایک آہنی کتبہ ہے جو سلاطین مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں وہان کے مشہور بادشاہ ہوشنگ غوری (۸۰۸ھ — ۸۳۸ھ) کے مقبرہ کے دروازہ کے داہنے ہاتھ پر لگا ہوا ہے، یہ ۷ انچ لمبا اور ۴$\frac{1}{4}$ چوڑا کتبہ ہے، جس میں بخط خفی حسب ذیل عبارت چار سطرون مین منقوش ہے،

۱- بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری۔

۲- فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی،

۳- و خواجہ جادو رائے و استاد شیورام و استاد حامد،

۴- بجہت زیارت آمدہ بود،

اثریات ہند کے ماہر جناب ظفر حسن صاحب بی۔ اے (محکمۂ آثار قدیمہ ہند) نے مانڈو کے کتبات پر انگریزی مین جو مقالہ لکھا ہے، موصوف نے اس مین یہ کتبہ سترھوین پلیٹ پر چھاپ دیا ہے، اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے۔

غالباً ان معمار سیاحون کے لئے اس کتبہ کے یہان لگانے کا محرک یہ امر ہوا ہے کہ یہان اکبر بادشاہ نے اپنے سفر و گذر کی تاریخین ثبت کرائی ہین اُنہین کو دیکھ کر ان معمارون نے بھی اپنا یادگاری کتبہ لگا دیا ہے،

اس کتبہ سے متعدد باتون پر روشنی پڑتی ہے،

۱- اس عہد کے استادان تعمیر دوسری عمارتون کو بھی فن کی حیثیت سے دیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے،

۲- ہندو مسلمان باکمالون مین فن کی یکجہتی کا رشتہ خاصہ مستحکم اور مضبوط تھا،

۳- ہندو شاہی معمارون کے ساتھ خواجہ اور استاد کا بولنا گیا عام تھا، خواجہ جادو رائے اور استاد شیو رام کبھی کیسی عزت کے الفاظ تھے،

۴- لطف اللہ مہندس گو شاعر و مصنّف تھا تاہم اس میں اس کے موروثی فنِ تعمیر کا ذوق اتنا تھا کہ وہ دوسرے معمارون کے ساتھ کسی عمارت کے دیکھنے کے لئے سفر کی زحمت گوارا کر سکتا تھا،

لطف اللہ کی جن چھ کتابون کے نام ہم کو ملے ہین وہ حسب ذیل ہیں،

۱- صُوَرِ صوفی،

۲- رسالہ خواصِ اَعداد،

۳- شرحِ خلاصۃ الحساب،

۴- منتخبُ الحساب،

۵- تذکرۂ آسمان سخن،

۶- دیوانِ مُہندس،

پہلی کتاب ہیئت مین اور بعد کے تین رسالے علم حساب ہین، اور دوسری کو چھوڑ کر کہ وہ عربی مین ہے، بقیہ پانچ کی زبان فارسی ہے، جن میں سے تین اوّل الذکر نثر مین ہین اور آخری دو نظم مین، اب ذیل مین ہم ہر ایک تصنیف پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں،

۱- **صُوَرِ صُوفی** مشہور مسلمان ہیئت دان عبدالرحمٰن الصوفی المتوفی ۳۷۶ھ نے ستارون کے اَشکال و صُوَر پر جو بلند پایہ تصنیف صُوَرُ الکواکب ... ھ سے لکھی تھی، لطف اللہ نے ۱۰۵۰ھ مین اپنے باپ احمد معمار کے حکم سے اس کا

فارسی مین ترجمہ کیا، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی عمر کا پہلا کام ہے کہ اس کا دیباچہ کسی بادشاہ کے نام کے بجائے خود اس کے باپ کے نام نامی سے مزین ہے۔ اور اُس مین نوجوان مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی محنت کا بہترین صلہ یہ ہے کہ اس کا باپ اس کے اس کام کو دیکھ کر خوش ہو اس کتاب کا اصل مسودہ جو خود لطف اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہے مسلم یونیورسٹی لائبریری (۵۲۳ فارسی علوم) مین موجود ہے۔ دیباچہ کی عبارت یہ ہے

"رخشندہ ترین کوکبی کہ از مشرق طبع بر فلکِ ظہور آمد حمد مبدعی و شکر مخترعی۔۔۔۔۔۔

امابعد چنین گوید محتاج الی اللہ القادر الغفار، لطف اللہ بن احمد النادر المعمار، مداللہ ظلہ، علی رؤس الاولاد، بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد کہ چون اشارۂ آنحضرت بسوی این فقیر حقیر شد کہ کتاب عمدۃ الاسلام قدوۃ الانام مولانا عبدالرحمٰن ابن صوفی افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران واسکنہ فرادیس الجنان کہ در معرفت نجوم ثابتہ کتابیست معتمد، و رسالہ ایست کافیہ بحیثیت عموم فائدۂ کلام، و سہولتِ فہم مرام، بعبارتِ فارسی سادہ ترجمہ کردہ آید، تا بر ترغیبِ خاطرِ فارسی خوانانِ حقیقت طلب باعث تر شود، کمرِ اطاعت بر میانِ جان بستہ، دست را بنوشتن نگارین کرد، امید کہ بااین سجیۂ مرضیۂ من در عقبیٰ ماجور، و ترجمۂ من در دنیا مقبول باشد، و طالبانِ این فن ازین ترجمہ مستفید شوند، چنانکہ از اصلِ این، و اگر خطائے باشد اصلاح فرمایند، الحمد للہ والمنۃ کہ در فرصتے اندک ہمگی بوجہ احسن وشائستہ میسر شد، وسنۃ یکہزار و پنجاہ ہجری اتمام پذیرفت، اما احسن وشایستہ تر وقتی کہ از نظرِ مبارکِ والدِ بزرگوارِ من بگذرد و بعینِ عنایت و چشمِ مکرمت نگاہ کنند و قبول فرمایند"

خاتمہ کی عبارت :-

۔۔۔۔۔۔۔۔ ہزار در ہزار حمد ایزدِ داور کہ ترجمۂ کتابِ صُورِ صوفی حسب الحکم قبلۂ صورت

ومعنیٰ، کعبۂ ظاہر و باطن، خداوندِ حقیقت و مجاز، ابویم المسمیٰ باحمد المخاطب بنادر العصر سلمہ اللہ
تعالیٰ من بلیات الزمان و آفات الدہر بآخر رسید و اتمام پذیرفت،

بقلم شکستہ رقم لطف اللہ کہ مؤلف این رسالہ و مترجم این مقالہ است کتاب باتمام
رسید، الحمد للہ علیٰ نعمائہ والصلوٰۃ علیٰ انبیائہ لاسیما علیٰ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین، واغفرلی
ولوالدی بحرمتہم یا ارحم الراحمین،

کتاب کے آخری صفحہ پر آفتاب اور سہا کی مناسبت سے کچھ فقرے مشق کئے گئے ہین اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی یادگار کے طور پر اس کو گھر کے ارکان نے محفوظ رکھا تھا، یہ مشق میرے خیال مین اس کے بھائی عطار اللہ کے قلم سے ہے کہ آخر مین ایک شعر مین جو اوپر عطار اللہ کے حال مین نقل کیا جاچکا ہے اس کا نام لکھا ہے،

۲- رسالۂ خواصِ اعداد یہ فارسی مین علم حساب پر سات صفحون کا رسالہ ہے، اور چار مقالون پر منقسم ہے، اس مین اعداد کے خواص اور قیمتون پر بحث کی گئی ہے، اس کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتبخانہ مین ایک مجموعہ کے اندر ہے، جس مین دو رسالے لطف اللہ کے ہین اور تیسرا عطار اللہ کا وہی خلاصۂ راز ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا (ع ۱۶۷۴/۲) اس کا آغاز یہ ہے،

"الحمد للہ . . . . . . میگوید فقیر لطف اللہ متخلص بمہندس"،

۳- شرحِ خلاصۃ الحساب علم حساب مین بہاؤ الدین محمد بن حسین عاملی المتوفی سنہ ۱۰۳۰ھ کی مشہور عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کی ممزوج شرح ہے، اوس کی شرحین متعدد علمار نے لکھی ہین، جن مین خود اس کے معاصر عصمۃ اللہ سہارنپوری کی عربی شرح جو سنہ ۱۰۸۷ھ مین لکھی گئی ہے بہت مفصل ہے،

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱	لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا از مولوی سید سلیمان ندوی	(۱)
۵۱	بچوں کے تعلیمی نصاب۔ از حافظ محمود خاں شیرانی	(۲)
۱۴۰	سسلی میں مسلمانوں کا تمدن۔ از مولوی ریاست علی ندوی	(۳)
۲۶۲	مناصب اکبری اور ان کی تنخواہیں۔ از شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب دہلوی	(۴)
۲۷۷	عربی علم اللغۃ کی تاریخ۔ از مولوی سعید انصاری	(۵)
۳۶۷	قراقویونلو ترکمان۔ از ڈاکٹر سید اظہر علی	(۶)
۴۰۳	کمال الدین بہزاد مصور۔ از ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی	(۷)

2

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام پروفیسر محمد اقبال
سیکرٹری ادارہ معارف اسلامیہ لاہور چھپ کر دفتر ادارہ معارف اسلامیہ لاہور سے شائع ہوا۔

ادارۂ معارف اسلامیہ

اور

اس کا پہلا اجلاس

۱۹۲۸ء میں جبکہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو اس کو دیکھ کر ڈاکٹر سر محمد اقبال کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسی نمونے پر ایک ادارہ مخصوص طور سے علوم اسلامیہ کی تحقیق و ترویج کے لئے قائم ہونا چاہئے چنانچہ ان کی تحریک اور رہنمائی سے اس مقصد کی تکمیل کے لئے لاہور کے بعض علم دوست مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے یہ فیصلہ کیا کہ ادارۂ مجوزہ کا نام **ادارۂ معارف اسلامیہ** ہو اور ہر دوسرے سال اس کا اجلاس ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں ہوا کرے جہاں محققین علوم اسلامیہ جمع ہو کر اپنے علمی مقالات سے حاضرین کو مستفید کیا کریں اور بعد میں یہ مقالات ایک کتاب کی شکل میں شائع کئے جایا کریں۔ بعینہٖ جیسے یورپ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس یا ہندوستان میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کرتی ہے۔

لیکن اس اہم مقصد کو عمل میں لانے کے لئے روپے کی فراہمی ایک مشکل مسئلہ تھا جو اس وقت حل نہ ہوسکا۔ لہٰذا دو تین سال یہ سکیم معرضِ التوا میں رہی تا آنکہ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کو حیدر آباد تشریف لیجانے کا اتفاق ہوا۔ ان کی کوشش اور ذاتی اثر سے ادارہ کے لئے ریاست کی طرف سے دو ہزار روپے سالانہ کی

امداد تین سال کے لئے منظور ہوئی۔ سال اول کی قسط دسمبر ۱۹۳۲ء میں وصول ہونے پر مجلسِ عاملہ نے فیصلہ کیا کہ ادارہ کا پہلا اجلاس ۱۵ اور ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو بصدارت ڈاکٹر صاحب ممدوح لاہور میں منعقد ہو۔

کچھ وقت کی تنگی اور کچھ عام مالی مشکلات کی وجہ سے یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کی طرف سے ڈیلیگیٹ بہت کم آسکے اور اسی سبب سے مقالات کی تعداد بھی جتنی ہونی چاہئے تھی نہ ہو سکی لیکن مجلس عاملہ کی رائے تھی اور وہ صحیح رائے تھی۔ کہ خدا کا نام لیکر ابتدا کر دینی چاہئے جو کمی پہلے اجلاس میں رہی وہ انشاء اللہ بعد کے جلسوں میں پوری کر دی جائیگی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کو صدارت کے قبول کرنے میں پہلے کچھ تامّل رہا۔ ان کا خیال تھا کہ ادارہ کے حق میں یہ بات مفید ہوگی کہ اسکا صدر لاہور والوں میں سے کوئی نہ ہو بلکہ باہر کا کوئی شخص ہو۔ انہی کی تجویز پر پہلے سر عبدالرحیم اور پھر سر عبداللہ سہروردی مرحوم کو صدارت پیش کی گئی لیکن ان دونو بزرگوں نے مجبوری ظاہر کی خط وکتابت میں بہت سا وقت صرف ہوا حتیٰ کہ اپریل آگیا۔ بحالت مجبوری ڈاکٹر صاحب نے صدارت تو منظور کر لی لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے خطبۂ صدارت نہ لکھ سکے۔ اجلاس کے افتتاح کے وقت جو انہوں نے تقریر کی وہ محض زبانی تھی انکا وعدہ تھا کہ بعد میں اس کو ضبطِ تحریر میں لایا جائیگا۔ لیکن افسوس کہ اُس وقت سے اب تک اُن کی مسلسل علالت نے اس وعدہ کے ایفا کی اجازت نہیں دی۔ مجلس عاملہ کو ایسے حالات میں سخت افسوس ہے کہ اجلاس اوّل کی روئداد خطبۂ صدارت کے بغیر شائع ہو رہی ہے۔

باہر سے جو حضرات بغرض شرکت بحیثیت ڈیلیگیٹ یا وزیٹر تشریف لائے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱) نواب صدر یار جنگ مولا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔
۲ علامہ عبداللہ یوسف علی۔
۳ ڈاکٹر حسین الہمدانی پروفیسر اسمعیل کالج بمبئی۔
۴ ڈاکٹر عبدالعلیم (ڈیلیگیٹ جامعہ ملیہ دہلی)
۵ شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب (ڈیلیگیٹ دہلی یونیورسٹی)
۶ ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب پروفیسر فارسی (" " ")
۷ ڈاکٹر ہادی حسن پروفیسر فارسی (ڈیلیگیٹ علی گڈھ یونیورسٹی)
۸ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی (ڈیلیگیٹ دارالمصنفین اعظم گڈھ)
۹ مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی (" " ")
۱۰ مولانا مولوی سعید انصاری " " (" " ")
۱۱ پروفیسر احسان سامی حقی، سابق پروفیسر علی گڈھ یونیورسٹی)

پروگرام و کارروائی اجلاس اول

۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء

۱۵ اپریل کی سہ پہر کو ہیلی ہال پنجاب یونیورسٹی میں ادارۂ معارف اسلامیہ کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ حاضرین کی تعداد اس قدر تھی کہ ہال میں کوئی نشست خالی نظر نہیں آتی تھی۔ علاوہ اُن باہر سے آنے والے حضرات کے جن کے نام اوپر مذکور ہوئے بہت سے مقامی علم دوست بزرگ شریک جلسہ تھے۔ جن میں سے اسمائے ذیل خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

آنریبل جسٹس سر شیخ عبدالقادر۔ علامہ عبداللہ یوسف علی، شیخ اصغر علی صاحب ریٹائرڈ کمشنر، ڈاکٹر نند لال بیرسٹرایٹ لا، خانصاحب قاضی فضل حق پروفیسر گورنمنٹ

کالج، خان بہادر ملک نے مان مہدی ڈپٹی کمشنر، خان بہادر سردار حبیب اللہ ایم۔ ایل سی مولانا مولوی غلام محی الدین سیکرٹری انجمن حمایت اسلام، شیخ عظیم اللہ بی۔ اے ایل ایل بی سیکرٹری انجمن حمایت اسلام، ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج، ڈاکٹر سعید اللہ پروفیسر اسلامیہ کالج۔ ملک عبدالقیوم بیرسٹر سابق ایڈیٹر ایسٹرن ٹائمز، ملک برکت علی صاحب ایڈووکیٹ، خانصاحب گل محمد خاں وکیل فیروز پور، پروفیسر محمد شفیع وائس پرنسپل اورینٹل کالج۔ حافظ محمود خانصاحب شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق پروفیسر اسلامیہ کالج خان بہادر سید مقبول شاہ سابق انسپکٹر سکولز، وغیرہم،

کارروائی کی ابتدا تلاوت کلام مجید سے ہوئی۔ مولانا سید احسان سامی حقی سابق پروفیسر علیگڈھ نے اپنے عربی لہجہ میں ایک رکوع پڑھا جو معنی اور مطالب کے لحاظ سے نہایت برمحل تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب بیرسٹر صدر استقبالیہ کمیٹی نے حاضرین سے خطاب کیا اور ممبران اور مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے ادارۂ معارف اسلامیہ کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ ازاں بعد علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے صدر جلسہ کی حیثیت سے ایک پرمغز تقریر کی جس میں انہوں نے ادارہ کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا اور اختتام تقریر پر حضور نظام کے گرانقدر عطیہ کا شکریہ ادا کیا جو ذیل کے ریزولیوشن کی شکل میں بہ اتفاق منظور ہوا۔

"ممبران ادارۂ معارف اسلامیہ اپنے اجلاس اولین منعقدہ لاہور میں بالاتفاق حضور نظام دکن کے اس گرانقدر عطیہ کا جو انہوں نے از راہ کرم ادارہ کو بطور سالانہ امداد کے مرحمت فرمایا ہے۔ مؤدبانہ شکریہ ادا کرتے ہیں"۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اردو میں اپنا مضمون بعنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان" پڑھا جس کو سب نے پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا۔ اختتام مضمون پر ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی نے اسی مضمون پر مزید روشنی

اور چھپ بھی چکی ہے' اور جس کا نام انوار خلاصۃ الحساب ہے، دوسری یہ لطف اللہ مہندس کی ہے، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ مین ہے (ع ۷۶۱ مخطوطات عربی) اس مین مصنف کا نام لطف اللہ المتخلص بالمهندس ابن الاستاذ احمد المعمار' لکھا ہے اور اس کا آغاز ان لفظون سے ہے' اَلحمد للّٰہ الواحد الفرد الصمد' یہ نسخہ ایک خاص حیثیت سے ممتاز ہے جس کا ذکر آگے آئیگا، اس کتاب کا دوسرا نسخہ ہندوستان مین رامپور کے کتبخانہ مین ہے (ع ۴۵ ریاضی) اس نسخہ کے صفحات کی تعداد ایک سو بیس ہے۔

۴۔ مُنتخب یہ بہاء الدین عاملی کی مذکورۂ بالا تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ اور خلاصہ ہے' انگلستان اور ہندوستان مین اس کے متعدد نسخے ہین، دو نسخے انڈیا آفس کے کتبخانہ مین ہین، تیسرا برٹش میوزیم لائبریری مین، چوتھا کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن مین[1]، پانچوان مسلم یونیورسٹی علی گڈھ مین، اور چھٹا جامعۂ ملّیہ دہلی مین ہے، اس رسالہ کا مُنتخب نام تاریخی ہے' اس سے سنہ ۱۰۹۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے' مقدمہ مین لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندان وزارت کے رکن رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ کی فرمائش سے لکھی گئی ہے'

اس کا آغاز اور دیباچہ حسب ذیل ہے'

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُولِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَاَصحَابِہٖ اَجمَعِینَ، امابعد می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد

---

[1] برٹش میوزیم کے نسخہ کا ع ۱۶۷۴۴ اور انڈیا آفس کے نسخہ کا ع ۲۲۵۳ اور ع ۲۲۵۴ اور آصفیہ باب ریاضیات تاریخ کا ۲۱۱ ہے'

احمد معمار لاہوری غفراللہ لہ و لوالدیہ و احسن الیہما و الیہ، کہ کتاب حساب را کہ تصنیف است از محقق و تحریر مدقق شیخ بہاء محمد بن حسین عاملی است (؟) رحمۃ اللہ علیہ مشتمل بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ با شارات خلاصہ دودمان سیادت، منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ و ضاعف اجلالہ ترجمہ کردم کہ چون آن نسخہ خلاصہ نام داشت این نسخہ را منتخب نہادم .... نام تاریخ تالیف این رسالہ است و این رسالہ بنا بر ترتیب کتاب مرتب است بر مقدمہ و ابواب،

آخر مین ایک حسابی مسئلہ کا حل نظم مین ہے، جس کا خاتمہ ان دو شعرون پر ہے ؎

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ — بمہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنروران کبار — پور استاد احمد معمار

انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ نمبری ع ۲۲۵۴/۵ ۳ شعبان ۱۱۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اور حیدرآبادی نسخہ کی تاریخ ۱۲۴۳ھ ہے، اور کتب خانہ مین اس کا ع ۲۱۱ ریاضیات فارسی ہے، مسلم یونیورسٹی کا نسخہ سبحان اللہ خان لائبریری مین ہے، اس کا ع ۵۱۱/۴ ہے، اور وہان اوس کا نام ترجمہ خلاصۃ الحساب ہے اور کتابت کا سال ۱۸۳۹ء ہے، جامعۂ ملیہ کے نسخہ کا ع ۷۶ سلسلہ مخطوطات ہے، اور تاریخ سے خالی ہے،

۵۔ آسمان سخن دولت شاہ سمرقندی کا فارسی شعرا کا تذکرہ جو ۸۹۲ھ مین تالیف پایا ہے، با این ہمہ اغلاط دلچسپ ضرور ہے اور اسی لئے اہل سخن کی محفلون مین اس کا تذکرہ رہا کیا ہے، دولت شاہ کا تذکرہ فارسی نثر مین ہے، اور سات طبقون پر منقسم ہے، اکبر کے زمانہ مین فائضی کرمانی

نام ایک شاعر نے اس کو نظم کر ڈالا' اور سات طبقون کے بجائے اوس کو دس طبقون مین مکمل کیا، لطف اللہ مہندس نے فائضی کے نسخہ میں دو اور طبقون کا اضافہ کرکے اوس کو ۱۲ طبقون مین پورا کر دیا، اور بارہ برجون کی مناسبت سے اوس کا نام "آسمانِ سخن" رکھا'

یہ تمام واقعات لطف اللہ مہندس نے اس کتاب کے دیباچہ مین ذکر کئے ہین' اس کتاب کا نسخہ شاہِ اودھ کے کتبخانہ مین تھا، ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتبخانہ کی فہرست مین اس کتاب کا صفحہ ۱۱۶ پر ذکر کیا ہے، اب کسی اور کتبخانہ مین اس کا نشان نہیں ملتا، معلوم نہین گردش چرخ نے اِس آسمانِ سخن کو کس خاک میں ملا دیا، لطف اللہ مہندس کے اس اضافہ مین کل ۲۵۰ بیتین' ایک ایک بیت میں ایک ایک شاعر کا بیان تھا، اس کا پہلا شعر یہ تھا'

تخست شکر خدای کہ آسمان سخن　　بیافرید محیط نُہ آسمان کہن

فہرست مذکور مین ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کے بارھوین طبقہ کے ۱۲ شعر نقل کئے ہین' ان شعرون مین شاہجہانی شعرا کے نام نظم کئے گئے ہین اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے دورِ اکبری کے بعد جو دو طبقے بڑھائے تھے' ان مین سے پہلے مین جہانگیری عہد کے اور بارھوین مین شاہجہان کے زمانے کے سخنورون کے نام ہونگے وہ ۱۲ شعر یہ ہین'

وحید دہر امانی بن مہابت خان　　ولے بجا نزمان است شہرۂ دوران
دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن　　ربودہ گوی سخن از سخنوران در فن
دگر وحیدِ زمن آشنا عنایت خان　　بود بجر سخن آشنا عنایت خان
دگر وحیدِ زمن شادمان غم پرور　　بیانِ شادی وغم در کلامِ او مضمر
دگر سخنورِ کشمیر محسن فانی است　　بقای نام وی از دولتِ سخندانی است
مہِ سپہرِ سیادت یگانہ میر عماد　　کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیبِ عصر محمد حسین آشوب است | سخنوری کہ سخنہاش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان است طالبلے کلیم | کہ شعرِ اُو یدِ بیضا است نزدِ طبعِ سلیم
دگر فرید جہان قدسی محمد خان | بعہدِ شاہجہان گوربودہ از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد | سخنورے است کہ دادِ سخنوری می داد
لبیب از منہ امّی نخواند ہیچ کتاب | زفیضِ حق شدہ مفتوح بر رخش صدباب
دگر وحیدِ زمن باقیا ترا آزاد | خوشست ہمچو غزلہائے عاشقانہ او
فصیح از منہ فتحا کہ چون غزل می گفت | چو عندلیبِ غزلخوان در وگہری سفت

دوین شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے یہ دادِ سخن عہد شاہجہانی (۱۰۶۸ھ) کے بعد دی ہے،

۶ - دیوانِ مُہندِس

یہ پورا دیوان چھوٹی تقطیع کے چھیانوے صفحون مین ہے، سب سے پہلے دیوان کے شروع مین دس صفحون مین چار قصیدے ہین، پہلا نعت مین ہے، دوسرا دارا شکوہ کی، اور تیسرا شاید دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان کی مدح مین ہے، اور چوتھا، کسی معشوق کا سراپا ہے، اس کے بعد نئی بسم اللہ سے غزلین شروع ہوتی مین، جو حروف تہجی پر مرتب ہین، یہ گیارھوین صفحہ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۷ پر تمام ہوتی ہین، پھر نئی بسم اللہ سے وہ مثنوی شروع ہوتی ہے جس مین اس نے اپنے خاندان کا احوال لکھا ہے، پھر ایک دو مختصر مثنویان اور چند قطعے ہین جن مین سے دو چار قطعے تاریخی ہین،

پہلے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب بہت پُر زور ہے،

خسروِ مہر چو بنشست براورنگِ عمل | رستمِ رُوز در اقلیم سب افگند خلل

رومی روز برافراختہ رایت بمصاف — زنگی شب سپر انداختہ ہنگام جدل
کیمیا ساز نبود است گراین عامل روز — مس شب را بزر روز چرا کرده بدل
روز افزودۂ و شب کاستہ زآن روی کہ مہر — کردہ آئینۂ ایام و لیالی صیقل
سنگ از تربیت مہر شود لعل و کنون — اخگر از تربیتش لعل شود در منقل
وقت آنست کہ در قافلہ از فیض بہار — آب زمزم شود اکنون نمی باب بدل
وقت آنست کہ واعظ چو نہد مجلس وعظ — صورت شیشہ شود نسخۂ واعظ بہ بغل

اس قصیدہ کے آخر مین شاعر نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغل تدرس وتدریس کا ذکر کیا ہے،

دل دانائی مرا فخر بعلم است و بفضل — جاہل است آنکہ بنازد بجلی و بحلل
باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم — جہل ازین علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار — ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل

دارا شکوہ کے مدحیہ قصیدہ مین اپنی مدح خود ان شعرون مین کرتا ہے،

مہندسم کہ کنم صورت فلک تصویر — کشم بروی زمین گر خطوط پرکاری
چنان بلند نہادم اساس قصر خرد — کہ بر سپہر زنم طعنۂ نگونساری
چنان منیر شود شمسۂ عمارت من — کہ نور مہر بود نزد نور او ناری
دمی کہ من بعمارت گری شوم مشغول — ملک مصالح کار آورد بسر باری
بدستیاری لطف شہ بلند اقبال — بلند پایہ زمین گشت قدر معماری
سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریا دل — کہ ہمچو ابر کفش می کند گہر باری
بعہد دولت تو راجہ ہای کوہستان — ز فرق خویش نہادہ کلاہ جباری

بیک نگاہ کہ کردی بسوئی کوہستان — گرفتہ پست و بلندی کوہ ہمواری

ان اشعار مین جن واقعات کی طرف اشارہ گیا ہے،

لطف اللہ مہندس کے اکثر اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نام و نمود کا حریص اور معماری جیسے پیشہ سے اپنے کو بلند سمجھتا ہے، چنانچہ اس قصیدہ مین وہ کہتا ہے،

شہا اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من — وگرچہ نیست ضمیرم ازین ہنر عاری

کنون کہ ملکِ دلم شد خرابِ عشقِ بتان — تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بمعماری

غزلون کا عام انداز وہی ہے، جو اس عہد کے دوسرے ملا شاعرون کے کلام مین ہے، زبان مین کہین کہین ہندیت ہے، اس کے مقطعون مین خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس مین مُہندس کی نسبت سے کوئی بات ضرور پیدا کرتا ہے، مثلاً

مہندس گرچہ آگہ بود زین پیش — فرامش کرد قانون شفا را

باشد ز فلک مہندس آگاہ — با آنکہ نشستہ بر زمین است

ای مہ بے مہر در چشم مہندس بے رخت — از حضیض خاک تا اوجِ ثریا آتش است

رو مہندس بعلم یکدو سہ شکل — این ہمہ افتخار بے معنی است

ای مہندس رو کہ در علمِ نظر — احتیاج مسطر و پرکار نیست

ہان حرف زمین بگو مهندس — تا کے ز فلک کنی حکایت

از مهندس مپرس سرِّ فلک — کین معما ز ہیچ کس نکشود

ایک مقطع مین اس مهندس کے لفظ سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے،

در حقّ من گمانِ خطامی بری خطاست — ہرگز شنیدۂ کہ مهندس خطا کند

تا بکے شکل زمین خواہی کشید — رو مهندس صورت افلاک کش

کہنہ شد آسمان مهندس خیز — تا بنا ہائے نو نہادہ شود

حسب ذیل غزل اس کے بہترین کلامون میں سے ہے،

یاران ہلال عید بر آمد نظر کنید — ماہِ صیام رفت مغان را خبر کنید

یاران دگر بکوری مفتی و محتسب — امروز خاک میکدہ کحل بصر کنید

آن کس کہ از بر آمدنِ مہ خبر کند — اورا باحترام و ہن پر شکر کنید

اکنون رسید کوکبۂ عیش و انبساط — ای درد و غم ز مملکت دل سفر کنید

گر در من و نگار مهندس شود حجاب — دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

ذیل مین اس کے دیوان کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہین جن سے اس کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہین، اس کا نام

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم — جہل ازین علم تو بہتر کہ نیاید بعمل

خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد — تا چند کشم محنت دورِ قمری را

ہمچو لطف اللہ احمد کوس دانش می زدم　　چون شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف

ان شعروں میں لطف اللہ اس کا، اور احمد اس کے باپ کا نام ہے، لاہور اس کا وطن تھا،

کے بود آمدن قاصد فرخندہ پیام　　مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

ہندسہ و منطق و حکمت میں اوس کو غلو تھا،

برمن ہیچمدان کشف شد از فیض ازل　　راز سربستہ کہ بر ہندسہ دان مشکل بود

صرف در منطق و حکمت شدہ این عمر عزیز　　نیک آن نکتہ نخواندم کہ درو حاصل بود

معماری و ہندسی میں نامور تھا،

لطف اللہ معمار و ہندس شد و استاد　　گر کار درایت نکند پس چہ کند کس

درس و تدریس کا بھی شغل تھا،

عمر در درس بسر بردی و در آخر کار　　ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل

کسی شاہزادہ کے نام ایک مثنوی ہے جس سے مراد غالباً دارا شکوہ ہے، کہ "شہزادۂ بلند اقبال" کے نام سے وہی مخاطب تھا، اس میں وہ کہتا ہے،

لطف شہ می کند مددگاری　　ورنہ آگہ نیم ز معماری

خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب　　ہیئت و ہندسہ و نجوم و حساب

نہ نویسم ز بیم بے ادبی　　کہ چہا خواندام من از عربی

. . . .

لطف شہزادۂ بلند اقبال　　گر شود بندہ را معاون حال

خدمت بندہ را بفرماید　　کہ از و علم رفتہ باز آید

گر یکے از مقربان بساط | در دم عیش و در زمان نشاط
این سخن از مقیم این درگاہ | برساند بسمع حضرت شاہ
اجر باید ز کردگار کریم | نہ کہ اجر قلیل اجر عظیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داراشکوہ کے توسط سے شاہجہان تک پہونچنا چاہتا ہے، کہین کہین غزلون کے مقطع مین بھی ادھر اشارہ ہے،

ہان مہندس بندۂ شاہِ بلند اقبال باش | آنکہ گر فرمان دہد جمشید فرمان بر شود

ایک مثنوی مین کسی ایسے خانوادۂ وزارت کے کسی رکن کی مدح وہ کرتا ہے، جس کو سیادت کی عزت بھی حاصل تھی،

اخترِ برج حشمت و اجلال | گوہرِ درج دولت و اقبال
نیّرِ آسمان بینائی | آفتابِ سپہرِ دانائی
منبع جود و مخزنِ احسان | مظہرِ فیض و معدنِ ایقان
زبدۂ دودمانِ مصطفوی | نخبۂ خاندانِ مرتضوی
امرا را شرف امارتِ او | وزرا را شرف وزارتِ او
امرا از امارتش منصور | وزرا از وزارتش دستور
آب شرع است سیفِ مسلولش | دست عدلست رمحِ مصقولش

میرا خیال ہے کہ اس مدح کا موضوع وہی ہستی ہے جس کے نام پر شاعر نے اپنی کتاب منتخب الحساب لکھی ہے، یعنی "خلاصۂ دودمان سیادت، منتخبِ خاندانِ وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحیٰی ادام اللہ اقبالہٗ و ضاعف جلالہٗ"؛

لطف اللہ اور اس کے بھائیون کی تصانیف سے یہ ہویدا ہے کہ ان لوگون

کو شاہجہان کے بعد جس سے تعلق رہا ہے وہ شہزادہ دارا شکوہ ہے، چنانچہ لطف اللہ کے بھائی عطار اللہ رشیدی نے اپنا رسالہ خلاصۂ راز شہزادہ موصوف ہی کے نام سے معنون کیا ہے، لطف اللہ کے اس دیوان کے اکثر اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اسی شہزادہ کے دربار میں رسوخ و اعتبار حاصل تھا، نعت کے بعد جو پہلا قصیدہ اس دیوان میں ہے، وہ اسی کی مدح میں ہے۔

بدستیاریِ لطفِ شہِ بلند اقبال — بلند پایہ زمن گشت قدر معماری
سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریادل — کہ ہمچو ابر کفش می کند گہر باری

اوس کی ایک غزل کا ایک مطلع ہے:

گر بادشہ بلطف نظر بر گدا کند — بر بادشہ نظر بعنایت خدا کند

اس کی دوسری غزل کا مطلع ہے،

ای شاہِ زمن بیا و بنگر — دردِ دل من بیا و بنگر

ایک پوری غزل مدح میں ہے،

ای زجودِ تو کامرانیِ دھر — وز وجودِ تو پاسبانیِ دھر
بخدای خدایگانِ زمان — بتو زیبا خدایگانیِ دھر
دھر را مدح تو وظیفہ بود — گوش کن بر وظیفہ خوانیِ دھر
بتو زیبا است خلعتِ شاہی — زِ تو پیدا است کامرانیِ دھر

باشد از لطف تو مہندس شاد
ای ز لطفِ تو شادمانیِ دھر

ان موقعوں پر لفظ لطف کا لطف اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں،

ایک اور مدحیہ غزل سنیئے جس کے مطلع مین دادا بیٹا اور پوتا تینون کے نام لکھا ہین،

دارا شکوہ، شاہجہان بانی جہان ۔۔۔ بردی مبارکست سلیمانی جہان

شاہ جہان، دارا شکوہ بن شاہجہان اور سلیمان شکوہ بن دارا شکوہ بن شاہجہان،

پروردگار باد نگہبان دولتت ۔۔۔ زانرو کہ کار تست نگہبانی جہان

تا ز آب و آتش است نشان در زمانہ باد ۔۔۔ روشن زخاک پائی تو پیشانی جہان

ای بانی جہان کہ جہان در ثنای تست ۔۔۔ یکلخظہ گوش دار ثنا خوانی جہان

تا کے مہندس است پریشان چو زلف یار

اے از تو دور گشتہ پریشانی جہان

ایک قطعہ ہے،

دولت جاوید و تخت سرمد و ملک دوام ۔۔۔ ہمعنان و ہمدم شاہ بلند اقبال باد

از کف دستش زر و گوہر برد دربارگاہ ۔۔۔ تا ابد دریا و کان زین فیض مالامال باد

می کند احسان او درماندگان را یاوری ۔۔۔ یاور او را ایزد ذوالمجد والافضال باد

دوسرا قطعہ

ثنا خوان ترا شاہا چہ حاجت مدح جم گفتن ۔۔۔ بجام بادہ حاجت نیست مست جام سرمد را

چو می خواہد کہ باشد بانی قصر ثنای تو ۔۔۔ بکار خشت و گل مگذار لطف اللہ احمد را

اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معماری کے پیشہ کو اپنے سے کم درجہ جانتا تھا،

دارا شکوہ نے اس سے اپنا محل بنوایا ہے اس کی تاریخ نکالتا ہے،

چو بنا کردہ قصر جاہ و جلال ۔۔۔ ظل حق بادشاہ عالی ملک

شبہ این عمارت والا ۔۔۔ تافت چون مہر بر حوالی ملک

گفت معمارِ قصر، تاریخش　　قصرِ داراشکوہ، والیِ ملک

اس مصرع تاریخ سے بنا ۱۰۶۰ھ نکلتی ہے، اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ کا یہ قصر اسی شاعر معمار نے بنایا تھا،

داراشکوہ نے کوئی کنجی بنوائی ہے، اوس کی تاریخ لکھی ہے،

چو طیار شد این کلید ظفر　　بفرمانِ دین پرورِ حق پژوہ

پی سال تاریخ انجام وی　　خرد گفت "مفتاح داراشکوہ"

"مفتاح داراشکوہ" سے ۱۰۶۶ھ نکلتے ہیں، جس کے ایک سال بعد داراشکوہ کی تاریخ کا صفحہ بدل جاتا ہے،

داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کدخدائی کی تاریخ یہ لکھی ہے،

کدخدا گشت باقبال بلند　　پورِ دارای زمان شاہِ زمین

در زمانے کہ مُراداتِ جہان　　بود در دست چو در دست نگین

گفت جبریلِ امین تاریخش　　<u>بسلیمان شدہ بلقیس قرین</u>

آخری مصرع سے ۱۰۶۴ھ نکلتے ہیں،

اوپر کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اور اس کے خاندان کا تمامتر تعلق داراشکوہ سے تھا، اہلِ تاریخ سے اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ پیدا کرنا نہایت آسان ہے، یعنی یہ کہ اوس کو داراشکوہ سے جس قدر وابستگی ہوگی اسی قدر عالمگیر کے دربار سے اس کو دوری ہوگی داراشکوہ کے مدحیہ قصیدہ مین کچھ ایسے شعر بھی ہین جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مین داراشکوہ کے حریف مقابل یعنی اورنگ زیب پر طعن وتعریض ہے، مثلاً

زہستیش نہ توان نیم قطرۂ خون　　ہزار بار دل خصمش ازبفشاری
بزخم تیر کہ زد در دل معاند او　　ربودہ رنگ دلم را سپہر زنگاری
دران دیار کہ بخت حسود تست بخواب　　ندیدہ دیدۂ مردم بخواب بیداری
مدام باد ہوا خواہ دولت تو بعیش　　نصیب خصم تو جاوید باد خونخواری

ان اشعار مین "خصم" اور "معاند" اور "حسود" سے غالباً اورنگ زیب ہی کی طرف اشارہ ہے، اس بنا پر سنہ ۱۰۶۷ھ کے انقلاب مین جب "شہزادہ بلند اقبال" کی جگہ اورنگ زیب عالمگیر زیب اورنگ ہوا تو اس خاندان کی کس مپرسی محتاج بیان نہ ہوگی، لطف اللہ کے دیوان مین ایک قطع بند غزل ہے،

شہا گوش بر داد خواہی نداری　　بحال گدایان نگاہے نداری
رقیبان بقتلم نوشتند فتوے　　وگرنہ تو ہرگز گناہے نداری
جہان سربسر خیر خواہ تو باشد　　ولے ہیچو من خیر خواہے نداری
نیاری صبا سوی بلبل پیامے　　مگر سوی گلزار راہے نداری
مہندس از آنرو نداری وقارے　　کہ چون زاہدان خانقاہے نداری

میرے خیال مین اس غزل کا خطاب اورنگ زیب ہی کی طرف ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس کو دارا شکوہ کے عہد میں اس گلہ و شکایت کا موقع نہ تھا، اور نہ زاہدون کی خانقاہ پر تعریض کی حاجت تھی،

اوپر کے اشعار مین مہندس نے اپنی تعمیری مہارت فن کا بھی جا بجا اظہار کیا ہے کہتا ہے ع "بلند پایہ زمین گشت قدر معماری" ایک جگہ فخریہ کہتا ہے ع "ماہمہ معمار و عمارت گریم" ایک جگہ کہتا ہے کہ میرے بنائے ہوئے نقشے آفتاب

کی طرح روشن ہوتے ہیں،

چنان منیر شود شبہہ عمارت من · کہ نور مہر بود نزد نور او ناری
دمی کہ من بعمارت گری شوم مشغول · ملک مصالح کار آورد بسر باری

مگر با این ہمہ یہ نہیں معلوم کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں کون ہیں، اوپر کے ایک تاریخی قطعہ سے دارا شکوہ کے ایک محل کے بنانے کا حال معلوم ہوتا ہے، تذکرہ سفینۂ خوشگو۔ اور نشتر عشق حسین قلی خان میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے حال میں ہے،

"ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوری است کہ قلعۂ ارک دار الخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ" (خوشگو)

اس سے معلوم ہوتا ہے قلعۂ دہلی کے شاہجہانی عمارات کی تعمیر میں یہ بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ شریک تھا،

امام الدین الریاضی

یہ لطف اللہ مہندس کا بیٹا اور استاد احمد کا پوتا ہے،

ریاضیات کے اس ریاض علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکرہ کی خوشبو بارھویں صدی کے اہل تذکرہ کی محفل تک پھیلی ہے، خوشگو نے اپنے سفینہ میں، حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنے نشتر عشق میں، کشن چند اخلاص نے اپنے ہمیشہ بہار میں، اور احمد علی خان سندیلوی نے اپنے مخزن الغرائب میں ان کے حالات لکھے اور ان کے فارسی اشعار نقل کئے ہیں اور اسی ضمن میں ان کے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے احوال کی طرف بھی اشارات کئے ہیں، سفینۂ خوشگو میں ہے،

"مولوی امام الدین ریاضی تخلص خلف ملّا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک دارالخلافہ شاہجہان آباد تجویز و صوابدید او بنا یافتہ و از عہد جدّ خود بدار الخلافہ سکونت دارد، در جمیع علوم رسمی یگانہ و منفرد بود، خصوص در ریاضیات تصانیف معتبر دارد، و با این ہمہ قناعت و ریاضت را زیور حال و مآل خود ساختہ، بدرس و افادت مشغولی داشت درین جزو زمان از مغتنمات بودہ، اگرچہ بنا بر اشتغال علمی بفکر سخن کم می پرداخت، لیکن سلیقۂ بسیار درست داشت، و در جوابہای پای کم نمی آورد، و در سال ہزار و صد وچہل و پنج رحلت کرد، و امروز ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی او ...... (خیر اللہ کی رصد بندی کا تذکرہ جس کا ذکر اس کے حال مین آئیگا)

پھر مولانا ریاضی کے چند فارسی اشعار کا انتخاب ہے،

حسین قلی خان عظیم آبادی نشترِ عشق مین لکھتے ہین،

"مولانا امام الدین نام، خلف مولانا لطف اللہ مہندس لاہوریست کہ قلعۂ ارک شاہجہان آباد برای وی بنیاد شدہ، مدۃ العمر خود در شاہجہان آباد گذرانیدہ چون وی بعلم ریاضی تفوق بر ابنائے جنس داشت و در ورع و پرہیزگاری بے مانند بود لہذا تخلص خود ریاضی می کرد و گاہ گاہے بفکر بہ تلاش سخن ہم می گماشت ...... در سنہ یکہزار و یکصد و چہل و پنج بگل چینی ریاض جنان شتافت،

حسین قلی خان نے ان کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ لکھا ہے،

بگفتہ عاشقے با آہِ دل سوز　　برفتہ چون امام الدین زدنیا
بدیع و صرف و معنیؔ و ریاضی　　شدند ای وای بے او بے سروپا

کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرۂ ہمیشہ بہار مین ان کا تذکرہ بڑے اخلاص کے ساتھ چند صفحون مین لکھا ہے، جس کی ایک ایک سطر سے اس کی عقیدتمندی اور نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے، خصوصاً ان کے زہد و استغنا اور سلاطین و امرار کے درباروں سے ان کی بے نیازی کی تعریف کی ہے، ابتدائی سطرین یہ ہین،

.... اصل وطن ایشان دارالسلطنت لاہور است و جدِّ شریف آن دانائے اسرار کونی و الٰہی آمدہ در دارالخلافۃ شاہجہان آباد اقامت گرفتہ والدِ شریف ایشان مولوی لطف اللہ مہندس کہ ایشان ہم گاہ گاہے میل بشعر می کردند و مہندس تخلص می فرمودند، و در علمِ ریاضی خیلے ید علیا داشتند'

پھر چند صفحون مین ان کے زہد و اتقا کے حالات لکھے ہین، اور ان کے شاعرانہ کمال کے ایک دو واقعے نقل کئے ہین،

احمد علی خان سندیلوی نے تذکرہ مخزن الغرائب مین جو ۱۲۱۸ھ مین لکھی گئی ہے ذرا سے لفظی تغیر سے وہی کچھ لکھا ہے جو اخلاص نے بیان کیا ہے، چنانچہ اس مین ہے،

" مولانا امام الدین ریاضی اصل وطن ایشان بلدۂ لاہور است، جدش توطن در دہلی اختیار کردہ، پدرش مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشان ہم گفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند، و در علم

ریاضی مثل این ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودہ اند، ہر چند مولانا ریاضی بگفتن شعر توجہ نداشت روز و شب بہ تدریس مشغول بود"۔

تذکرۂ صبح گلشن مین ہے،

ریاضی امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعۂ ارک شاہجہان آباد بصوابدید رای زرینش بنیاد گرفتہ، و ریاضی متوطن شاہجہان آباد گردیدہ، از ان شہر مدۃ العمر بیرون نرفتہ، ماہر علوم درسیہ بودہ، و در سبق علم ریاضی از معاصرین قصب السبق ربودہ، در عبادت و ریاضت و ورع و زہد عدیل خود نداشتہ"

تاریخ علمائے ہند مین یہ سطرین ہین،

"ملا امام الدین دہلوی در اصل لاہوری است، ریاضی دان بود کہ بدہلی توطن گرفتہ، شرح مختصر بہ تشریح الافلاک مصنفۂ بہاء الدین آملی در سال یازدہ صد و سہ ہجری نوشتہ کہ بنام التصریح فی شرح التشریح شہرت دارد"
(صفحہ ۲۶۲ نول کشور)

عام طور سے اس کی یہی تصنیف تصریح جو بہاء الدین آملی کے مشہور متن تشریح الافلاک کی شرح ہے، لوگون مین مشہور ہے، حالانکہ اس سے پہلے عصمۃ اللہ سہارنپوری نے ۱۰۸۶ھ مین اس کی مفصل شرح لکھی تھی، جس کا نام باب تشریح الافلاک ہے، اور جو چھپ بھی گئی ہے، تاہم علم ہیئت مین عربی درسگاہون کی سب سے ابتدائی اور مختصر ترین کتاب یہی ہے اس لئے بہت متداول ہے مصنف نے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے،

"امابعد فیقول العبد الضعیف امام الدین بن لطف اللہ المھندس اللاھوری ثم الدھلوی،"

(دیباچۂ تصریح)

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان گو دراصل لاہور کا رہنے والا تھا، مگر بعد کو شاید شاہی تعمیرات کے تعلق سے دہلی آکر آباد ہو گیا تھا،

امام الدین نے اپنی اس تالیف (تصریح) کا سنہ دیباچہ مین سنہ ۱۱۰۳ھ لکھا ہے، اور ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ لطف اللہ کم از کم سنہ ۱۰۹۲ھ تک زندہ تھا کہ اوس کی تصنیف "منتخب" اسی سال تالیف پائی ہے، اور اس کے گیارہ برس کے بعد اس کا بیٹا تصریح لکھتا ہے، اس سے یہ یقینی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ ہی کے عہد مین بیٹا علوم وفنون کی تکمیل کر چکا تھا، یا کر رہا تھا، اس سے ہم کو یہ قیاس کرنے کا حق ہوتا ہے کہ غالباً اس نے اپنے باپ ہی سے علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی ہوگی، تذکرون مین اس کی تاریخ وفات سنہ ۱۱۴۵ھ (سنہ خمس و اربعین و مائۃ و الف) لکھی ہے،

تصریح کے دیباچہ مین لکھا ہے کہ" یہ شرح اوس نے بھائیون اور دوستون کی فرمائش سے لکھی ہے"، اس سے مراد اوس کے شاگردون کی جماعت ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی درس و تدریس کے موروثی پیشہ مین مشغول تھا، چنانچہ سندیلوی نے تصریح بھی کی ہے کہ "روز و شب بہ تدریس مشغول بود"،

رامپور کے کتبخانہ مین اس کی کتاب تصریح کے دو نادر نسخے ہین، جن مین سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصنیف کی تاریخ سے بارہ برس کے بعد سنہ ۱۱۱۵ھ

مین لکھی گئی ہے، اور دوسرے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ سنہ ۱۲۱۱ھ مین اس نسخہ سے منقول ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، پہلے نسخہ کا نمبر ۱۵ اور دوسرے کا ۱۶ (فن ہیئت) ہے،

مصنف نے اپنی اس شرح پر حواشی بھی لکھے تھے، چنانچہ رامپور کے نسخہ نمبر ۱۶ پر مصنف کے یہ حواشی موجود ہین، ہمارے استاد مولینا حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ مدرسۂ عالیۂ رامپور و دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے تصریح پر جو حاشیہ اپنے قیامِ رامپور کے زمانہ مین سنہ ۱۳۱۱ھ مین لکھا تھا، اور جو مجتبائی دہلی مین چھپا ہے، اوس کے آخر مین محشّی نے تصریح کی ہے کہ انہون نے شارح کے ان حواشی سے جو اوس کے ہاتھ کے نوشتہ نسخہ سے منقول ہین استفادہ کیا ہے (خاتمہ حاشیۂ تصریح مطبوعۂ مجتبائی دہلی)

امام الدین نے دو اور کتابون پر بھی حاشئے لکھے ہین، جن مین سے ایک قاضی زادہ رومی کی مشہور فلکی تصنیف شرح چغمینی پر ہے، نوابی اودھ کے زمانہ مین علی بخش خان ... مطبع علوی مین مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خان بہادر قبول کے زیر اہتمام شرح چغمینی کا جو نسخہ متعدد علما کے حواشی اور تعلیقات ... چھپا ہے، ان مین ایک امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس الدہلوی" کے حاشیہ کے بھی منقولات اور حوالے ہین، چنانچہ کتاب کے خاتمہ ... کا ذکر ...

پر ہے،

امام الدین [illegible]

کشن چند اخلاص اور [illegible]

سے شعر گوئی کی فرصت نہین ملتی تھی، [illegible]

جس کا جواب نہین ہوسکتا تھا، ایسا جواب لکھا جو [illegible]

باہر ہے، طالب کا مطلع تھا،

بتن بو یا کند گلہای تصویر خیالی را بیا بیدار سازد خفتگان نقش قالی را

اخلاص اور سندیلوی کہتے ہین کہ اس کا جواب شاعرون سے اب تک نہین ہوسکا

[illegible] تک کہ "میان ناصر علی" کو ان کے دوستون نے اس زمین مین کچھ کہنے

[illegible] تو صاف کہا کہ "این زمین را طالبا بر د چیز یکہ ماندہ است و رواست"

[illegible] جیسے "شاعر غرّا" نے جب اس غزل کا جواب لکھا تو سپر ڈال دی،

[illegible] مطلع نہین لکھا، بلکہ یہ مطلع کہا،

[illegible] را [illegible] دوست [illegible] عاشق [illegible]

[illegible] جواب [illegible] دیا،

[illegible]

[illegible] جہان [illegible] ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

[illegible] اپنے بھائی امام الدین کا شاگرد تھا، اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محمد شاہ

کے زمانہ مین راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس اور اجین

[illegible] قائم کئے تھے ان کا بانی اور نگران [illegible] نادرۂ روزگار تھا، آج

[illegible] لائبریری مین نظر سے گذرا،

[۲] رفتی، ورفت لشکرِ دل در رکابِ تو　　شهرم برنگ مجلسِ تصویر جان نداشت

---

[۳] روشن دلیم وخاک نشینی عیارِ ماست　　سیماب وارکشته شدن اعتبارِ ماست
[۴] آزاده ایم مطلبِ ما ترکِ مطلب است　　باز آمدن زحاصلِ ہر کار کارِ ماست
[۵] ما خارِ غم بسینہ چو ماہی نہفتہ ایم　　گلزارِ عشق داغِ دل خار خارِ ماست
[۶] دریا دل است یار وغم از ما دریغ داشت　　خشک و تری بپای گل افسوس خارِ ماست

---

[۷] زعشقِ یار چہ گویم کہ حالِ من چون است　　غمم بدورِ خطش از احاطہ بیرون ست
[۸] ندانم ارچہ شدی سنگدل کہ بیمار است　　بجان رسید ونپرسی کہ حال او چون ست

ساتوین شعر میں دیکھیئے کہ ریاضی کی جھلک دَور ، خطّ ، اور احاطہ مین موجود ہے سفینۂ خوشگو مین یہ دو شعر اور ہین ،

پایۂ عشق بلندی زسرِ دار گرفت　　ہر کہ دریافت چو منصور سرے سر دار یست
یوسفستان معانی است ریاضی سخنت　　چاک پیراہنِ نظمِ تو عجب بازار یست

امام الدین ریاضی نے تصریح کے دیباچہ مین جو چند لفظ لکھے ہین اون سے اور کشن چند اخلاص کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تربیت کے دامن مین ، ریاضیات کے کئی مستعد شاگرد پل کر جوان ہوئے ، اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار مین ہے ،" ویکے از شاگردانِ ایشان بر مجسطی شرح فارسی نوشتہ خیلے تفصیل" پھر لکھا ہے ،

"عزیزے درحق بعضے از شاگردانِ ایشان گفتہ: ع
تو ئی در ہر فنی چون مردمک 'فن'

اس کے بعد ہے،

"شاگردانِ ایشان در ریاضی تصانیف رائقہ و نکتہ دارند"

خیر اللہ بن لطف اللہ

لطف اللہ مہندس کا یہ دوسرا لڑکا ہے۔ اس کا پورا نام ابو الخیر المخاطب بہ خیر اللہ خان مہندس ہے، محمد شاہ کے عہد مین اُس نے اپنا نام روشن' اور لفظ "المخاطب" سے ہویدا ہے کہ بادشاہ کے دربار تک اس کو رسائی حاصل تھی، اپنے باپ کی طرح یہ بھی اپنے نام کے ساتھ مہندس لکھتا ہے۔ غالباً اس نے تعلیم اپنے بڑے بھائی امام الدین سے پائی ہوگی' جس نے ۱۱۴۵ھ تک زندگی پائی ہے، تصریح کے دیباچہ میں امام الدین نے لکھا ہے کہ" اس نے اپنے دوستون اور بھائیون کی فرمائش سے یہ شرح لکھی ہے"، عجب نہین کہ ان بھائیون مین اس کا یہ بھائی بھی ہو، کشن چند اخلاص کے تذکرہ ہمیشہ بہار[1] مین امام الدین ریاضی کے حال مین ہے "یکے از شاگردان ایشان بر مجسطی شرح فارسی نوشتہ خیلے تفصیل...." آگے معلوم ہوگا کہ یہ شاگرد خود اس کا بھائی خیر اللہ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خیر اللہ اپنے بھائی امام الدین کا شاگرد تھا، اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ مین راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس اور اجین مین جو رصد خانے قائم کئے تھے ان کا بانی اور نگران کار یہی نادرۂ روزگار تھا، آج

---

[1] اس کا نسخہ بانکی پور لائبریری مین نظر سے گذرا،

سے پچیس چھبیس برس پیشتر مین نے یہ بات قیاساً لکھی تھی لیکن بحمداللہ کہ آج اس کے ایک معاصر تذکرہ نویس بندرا بن خوشگو المتوفی سنہ ۱۱۷۰ھ کی معاصرانہ شہادت سے پایہ ثبوت کو پہونچ گئی، خوشگو اپنے تذکرہ سفینہ خوشگو مین جس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری مین نظر سے گذرا' امام الدین ریاضی کے حال مین لکھتا ہے،

"ذا... روزملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر ریاضی وی در ہیئت و ہندسہ و اکثر علوم یگانۂ روزگار است، چنانچہ راجہ دھیراج جے سنگھ سوائی زمیندار آنبیر کہ درین ایام خیال رصد بستن در پیش داشتہ، قریب بست لک روپیہ در بست سال صرف این کار نمودہ باستصواب ابوالخیر مذکور است، و حق آنست کہ ذات او بر زمانہ منت است ......"

سفینہ خوشگو ع ۲۵ صفحہ ۱۲۳

دلی مین اس رصد خانہ کے کام کے علاوہ ریاضیات کا درس بھی دیا کرتا تھا، (دیباچۂ تقریب التحریر) چنانچہ اس کے شاگردون مین سب سے پہلا نام اس کے بیٹے محمد علی کا ہے،

اس کی ایک معنوی یادگار انڈیا آفس لائبریری لندن مین اور دو بانکی پور کے مشرقی کتبخانہ مین ہین، ان مین سے ایک علی گڈھ مسلم یونیورسٹی لائبریری مین بھی ہے، اور چوتھے کا ذکر علامہ غلام حسین جونپوری نے جامع بہادرخانی مین کیا ہے،

۱ - تقریر التحریر، یہ خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی سنہ ۶۷۲ھ کی "تحریر اقلیدس" کا فارسی ترجمہ ہے، اس مین مترجم کا نام "خیر اللہ خان بن لطف اللہ مہندس"

لہ - الندوہ سنہ ۱۹۱۵ء مین مضمون "اسلامی رصد خانے"

لکھا ہے محمد شاہ کے زمانہ مین ۱۱۴۰ھ مین اس نے یہ ترجمہ ختم کیا۔ کتاب کا آغاز ان فقرون سے ہے ،

" شکرست مرخدای را کہ از دست ابتدا ، بسوی اوست انتہا و بدست اوست اختیار ہمہ چیزہا " (فہرست فارسی انڈیا آفس لائبریری جلد اول صفحہ ۱۲۲۰)

اس کا نسخہ انڈیا آفس لائبریری نمبر ۲۹۰ ء مین موجود ہے لیکن فہرست مین اس کا نام " ترجمۂ تحریر اقلیدس " لکھا ہے ، حالانکہ یہ نام نہین ہو سکتا ، " تقریب التحریر " جس کا نام آگے آتا ہے ، اور جس کا نسخہ بانکی پور اور علی گڈھ کی لائبریریون مین ہے اس کے دیباچہ مین مصنف کے فرزند نے اس کا نام " تقریر التحریر " بتایا ہے ، جو بجائے خود اور دوسری تصنیف کے نام کی مشابہت سے بھی نہایت موزون ہے ، انڈیا آفس کے نسخہ کی کتابت کی تاریخ یکم رجب ۱۱۹۴ھ ہے ، اس کے پہلے صفحہ پر ایک حاشیہ ہے جس مین مذکور ہے کہ یہ نسخہ راجہ انند رام پنڈت نے مسٹر رچرڈ جانسن کے لئے لکھنؤ مین تیار کیا تھا ، تعجب ہوگا کہ کبھی ہمارے بزرگون کی ریاضی کی تصانیف سے استفادہ کے انگریز شائق علم بھی مشتاق تھے ،

۲ - **تقریب التحریر** یہ خواجہ طوسی کی دو ۔ ری کتاب " تحریر مجسطی " کا فارسی خلاصہ ترجمہ مع شرح ہے ، مصنف کا نام اس مین " ابوالخیر المعروف بہ خیر اللہ المخاطب بہ خیر اللہ خان المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ " ہے ، کتاب کا آغاز یہ ہے ،

" ثنای کہ از اندازۂ مہندسِ خرد بیرون است شایان صانعی کہ خالق سبع سماوا تست " (فہرست کتبخانۂ مشرقی بانکی پور جلد یازدہم صفحہ ۰۷)

مصنف نے اس کے دیباچہ مین یہ بیان کیا ہے کہ "تحریر اقلیدس" کے ترجمہ کے بعد اوس نے یہ کتاب محمد شاہ (سنہ ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء — سنہ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کی تخت نشینی کے اخیر ثلث (سنہ ۱۱۶۱ھ) مین تالیف کی؛ اس کی شرح مین اس نے مولینا عبد العلی برجندی کی شرح تحریر مجسطی سے مدد لی ہے، کتاب کا عام انداز یہ ہے کہ پہلے خواجہ طوسی کی عربی متن کا ایک فقرہ ہے، پھر اس کا فارسی ترجمہ، پھر حسب ضرورت برجندی کی عربی شرح، اور پھر خود خیر اللہ کی فارسی شرح ہے،

اس کا ایک نسخہ بانکی پور کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، ۲۲ شوال سنہ ۱۲۵۱ھ کتابت کا سال ہے، کتاب کا نمبر ۱۰۵۸ ریاضیات فارسی ہے، اور دوسرا مسلم یونیورسٹی لائبریری (عـ۶ علوم فارسی) مین ہے، فہرست مین اوس کا نام "ترجمہ مجسطی" لکھا ہے، دونون نسخے نظر سے گذرے ہین، کتاب کا آغاز اس طرح ہے

یارب آسان کن بفضل شامل خود فتح باب پس بلطف کامل خود ساز انجام کتاب

قال الفاضل الکامل المحقق و العامل الماهر المدقق استاذ الکل فی الکل عالم العلوم بالحیل الشارح المترجم بالفارسیة ابو العلوم العربیه ابو الخیر المعروف بخیر اللہ المخاطب خیر اللہ خان سلمه الرحمان المتخلص بالمهندس ابن لطف اللہ غفرله اللہ،

الحمد للہ رب العالمین . . . . اما بعد . . . .

پوشیدہ نماند کہ چون در سالف زمان ترجمۂ تحریر اقلیدس کہ از محقق طوسی با زیادت شرح بعض مقدمات بزبان پارسی، برائے عموم فیض اتفاق افتادہ بود، و بتقریر التحریر

موسوم گردیده، خواست کہ برائے اتمام خدمت عباداللہ ترجمۂ تحریر مجسطی ہم
کہ ازان مدقق است، بایزاد بعض فوائد مرقوم سازد، چنانکہ بفضل الہی جل جلالہٗ
عم نوالہ، و مسودۂ آن کتاب عظیم النفع در مدت اخیر مدت سلطنت شاہ خلائق پناہ
انجم سپاہ، فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ غازی علیہ الرحمۃ والرضوان فراغ دست
دادہ بود، و بہ تقریب التحریر مسمی شدہ بسبب عدم دریافت قدر دانی ارکان
در حیز تعویق افتادہ بود، بہ ترغیب بعض دوستان طالب این فن در اواسط
سنۂ احد جلوس (بادشاہ عالی جاہ احمد شاہ بہادر از مسودہ اتفاق شروع بیضہ افتاد
در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و یکم ہجری مقدسہ صلعم)

علی گڈھ کا نسخہ جابجا سے کرم خوردہ ہے، اور بانکی پور کا نسخہ اچھا اور محفوظ ہے
اوپر کی عبارت دونوں نسخوں کی تطبیق سے درست کی گئی ہے۔ خاتمہ کی عبارت دونوں
مین یہ ہے،

بعد از بیان سعی در حل این کتاب، و وصف خوبی ہائے آن، و اعتذار سہو و
خطا و طلب دعائے خیر و ختم بر صلوۃ و کلام حضرت رسالت پناہ را ....
فارغ شدم از تحریر این شرح و تصحیح آن روز یکشنبہ اوائل ذی قعدہ سنۂ
نہصد و ہشت و یک ہجریہ نبویہ .... بن لطف اللہ مہندس بن احمد،

"سنہ نہصد و ہشت و یک" سراسر تحریف ہے، یہ حقیقت مین "ہزار و یکصد و
شصت و یک" ہوگا۔ کہ یہی سال محمد شاہ کی وفات کا ہے، اور اس نسخہ کے آغاز
مین تصریح ہے کہ اس وقت بادشاہ ممدوح کی وفات (۱۱۶۱ھ) ہو چکی تھی، گویا
کتاب کا مسودہ محمد شاہ کی زندگی مین تیار ہو چکا تھا، مگر ارکان سلطنت کی ناقدردانی

سے یہ پڑا رہا، بالآخر شاہ مرحوم کی وفات پر ریاضی کے اصرار سے احمد شاہ کے پہلے سال جلوس مین اس کا یہ مبیضہ تحریر مین آیا،

۳۔ حاشیہ بر شرح بیست باب در معرفت اسطرلاب

"بیست باب در اسطرلاب" خواجہ نصیر طوسی کا ایک مشہور رسالہ ہے، اس کی شرح علامہ عبد العلی برجندی نے ۸۸۹ھ مین لکھی، اس پر خیر اللہ مہندس نے یہ حاشیہ لکھا ہے، یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخہ نمبر ۱۰۴۵ کے کنارون پر لکھے ہوئے موجود ہین، اس پر محشی کا نام حسب ذیل تحریر ہے،

"خیر المہندسین ابو الخیر منجم المخاطب بخیر اللہ خان مہندس"

اس نسخہ کی کتابت کا سال ۲ جمادی الثانیہ ۱۱۶۵ھ ہے (فہرست کتبخانۂ مذکور جلد ۱ صفحہ ۶۲)

۴۔ شرح زیج جدید محمد شاہی

راجہ جے سنگھ سوائی بانی جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ (المتوفی ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء) نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے دہلی، جے پور، اجین، بنارس اور متھرا مین رصد خانے قائم کئے تھے، اور جن کے بنانے مین علاوہ دوسرے ہندو مسلمان اور انگریز ہیئت دانون کے یہ خیر اللہ مہندس بھی شریک تھا، ان رصد خانون کی تحقیقات خود راجہ کے نام سے زیج محمد شاہی کے عنوان سے ۱۱۴۰ھ مین تصنیف ہوئی تھی، خیر اللہ نے اس زیج کی ایک شرح لکھی، جس مین جابجا اس نے تشریحات اور استدلات مین اپنے ذاتی مشاہدون کا ذکر کیا ہے، اس شرح مذکور کا حوالہ علامہ غلام حسین جونپوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی مین دیا ہے،

"مرزا خیر اللہ مہندس در شرح زیچ محمد شاہی دعویٰ نمودہ است کہ' ما مدار خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بشکل بیضوی یافتہ ایم'۔"

۵۔ شرح زلالی و شرح حافظ

خیر اللہ کو اپنے خاندان کے موروثی جوہر سخنوری سے بھی حصہ ملا تھا، اسی ذوق کا یہ اثر تھا کہ اس نے دیوان زلالی اور دیوان حافظ کی شرحین لکھین، ان شرحون کا ذکر اوس کے بیٹے نے تقریب التحریر کے دیباچہ مین کیا ہے، اسی قسم کی اوس کی ایک اور کتاب سکندر نامہ کی شرح ہے۔ یہ دو جلدون مین تمام ہوئی ہے، اور عجیب تر یہ ہے کہ پرانے زمانہ مین وہ چھپ بھی چکی ہے، اوس کی دوسری جلد جامعہ ملّیہ دہلی کے کتبخانہ مین نظر سے گذری۔ یہ مطبع شرف المطابع دہلی مین طبع ہوئی تھی، اس پر مصنف کا نام و لقب "مرزا اسد خیر اللہ خان مہندس خیر الشارحین" لکھا ہے،

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس

خیر اللہ مہندس نے اپنی ایک جسمانی یادگار بھی چھوڑی جس کا نام محمد علی ہے، یہ بھی اپنے خاندان کے موروثی علوم ریاضی و ہندسہ کا امانت دار تھا، اور اسی لئے "الریاضی" کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے باپ نے اپنی کتاب "تقریب التحریر" مسودہ کی حالت مین چھوڑی تھی، اور مبیضہ کا صرف دیباچہ لکھا تھا کہ وہ دوسری کتابون کی تصنیف اور طلبہ کے درس تدریس مین مصروف ہوگیا، محمد علی نے اس کتاب کو صاف کرکے اشاعت و افادہ کے قابل بنایا، چنانچہ اس کتاب پر خود محمد علی نے ایک دیباچہ بڑھایا ہے جس مین یہ واقعہ درج کیا ہے،

"می گوید بندۂ خاکسار، ذرۂ بے مقدار الراجی الی رحمۃ ربہ القوی، محمد علی الریاضی آنکہ چون والد این احقر العباد، بر تحریر اقلیدس شرحے مبسوط معنی کہ مسمی تقریب التحریر

است بزبان فارسی نوشتند .... خواستند کہ بر تحریر مجسطی کہ مشکل ترین کتب علم ہیئت

است با براہین ہندسی و درین دور بے نظری کہ دست فکر ہر کس از ریاضی دان بدامن

مطلبش نمی تواند رسید و زور خیال ہر یکے از ہیئت دان لنگر معانیش نتوان جنبانید نیز

شرحے بزبان فارسی با فوائد دیگر نویسند کہ برای ہر طالبی بکار آید ....

در اواخر سلطنت فردوس آرامگاہ محمد شاہ مسودہ آن تمام تحریر یافت و بسبب بعضے

از موانع کہ شغل مطالعۂ کتب دیگر باشد و عدم فراغ از دیگر امور مبیضۂ آن در حیز تعویق

افتاد ، الحال من بے بضاعت ، عاکف زاویۂ جہالت خصوصاً در علم ریاضی کہ دران ریاضت

معتد بہ نکردہ ، و آشنائی پیدا ناساختہ و از بوئی ریاض ریاضی نموده (؟) و الد گرامی خواست

کہ آن مسودہ را مبیضہ نویسد ، احسب انچہ در خاطر فاتر این ناقص در آید تن را ....

اس کے بعد خیر اللہ کے مبیضہ کا دیباچہ ہے ، جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے ، اوس کے بعد محمد علی

کی یہ عبارت ہے ،

"و من مترجم می گویم کہ این اخبار شارح بہ مبیضہ ساختن تا نوشتن دیباچہ بود ، و زیادہ

از ان بسبب بعضے از مشاغل اتفاق نیفتاد ، چنانچہ ساختن شرح زلالی ، شرح حافظ

و درس کتب ریاضی ، این حقیر نقیر خواست کہ تا این محنت ضائع نشود جرارت در نوشتن

مبیضہ نمود و الّا چہ نسبت خاک را با عالم پاک ..... "

محمد علی ریاضی ، احمد معمار کے سلسلۂ نسل کی آخری کڑی ہے ، جس کا حال ہمیں معلوم

ہوسکا ہے ، اور اسی نام پر اوس خاندان کے تذکرہ کا خاتمہ ہوتا ہے ، جس نے کم از کم سوا سو

برس تک لاہور اور دہلی مین تعمیرات و ہندسہ و ریاضی کی زندہ جاوید خدمتین انجام دین ،

اس تفصیل کے بعد ضرورت ہے کہ لطف اللہ مہندس کی اوس مثنوی کو مسلسل یکجا

نقل کر دیا جائے جس مین اوس نے اپنے باپ اور بھائیون کا اور خود اپنا حال لکھا ہے تا کہ اب ناظرین کو اس کی خاندانی حیثیت کے واضح ہوجانے کے بعد اس کی صداقت بیان کا پورا وثوق ہوجائے، اور معلوم ہوجائے کہ تاج اور لال قلعہ کی عمارتون کا اصل معمار اور مہندس کون تھا،

شاہ جہان داور گیتی ستان — روشنی دودۂ صاحب قران
عرش برین قبۂ خرگاہ اوست — رشک فلک سدۂ درگاہ اوست
احمد معمار کہ در فن خویش — صد قدم از اہل ہنر بود بیش
واقف تحریر و مقالات آن — آگہ از اشکال و حوالات آن
حال کواکب شدہ معلوم او — سر مجسطی شدہ مفہوم او
از طرف داور گیتی جناب — "نادر عصر" آمدہ او را خطاب
بود عمارت گر آن بادشاہ — داشت دران حضرت فرخندہ راہ
اگرہ چو شد مضرب رایات شاہ — بس کہ برو بود عنایات شاہ
کرد بحکم شہ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہ انجم سپاہ — شاہ جہان داور گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمد روشن ضمیر
این دو عمارت کہ بیان کردہ ایم — در صفتش خامہ روان کردہ ایم
یک ہنر از گنج ہنرہای اوست — یک گہر از کان گہرہای اوست
چون نبود عالم فانی مقر — کرد سوی عالم باقی سفر
پس سہ پسر ماند ز مرد سترگ — زان سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

نادرِ عصرِ خود و مشهورِ شهر　　عالم و علّامه و دانائے دهر
مردِ هنر پرور و استادِ فن　　فاضل و دانشور و حبرِ زمن
مخزنِ علم آمده تالیف او　　گنج هنرهاست تصانیف او
نثرِ وی از آبِ روان پاک تر　　نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گهر
منکه سخن پرور و دانش ورم　　بندهٔ آن حبرِ سخن پرورم
منکه ربودم ز جهان گوی علم　　از چمنش یافته ام بوی علم
منکه شده آگهِ سرِّ نهان　　از دمِ او یافته ام قوتِ جان
ثانی آن هر سه برادر منم　　هندسه یکفن بود از صد فنم
گرچه مهندس لقبم از شه است　　نامِ من دل شده لطف اللّٰه است
ثالثِ آن هر سه برادر بسال　　آمده نور اللّٰه صاحب کمال
ما همه معمار و عمارت گریم　　ما همه استاد و سخن پروریم
لیک بود قصرِ کلامش عجب　　زان شده معمارم و او را لقب
گرچه کم است سالِ وی از سالِ من　　بیش بود حالِ وی از حالِ من
نثرِ وی از نظم گهربار تر　　نظم ز نثر آمده هموار تر
دیده ز نورِ سخنش پرضیا　　طبع ز لطفِ سخنش پرصفا
گنجِ هنر آمده در مشتِ او　　هفت قلم رانده سه انگشتِ او
گرچه منم بے سخن استادِ فن　　آن یک و وین یک بود استادِ من
گرچه مرا هست مهندس لقب　　هندسه زان هر سه برادر طلب

دار المصنفین ۔ اعظم گڈھ　　رقمه سید سلیمان ندوی

۲۹ ۔ رمضان المبارک سنه ۱۳۵۱ھ

بچوں کے تعلیمی نصاب

بچوں کی تعلیم ہر زمانہ میں ایک عقدہ رہا ہے اور مشرق و مغرب نے اس کے مختلف حل تلاش کئے ہیں۔ موجودہ یورپ کی کوشش زیادہ تر اس پہلو پر ہے کہ بچوں کی توجہ تعلیم کی طرف جلب کی جائے۔ اس غرض سے تصاویر سے کام لینے کے علاوہ ایسے علمی کھیل بھی ایجاد کئے ہیں جو ان کی توجہ کے ساتھ ان کے تخیل کو بھی بیدار کرتے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے اس مقصد کے لئے اور راستہ اختیار کیا تھا وہ اس راز سے واقف تھے کہ بچوں کا حافظہ نہایت تیز ہوتا ہے اور وہ نثر کے مقابلے میں نظم سے زیادہ انس رکھتے ہیں جو آسانی سے یاد بھی ہو جاتی ہے۔ اس لئے انھوں نے ان کی قوت حافظہ سے کام لینے کے لئے نظم سے زیادہ امداد لی اور منظوم نصاب تیار کرنے شروع کر دئے۔ ابو نصر فراہی جو فارسی منظوم نصابوں کے ابوالبشر مانے جاسکتے ہیں کہتے ہیں

"خوش آمد ن شعر مر طبعہائے موزوں را عزیزی است" (دیباچہ نصاب الصبیان)

یہی خیال ایک اور بزرگ مولانا صدرالدین بن بدرالدین اپنی تالیف قنیۃ الفتیان میں ظاہر کرتے ہیں ؎

زانکہ آسانست حفظ شعر بر دلہا کہ ہست　　طبع خاص و عام را رغبت باو در ہر مکاں

اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ بچے اپنا سبق ذوق شوق کے ساتھ سیکھنے لگے دوسرے شروع ہی سے ان میں شعر کا شوق پیدا ہوگیا۔ ان ایام میں مطابع موجود نہیں تھے۔ کتابیں ضرورت سے بہت کم ملتی تھیں۔ کاغذ مہنگا تھا۔ کاتب اجرت زیادہ لیتے تھے۔ ہر شخص اتنا دولتمند نہیں تھا کہ یہ تمام اخراجات برداشت کر سکے۔ بچے کتابیں پھاڑنے اور ان کا ستیاناس کرنے میں مشہور ہیں ان صورت حالات میں یہی مناسب تھا کہ بچوں کے حافظہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے نہ ان ایام میں وقت کی پابندی اور کلاس چڑھائے جانے کا غم تھا نہ ملازمت کے لئے عمر کی قید تھی۔ ان کو صرف پروا تھی تو یہ تھی کہ جو کام ہو اچھا ہو اور کتاب جو پڑھی جائے ازبر ہو۔ ٹھوس قابلیت بڑھے اور رسمی تعلیم نہ ہو۔

قصہ مختصر اس ضرورت کی بنا پر اب سے سینکڑوں سال پیشتر بچوں کے نصاب کا ایک طریقہ معلوم کر لیا گیا اور نصاب کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ نصابی طرز کا لٹریچر عربی سے شروع ہوتا ہے اور فارسی نے تقلیداً اس سے کام لینا شروع کیا ہے۔ عربی کتب نصاب سے ہم یہاں کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ فارسی نصاب کو البتہ ضرورتاً تاریخی دلچسپی کے خیال سے اس مضمون میں شامل کر لیا گیا ہے کیونکہ اول تو ہندوستان میں ان نصابوں کا بیحد رواج رہا ہے دوسرے فارسی نصاب ہی دراصل ہماری ملکی زبانوں میں نصاب کی ترویج کے محرک ہیں۔ ہمارا مقصد دراصل ہماری اپنی زبان یعنی اردو کی کتب نصاب کا استقصا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً نصابوں کی تحریک ہندوستان میں زبانوں کے لحاظ سے مقامی ہے اور ہر صوبہ میں یہ نصاب صوبہ کی زبان میں طیار ہوتے رہے ہیں مثلاً پنجاب میں بزبان پنجابی طیار کئے گئے۔ گجرات میں بزبان گوجری۔ بھاشا میں بھی طیار ہوئے۔ اور دکن میں بزبان دکنی لکھے گئے۔ پشتو اور کشمیری زبانوں میں بھی موجود ہیں اور تلنگی میں بھی انکا سراغ چلتا ہے

ہندوستان میں غزنویوں کے زمانہ سے لے کر مغلوں کے آخر عہد تک فارسی زبان کا دور دورا رہا ہے۔ غزنویوں اور غلاموں کے دور کو خارج کر کے کہا جا سکتا ہے کہ فارسی ہر عہد میں اس ملک میں اکتسابی زبان رہی ہے۔ ہمیں تحقیقاً معلوم نہیں ہے کہ مغلوں کے عہد سے پیشتر فارسی کی تحصیل کے لئے اس ملک میں کوئی مقامی زبان استعمال میں لائی جا رہی ہے یا نہیں۔ البتہ کتب لغات سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان ایام کے فرہنگ نگار اپنی تالیفات میں بعض بعض الفاظ کی تشریح میں ایک ہندی زبان کے الفاظ دیتے ہیں اور چونکہ ان الفاظ کا اکثر ذخیرہ آج اردو زبان میں شامل ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ پرانی اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان فرہنگوں کی تشریحی زبان جس طرح کہ ان شروح کی جو ہندوستان میں تالیف ہوتی ہیں فارسی زبان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں فارسی کو فارسی ہی کے ذریعہ سے سیکھا جاتا تھا۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک زمانہ وہ بھی آتا ہے جب بچہ فارسی مطلق نہیں جانتا اور معلم کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بچہ کو اسی زبان میں تعلیم دے جو اس نے اپنی ماں کی گود میں سیکھی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیسی زبان کا ابتدا ہی سے ذریعۂ تعلیم بن جانا بہت ممکن ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم نصابی کتابیں سب کی سب فارسی میں ہیں۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ جس طرح کلام مجید ہرگاہ بچوں کو معنے سمجھانے کی کوشش کئے بغیر ناظرہ پڑھا دیا جاتا ہے اسی طرح فارسی بھی ابتدا سے شروع کرا دی جاتی تھی۔ نہیں یہ صورت حالات نہ تھی۔ ہندی زبان سے ضرور امداد لی جاتی رہی ہے اور بچوں کو فارسی سمجھانے کا اسے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے تحریری نمونے موجود نہیں ہیں اور نہ ایسا ذولسانی لٹریچر ملتا ہے۔ اس سے یہی قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ ان ایام میں ایسے لٹریچر کے طیار کرنے کا دستور نہیں تھا۔ اور یہ امر

تو صاف واضح ہے کہ ترقی یافتہ طلبہ کے واسطے خود فارسی ذریعۂ تعلیم رہی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد ماقبل مغل میں ہمارے ملک میں ایسی تالیفات وجود میں آئی ہیں جن کا تعلق مذہب و ادبیات۔ لغات و تاریخ۔ تصوف و نجوم۔ طب و موسیقی و دیگر فنون سے ہے اور یہ سب کی سب فارسی زبان ہی میں ہیں۔

نصاب کی کتب سے اصل مقصد بچوں کو لغات عربی کی تعلیم تھی۔ پرانے نصاب سب کے سب فارسی میں ہیں خواہ وہ ہندوستان کی تالیف ہیں یا بیرون ہند کی۔ ہندوستان میں جب تک عربی کی تحصیل مطمح نظر رہی یہ نصاب درس میں جاری رہے۔ لیکن مغلوں کے عہد میں عربی کی بجائے فارسی کی تحصیل اصل مقصد قرار پائی۔ آخر وہ زمانہ آیا کہ اس جدید انقلاب کے مدنظر نئے نصاب دیسی زبانوں میں طیار ہونے لگے اور یہی وہ زمانہ ہے جب اس سلسلہ میں معلمین و متعلمین کی توجہ دیسی زبانوں کی طرف منعطف ہونے لگی ہے۔ یہ تبدیلی جس قدر اہم اور انقلاب خیز ہے اسی قدر ہم اس کی سرگزشت اور تاریخ سے ناواقف ہیں۔ ہمیں صحیح معلوم نہیں کہ تعلیمات میں دیسی زبانوں کا داخلہ کس عہد سے شروع ہوتا ہے اور وہ کیا وجوہ تھے جن کے زیر اثر یہ تحریک پروان چڑھی۔ سطورِ ذیل میں ان نصابی کتابوں کے مطالعہ سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ اس عہد کا پتہ لگایا جائے جب یہ انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس فہرست میں اردو کے علاوہ پنجابی زبان کے نصابوں کو بھی شامل کر لیا ہے تاکہ ہمیں اس خاص زمانہ کا پتہ لگانے میں سہولت رہے جب سے یہ سلسلۂ نصاب دیسی زبانوں میں جاری ہونے لگا۔ میرا یہ خیال غالباً بے بنیاد نہیں ہے۔ کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں نصاب بنائے جانے کی تحریک بہ یک وقت جاری ہوئی ہے۔ چالیس پچاس سال کا تقدم و تاخر چنداں قابل لحاظ نہیں ہے کیونکہ یہ امر ظاہر

ہے کہ یہ تحریک اولاً کسی ایک زبان میں شروع ہوئی ہے اور تقلیداً دوسری زبانوں نے بھی اسے اختیار کر لیا ہے۔

نویں صدی ہجری فارسی کے لئے ہندوستان میں ایک نامبارک زمانہ ہے۔ اس صدی میں ہمیں کوئی بڑا شاعر نظر نہیں آتا۔ دہلی میں قاضی ظہیر کے بعد جو محمود تغلق کا مداح ہے ہمیں کسی اور شاعر کا نام معلوم نہیں۔ اس صدی میں ہمارے ملک میں دیسی زبانوں میں شعر و موسیقی کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ ہندی گو شاعر پیدا ہونے لگتے ہیں کبیر اسی صدی کی پیداوار ہے۔ آیندہ صدی میں بیسیوں ہندی گو شعرا کے نام ملتے ہیں اور دیسی زبانوں کی طرف عام رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی یعنی دسویں صدی ہجری کے منتصف دوم میں فارسی کا دورِ احیا آتا ہے اکبر کی تعلیمی اسکیم سے فارسی کو فروغ ملتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی صدی ہے جس میں ہندی زبانون کے نصاب بغرض تحصیل فارسی طیار ہونے لگے ہیں۔

ہندوستان میں نصاب کا رواج توران و ایران سے آیا ہے جہاں وہ عربی زبان کی تحصیل کی غرض سے طیار کئے جاتے تھے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ابتدا میں وہ نثر میں تھے لیکن ان نثری نمونوں کا آج پتہ لگانا بہت دشوار ہے۔ تاہم اگر تلاش کی جائے تو ایسی تالیفات کا دستیاب ہونا کوئی بعید نہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پیشتر میں ایک قدیم رسالہ کا ذکر کرتا ہوں جس کا نام "منطق" ہے۔ یہاں منطق سے مراد بول چال ہے۔ رسالۂ ہذا درحقیقت عربی بول چال کی تعلیم کی غرض سے جلال الدین شمس المعالی سلطان شاہ ابوالقاسم محمود بن ایل ارسلان بن اتسز خوارزم شاہ کے واسطے لکھا گیا ہے۔ سلطان شاہ ۵۶۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور یہ رسالہ یقیناً

اس سال سے پیشتر سلطان شاہ کی شہزادگی کے زمانے میں لکھا گیا ہوگا۔ اس کے کل پانچ باب ہیں بہ تفصیل ذیل:-

باب اول در امر ونہی۔ باب دوم در خبر پرسیدن و جواب دادن۔
باب سوم در پرسیدن حال۔ باب چہارم در پرسیدن زمان و حال۔
باب پنجم در دعوات و احادیث و حکم و مواعظ و امثال آن و دیگر سخنہا۔

یہ رسالہ مبتدیوں کو عربی بول چال سکھانے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ آسان اور چھوٹے چھوٹے جملے درج ہیں اور اس لحاظ سے اس کا شمار کامیاب رسالوں میں ہوسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم مصنف کے نام سے واقف نہیں۔ حمد و نعت کے بعد دیباچہ میں مرقوم ہے۔

"این کتابیست کہ آنرا منطق خوانند ساختہ شد و پرداختہ آمد بر سبیل ایجاز و اختصار از جہت بندگان و خدمت گاران مجلس خداوندزادۂ مکرم و معظم عالم و عادل موید مظفر منصور جلال الدنیا والدین تاج الاسلام والمسلمین علاء الملوک والسلاطین قطب الدولہ و مجد الملہ بہار الامۃ عمدۃ الخلافۃ ناصر الملک سید ملوک الشرق والمغرب شمس المعالی سلطان شاہ ابوالقاسم محمود بن خوارزم شاہ ایل ارسلان بن خوارزم شاہ اتسز اعز اللہ انصارہ و ضاعف اقتدارہ و امید بالطاف کرم و اصناف نعم ایزد عز و علا آنست کہ این کتاب در محل قبول افتد و از قبال نظر مبارک بہرہ یابد و این کتاب بر پنج باب نہادہ شد"

اسی طرح ایک اور رسالہ 'کتاب اسامی' ہے جس کی تاریخ تالیف و نام مؤلف سے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن اس کی قدامت میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے

ابواب مضامین کے لحاظ سے مرتب ہیں جیسا کہ ہمارے ہاں کتب فقہ و حدیث کا دستور تھا
ہر باب کے ذیل میں اس کے مناسب مضمون الفاظ بغیر کسی قسم کی ابجدی یا ابتثی ترتیب
کے درج ہیں۔ کل تیرہ باب ہیں جو کئی کئی فصلوں پر منقسم ہیں۔ سرخیوں کی زبان حسب دستور
قدیم عربی ہے مثلاً

باب اول فی اسماء اللہ تعالےٰ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ۔ اس میں چھوٹی چھوٹی بارہ فصلیں ہیں۔

الباب الثانی فی ذکر الآلات وغیرہا فی الصناعات والادوات۔ چودہ فصلوں میں۔

الباب الثالث فی ذکر الاشیاء۔ دو فصلوں میں۔

الباب الرابع فی ذکر القرابتہ۔ پانچ فصلوں میں۔

الباب الخامس فی ذکر الاطعمہ وغیرہا۔ تین فصلوں میں۔

الباب السادس فی ذکر الامتعہ۔

الباب السابع فی ذکر الادوات الداء والالم۔

الباب الثامن فی ذکر الخیل۔ تین فصلوں میں۔

الباب التاسع فی ذکر البہائم۔ چار فصلوں میں۔

الباب العاشر فی ذکر السباع۔ چھ فصلوں میں۔

الباب الحادی العشر فی ذکر الاوزان والاعداد۔ تین فصلوں میں۔

الباب الاثنا عشر فی ذکر الھواء والریاح۔ نو فصلوں میں۔

الباب الثالث عشر فی ذکر النبات۔ تیرہ فصلوں میں۔

رسالہ کے کل چالیس صفحات اور فی صفحہ چودہ سطور چھوٹی تقطیع پر ہیں۔ مضامین کی ترتیب

اور زبان کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ مذکورۂ بالا رسالہ سے کم قدیم نہیں بلکہ کوئی تعجب نہیں اگر اس سے بھی زیادہ قدیم ہو۔ مثلاً مسجد کا فارسی ترجمہ مزگت۔ مقدم الجیش کا پیش آہنگ طلیعہ کا دیدبان۔ الثغرہ کا دربند میان کفر و اسلام کیا ہے منجنیق و عرّادہ کے معنے نہیں دئے ہیں معروف کہ کر چھوڑ دیا ہے۔ خبّاز کا نانوا۔ اکّار کا برزگر۔ نقّاد کا رگ زن۔ سجّان کا زندان بان۔ فلاخن کا کلاسنگ۔ کنّاس کا خلاروب اور برید کا پیک ترجمہ دیا ہے۔ آثم کا فارسی مرادف بزہ کار۔ المفادہ کا دوغوا (دوغبا)۔ رو امیر کا ریچار ہا (آچار ہا) ہے۔

ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر یہ رسالہ چھٹی صدی میں یا اس سے قبل تالیف ہوا ہو اسامی نام کے ایک سے زیادہ رسالے ہیں ان میں زیادہ مشہور تاج الاسامی ہے۔ اس کا ذکر شرف نامۂ احمد منیری تالیف ۸۷۷ھ میں آتا ہے۔ تاج الاسامی اس وقت بھی موجود ہے اور ہمارے رسالہ 'کتاب اسامی' سے بالکل مختلف ہے۔ فرہنگ بحر الفضائل تالیف ۸۳۵ھ میں ایک تالیف اسامی فی الاسامی کا ذکر ہے۔ فرہنگ درّ درّی میں شرح اسامی فی الاسامی ایک اور تالیف کا ذکر ہے لیکن ان تالیفات کا ہمارے رسالہ سے کوئی تعلق نہیں۔

ان دو نصابوں سے ظاہر ہے کہ اوّلاً یہ نصاب منثور ہوتے تھے بعد میں منظوم لکھے جانے لگے۔ منثور نصابوں میں ایک نصاب ہمیں ایسا بھی معلوم ہے جو ہندوستان میں تالیف ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ نصابی حجم سے بڑا ہے لیکن بغرض نصاب تیار کیا گیا ہے۔ اس تالیف کا نام وضوح النصابین ہے اور شیخم بن مولانا کلاں کی یادگار ہے اور چار نصابوں پر جن کے اسمار سے ہم ناواقف ہیں مبنی ہے۔ چونکہ اس کی ترتیب ابتثی ہے اس سے خیال گذرتا ہے کہ وہ آٹھویں یا نویں ہجری کی تالیف ہو۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان نصابوں کے متعلق اپنے تبصرہ کو زبان وار

علیحدہ علیحدہ سرخیوں میں پیش کریں۔

فارسی نصاب

اس عنوان کے تحت میں تمام فارسی نصاب جن تک میری رسائی ہوئی ہے داخل کردئے گئے ہیں۔منظوم تالیفات میں قدیم وہی ہیں جو قطعات کی ترتیب میں منقسم ہیں۔ان میں نصاب الصبیان کا نمبر سب سے پہلا ہے جو ۶۱۷ھ میں تالیف ہوتی ہے۔نصاب الصبیان کو فارسی نصابوں سے وہی تعلق ہے جو حضرت آدم کو بنی نوع انسان سے ہے یہ کتاب اپنے زمانۂ تصنیف سے لے کر چند سال قبل تک درس میں داخل رہی ہے اور ایسی مبارک ساعت میں تالیف ہوئی ہے کہ گذشتہ سات صدیوں میں ہر نوآموز کو اس سے سابقہ رہا ہے اور شیخ سعدی کی طرح اس کے مصنف ابو فراہی کا نام ہر مدرسہ اور مکتب میں گونجتا رہا ہے۔مقبولیت کے لحاظ سے اس کتاب کا نام سعدی کی گلستاں کے ساتھ لیا جا سکتا ہے بلکہ تقدم کے لحاظ سے گلستاں سے بھی اول ہے اور یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ گلستاں زیادہ مقبول رہی ہے یا نصاب الصبیان۔ایک امر بالکل واضح ہے کہ اس کے شارحین اور حواشی نگاروں کی تعداد گلستان کے شارحین سے بہت زیادہ ہے توران۔ایران افغانستان۔روم اور ہندوستان میں ہر زمانہ میں داخل درس رہی ہے۔طلبا اس کو زبانی حفظ کیا کرتے تھے۔عہد عالمگیر کے مشہور ادیب و بذلہ سنج نعمت خان عالی نے اپنی تالیف وقائع حیدر آباد کے اوراق میں اس کے اشعار اور مصرعوں کی تضمین سے نصاب الصبیان کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔مصنف کے نام میں اختلاف ہے۔بعض ابو نصر محمد بدرالدین بیان کرتے ہیں۔بعض ابو نصر فراہی مسعود بن حسن بن حسین

الادبی بتاتے ہیں (بودلی ع۱۶۳۶ ۔ ک ۹۸۰) بعض نسخوں میں ابونصر مسعود بن ابی بکر بن حسین بن جعفر الفراہی درج ہے مثلاً حاجی خلیفہ ششم صـ ۳۴۶ ۔ عـ ۱۳۸۰ ' دوم اور فلیوگل I صـ ۱۱۲ کے ہاں ۔ اور یہی نام زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اکثر نسخوں میں یہی نام ملتا ہے مثلاً ریو ۲ صـ ۵۰۴ بلاخمین ۔ اور فلیشر وغیرہ کے ہاں ۔ اختصار کے لئے ابونصر فراہی کہا جاتا ہے اور یہی نام خود مصنف نے اپنے نصاب میں استعمال کیا ہے ۔ ع

ہمی گوید ابونصر فراہی

جب سے ہمارا مشرقی نظام تعلیم درہم وبرہم ہوا ہے اور درس نظامیہ میں زوال آیا ہے نصاب الصبیان کی شہرت کا چاند گہنانے لگا ہے ۔ لیکن عروضی اوزان کے لحاظ سے مختلف بحروں میں اس کے قطعات ۔ الفاظ و دیگر معلوماتِ عامہ کا انتخاب زبان کی سلاست و روانی اور نظم کی چستی و صفائی اس کے ایسے صاف و صریح اوصاف ہیں جن کی بنا پر یہ تالیف ہر عہد میں محبوب رہی ہے ۔ اس کی تقلید میں سینکڑوں نصاب طیار کئے گئے ۔ متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں سے بعض کے نام ذیل میں درج ہیں ۔

(۱) شرح نصاب الصبیان از نظام بن کمال بن جمال بن حسام ہروی معروف به ابن حسام سنہ ۹۷۰ ہجری

(۲) شرح نصاب الصبیان از علی بن حمر بن علی النجّار

(۳) ایضاً از محمد بن جلال بن سلیمان قہستانی

(۴) ایضاً از محمد بن فصیح بن محمد عرف کریم دشت بیاضی قہستانی جو اکبر کے عہد کا مؤلف ہے

(۵) شرح نصاب از محمد سعد ۔ (پرش ۔ فہرست برلن صـ ۲۱۶ ' عـ ۱)

(۶) شرح نصاب الصبیان از یوسف بن مالی (بلاحمین - لغات)
ان کے سوا دو اور شرحیں ہیں جن کے مصنفین کے نام دریافت نہو سکے (دیکھو فہرست بودلی)- یہ فہرست ابھی نا تمام ہے - مزید تلاش سے اور شرحیں منظر عام پر آئینگی ۔

نصاب کی وجہ تسمیہ میں کہا جاسکتا ہے کہ شرعی اعتبار سے دو سَو درہم وہ رقم ہے جس پر زکوٰۃ لازم آتی ہے اور اس رقم کا مالک صاحب نصاب کہلاتا ہے چونکہ نصاب الصبیان کے اشعار کی تعداد بھی دو سَو اشعار ہے اس لئے مصنف نے اس کا نام نصاب الصبیان رکھ دیا ۔

نصاب کے علاوہ ابو فراہی نے شیبانی کی جامع الصغیر کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔
بہر حال نصاب الصبیان کا بعد کے نصابی ادب پر بجید اثر ہے - اس کو ام النصاب کہنا بیجا نہ ہوگا - نہ صرف فارسی نصاب اس کے ممنون احسان ہیں بلکہ دوسری زبانوں کے نصابوں پر بھی اس کا پرتو نمایاں ہے - میں صرف ناموں کی ہم آہنگی کو لیتا ہوں مثلاً قنیۃ الصبیان منطق الصبیان - ذوق الصبیان مطبوع الصبیان نزہتۃ الصبیان- نصاب الاخوان - نسب صبیان - فرح صبیان ۔

نصاب الصبیان کے بعد بلحاظ زمانہ امیر خسرو کے بدیع النصاب کا ذکر آنا چاہیئے - کم از کم ہندوستان میں اس کا بہت چرچا رہا ہے - اور متعدد بار چھپ بھی چکا ہے - نصاب نصیب اخوان از مطہر ۷۷۶ھ کی تالیف ہے . اس کے بعد نصاب عقود الجواہر کا نمبر ہے جو روم میں مرزا الغ بیگ چلپی بن سلطان محمد (۸۰۵ھ و ۸۲۴ھ) کے واسطے لکھا جاتا ہے اور اکاون قطعات پر شامل ہے - اس کی ایک دوسری اشاعت بھی ہے جس میں ستاون قطعات ہیں اور سلطان مراد (۸۲۵ھ و ۸۵۵ھ) کے

نام پر معنون ہے۔ عقود الجواہر کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں ایک مختصر دیباچہ فارسی نثر میں ہے اس میں محمد حنیف مصنف رسالہ کہتے ہیں کہ یہ مختصر تالیف جو استاد رشید الدین وطواط کی طرف منسوب ہے نثر میں تھی میں نے اس کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے اور اکاون قطعات میں تقسیم کر دیا ہے۔

فتیۃ الفتیان مولینا صدر الدین بدر الدین کی تصنیف ہے اگرچہ ہم اس کے عہد تالیف سے واقف نہیں لیکن قدیم معلوم ہوتی ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ہندوستان میں لکھی گئی ہو۔

وضوح النصابین ایک منثور تالیف ہے۔ ہندوستان میں لکھی جاتی ہے جس میں چہار نصابوں کے الفاظ جمع کر دئے گئے ہیں۔ بعض وقت اس میں ہندی مرادفات بھی درج کئے گئے ہیں۔ غالباً آٹھویں یا نویں صدی سے علاقہ رکھتی ہے۔

اب نصاب بدیعی اور تجنیس اللغات مولینا جامی کی باری آتی ہے۔ نصاب بدیعی کے مصنف اور زمانہ سے ہم بالکل بے خبر ہیں لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نصاب بدیعی کو عام طور پر ہمارے ہاں امیر خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک مولینا بدیعی اس کے مصنف ہیں جیسا کہ رسالہ کے آخری شعر سے جس میں بدیعی تخلص درج ہے ثابت ہے۔ متاخرین میں ایک نصاب انشاء اللہ خاں انشا سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

یہ نصاب اس کثرت سے لکھے گئے ہیں کہ ان سے کوئی صدی خالی نظر نہیں آتی۔ وہ کسی خاص ملک کی پیداوار نہیں بلکہ مختلف ممالک میں لکھے گئے ہیں یعنی توران ایران۔ روم اور ہندوستان و افغانستان۔ یہ امر درحقیقت ان ایام میں فارسی زبان

کی ہر دلعزیزی اور مسلمان اقوام میں اس کی مقبولیت نیز فارسی دان ممالک میں زندہ تعلقات و روابط کا افسانہ خواں ہے کہ ایک نصاب ایک ملک میں طیار ہوتا ہے اور دوسرے ممالک میں رواج پاجاتا ہے مثلاً عقود الجواہر روم میں لکھا جاتا ہے مگر ہندوستان کے مکتبوں میں بھی بچے اس کو پڑھتے ہیں۔

فارسی میں نصاب سے ابتدائی مقصد یہ تھا کہ بچوں کو عربی الفاظ سے اس قدر آشنائی پیدا کرا دی جائے کہ فوقانی تعلیم میں اس سے امداد مل سکے لیکن یہ مقصد اپنی منازل ارتقا میں زمانہ گذرنے پر بہت وسیع ہوتا گیا اور ایسے ایسے نصاب طیار کئے گئے ہیں جو منتہی طلبا کے واسطے زیادہ مفید ہیں۔ ہماری طبائع صنایع و بدایع کی قدرتاً نہایت دلدادہ ہیں۔ الفاظ کی مرصع کاری ہمارے اسلاف کا خوشترین مشغلہ تھا خصوصاً صنعت قلب و تجنیس پر ہر شاعر و ناثر کی نگاہ رہی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے متعدد نصاب جو مثلث کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں بنائے گئے ہیں مثلاً نصاب قنیۃ الفتیان جس میں الفاظ مقلوب و متجانس جمع کئے گئے ہیں۔ تجنیس اللغات یا نصاب ضیائی از جامی۔ تجنیس اللغات جو جامی کی تصنیف سے علیحدہ ہے۔ نصاب مقلوب از انشا منشئے نمونۂ خروارے کا حکم رکھتے ہیں۔ نصاب بدیعی اور مثلث برای محمد ختلانی میں ہم شکل سہ حرفی الفاظ جمع ہیں جن کا پہلا حرف بہر سہ حرکات آتا ہے۔ مثلاً شَرب۔ شِرب۔ شُرب۔ حَب۔ حِب۔ حُب وغیرہ۔ بدیع النصاب میں خسرو نے ایسے الفاظ کو لیا ہے جو اکثر اقسام تجنیس پر حاوی ہیں بعض نصاب ایسے ہیں جن میں الفاظ مترادف کا لحاظ رکھا گیا ہے مثلاً نصف النصاب و نصاب میراب۔ نصاب کمال الدین میں مترادف و اضداد اور نصاب ایاز الدین میں فارسی مرادفات

درج ہیں۔ نصاب حسنیٰ میں صنعت اشتقاق و تجنیس پر زور دیا گیا ہے۔ منطق الصبیان کا موضوع عربی افعال و امر و نہی ہیں۔ شاہ نظم ایک نہایت مفید رسالہ ہے جو شاہ عالم اول کے عہد میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں ان اغلاط مشہورہ کو لیا گیا ہے جو اہل علم لغات کے سلسلہ میں کرتے ہیں۔ نصابی مؤلفات میں سب سے ضخیم حافظ احسن اللہ لاہوری کی تصنیف مفتاح الافواہ ہے جو ۱۱۹۶ھ میں لکھی جاتی ہے اس میں سترہ ہزار کے قریب اشعار ہیں۔

ہمیں حیرت ہوا کرتی تھی کہ نثر نگاری کے میدان میں وصاف و مہدی علی خان جیسے مقفیٰ و متجانس نگار کیونکر پیدا ہو گئے۔ لیکن جب ہم اس ذخیرۂ ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں جو نصاب کے نام سے ہماری درسگاہوں میں جاری تھا اور اس کے طریق کار کو پیش نظر رکھتے ہیں تو یہ تمام تعجب رفع ہو جاتا ہے اور سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس ذخیرہ کی موجودگی میں وصاف اور مہدی علی خان کیا ایسے اور درجنوں زبان دان اور اہل قلم پیدا ہو سکتے ہیں۔

اُردو

اردو میں نصابوں کی افراط اس قدر نہیں ہے جتنی فارسی میں نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو فارسی کی بین الاقوامی حیثیت ہے جس کی بنا پر وہ ایران و ترکستان و روم و ہندوستان میں تحصیل کی جاتی تھی۔ دوسرے ہمیں وقت کو بھی لحاظ میں لانا ہوگا۔ فارسی میں نصابی سلسلہ تقریباً سات آٹھ سو سال سے جاری ہے بحالیکہ اردو میں اس کو رواج عام میں آئے تین ساڑھے تین سو سال گذرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اردو میں نصاب کا سلسلہ غالباً دسویں صدی ہجری سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس موقعہ پر مجھے حکیم یوسفی کے 'قصیدہ درلغات ہندی' کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یوسفی دسویں صدی ہجری کے منتصف اول کے بزرگ ہیں۔ ہرات کے رہنے والے اور ہندوستان میں تازہ وارد ہیں۔ ان کا اکثر زمانہ عمر تصنیف و تالیف میں بسر ہوا ہے۔ ان کے والد محمد بن یوسف مشہور طبی فرہنگ بحر الجواہر کے مصنف ہیں حکیم صاحب نے بھی آبائی پیشہ کو اپنا خاص میدان بنایا۔ ان کی تالیفات میں ریاض الادویہ سنہ ۹۴۶ھ بہت مشہور ہے اور متعدد مرتبہ چھپ چکی ہے۔ رسالۂ ماکول و مشروب سنہ ۹۰۶ھ میں فوائد الاخیار سنہ ۹۱۳ھ میں۔ جامع الفوائد سنہ ۹۱۷ھ میں۔ دلائل نبض و رسالہ قارورہ سنہ ۹۴۲ھ میں اور ستہ ضروریہ سنہ ۹۴۴ھ میں تالیف ہوئے۔ فن انشا میں ان کی انشائے یوسفی معروف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ابھی حکیم صاحب کی فہرست مولفات ناتمام ہے۔ تلاش سے اور چیزیں معلوم ہونگی

حکیم صاحب نے معلوم ہوتا ہے ہماری ملکی زبان اردو میں خاص طور پر دلچسپی لی ہے اور کوشش کرکے اس کو سیکھا ہے۔ اگرچہ مخصوص ہندی اصوات پر وہ کبھی قادر نہ ہوسکے تاہم اردو پر ان کو ماہرانہ عبور ہے۔ اس کا ثبوت ان کی طبی تالیف ریاض الادویہ سے

ملتا ہے جس میں ہر حیوان اور دوا کا ہندی مرادف اردو میں دیتے ہیں۔

قصیدہ در لغات ہندی ایک دلچسپ نظم ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اس میں فارسی الفاظ کے ہندی مرادفات دئے گئے ہیں۔ اشعار کی تعداد چوالیس ہے۔ اس قصیدہ پر اگرچہ نصاب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ عملاً اس پر نصاب کی تعریف صادق آتی ہے اور نظم میں شاید یہی قدیم نمونہ ہے۔ جو ہندی الفاظ سے بحث کرتا ہے اور جس کے مصنف اور زمانہ سے ہم واقف ہیں۔ میں اس کی ابتدا سے کچھ شعر نقل کرتا ہوں۔

قصیدہ در لغات ہندی

نام ہر چیزی بہندی بشنو از من ای پسر — خاصہ نام ہر دوائے نفع بر داری مگر
بُل تکلم باشد و بُل کر بگو یعنے سخن — شکر فرماید ترا آنکس کہ گوید شکر کر
جیب کن آمد زبان و گوش دھاری ریش داں — موچہ را میخوان بروت و دانہ کورو بجر کر
آنکہ چشم و ناک بینی بون ابرو ہوتہ لب — دند دندان کارہ گردن گوتہ زانو مونڈ سر
کھال پوست و پٹہ مغز و استخواں گوید ہاد — انگلی انگشت باشد انگوتہ انگشت نر
ہست پیشانی متہ و سینہ چھاتی دست ہتہ — موہ رو و چل رواں شو بیتھہ نشیں دیکھ نگر
جیو جان چوچی است پستان پیٹ آب بینی است — موی مژگاں را بروتی خوان کلیجہ دان جگر

(ایک شعر کے بعد)

پنڈری ساقست پیچھ پشت تلی آمد سپرز — رودہ را اتری ہمیدان اجبرا شکنبہ شمر
گوسپند آمد بھیر بز بکری و اونٹ اشتر است — بلد گاو و فیل ہاتھی گورہ اسپ و گدہ خر

بیرہ لحم و روتی پانی است نان و آب ہست | حلبہ میتھی منگ ماش و سوک خشک و گیلہ تر
بھدرہ کال و کلونجی (ہم) سیہ دانہ بود | بادیاں سونف و کرفس اجمود ھسم گاجر گذر
تمر ہندی انبلی و السی بود تخم کتان | مندوہ نوعے ز ارزن دان و گندہ نیشکر
چاول چینہ برنج و ارزن اندہ تخم مرغ | تل بود کنجد جواری زرّت اے فرخندہ فر
ریشم است ابریشم و کالہ سیہ اجلا سپید | سرمہ کاجل مرچ فلفل سعد موتہ عود اگر
مانک و موتی بود یاقوت و مروارید لیک | کہربا باشد کپور رو روپہ نقرہ سونہ زر
تھورہ اندک می شمر بسیار را میگو بہت | بدترہ میدان و چنگہ نیک ای نفت بشر
تو تہ را میگوی طوطی فند کی را فاختہ | تول دان را سوز دانش آمدی گر بہرہ ور

یہ قصیدہ اگرچہ دلچسپ ہے لیکن میں بخوف طوالت اس کی نقل سے احتراز کرتا ہوں اور خاتمہ کے بعض شعروں پر قناعت کرتا ہوں

دیو روز و رات شب سنجہ است شام رات صبح | تارہ استارہ است چند و سور باشد ماہ و خور
میہ بود باران اکس باشد (کذا) بژلی ست برق | یا دگیر این جملہ را ای رای روشن چون قمر
یوسفی بہرت درین ابیات کردست آنچہ ذکر | گر کنی از بر ترا ہر دم رسد نفعے دگر
از ضرر دارد مدامت در پناہ خویشتن | آنکہ در عالم بتقدیرش بود نفع و ضرر

اگر روایت پر اعتبار کیا جائے تو ہمیں ہندی نصابوں کے زمانہ کو آٹھویں بلکہ ساتویں صدی ہجری میں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو تمام حالات پر نظر ڈالتے ہوئے خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ نصاب مشہور خالق باری کو جس کا زمانۂ تالیف بالکل نامعلوم ہے روایت نے امیر خسرو کی طرف منسوب کر کے ہمیں الجھن اور پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ دیسی زبانوں میں تعلیم کا رواج ایسے قدیم زمانہ سے نہایت بعید معلوم

ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کہا جا سکتا ہے کہ بہت جلد بعد دیسی زبانیں ہماری تعلیمات میں ہاتھ بٹانے لگتیں اور ادب و لٹریچر ان میں بہت پہلے سے جاری ہو جاتے۔

خالق باری کے متعلق میں 'پنجاب میں اردو' میں کسی قدر تفصیلی بحث کر چکا ہوں یہاں ایسے پہلو بیان کرتا ہوں جو اس وقت میرے علم میں نہیں تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو پہلے شخص ہیں جو خالق باری کا ذکر کرتے ہیں۔ غرائب اللغات میر عبدالواسع ہانسوی کی تصنیف ہے۔ خان آرزو بعد ترمیم و اضافہ اس کی ایک جدید اشاعت طیار کرتے ہیں۔ اس اشاعت میں خان موصوف کئی موقعوں پر رسالۂ منظومۂ امیر خسروؒ کا جس سے ان کی مراد خالق باری ہے ذکر کرتے ہیں۔ ایک موقعہ پر لفظ اَوَن کی تشریح کے وقت میر عبدالواسع پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اَوَن۔ در رسالہ بخارے کہ در ایام زمستان بر روی ہوا پیدا شود۔ میغ۔ مولف گوید کہ این غلط است چرا کہ اون در ہندی ابر بلند شدہ را گویند۔ لہٰذا در وقتے کہ ابر شود ہندیان گویند "بادل اوٹھے" یعنے ابر ہا پیدا شد وسبب غلط اینست کہ امیر خسرو علیہ الرحمۃ در رسالہ منظومۂ خود اون میغ گفتہ و در اکثر لغت فرس میغ بمعنی بخار مذکور آوردہ و حال آنکہ میغ بمعنی ابر نیز آمدہ چنانکہ در سروری است و ہندی صحیح بخار مذکور 'کہر' است و در فارسی مشہور در کتب لغت 'تیرم' بکسر نون وسکون رای معجمہ ومیم"

اس موقعہ پر خان آرزو کی مراد خالق باری کے اس شعر سے ہے ؎

خنجر و شمشیر و صمصام است تیغ ہندوی کھانڈا کھادے آن من تیغ

مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر اسی طرح ملتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ خالق باری کے قلمی و قدیم نسخوں میں 'آن من' کی جگہ 'انون' یا 'اونون' یا 'انوں' ملتا ہے۔

چھرے کی تشریح میں خان تحریر کرتے ہیں :-

"چھرا - در رسالہ کارد بزرگ و بتازی ساطور خوانند - ہمین است در کشف اللغات و در منتخب اللغات کارد و خنجر و در قاموس مطلق چیزے کہ بہ برد و در رسالہ منظومۂ امیر خسرو چھرہ بمعنی استرہ است و مشہور در قصبات ہندوستان نیز ہمین است"

یہاں خان موصوف خالق باری کے شعر ذیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

جاروب سوہنی کہ سبد است ٹوکرا مقراض کترنی کہ بود استرا چھرا

ایک اور لفظ ماڑھی کے بیان میں کہتے ہیں

"ماڈھی - در رسالہ عمارتے کہ بر قبر آتش پرستان و یہودان سازند۔ ستودان۔ سین مہملہ و فوقانی بواو رسیدہ۔ لیکن بمعنی بام است چنانچہ از رسالۂ منظومۂ امیر خسرو علیہ الرحمۃ معلوم می شود۔ اما تحقیق آنست کہ ماڈھی مطلق عمارت است و بمعنی کہ مصنف آوردہ مڈھی بحذف الف " الخ

خالق باری کا یہ شعر خان کے ذہن میں ہے۔

قصر کوشک حصن درتازی حصار حجرہ کوٹھا بام ماڑھی (ماڈھی) دردوار

چکوا چکوی کے ذکر میں کہتے ہیں۔

" و اینکہ در شعر امیر خسرو لفظ چکاوک بمعنی چکوا چکوی واقع شدہ توجیہ آن در سراج اللغۃ نوشتہ ام۔"

خالق باری میں مجھے کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس میں یہ لفظ آتا ہو۔ بہرحال ان تلمیحوں سے

ظاہر ہے کہ خان آرزو خالق باری سے بخوبی واقف ہیں۔

خان آرزو کے پیشروؤں میں بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی "اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ آج سے تین سو برس پہلے بھی یہ کتاب خالق باری ہی کے نام سے مشہور تھی"۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ " اللہ خدائی کے مصنف تجلّی نے اپنی تالیف کی مختصر منظوم تمہید میں یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

شاید از لطف و رحمت باری — روح خسرو نماید م یاری

اس شعر میں امیر خسرو کی روح سے مدد مانگی ہے اور اس کے پہلے مصرع کے آخری لفظ سے خالق باری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ خود اپنی تصنیف کا نام اللہ خدائی رکھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں بھی امیر خسروؒ کا ہندی و فارسی منظوم لغت موجود تھا اور اس کا نام بھی خالق باری ہی تھا"

(ہندوستانی ص ۴۴ جنوری ۱۹۳۱ء)

سید صاحب کی جدت طرازی قابل آفرین ہے۔ خسرو کے ذکر سے بالخصوص ایک ایسی کتاب میں جو خالق باری کی طرز میں لکھی جا رہی ہے ہر شخص اسی قیاس پر پہونچیگا جو سید صاحب نے نکالا ہے لیکن شعر بالا میں لفظ باری سے پروفیسر صاحب کا یہ قیاس کہ شاعر خالق باری کی طرف تلمیح کرتا ہے اضافت با دنیٰ ملابست کا حکم رکھتا ہے۔ بہر حال سید صاحب کا استدلال اگرچہ حجت قاطع کا حکم نہیں رکھتا ایک بعید قیاس ضرور پیدا کرتا ہے کہ ممکن ہے تجلّی خالق باری سے واقف ہو۔ لیکن اگر اسی مناسبت کوئی قوی دلیل ہو سکتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب اس مسئلہ پر شاید بہتر ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ پنجابی زبانوں کے نصابوں میں سب سے مقدم واحد باری ہے جو

میری نظر سے گذری ہے۔ واحد باری کا ذکر وارث شاہ علیہ الرحمۃ نے اپنی مشہور عشقیہ نظم ہیر و رانجھا میں کیا ہے۔ اب واحد باری کی تصنیف کا سال ایک قلمی نسخہ میں سمت ۱۶۸۳ اور متعدد قلمی و مطبوعہ نسخوں میں سمت ۱۶۷۹ دیا گیا ہے جو سال ہجری ۱۰۳۲ یا ۱۰۲۸ھ کے مطابق ہے۔ جب واحد باری کے نام پر غور کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے خالق باری کے نام کے ساتھ خاندانی مناسبت ہے۔ جس طرح خالق باری کی ابتدا الفاظ خالق باری سے ہوتی ہے بعینہٖ واحد باری کے شروع میں الفاظ واحد باری آتے ہیں

یعنے ؎   واحد باری ایکو سائیں   ایکو نام سہنس نائیں

اور خاتمہ یہ ہے ؎   واحد باری جگ جگ رہے   پڑھے جو فارسی مان بسیہ رہے

سولا سے اناسی سمت   واحد باری کردم تمت

ناموں میں اس قدر مشابہت اتفاقیہ نہیں ہوسکتی۔ میرا یہ خیال کہ خالق باری واحد باری پر مقدم ہے محض اس بنا پر ہے کہ اول تو خالق باری صوبۂ پنجاب میں قدیم سے داخل نصاب ہے دوسرے مصنف واحد باری نے خالق باری کے بعض اشعار اپنی تصنیف میں سہواً داخل کر لئے ہیں۔ میں ایک دو مثالیں دیتا ہوں

خالق باری ؎   آتش آگ آب ہے پانی   خاک دھول جو باؤ اوڑانی

واحد باری ؎   عمہ پھوپھی تو عمہ نانی   آتش آگ آب ہے پانی

خالق باری ؎   دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی بحطا   تابہ کرگان است کڑاہی توا

واحد باری ؎   دیگ ہانڈی کفچہ ڈوئی بحطا   تابہ کرغان ہے کڑاہی توا

خالق باری ؎   چالنی غربال چاکی آسیا   دیگدان چلھا و کندو کوٹھیا

واحد باری ؎   چھانی غربال چکی آسیا   چینی سرپوش چلھا دیگیا

بد قسمتی سے خالق باری کے عہد تالیف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جاسکتی لیکن گمان غالب ہے کہ واحد باری کی تالیف کے وقت وہ موجود اور داخل درس تھی۔

ایک بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایسی تالیف بغیر کتب لغات کی امداد کے مشکل سے طیار ہو سکتی ہے۔ یہاں بطور جملۂ معترضہ چند الفاظ کتب لغات کے متعلق کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستان ہی صرف ایسا ملک ہے جہاں فارسی لغات کے سلسلہ میں بڑی تندہی و سرگرمی کے ساتھ باقاعدہ کام کیا گیا ہے۔ چونکہ اس ملک میں فارسی کی حیثیت ہمیشہ سے اکتسابی رہی ہے اس لئے فارسی لغت کے متعلق ہر زمانہ میں دلچسپی لی گئی ہے اور فرہنگیں کثرت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ عہد مغلیہ میں جو لغات لکھے گئے ہیں مثلاً فرہنگ جہانگیری، سروری، رشیدی وغیرہ ان سے خالق باری کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ عہد ماقبل مغلیہ میں پھر ایک دراز سلسلہ فرہنگوں کا ملتا ہے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تالیف ہوا ہے۔ ان میں سب سے مقدم فرہنگ نامۂ قواس ہے جو بعہد علاؤ الدین خلجی ۶۹۶ھ و ۷۱۵ھ تالیف ہوتا ہے۔ فرہنگ نامہ کے بعد بیسیوں تالیفات وجود میں آتی ہیں۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی موید الفضلا ہے جو کہا جاتا ہے ۹۲۵ھ میں لکھی جاتی ہے۔ اب خالق باری اس سلسلہ کی فرہنگوں پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ خالق باری کا ماخذ فلاں فلاں کتب لغت ہیں ایک دراز مطالعہ کے بعد ممکن ہے تاہم یہاں بعض ایسے امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو براہ راست اس تصنیف کا علاقہ عہد ماسبق مغلیہ کی فرہنگوں کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ ایک امر تو یہ ہے کہ خالق باری میں بعض وہی غلطیاں نظر آتی ہیں جو خود ان فرہنگوں میں موجود ہیں مثلاً موید الفضلا میں فارسی لفظ 'نیا' کے معنے 'ماموں' بھی دئے ہیں جو عہد مغلیہ کی لغات میں نہیں ملتے۔ اب خالق باری میں بھی یہی معنے دئے گئے ہیں ع نیا خال ہندوی ماموں جان۔ خالق باری میں تدرو کو کبک

کا مرادف کہا گیا ہے ع فارسی سیمرغ عنقا ہے تدرو کبک ہنس
حالانکہ دونوں مختلف پرندے ہیں۔ لیکن موید الفضلا میں دونوں پرندوں کو ایک مانا گیا ہے
یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موید الفضلا سے قبل کی فرہنگوں میں فلفل کا لفظ ملتا ہے لیکن ان فرہنگوں میں اس کی تقسیم باعتبار سیاہ و سرخ نہیں ملتی۔ مثلاً شرف نامۂ احمد منیری تالیف ۸۷۳ھ میں یہ تشریح ملتی ہے۔

"فلفل بضم یکم و سویم پلپل و بکسر ہماں پلپل"

لیکن موید الفضلا تالیف ۹۲۵ھ میں تشریح بہ دی گئی ہے:-

"یکے پلپل گرد کہ آنرا بہندوی مرچ گویند و دوم پلپل دراز و آنرا بہندوی پپل گویند و آن ہر دو برای تداوی بکار آید و آنرا فلفل تیز گویند"

اور پھر اسی تالیف میں فلفل کی ذیل میں کہا گیا ہے

"بضم یکم و سوم پلپل و بکسر ہماں پلپل و آن دو نوع است یکے دراز و دوم گرد"

اب خالق باری میں بھی یہی تقسیم بعینہٖ انہی الفاظ میں دی گئی ہے یعنے ؎

ہندوی پپل بود فلفل دراز　　مرچ فلفل گرد را گویند باز

جس سے یہ گمان کرنے کی کافی وجہ نکل آتی ہے کہ خالق باری کا ماخذ موید الفضلا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ان ایام میں مرچ کی یہ قسمیں یعنی سیاہ و سرخ، ہمارے عہد کی طرح سے عام طور پر خانگی استعمال میں نہیں تھیں بلکہ جیسا کہ صاحب موید کہہ رہے ہیں دواؤں میں مستعمل تھیں۔ خصوصاً مرچ سرخ۔ آزاد بلگرامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں مرچ سرخ کا رواج ہندوستان میں مرہٹوں کی آمد سے تعلق رکھتا ہے۔ خزانۂ عامرہ میں یہ عبارت ملتی ہے:-

و دریں دو بست سال کہ قدم ایہا بسرزمین ہندوستان رسیدہ برخے مردم ہندوستان ہم

استعمال مرچ سرخ آموختند بیشتر رواج ایں مرچ بیت المال در ہندوستان نبود صفحہ ۳۸"

لال مرچ کا نام آزاد بلگرامی فلفل خراسانی بتلاتے ہیں چنانچہ

"و مرچ سرخ را در فارسی فلفل خراسانی خوانند۔ رفیع الدین قزوینی مصنف حقائد رفیعہ بعبارت عربی گوید۔ ترجمہ اش اینست کہ فلفل خراسانی غلافے است مثل غلاف تخم ترب وقت پختہ شدن سرخ میشود در شدت حدت و حرارت مثل فلفل سیاہ است" (صفحہ ۴۸ خزانۂ عامرہ)

موید کے علاوہ خالق باری کے اور مآخذ بھی ہیں جن کی نشاں دہی بالفعل مشکل ہے مثلاً اس تصنیف میں جوار کے لئے جرت کا لفظ آیا ہے ع

جرت جواری عدس مسوری برگ ہے پان —— اس شکل میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ اہل لغات اس کو زرّت بالتشدید لکھ رہے ہیں لیکن اہل نصاب بہ تخفیف تشدید لا رہے ہیں۔ اسی طرح مصرع چرخہ رہٹہ غلہ را پاگلہ داں —— میں پاگلہ ایسا لفظ ہے جس سے اہل لغات ناواقف ہیں۔ اور مصرع سیرا کھانا کور کانا بھید راز —— میں کور کا ترجمہ کانا بہ ظاہر صحیح نہیں۔ علی ہذا مصرع تابہ کڑگان است کڑاہی و توا —— میں کڑگان فرہنگوں میں نظر نہیں آتا۔ مصرع شبچرا رخش ونگا ورخنگ توسن ہے ترنگ میں شبچرا کو خنگ و توسن کا مرادف قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ شبچرا وہ حیوان ہے جو رات کو چرائی کرے یعنی چرندۂ شب۔ ایک اور مصرع ہے ع

شبچراغ یاقوت رتن ہیرا ہے الماس —— یہاں شب چراغ کو یاقوت اور رتن کے ہم معنے سمجھنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ شبچراغ کو اہل لغت کسی گاو دریائی کا گوہر بتاتے ہیں جس کی روشنی میں وہ رات کو چرتی ہے اور یاقوت جواہر کانی میں سے ہے

جیسا کہ جواہر ناموں میں مذکور ہے۔ مگر مصنف خالق باری شبچراغ اور یاقوت کو اس لئے ایک مانتے ہیں کہ ان کے ماخذ موید الفضلا میں لعل کے ذکر میں لکھا ہے کہ " گاؤ از ظلمات می آرد و بروشنائی آن علف خورد" اور شرفنامہ میں عجائب البلدان کے حوالے سے مرقوم ہے۔" لعل گوہرے است قیمتی درخشاں بدیں حدود نیفتد مگر بہ سراندیب و آن را گاؤ می آرد از ظلمات در دہن گیرد و بصحرا نہد۔ در روشنائی آن علف خورد۔ مردم کمین کنند گل تر بر سرش زنند۔ گاؤ بانگ و زاری کناں باز بہ دریا شود۔ مردم آں را بر دارند"۔ اب یہ بیان درحقیقت شبچراغ کا ہے نہ لعل و یاقوت کا۔

اس مختصر تبصرہ سے یہ امر روشنی میں آ جاتا ہے کہ بعض اغلاط مغلیہ عہد سے قبل کی فرہنگوں اور خالق باری میں مشترک ہیں اس لئے ہم اس قیاس میں حق بجانب ہیں کہ خالق باری موید الفضلا کی تالیف کے بعد وجود میں آئی ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر دسویں صدی ہجری میں کسی وقت لکھی گئی ہو۔

خالق باری کی عالمگیر مقبولیت کچھ اس کے داخلی محاسن پر نہیں ہے جس قدر اس عقیدہ کی بنا پر کہ وہ حضرت امیر خسرو دہلوی کی یادگار ہے۔ اس کی تائید میں خاتمہ کا یہ شعر جو قدیم و جدید نسخوں میں مختلف ہے موجود ہے۔ جدید نسخوں میں اس کی شکل یوں ہے؎

مولوی صاحب سرن پناہ　　گدا بھکاری خسرو شاہ

قدیم مخطوطات میں جو بارھویں صدی ہجری کے ربع دوم سے تعلق رکھتے ہیں اس طرح مرقوم ہے؎

خالق باری ہُئی تمام　　دُوں جگ رہا خسرو کا نام

انڈیا آفس کے نسخہ میں جو ۲۰ جلوس محمد شاہی کا مخطوطہ ہے ذیل کی صورت میں ملتا ہے

خالق باری بھی تمام   چل خسرو گھر آپنے (بھئی) شام

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہی شعر جو امیر کے نام کی مہر کا حامل ہے قدیم و جدید نسخوں میں اس قدر اختلاف کے ساتھ ملتا ہے۔

یہاں اس صورت حال کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مقبول و مشہور تالیفات کی طرح خالق باری کے قدیم نسخے دستیاب نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ گیارھویں صدی ہجری کا بھی کوئی باتاریخ نسخہ معلوم نہیں۔ چہ جائیکہ دسویں صدی یا اس سے قبل کا نسخہ ملے۔ اس سے یہی قیاس مرتب ہو سکتا ہے کہ خالق باری کے لئے قدامت کا یہ مفروضہ دعویٰ کسی مضبوط اساس پر قائم نہیں ہے۔ میرے علم میں ایک قدیم اور باتاریخ نسخہ وہ ہے جو سنہ ۴ جلوس محمد شاہی مطابق سنہ ۱۱۳۴ھ بلدہ اکبرآباد میں نقل ہوا ہے اور کتبخانۂ انڈیا آفس کی ملک ہے۔ اس نسخہ کا نمبر ع ۱۰۸۴ ہے۔ میرے پاس جو مخطوطہ ہے وہ سنہ ۱۱۳۵ھ کا نوشتہ ہے۔ اس کا خاتمہ ہے۔ "تمت تمام (شد) نصاب ہندوی زبان تصنیف امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ بیست و پنجم جمادی الثانی سنہ ۱۱۳۵ھ"۔ اس نسخہ میں ایک سو پچپن ابیات ہیں۔ بائیس شعر حاشیہ پر بعد میں اضافہ کئے گئے ہیں۔ کتاب پر ایک مہر ہے جس پر سنہ ۱۱۳۹ھ اور یہ سجع درج ہے سجع "از محمد مرتضیٰ ابوالفتح شد" اس نسخہ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس عہد میں نسخۂ ہذا امیر خسرو کی طرف بالعموم منسوب ہے۔

لیکن مذکورہ بالا نسخوں سے اہم انڈیا آفس کا ایک اور مخطوطہ ہے جس کا نمبر ۱۰۸۲ ہے۔ یہ نسخہ اگرچہ بلاتاریخ ہے لیکن معلومہ نسخوں میں میری رائے میں بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس کا نام مطبوع الصبیان ہے اور ذیل کے مختصر دیباچہ سے مزین ہے:

"الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ بدان اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین این چند کلمۂ عربی و فارسی ہر یک با ترجمۂ ہندی برای تعلیم صبیان بر طریق ریختہ منظومہ ساختہ آمد تا خاطر ایشان رغبت نماید و یاد گیرند و لغات ہر یک دریابند و نام این کتاب مطبوع الصبیان نہادہ شد و بر پنجاہ و شش (ہشت صحیح) فصل مرتب گردانیدہ آمد"

اس دیباچہ سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اول یہ کہ کتاب بچوں کے نصاب کی حیثیت سے لکھی گئی ہے اور نہ ان ترکوں اور ایرانیوں کے لئے جو امیر خسرو کے عہد میں چنگیزیوں کی دست برد سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہو رہے تھے جیسا کہ آج کل بعض اہل قلم کا عقیدہ ہے۔

دوسرے یہ کہ خالق باری کا قدیم نام مطبوع الصبیان تھا اور وہ اٹھاون فصلوں میں منقسم تھی لیکن مطبوعہ نسخوں میں اس کا دیباچہ نام اور فصول ترک کر دی گئی ہیں۔ اور قدیم ترتیب کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ بقول مولانا ادریس احمد "مطبوعہ نسخوں میں تعداد اشعار ایک سو اکانوے اور کلکتہ کے قلمی نسخہ میں دو سو پندرہ ہے۔" مگر اس نسخہ میں یہ تعداد دو سو بتیس ہے۔ اس لئے یہ نسخہ معلومہ نسخوں میں سب سے مکمل اور مفصل ہے۔ خاتمہ کا شعر ہے :-

خالق باری بھی تمام دو ہوں جگ رہیا خسرو کا نام

تیسرے یہ کہ اس نسخہ کی زبان مطبوعہ نسخوں و دیگر مخطوطات کے مقابلہ میں قدیم مانی جا سکتی ہے مگر نہ ایسی قدیم کہ اس کو امیر خسرو کے عہد کی زبان کہا جا سکے۔ میں چند فقرے یہاں دیتا ہوں :-

اسکوں لیکھ (ایں رابنویس)۔ آپیں اوڑگیا (خود پریدہ رفت) کل رات جو گئی۔ آج رات جو بہی۔ میں تجھ کہیا (ترا گفتم) توں کت رہیا (کجا بماندی)۔ آورسے بھائی (بیا برادر) پیس ری مائی (بنشیں مادر)۔ آہے (ہے) جوی کا بھائی (سالہ) جوی کا باپ جن جائی (سسرا)۔ سنیسر (سنیچر)۔ کہونگا ہوں (خواہم گفت)۔ کہیگا توں۔ کرونگا ہوں کریگا توں۔ ہوں آونگا۔ توں آویگا۔ ہوں مارونگا۔ توں ماریگا توں سترجن میرا (دوست منی) توں جیورا میرا۔ توں میری پانکھ (بازو)۔ سو اسکا ہے (ازان اوست)۔ سو تیرا ہے۔ چھنیں لیا تھا (چھین لیا تھا) پاچھا دیا (واپس دیا)۔ آپیں لیا (خود لیا) **شعر**

دوستگانی وہ پیالہ دو راپنیں کا جودیئے منتر اپنے کاج بھرپانیہ دھریوں جان لیے

بھرا بھیا (بھرا ہوا) سپکلی (چھپکلی)۔ ہوں اچنبھا (در شگفتم) وغیرہ۔

اس کے الفاظ بھی قدیم حالت میں پائے جاتے ہیں یعنی:۔ یشمہ (دوست) دوکال (کال)۔ کیا (تن)۔ گھیو (گھی)۔ سنّا (سونا)۔ روپ (روپہ۔ روپیہ)۔ کوپ (کپّا)۔ راتی، کلی (بستد)۔ بھال (بھالا)۔ ہاڑ (ہاڈ۔ ہڈی)۔ لاڑ (لاڈ) بیچھو (بچھو)۔ کوتا (کتّا)۔ جاڑی تاپ (جوڑی تاپ)۔ کہاڑا (کلہاڑا)۔ کاگل (کاغذ) لادن (لڈو)۔ بھیٹئی (بھیڑیا)۔ نالیر (ناریل)۔ ادکھ (اکھ)۔ گوٹھن (گھٹنا)۔ پاپن (پلک) پانکھ (بازو)۔ پریورا (عنقا)۔ پونگڑا (طفل)۔ بچونگڑا (چوزہ)۔ کپال (پیشانی)۔ کاکھ (بغل)۔ گال (گالی)۔ ساکھیا (گواہ)۔ بگل (بگلا)۔ دونٹی (ناف)۔ رترا (سرخ) کھنڈڑی (گدڑی)۔ جھونرا (جھمکا)۔ ہانس (طوق) دمڑا (عہد اکبری میں تانبے کا ایک سکہ جو دام کا آٹھواں حصہ ہوتا تھا۔ اس پر لفظ دمڑا نقش ہوتا تھا۔ گویا ہمارے عہد کی دمڑی اس کی مونث ہے)۔ چمار (کلال)۔ ناتہ (بکرا)۔ گود (گودا)۔

اگرچہ اس نسخہ کو بارھویں صدی سے زیادہ قدیم نہیں مانا جا سکتا تاہم موجودہ نسخوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور کسی اچھے نسخہ پر مبنی ہے۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ خالق باری کا کوئی اچھا نسخہ اب تک دریافت نہیں ہوا۔ مروجہ نسخوں کے متعلق یہ کہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ بالکل ناقابل اعتبار ہیں۔ خالق باری اگر امیر خسرو کی یادگار ہے تو ہم نے خسرو کی اس یادگار کو بڑی بے خبری کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔

یہاں چند الفاظ خالق باری کے مقبول عام ہونے کے متعلق بھی کہنے ضروری ہیں نصاب الصبیان کی طرح خالق باری کا اثر بعد کے نصابی ادبیات پر بیحد ہے۔ نہ صرف اردو نصاب اس کے شرمندۂ احسان ہیں بلکہ پنجابی۔ پشتو۔ گوجری۔ دکنی۔ برج و تلنگی زبانوں پر بھی اس کا اثر کار فرما ہے۔ گذشتہ دو صدیوں میں یہ کتاب ہندوستان کے اکثر صوبوں میں داخل درس رہی ہے۔ ہندوستان۔ پنجاب۔ گجرات اور دکن کی سرکاری و غیر سرکاری درسگاہوں میں شامل نصاب رہی ہے۔ اور اس قدر مقبول رہی ہے کہ پنجاب و دکن نے اس پر مقامی رنگ چڑھا دیا ہے۔ دکن و پنجاب کی خالق باریاں تغیر لہجہ و دیگر مقامی خصوصیات کی بنا پر اختلاف کثیر کی حامل ہیں۔ حتی کہ اس اختلاف نے اصل متن پر بیحد اثر ڈالا ہے۔ جہاں اہل قلم نے اس کی تقلید میں نئے نصاب طیار کئے ہیں بعض نے اس کی قبولیت کو دیکھ کر اور اپنے نصابوں کو مقابلہ میں سرسبز نہوتا دیکھ کر خود خالق باری کی ترمیم و اصلاح شروع کر دی ہے۔ دیکھو ترمیم شدہ خالق باری از منشی محمد باقی بعض نے اس کی ترتیب وزن عروضی کے اعتبار سے کی ہے۔ دیکھو مطبوع صبیان از صفی۔ بعض نے اپنی تصنیف کے لئے یہی نام اختیار کیا ہے مثلاً خالق باری از اکرم۔ خالق باری از سید غلام علی شاہ امروہوی۔ ادہر اردو کے میدان میں ذیل کی

کتابوں کے نام بہ تقلید خالق باری رکھے گئے ہیں :-

۱ - حمد باری از عبدالواسع ہانسوی ۲ - اللہ باری از احسن ۱۲۰۷ھ

۳ - رازق باری از والہ ۴ - ایزد باری

۵ - قادر باری از فیاض عسکری ۱۲۱۱ھ ۶ - حمد باری از عبدالسمیع رامپوری

۷ - فیض جاری از میر شمس الدین محمد

پنجابی زبان میں یہ نام خالق باری کے ساتھ اپنا خاندانی شجرہ ملاتے ہیں :-

۱ - واحد باری ۱۰۲۸ھ ۲ - رازق باری از اسمٰعیل ۱۰۷۱ھ

۳ - ایزد باری از کھرل پسر سابنداس سنامی ۱۱۰۵ھ

۴ - صنعت باری از گنیش داس بدہرہ قانون گوی ۱۲۲۰ھ

۵ - واسع باری از یکدل ۱۲۳۱ھ ۶ - اللہ باری

۷ - ناصر باری ۸ - اعظم باری

۹ - صادق باری

اردو کی نشر و اشاعت میں اس تالیف نے بہر حال ایک قابل قدر خدمت کی ہے۔ اور گذشتہ صدی میں بمبئی۔ حیدر آباد۔ لکھنؤ۔ کانپور۔ دہلی۔ آگرہ و لاہور کے مطبعوں میں سینکڑوں بار چھپ چکی ہے۔

خالق باری کے بعد دوسرا نمبر اللہ خدائی کا ہے۔ اس کے مصنّف تجلّی ہیں جو ۱۰۶۶ھ میں اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کے قول کے مطابق ۱۰۶۰ھ میں بعہد شاہجہان تالیف ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسے خطہ میں لکھی گئی ہے جو گوالیاری بالفاظ دیگر برج بھاشہ کے زیر اثر ہے۔ اس میں ثانی

حرفِ علت بکثرت ملتا ہے۔ مثلاً ڈانڈ (ڈنڈ۔ جرمانہ)۔ گھانٹ (گھنٹی)۔ باتی (بتّی)۔
باچھا (بچہ)۔ نیوچھاور (نچھاور۔ نثار)۔ موٹھی (مٹھی)۔ ساہی (سہی)۔ پات جھڑ
(پت جھڑ)۔ پاٹ (پٹ۔ ریشم) وغیرہ۔

اردو کی ڑ سے دال ہندی کے ساتھ بدلتی ہے۔ مثلاً گڑیا کو گڈیا لکھا ہے۔
گوالیاری میں اردو کی لام 'ر' سے کے ساتھ بدل جاتی ہے یعنے ںیال کو سیار
ڈال کو ڈار (شاخ)۔ اور کھلیان کو کھریان لکھا ہے۔

عمانی کے قیاس پرچپی کو چپانی لکھا گیا ہے۔ ادھر بنیتی کو بنیاین بنا دیا ہے۔ اکثر
ایسے لفظ ملتے ہیں جو اردو میں فی زمانناکم مستعمل ہیں۔ یعنے سنیہ (دوستی)۔ اتیت (درویش)۔
پوکھر (تالاب)۔ رسری (رسّی)۔ سسری (لاشہ)۔ سوہا (سرخ)۔ کونٹ (مسخرہ)۔ سنیھڈ
(زقوم۔ تھوہر)۔ پانت (مجلس)۔ بروتی (پلک)۔ ٹانڈا (قافلہ)۔ نوبلو (بہار)۔ رہلا
(نخود۔ چنا)۔ گبرٹوڑا (گبریلا)۔ لابھا (نفع)۔ پچھوری (چادر)۔ سار (فولاد)۔ تانی اور
بھرنی (تانا بانا)۔ ترنی (جوان عورت)۔ ہیلا (خاکروب)۔ جوجھ (لڑائی)۔ رباز (دف)
وغیرہ۔

تجلی گنگا کا جیوں اور جمنا کا سیوں ترجمہ کر رہا ہے۔

گوالیاری کا دستور ہے کہ اس میں بعض الفاظ کی واؤ میم کے ساتھ بدل جاتی ہے مثلاً
عربی لفظ 'والدہ' کو جیسا کہ گریرسن نے لکھا ہے مالدہ بنا لیا گیا ہے۔ اس قسم کی ایک مثال
اللہ خدائی میں بھی موجود ہے یعنے بھاگوانی کو بھاگمانی کر لیا گیا ہے۔ اللہ خدائی کئی مرتبہ
چھپ چکی ہے۔

تجلی کے بعد میر عبدالواسع ہانسوی کی باری آتی ہے۔ ان کا زمانہ عہدِ عالمگیری ہے

غرائب اللغات کے علاوہ جو اردو کی ایک فرہنگ بلہجۂ ہریانی ہے۔ میر عبدالواسع کی یادگار ایک نصاب موسوم بہ نصاب سہ زبان یا حمد باری ہے جو بعض وقت جان پہچان کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ خالق باری کے بعد یہ نصاب بہت مقبول رہا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پنجاب میں بھی اس کو قبولیت حاصل تھی اور کئی بار چھپ چکا ہے۔

نصاب مصطفٰی بعہد فرخ سیر سنہ ۱۱۲۶ھ میں لکھا جاتا ہے اور نصابی سلسلہ میں کسی قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اردو کے نصابوں میں بھی چند زیادہ قدیم ہیں۔ بارھویں صدی میں اور نصاب بھی طیار ہوئے ہیں۔ لیکن ان تک میری رسائی نہیں ہوئی ہے بہرحال بارھویں صدی میں کم لیکن تیرھویں صدی میں اردو کے نصاب بہ تعداد کثیر لکھے جاتے ہیں۔ ان میں ایک نصاب میرزا غالب دہلوی کی بھی یادگار ہے۔

پنجابی نصاب

پنجابی نصابوں کی تعداد اردو سے کم ہے۔ ان میں اولیت کا فخر غالباً واحد باری کو حاصل ہے جو سنہ ۱۰۳۲ھ یا سنہ ۱۰۳۶ھ میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد رازق باری کا نمبر ہے جو سنہ ۱۰۷۱ھ کی تصنیف ہے۔ ایزد باری سنہ ۱۱۰۵ھ میں۔ اللہ باری سنہ ۱۱۹۶ھ میں اور صنعت باری سنہ ۱۲۳۰ھ میں لکھی جاتی ہیں۔ واسع باری سنہ ۱۲۳۱ھ مشہور مولوی یکدل مصنف تحقیقات چشتی کا کارنامہ ہے۔ فارسی نامہ کے عبدالرحمٰن قصوری مالک ہیں۔ لیکن ہم اس کی تاریخ تصنیف سے ناواقف ہیں۔

پنجابی زبان کے نصابی لٹریچر کا جائزہ لیتے وقت ہم ایک نہایت غیر متوقع صورت حال

سے روشناس ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جہاں بچوں کے لئے پنجابی زبان ذریعۂ تعلیم ہے وہاں اردو بھی یہی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد کے زمانہ کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ سکھا شاہی اور مغلیہ دور کا۔ یہ امر موجودہ نسل کے لئے باعث حیرت ہو۔ مگر میں اس صداقت کے اظہار میں تامل نہیں کرونگا کہ اور صوبوں سے قطع نظر اردو زبان پنجاب میں قدیم سے ملکی زبان مان لی گئی ہے۔ ہمارے اسلاف کا رویہ اس مسئلہ کے متعلق بالکل واضح اور قطعی تھا۔ انہوں نے پنجاب میں پنجابی کے ساتھ اردو کو فراموش نہیں کیا تھا گویا پنجاب میں دو زبانیں ذریعۂ تعلیم بنی رہیں۔ اس نقطۂ نظر سے انہوں نے شروع ہی سے بچوں کو دونوں زبانوں سے واقف کرنا ضروری سمجھا تھا اور ان کی تعلیم میں دونوں قسم کے نصاب شامل کر لئے تھے۔ چنانچہ پنجابی زبان کے مشہور نصاب واحد باری اور رازق باری کے ساتھ ساتھ خالق باری اور حمد باری اردو کے نصاب پڑھائے جاتے تھے۔ خالق باری پنجاب میں بیحد مقبول رہی ہے اور مکتبوں میں کثرت کے ساتھ پڑھائی گئی ہے۔ چنانچہ وارث شاہ بھی اپنی تالیف ہیر ورانجھا میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ خالق باری کے متعدد نسخے نوشتۂ پنجاب میری نظر سے گذرے ہیں۔ اس صوبہ میں خالق باری کی ہر دلعزیزی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اکثر پنجابی نصابوں کے نام خالق باری کی طرز پر رکھے گئے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

میر عبدالواسع ہانسوی کا نصاب سہ زبان یا صمد باری پنجاب میں کثرت کے ساتھ استعمال میں آتا رہا ہے۔ صمد باری کے متعدد نسخے نوشتۂ پنجاب میری نظر سے گذرے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی زبان کے ایک مجموعۂ نصاب یعنی فارسی نامہ واحد باری و اللہ باری کے ساتھ کئی مرتبہ لاہور کے مطبعوں میں چھپ چکی ہے۔

ان سے قطع نظر خود اہل پنجاب نے اردو نصاب طیار کئے ہیں۔ سب سے قدیم مولوی اسحٰق لاہوری کا ایک نصاب ہے جو بعہد شاہجہان ۱۰۵۰ھ کے قریب تالیف ہوتا ہے۔ مولوی محمد اسحٰق نے دو نصاب لکھے ہیں اور دونوں فرح الصبیان کے نام سے موسوم ہیں۔ ان رسالوں میں اگرچہ پنجابی زبان کا چھینٹا بعض موقعوں پر نظر آتا ہے لیکن اردو الفاظ کی کثرت ہے۔ تشریحی زبان فارسی ہے میں بعض مثالیں دیتا ہوں۔

ذفر است گندہ بغل و ضحک است خندہ ہانسی　　خمیازہ فازہ باشد در ہندوی اباسی
انجیر تین باشد مادر دواں گلاب　　چوں کیلہ موز باشد عجلت بداں شتاب
طماخ داں طمانچہ دشنہ بداں کٹارا　　حفرہ مغاک گڈھا سکاچہ بداں گھوہارا
قم خیز کمک جنگی چوں بیغلوس کرچھی　　غربال شعر چھلنی طبتاخ داں بورچی
ابریق دلو چھاگل اسفل نشیب نیچہ　　محلوقہ سر سترہ داں گدگدی غلیچہ
صابوں بداں ریمک تجی بود شخنار　　بعرہ چو پشک مینگن تہ و ذلیل و خوار
رسیدن است کاتن تکلا شناس دوک　　پیچک است بوک پونی بشناس ثعدروک

ذیل میں بعض الفاظ درج ہوتے ہیں جن سے ناظرین اس تالیف کی زبان اور اردو پنجابی الفاظ کا تناسب معلوم کر سکینگے۔

(۱) اٹی (۲) اٹیرن (۳) چوری (چوڑی) (۴) مجیٹھ (۵) میہڈا (مینڈھا) (۶) انگل (۷) ناد (ناقوس) (۸) گولا (۹) کولا (کوئلہ) (۱۰) انگیٹھی (۱۱) بجلی (۱۲) سونڈ (۱۳) منگنا (مانگنا) (۱۴) چھجا (۱۵) پکھا (پنکھا) (۱۶) کانجی (۱۷) پھٹکری (۱۸) ہولاں (ہولے) (۱۹) ستو (۲۰) دھوپ (۲۱) مچان (۲۲) چھکا (چھینکا)

(۲۳) ٹیکا (۲۴) اوگالی (جگالی) (۲۵) کنوار (۲۶) کال کنگنی (۲۷) کوٹھی
(۲۸) السی (۲۹) میتھی (۳۰) سرسوں (۳۱) ڈوئی (۳۲) ہنگ (ہینگ)
(۳۳) سنگ (سینگ) (۳۴) جوار (۳۵) مسر (مسور) (۳۶) باڑی
(۳۷) املی (۳۸) نالیر (ناریل) (۳۹) پنڈ (خرمای تر) (۴۰) سپاری
(۴۱) اکھروٹ (اخروٹ) (۴۲) بدکی (بچکی) (۴۳) ڈیکار (ڈکار)
(۴۴) گکری (۴۵) کھیرا (۴۶) پھٹ (خیار برشکالی - پھوٹ) (۴۷) بیگن
(۴۸) توری (ترئی) (۴۹) توہر (تھوَر) (۵۰) پھلسا (۵۱) کسنبہ (۵۲) جواہا (جواسا) (۵۳) گھٹلی (گٹھلی) (۵۴) سکہ (۵۵) پیتل (۵۶) لوہا (۵۷) کھان
(۵۸) کھوٹا (۵۹) دیور (۶۰) فس (۶۱) بانجھہ (۶۲) سالہ (۶۳) پھوپھی
(۶۴) جوڑا (توام) (۶۵) ہانسی (۶۶) پالک (لے پالک) (۶۷) ساندھو
(ساڑھو) (۶۸) سسرا (۶۹) ماکھی (مکھی) (۷۰) جالی (جال) (۷۱) سوکن
(۷۲) ماموں (۷۳) چاچا (چچا) (۷۴) کاچا (کچّا) (۷۵) سمدھن (۷۶) گنگا
(گونگا) (۷۷) دہی (۷۸) مسکہ (۷۹) مکھن (۸۰) رائی (۸۱) ملائی
(۸۲) چھاچھ (۸۳) مدھانی (رئی) (۸۴) سرمدانی (سرمہ دانی) (۸۵) تیل
(۸۶) پلی (۸۷) کولھو (۸۸) کھل (۸۹) آٹا (۹۰) گالا (۹۱) گاڈی
(۹۲) بھڈیا (بھیڑیا) (۹۳) چیتا (۹۴) سہا (خرگوش) (۹۵) مینا
(۹۶) سندیسہ (۹۷) گوہ (۹۸) کویل (۹۹) تیترا (تیتر) (۱۰۰) جوک
(جونک) (۱۰۱) گھڑا (۱۰۲) نیول (نیولا) (۱۰۳) بچھو (۱۰۴) گرگٹ
(۱۰۵) کچھو (کچھوا) (۱۰۶) چھپکلی (۱۰۷) ڈھکلی (منجنیق)

یہ کل ایک سو سات الفاظ ہیں جن میں الفاظ ذیل بہ تفاوت لہجہ پنجابی مانے جا سکتے ہیں :-

(۱) بھیڈا (مینڈھا) (۲) کولا (کوئلہ) (۳) منگنا (مانگنا) (۴) پکھا (پنکھا)
(۵) ہولاں (ہولے) (۶) چھکا (چھینکا) (۷) ہنگ (ہینگ)
(۸) سنگ (سینگ) (۹) مسر (مسور) (۱۰) اوگالی (جگالی)
(۱۱) ہڈکی (ہچکی) (۱۲) پھٹ (پھوٹ) (۱۳) توری (ترئی)
(۱۴) جواہا (جواسا) (۱۵) ساندھو (ساڑھو) (۱۶) گنگا (گونگا)
(۱۷) کچھو (کچھوا)-

ان سترہ لفظوں میں اکثر ایسے ہیں جن کو صرف لہجہ کے فرق نے پنجابی بنا دیا ہے ۔ مثلاً ہینگ ۔ سینگ ۔ پھوٹ اور گونگا وغیرہ اور میں سمجھتا ہوں کہ مصنف کے مقابلہ میں کاتب اس ترمیم کا زیادہ ذمہ دار ہے ۔

اب میں ملا حافظ احسن اللہ لاہوری احسن تخلص کے نصاب ذوق الصبیان یا اللہ باری کا ذکر کرتا ہوں ۔ ملا صاحب کا پیشہ معلمی ہے اس کے ساتھ کتابت اور مہرکنی کو بھی ضم کر لیا ہے ۔ نہایت زود نویس معلوم ہوتے ہیں اور کتابیں کثرت کے ساتھ نقل کی ہیں۔ ایک معلم سب سے زیادہ بچوں کی ضروریات کا احساس رکھتا ہے جب لاہور میں بیٹھ کر ملا صاحب اردو کا نصاب طیار کرتے ہیں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ صوبۂ پنجاب میں ان کی از حد ضرورت ہوگی ۔ ملا صاحب کہتے ہیں کہ اس سے قبل میں نے اسی مضمون پر ایک ضخیم تالیف بڑی محنت کے ساتھ طیار کی ہے لیکن وہ بچوں کے لئے دقیق ہے لہذا نصاب ہذا کو آسان ہندی بولی میں طیار

کیا ہے۔ سنہ ۱۲۰۷ھ سال تصنیف ہے۔ اردو کے متعلق ملا صاحب فرماتے ہیں۔ یہ ہندی زبان بہت آسان ہے۔ بچے بڑی خوشی سے اسے پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ اب میں زبان کا نمونہ دکھانے کے لئے ذوق الصبیان کے دیباچہ سے ایک اقتباس دیتا ہوں :-

احسن نام ایک عاجز بندہ ملاں کاتب مہر کنندہ
احسن اللہ کی ہے یہ رعایت اوس کی ہدایت اوس کی عنایت
اوس کا وطن لاہور نگر ہے کمتر کہتر اور احقر ہے
اوس کی داتا خطا کو بخشے اوس کے ماتا پتا کو بخشے
کہیاں ہیں یہ کیتیاں بیتاں فارسی عربی ہندی باتاں
لڑکے میرے پاس ہیں پڑھتے لوگ ہیں مجھکو ملاں کہتے
آگے ایک کتاب لکھی ہے اوس پر محنت بہت گئی ہے
پر وہ بہت دراز و کلاں ہے لڑکوں کی ابھی کند زباں ہے
یہ آساں اور ہندی بولی لڑکوں کو ایک کھیل ہے کھولی
خوشی خوشی وہ پڑھتے ہیں اوسکو چشم و سر او پر دھرتے ہیں اوسکو
ذوق الصبیان نام رکھا ہے سال اوس دُرباغ کہا ہے
جو کوئی اوس کو پڑھے پڑھاوے عیب سوارے اور بناوے
دے اصلاح جو ہووے بھلائی مجھکو دے دعا وہ بھائی
بحر فروع تقارب میزاں فعلن فعلن فعلن فعلاں

ذیل کا اقتباس اصل نصاب سے ہے :-

دل و جگر ہے ہیا کلیجہ   کلا سر ہے مغز ہے بھیجا
امہ کنیز ہے لونڈی باندی   جیتل نقرہ فضہ چاندی
رپا سونا سیم و زر ہے   ڈبا کوپا ڈھال سپر ہے
عاشق منترا بندہ چیرا   خیمہ تنبو منزل ڈیرا
حلقہ دورہ گروہ گھیرا   گشت و گذار گذر ہے پھیرا
بھار بوجھ انبار ہے تودہ   بھیڑ انبوہی آنتر رودہ
لوہو خون سیاہی سودا   طحال سپرز تلی مغ گودا
پتہ زہرہ تلخ صفرا   دشت و بر بیاباں صحرا
گھیا کدو گو نگلو شلغم   لیس لعاب کف و جھگ بلغم
نیچ ہے اندر بیروں باہر   باگھ غضنفر شیر ہے ناہر

ملا صاحب کی زبان نہایت صاف ہے۔ خال خال موقعوں پر اردو کے بجائے پنجابی لہجہ نظر آتا ہے۔ میں چند شعر ایک اور مقام سے دیتا ہوں :-

سجن دوست ہے یار خلیل   تھوڑا اندک کم و قلیل
بہتا بیش بس و بسیار   افزوں زیادہ وافر دار
فیل اور پیل اور کمنا ہاتھی   ہمدم ہمرہ بیلی ساتھی
سنگ و سنگت قافلہ کارواں   سوداگر تاجر بازرگاں
پتھر سنگ رتن ہے جوہر   مروارید موتی در و گوہر
مربع چورس گرد ہے گول   نرخ بہا اور قیمت مول
اجر و اجرت مزد و مزدوری   روغن گھیو ملیدہ چوری

مرجان بسد کلی اور مونگا ۔ صم و بکم ہے ڈورا گونگا
غریب مسافر ماندہ تھکا ۔ پرندہ پنکھی باد کش پنکھا
سگ ہے کتا گربہ بلی ۔ جہاں آباد شہر ہے دِلّی
باگھ بگھیلہ شیر اسد ہے ۔ سباع درندہ وام و دد ہے
ماہی مچھلی سنسار نہنگ ۔ ہندی چیتا یوز پلنگ
آہو ہرن سہا خرگوش ۔ کھال رات جو گذری دوش
دی و پری جو گذرا کھل پرسوں ۔ کنجد تل سرشف ہے سرسوں
کھل پرسوں آیندہ جو آوے ۔ فردا اور پس فردا بھاوے

ملا صاحب کی مساعی لائق ستائش ہے وہ ہر لفظ کے لئے اردو مرادف دیتے ہیں اور جب نہیں ملتا ہے پنجابی الفاظ پر قناعت کرتے ہیں۔ اس طرح تالیف ہذا میں بعض پنجابی لفظ داخل ہو گئے ہیں۔ اوپر کے اقتباسوں میں آنتر (آنت)۔ جھگ (جھاگ)۔ کھل (کل)۔ گونگلو (شلغم)۔ گھیو (گھی)۔ چوری (ملیدہ)۔ کلی (مونگا) ڈورا (بہرا) وغیرہ پنجابی زبان کے ذخیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنت۔ جھاگ اور کل وغیرہ میں تو محض لہجہ کا فرق ہے۔ گھیو تو خود اہل اردو بولتے رہے ہیں۔ ملیدہ کے واسطے چوری میری نظر سے نہیں گذرا لیکن مالیدہ کا صحیح ترجمہ یہی ہو سکتا ہے گونگلو اگرچہ اب اردو میں غیر مستعمل ہے لیکن مغلیہ عہد سے قبل کے اہل لغات اس لفظ سے واقف ہیں اور قدیم تلفظ وہی ہے جو آج پنجاب میں رائج ہے۔ اداۃ الفضلا نوشتہ ۸۲۲ھ میں گونگلو ملتا ہے۔ شرف نامۂ احمد منیری ۸۷۷ھ میں گانگلو اور موید الفضلا ۹۲۵ھ میں گنگلو لکھا ہے۔ فی زماننا یہ لفظ اردو میں متروک ہے۔

خاتمہ:- ختم مرتب پورا سارا آخر اوڑک عجب نیسارا

تنکا خس ہے پیچھے پس ہے پورا سارا قانع بس ہے

تو بھی بس اب بس کر احسن پڑھ درود اور حمد ذوالمن

مانگ خدا سے یہی مدامی بخشے رب گناہ تمامی

بندہ منگتا کرے دعائیں مولیٰ صاحب دانا سائیں

کتاب کے عنوان کی پشت پر بالائی گوشہ میں جانب چپ محرابی مربع میں شعر ذیل اس تالیف کے دو نام دے رہا ہے ؎

اللہ باری ذوق الصبیان فارسی عربی ہندی باتاں

"در باغ" اس تالیف کا مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اسی سال تیمور شاہ درانی کا انتقال ہوتا ہے اور شاہ زمان تخت نشین ہوتا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ پنجاب میں اردو نصابوں کا رواج نیز اردو نصابوں کی اس صوبہ میں تالیف ہمیں اس نظریے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ پنجابی زبان کی طرح اردو زبان بھی اس صوبہ میں قدیم سے ذریعۂ تعلیم رہی ہے۔ اردو اس میں شک نہیں پنجاب میں بعہد مغل بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے لیکن ہم کو یہ علم نہیں تھا کہ بچوں کی تعلیم میں بھی اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ خالق باری کے بعد اردو کا سب سے قدیم نصاب فرح الصبیان پنجاب میں لکھا جاتا ہے۔ یہ امر شاید ان بزرگوں کی آنکھیں کھولے جو آج پنجاب میں اردو کے استحقاق کو نظر انداز کرتے ہیں اور پنجابی کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ ہم پنجاب کے ساتھ اردو کے قدیم تعلقات کی داستان سے بالکل بے خبر ہیں لیکن اس سلسلہ میں جو بعض واقعات گذشتہ چند سال میں روشنی میں آئے

ہیں ان سے اس قدر اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے روابط اس صوبہ کے ساتھ نہایت قدیم اور گہرے ہیں۔ اردو اور پنجابی کی صرف ونحو ان زبانوں کے اتحاد اور قرابت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ اردو کا سب سے قدیم فقرہ جو ہمیں معلوم ہے پنجاب ہی کے ایک شیخ حضرت فریدالدین گنج شکر کی یادگار ہے۔ مسلمانوں میں سب سے اول جس شاعر نے ہندی دیوان لکھا وہ لاہور کے مشہور شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں۔ سب سے پہلے جس شخص نے دوہرہ لکھا وہ یہی شیخ فریدالدین مذکورۂ بالا ہیں۔ گجرات و دکن میں اگرچہ اردو تالیفات دسویں صدی ہجری سے شروع ہو جاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں دو صدی بعد تک ان کا پتہ نہیں چلتا۔ دہلی میں ابھی اردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکتا ہے کہ پنجاب میں لوگ اردو زبان میں مثنویاں وغیرہ لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میرپور کے شیخ غلام محی الدین تصوف کی مثنوی گلزار فقر ۱۱۳۱ھ میں ختم کرتے ہیں۔ بٹالہ کے مشہور شیخ غلام قادر ۱۱۵۱ھ سے قبل مثنوی رمز العشق لکھتے ہیں۔ اسی بٹالہ کے ایک اور مصنف عاجز تخلص سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ فارسی سے اردو میں نظم کرتے ہیں۔ ایک اور بزرگ تحسین ہیں جو ایک نظم موسوم بہ واردات کے مالک ہیں۔ جس میں مصنف اپنے ایک شاگرد کی دعوت پر جو دیوان زادوں میں سے ہے۔ اپنے میرپور کے سفر۔ راہ کی مشقت و صعوبت میزبان کی بیرخی وہاں سے واپسی اور گھوڑے کی مذمت وغیرہ کا ذکر ۱۲۳۶ھ میں لکھتا ہے۔ یہ تالیفات جو اندکے از بسیارے و مشتے نمونۂ خروارے کا حکم رکھتی ہیں خالص پنجاب کی پیداوار ہیں جن پر ہندوستان کا کچھ اثر نہیں ہے۔ یہ بزرگ نہ ہندوستان گئے اور نہ اردو دانوں سے تعلق میں آئے۔ لیکن اردو میں

اپنی تالیفات لکھ رہے ہیں۔ ہمیں ستایش کرنی چاہیئے ان بزرگوں کی جو دلی ورکنا خود پنجاب کے دارالسلطنت لاہور سے بھی فاصلہ پر رہ کر ان دور افتادہ مقامات میں جہاں اردو بولنے والا مہینوں کیا بلکہ برسوں بھی ان سے تعلق میں نہیں آسکتا ہوگا اردو زبان کی تحریک کو زندہ رکھتے ہیں۔ اب تاوقتیکہ ان تالیفات کے پڑھنے والے پنجاب میں موجود نہوں ان کا منصۂ شہود پر آنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس لٹریچر کی روشنی میں ہمیں اس نتیجہ پر پہونچنا چاہیئے کہ پنجاب میں کم وبیش ہر عہد میں اردو کے لئے سرگرمی رہی ہے۔

فہرست کتب نصاب فارسی

(۱) منطق ۔ عربی بول چال کا ایک قدیم رسالہ ہے۔ چھوٹی تقطیع۔ اٹھاون صفحات فی صفحہ ۱۴ سطور۔ سلطان شاہ ابو القاسم محمود بن ایل ارسلان بن اتسز خوارزمشاہ کے لئے ۵۶۸ھ سے قبل تالیف ہوا ہے۔ گذشتہ سطور میں اس رسالہ کا ذکر ہو چکا ہے۔

ابتدا :۔ الحمد للہ رب العالمین الذی خلق عبادہ المکرمین وارسل الیہم القران العظیم المبین وجعل العاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی النبی العربی الامین وآلہ الطیبین الطاہرین واجابہ الذاکرین الشاکرین وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا

(۲) کتاب اسامی ۔ چالیس صفحات فی صفحہ ۱۴ سطور۔ اس کا بھی اوپر ذکر آچکا ہے۔

ابتدا :۔ الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین۔ الصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وآلہ اجمعین وسلم تسلیما۔ آغاز کتاب اسامی

(۳) نصاب الصبیان از ابونصر فراہی ۔ یہ کتاب متفرق اور مختلف اوزان کے قطعات پر شامل ہے۔ مصنف نے التزام یہ کیا ہے کہ قطعہ کے شروع میں ہر قطعہ کی بحر اور وزن بتا دیا ہے۔ اشعار کی تعداد دوسو ہے۔ سبب تالیف میں مصنف نے لکھا ہے :۔

"کہ چوں صبیان را پیش از تعلیم لغت عرب رغبت می افتد باشعار فارسی

وچوں خوش آمدن شعر مرطبعہائے موزوں را غریزی است وتعلم لغت کلید ہمہ علماست
قدرے ازوے نظم کردم تا بے تکلف یاد گیرند وچند بیتے کہ ضابط بود مرہر چیزے
را از علوم بیان این قطعہا درآوردم تا بنوشتن وخواندن این نسخہ ہر کسے را
رغبت افتد وچوں این مجموع دویست بیت آمد آنرا نصاب الصبیان نام کردم"

کتاب کا اکثر حصہ عربی الفاظ سے بحث کرتا ہے۔ ایک قطعہ میں عربی صرف سے تعلق رکھنے والے الفاظ مثلاً ضمائر۔ اسمائے اشارہ۔ حروف جارہ بیان ہوئے ہیں بعد میں عام معلومات کے مفید امور ذکر ہوئے ہیں مثلاً عربی فارسی رومی و ترکی مہینوں کے نام۔ ہفتہ کے نام۔ سبعہ سیارہ۔ بروج۔ فصول۔ ازواج النبی۔ اولاد النبی ائمہ معصوم۔ مدنی سورتیں۔ مغتیان نبی۔ موالی نبی۔ قاری۔ قبائل نبی گنتی بیماریاں۔ مدت بودن آفتاب در ہر برج۔ حساب جمل۔ مختلف دھاتوں کے اوزان وغیرہ وغیرہ۔

ابتدا:۔ الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہٖ اجمعین۔ ع

چنیں گوید ابو نصر فراہی حسد حافدہ وحفد حاسدہ الخ

(۴) بدیع النصاب از امیر خسرو۔

ابتدا:۔

مصر شہر وشہر ماہ وماہ آب خوف سہم سہم تیر واجخہ چہ بال باشد بال جان

مختلف قطعات پر شامل ہے اور ہر قطعہ میں خاص خاص صنعتوں کا التزام رکھا گیا ہے جن میں اکثر صنعت تجنیس اور اس کی شاخوں سے تعلق رکھتی

ہیں مثلاً تجنیس تام و ناقص و خط و قلب و زاید و مطرف وغیرہ۔ کل قطعات تیئیس ہیں۔

(۵) نصاب نصیب اخوان از مطہر

افتتاحیہ :-

نامہ بر نام کردگار جہان　　　　کوست اللہ و راحم و رحمٰن

دیباچہ میں مذکور ہے۔ چونکہ کلام پاک بزبان عربی ہے اس لئے لغات عرب کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس سے پیشتر استاد نے کسی قدر اس مضمون پر لکھا تھا جو مختلف اوزان کے قطعات میں تھا۔ میں نے ایک ہی وزن و قافیہ میں جمع کر دیا ہے۔ اُس کا نام نصاب صبیان تھا۔ اس کا نام نصیب اخوان ہے ؎

نام او گر نصاب صبیان بود　　　　نام این را نصیب اخوان دان

۲۳ صفحے اور نو سطریں فی صفحہ۔ کتاب خاصہ قدیم ہے۔ سنہ ۷۷۶ھ سال تصنیف ہے ؎

سال شش بود و ہفصد و ہفتاد　　　　کز مطہر شد این نوشتہ عیان

یارب این نامہ را قبول دہ　　　　تا شود شستہ نامۂ عصیان

لیکن شعر آیندہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۸۲ھ کی تالیف ہے ؎

سال 'برعوث' بود کین نامہ　　　　از مطہر چو ماہ گشت عیان

(۶) نصاب عقود الجواہر - ابتدا میں فارسی نثر میں ایک دیباچہ ہے جس میں محمد حنیف صاحب کہتے ہیں کہ یہ مختصر تالیف استاد رشید الدین وطواط کی طرف

منسوب ہے اور ارباب بلاغت کی اصطلاحات پر شامل ہے مگر نثر کے یہ منتشر موتی نظم کی لڑیوں میں پروئے بغیر خوبصورت نہیں لگتے۔ اس لئے میں نے یہ خواہش کی کہ ان کو نظم کا لباس پہنا دوں۔ چنانچہ میں نے ایسے لغت چن لئے جو اوزان شعر میں صحیح المعیار اترے اور اکاون قطعات میں ختم کر دیا۔ چونکہ یہ تالیف عقود الجواہر کے نام سے موسوم ہے اس لئے برسم تحفہ سلطان زادۂ جہان امیر کبیر جلال دولت و دین میرزا چلپی ابن سلطان الاعظم وخاقان المکرم ملک الروم والعجم غیاث الدولۃ والدین سلطان محمد بن بایزید بن مراد خان بن اورخان بن عثمان کے خزانہ میں سپرد کردی گئی۔ اس مختصر دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو مختلف وزن کے قطعات پر شامل ہے۔ اس نصاب میں زیادہ تر الفاظ مترادف جمع کئے گئے ہیں۔ تعداد اشعار ۵۷۸

ابتدا:-

ابتدا و افتتاح و فاتحہ آغاز کار استمالت دلخوشی دادن موافق سازگار

سلطان محمد نے ۸۰۵ھ سے ۸۲۵ھ تک سلطنت کی ہے۔ عقود الجواہر کی ایک بڑی اشاعت بھی ہے جو ۵۷ قطعات اور ۶۵۰ اشعار پر شامل ہے۔ حاجی خلیفہ کے ہاں (ص ۲۲۹ جلد ۴) سلطان مراد ۸۲۵ھ و ۸۵۵ھ کے نام پر معنون اور رشید وطواط کی طرف منسوب ہے۔

(۷) **نصیب الفضلا** - سب سے پہلے ایک عربی دیباچہ۔ اس کے بعد فارسی نظم شروع ہوتی ہے۔ قطعات کے بجائے قصائد میں تقسیم کی گئی ہے:

ابتدا - القصیدۃ الاولیٰ ؎

مجیب نام خدا مجتبیٰ است پیغمبر — دو جانشین رسولش عتیق دان و عمر

کتاب مختلف وزن کے قصیدوں میں منقسم ہے۔ موجودہ نسخہ میں ۸ صفحات اور فی صفحہ ۹ سطریں ہیں لیکن ابھی ناتمام ہے۔ سال تالیف و نام مصنف معلوم نہیں لیکن کتاب قدیم معلوم ہوتی ہے۔

(۸) اسمای حروف۔ نام نامعلوم۔ کل بائیس شعر ہیں حروف تہجی کے معنے بیان ہوئے ہیں۔

ابتدا:۔

بعد بسم اللہ و یاد مصطفیٰ — باز یاد آل و یاران صفا

آنکہ این اسماء احرف در بیان — ہر یکے را معنی است گویم بدان

سنہ ۸۱۰ھ کی تالیف ہے

خاتمہ:۔

سال "ضیح" در مہ ذی القعدہ بود — کین لغت را نظم کردن رو نمود

نظم کردم در مزار شیخ جام — شد تمام الحمد للہ والسلام

(۹) نصاب حسنیٰ۔ ایک ہی بحر و قافیہ میں ہے۔ تقریباً دو سو بیس اشعار ہیں۔ سنہ ۸۹۶ھ یا سنہ ۹۹۹ھ سال تالیف ہے۔ اس رسالہ میں صنعت اشتقاق و تجنیس و جمع کی رعایت کے الفاظ دئے ہیں۔

ابتدا:۔

نحمد اللہ الالٰہ و اِل خدای بندگان — راحم و رحمٰن بنک چون رحیم است مہربان

خاتمہ:۔ "وصض" سپری کردن است ہنگام جلوہ از عروس — وقت ختم این کتابست گر شماری رقم آن

گویا لفظ 'وصف' مادۂ تاریخ ہے جس سے ۸۹۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی یہ شعر آتا ہے :۔

شامل تسعین و تسع اسمار حسنیٰ نہ بود　　این نصاب است نام حسنیٰ انیک مرزان و نوران

یعنی اسمار حسنیٰ ۹۹ پر جب تو شامل کئے تو ۹۹۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ تمام کتاب اسی وزن و قافیہ میں ہے۔

(۱۰) نصاب کمال :۔

آغاز :۔

اکلیل صحیفہ را زبرجد　　حمد احد است و مدح احمد

دیباچہ میں مولینا کمال کہتے ہیں کہ میں نے الفاظ مترادف و اضداد عربی فارسی میں یہ کتاب لکھی ہے۔ اگر کہیں غلطی اور سہو نظر آئے تو معاف کریں اور میرے لئے دعائے خیر کریں۔ کمال حضرت شمشیر کے معتقد ہیں۔ اصل کتاب یوں شروع ہوتی ہے :۔

حق اللہ و ایزد و یزدان و گن گر گر بود　　تنگری و کردگار و شیدر و لرلر بود

موجودہ نسخہ میں ۷۵ صفحات اور فی صفحہ دس سطریں ہیں۔

خاتمہ :۔

بندۂ بارگہ حضرت شمشیر کمال　　دارد از قاری این فاتحہ استمداد

یہ کتاب گذشتہ صدی میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

(۱۱) قنیۃ الفتیان از شیخ صدر الدین بن بدر الدین

آغاز:۔ حمد ایزد را کہ داد او بندہ را طبع روان　　تا کہ در سلک بیان آورد نظمے چون جُمان

مصنف نے اپنے ہمشیر زادہ کے لئے تصنیف کی ہے اور مقلوب و متجانس الفاظ پر خاص توجہ دی ہے۔ تعداد ابیات دو سو پندرہ۔ کتاب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ خاصہ قدیم ہے۔

خاتمہ:۔

کرد انشا صدر بدر این تحفۃ الفتیان کہ ہست　　در لغت نزدیک اہل فضل گنج شائگان

کئی بار چھپ چکی ہے

(۱۲) نصاب ضیائی یا تجنیس اللغات از جامی۔ مولینا جامی نے یہ نصاب اپنے فرزند ضیاء الدین یوسف کے واسطے لکھا ہے

افتتاحیہ:۔

بعد توحید و صفات خالق شام و سحر　　وز پس نعت و ثنائے خواجۂ خیر البشر

کردم این مجموعہ را در صنع تجنیس اللغات　　تا ضیائی را لغت دانی بیاد آید مگر

خاتمہ:۔

تا چند سخن طویل گوئی چنداں　　خاموشی پیش گیر عبد الرحمن

بس کن کہ ہمیں رسالہ کافیست ترا　　زین بیش مدہ درد سر خود بکساں

یہ رسالہ کئی مرتبہ چھپا ہے۔

(۱۳) نظم مثلث یا نصاب الاخوان یا نصاب بدیعی از بدیعی

آغاز:۔

از پس حمد خداوند زمین و آسمان　　کردہ ام نظم مثلث چوں لآلی عمان

در خط است یک لفظ خود ہر سہ لغت حاصل شود　　رو تو غار از فتح و کسر و ضم بدین ترتیب دان

اس میں ایسے سہ حرفی ہم شکل الفاظ ہیں جن کا پہلا حرف بہر سہ حرکات آتا ہے پہلا مفتوح دوسرا مکسور اور تیسرا مضموم ہے اور یہی ترتیب تمام کتاب میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

خاتمہ :۔

این چنیں شعر بدیعی را بدیعی نظم کرد تا بود در روزگار از شرے ہمی نام و نشان

خاتمہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بدیعی کی تالیف ہے۔ لیکن چونکہ یہ نصاب امیر خسرو کے نصاب کے ساتھ درس میں داخل رہا ہے اور ساتھ ساتھ پڑھایا گیا ہے اس لئے متاخرین میں یہ عقیدہ راسخ ہوگیا ہے کہ یہ نصاب بھی امیر خسرو کی ملک ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مولوی محمد بدیع کی تالیف ہے جیسا کہ مولانا رشید احمد صاحب نے جواہر خسروی میں نصاب بدیعی کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے۔ چھپ چکا ہے اور کثرت کے ساتھ پڑھایا گیا ہے۔

(۱۴) منطق الصبیان از غنی

ابتدا :۔

بعد توحید خالق بیچوں کز عدم کرد خلق کن فیکون

اشعار کی تعداد دو سو ہے۔ زیادہ تر عربی افعال و امر و نہی معہ ترجمہ درج ہیں۔ رسالہ مختلف اوزان کے قطعات پر شامل ہے۔ شعر ذیل میں کتاب کا نام ملتا ہے ؂

از حدیث عرب چو شد شیاں کردمش نام منطق الصبیان

خاتمہ :۔ بدانکہ طرفہ تراین یادگار از غنی است نجستہ باد بعالم چہ بر صغار و کبار

(۱۵) **تجنیس اللغات** - جامی کی مذکورہ بالا تالیف سے مختلف ہے۔

ابتدا :-

بخل باشد ممسکی وبخل را گویند ہیچ   نخل را گر باز پرسی معنیش خرما شمر

رسالۂ ہذا میں عربی و فارسی الفاظ جن میں تجنیس کا بھی لحاظ دیکھا جاتا ہے بیان کئے گئے ہیں مختلف بحروں میں مختلف قطعات ہیں۔

(۱۶) **نسب صبیان از شیخ اسحٰق لاہوری** - مصنف نے اپنے فرزند عبدالرزاق کے لئے ۱۰۵۰ھ میں بعہد شاہجہان پادشاہ تالیف کی ہے۔

سال تصنیف لفظ 'نغز' ہے۔ مصنف اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں سے

عادل شجاع شاہجہان آنکہ ابروار   در بحر و بر نمودہ زر و گہر نثار

در عہد دین پرور شاہنشہ چنیں   تاریخ سال ہجری و ریگ نغز بہ بیں

مسکین ضعیف بندۂ اسحٰق خوش بیان   در معدن فضیلت لاہور پر امان

از نکتہای موزون شیرین عجب کلام   تا ہبد نسب صبیان در نفع خاص و عام

از بہر نور دیدہ عبدالرزاق نیز   از فیض بہرہ یابد گردد بحق عزیز

آغاز :-

بسم اللہ است تسمیہ لیجہ لغت زبان   اکبر بزرگ رحمٰن تنگر احد یگان

شیخ اسحٰق اس رسالہ کے سوا دو اور نصابوں کے مالک ہیں اور دونوں کا نام فرح صبیان ہے - پندرہ صفحات فی صفحہ ۱۳ سطور۔

(۱۷) **وضوح النصابین از شیخم بن مولینا کلان بن مخدوم الصبیان شیخ احمد** - یہ رسالہ نثر میں ہے اور چار نصابوں کے لغات پر مبنی ہے۔

ابتثی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگرچہ مصنف کے زمانہ کا علم نہیں لیکن زبان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً آٹھویں یا نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے اور ہندوستان میں لکھا گیا ہے۔ تشریح کے وقت جیسا کہ مغلیہ عہد سے ماسبق فرہنگ نگاروں کا دستور ہے بعض جگہ ہندی الفاظ دئے ہیں مثلاً ازمیل نشکردہ را گوینہ۔ ہندوی موچنا۔ شتری ہندوی طوری۔ حلبہ۔ شملیت یعنی میتی۔ ضاغوط آنچہ مردم را در خواب فرو گیرد۔ ہندوی انہارہ یفجن۔ سداب نام گیاہے است ہندوی وسار۔ قملہ۔ سپش۔ ہندوی جوں۔

ایک مقام پر نصاب الصبیان کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ فہرست ببلیوتیک نیشنل جلد دوم ص ۱۹۱، ۹۷۰ میں اس رسالہ کا نام وضوح الناصبین دیا گیا ہے۔ تعداد صفحات تیس فی صفحہ تیرہ و چودہ سطریں۔

(۱۸) **نصاب الاوان یا نصف النصاب۔**

شروع رسالہ :- نحمدہٗ علیٰ نوالہ ونصلی محمد وآلہ اجمعین۔ القطعۃ الاولیٰ

اوان وحین و اوقات است ہنگام　　　　فلق صبح وعشی است وعشا شام

کل پندرہ قطعات ہیں۔ تعداد صفحات دس۔ سطریں ۱۲-۱۳۔ زیادہ تر الفاظ مترادف جمع ہیں۔

(۱۹) **نصاب ؟**

آغاز :-

ہست اللہ و خدا ہم رب بود پروردگار　　　　مہربان رحمٰن رحیم و کارساز و کردگار

آخر سے ناقص ہے۔ نام معلوم نہ ہوسکا۔ موجودہ نسخہ میں کل آٹھ صفحے ہیں اور عربی

وفارسی مراوفات دئے گئے ہیں۔

(۲۰) شاہ نظم یا دافع الاغلاط از امان اللہ

ابتدائیہ :-

بعد حمد و نعت چندیں [...کر] دہ بیاں   ذرۂ کمتر امان اللہ بہر طالبـــان

کتاب چونکہ دیمک کی کھائی ہوئی ہے اس لئے دیباچہ کا پورا بیان نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال شاہ عالم اول کا زمانہ ہے جب یہ کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس میں مصنف نے تمام اغلاط مشہورہ جو اہل علم بسلسلۂ لغات کرتے ہیں بے نقاب کر دی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف خود شاہ عالم پادشاہ کے لئے لکھی گئی ہے مؤلف بعض اشعار میں اس کو خطاب کرتا ہے ؎

شاہ نظم این نسخہ را نامیدہ ام اے شہریار   در لغت تالیف کردم تا بماند یادگار
ظلمت اغلاط زائل شد ازین نظم منیر   زاں شدہ تاریخ آن "خورشید" ای روشن ضمیر
ہفتصد بیت است در این نسخہ از روی شمار   چارصد ہفتاد میخوانی لغت را یاد دار

اور تاریخ کے لئے لکھا ہے :-

سال ہجری اندرین ہنگام از روی شمار   یک ہزار و یکصد و بست است در دل یاد دار
دافع الاغلاط ہست این نسخۂ منظوم من   عرف آن شد دافع الاغلاط زاں اندر زمن

یہ نسخہ دافع الاغلاط کے نام سے چھپ چکا ہے لیکن دیباچہ کے اشعار ترک کر دئے گئے ہیں۔

(۲۱) مثلث۔ برای محمد ختلانی

افتتاحیہ :-

چوں بتوفیق لطف ربانی   کردم آغاز حمد سبحانی

سبب تالیف میں مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے یہ مثلث اپنے دوست محمد ختلانی کی فرمائش پر لکھا ہے ؎

سبب نظم این مثلث را — وقت اشغال وگاہ حیرانی
بود باری ز مخلص احباب — او محمد بنام ختلانی
مولدش بود جهار سو (کذا) بیشک — محمد انها حسن راسانی (کذا)
التماسش زمن نصابے بود — زان لغتها چو درعمانی

محمد کا مولد اگر جھاڑ سو ہے تو مصنف یقیناً ہندوستانی ہے۔ رسالہ کی وہی خصوصیت ہے جو نصاب بدیعی کی ہے یعنے ایسے ہم شکل سہ حرفی جن کا حرف اول بہ سہ حرکات آتا ہے بالترتیب اول مفتوح پھر مکسور اور پھر مضموم دیئے ہیں ؎

اولش فتح و آخرش ضم است — تا تو بے شبہ راست برخوانی

کل نو دس قطعات کا رسالہ ہے۔

(۲۲) **نزہت الصبیان از عبد المجید۔** کہتے ہیں :-

"تاریخ اتمامش کہ یازدہ صد و ہشت سال از ہجرت نبوی است علیہ السلام بدین گونہ در سلک نظم کشید ؎

للہ الحمد کہ این نظم لطافت آگین — یافت اتمام در ایام سعادت آمود
سال تاریخ چو جستم ز نہان خانۂ دل — ناگہاں پیر خرد نظم نو آئیں فرمود

رسالۂ ہذا کا بیان میں فہرست ببلیوتک نیشنل۔ جلد دوم صـ ۱۸۶ ، ۹۵۹ سے نقل کر رہا ہوں۔ میرا یہ خیال ہے کہ یہ ایک ہندوستانی تالیف ہے۔ کاتب

شیخ محی الدین ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۵ء

(۲۳) نصاب میراب

شروع کتاب :-

میرآب وہم کدیور نخل بند و باغبان   آنکہ باشد آبیاری خیابان راضمان

یہ رسالہ مترادف وہم معنی الفاظ پر حاوی ہے۔ کل اسّی اشعار ہیں۔

خاتمہ :-

نیمی وقسمی و آئینی کہ مقدورت بود   جد و جہدی کن کہ این اشغال از بر می شود

(۲۴) نصاب کمال الدین مسمی بہ نصاب

آغاز کتاب :-

از پس حمد و سپاس ذوالجلال   کو بود موصوف از اوصاف کمال

حمد و نعت و منقبت صحابۂ کرام کے بعد گویا ہے کہ میں نے بعض دوستوں کی خاطر جو لغات و نظم سے الفت رکھتے ہیں جن میں باز الدین (کذا) قابل ذکر ہیں یہ رسالہ تالیف کیا ہے۔ رسالہ کا نام نصاب اور اشعار کی تعداد تین سو ہے۔ حضرت سید محمد شاہ میر مصنف کے مرشد روشن ضمیر ہیں۔

خاتمہ :-

بس کمال الدین مگو زین بیشتر   دلپذیر آمد کلام مختصر

رسالۂ ہذا ۱۱۷۴ھ میں ختم ہوتا ہے۔

(۲۵) **نصاب از ایاز الدین** - صرف فارسی مرادفات کا نصاب ہے۔ پہلا شعر:-

زند و واراب   دادور داور   خود کرد کرخندیو او کرکر

خاتمہ :-

مایۂ کودکان ایازالدین ہست نامش بخواں زبرازبر
یک صدو یکہزار و [نود و]نہ بودکین نامہ شد بساز و لبسر

چھتیس صفحات۔ تیرہ سطر فی صفحہ

(۲۶) نصاب مقلوب از انشا

افتتاحیہ :-

بعد حمد ایزد دانای راز انس و جان ساختم این نظم مقلوب از نامل بکران

اس نصاب میں جیسا کہ انشا کی چلبلی طبیعت سے امید ہو سکتی ہے لفظ اوّل و ثانی ایک دوسرے کے مقلوب ہیں۔ جیسے رب۔ بر۔ ملح اور حلم وغیرہ۔ نو سطریں فی صفحہ۔ کل آٹھ صفحات کا رسالہ ہے۔

خاتمہ :-

کرد انشا این نصاب مقلوب با الفاظ در مرلعت؟ اندر رعونت؟ چوں لآلی عماں
ہر کہ آرد در نظر از انس و جان این نظم او یاد دارد از دعائے خیر او را در جہاں

(۲۷) مفتاح الافواہ از حافظ احسن اللہ لاہوری۔ سال تالیف لفظ 'منظور' سے جو ۱۱۹۶ھ کے برابر ہے برآمد ہوتا ہے۔ نصابی تالیفات میں یہ کتاب شاید سب سے ضخیم ہے۔ صفحوں کی تعداد (۹۰۳) اور فی صفحہ ۱۹ سطور ہیں۔ اس حساب سے اشعار کی تعداد سترہ ہزار کے قریب ہوگی

ابتدائیہ :-

صاحب است آقا خداوند اے جواں ہمچو آغا ھسم برادر دان کلاں

ابتدا آغاز و انجام انتہا   ہردو ایں با کسر الف و کسر تا

ایک دلچسپ امر اس تالیف کے متعلق یہ ہے کہ نسخۂ زیر نظر خود مصنف کا دستی ہے اور ۱۲۲۶ھ میں نقل ہوا ہے۔ اس سے قبل جناب مصنف اس کتاب کے چار اور نسخے اپنے ہاتھ سے نقل کر چکے ہیں اور یہ پانچویں نقل ہے جو میاں نظام الدین ابن خواجہ نورالدین گنائی کے واسطے طیار ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نسخہ پر میاں نظام الدین کی مہر بھی موجود ہے۔ یہ اطلاع میں نے جس نسخہ سے لی ہے وہ میرے محترم جناب خواجہ سلیم صاحب ایم۔ اے کی ملک ہے۔ مفتاح الافواہ کے علاوہ حافظ احسن اللہ نے ایک اردو نصاب بھی موسوم بہ ذوق الصبیان لکھا ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں آچکا ہے

اس تالیف کے مآخذ حسب ذیل ہیں :-

(۱) نصاب الصبیان و شرح آں (۲) شش نصاب دیگر معہ حواشی آں

(۳) شرح گلستاں (۴) فرہنگ مثنوی معنوی

(۵) عجوبہ لغات، کہ کتابے بغایت عجیب و غریب در ملتان بنظر آمدہ

(۶) خالق باری (۷) رازق باری

کتاب بترتیب ابتثی ہے جس میں حرف اول کو بنا قرار دیا گیا ہے اور حرف آخر بترتیب ابتثی باب مانا گیا ہے۔ مثلاً بنای الف و باب الالف میں ایسے الفاظ مذکور ہیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں اور الف پر ختم ہوتے ہیں مثلاً ابتدا، انتہا وغیرہ۔ بنای الف و باب البا میں ایسے الفاظ ہیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں اور بے پر ختم ہوتے ہیں مثلاً اصطرلاب، انتساب۔ اجتناب و اعصاب

وغیرہ۔ درمیانی حروف کے لئے کوئی التزام نہیں ہے۔ باقی بنا و ابواب کا اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ تمام ابواب کی سرخیاں مصرعوں میں دی گئی ہیں مثلاً ع باب الف اندر بنای الف خوان یا مصرع دربنای الف باب البا بخوان

تشریحی زبان فارسی ہے اور تمام توجہ عربی الفاظ پر دی گئی ہے اور اعراب بالالتزام بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد فارسی الفاظ دئے گئے ہیں اور اردو الفاظ تو بہت کمی کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں اور پنجابی خال خال موقعوں پر ضرورتاً آئے ہیں۔ سال تصنیف اس طرح بیان ہوا ہے :۔

رباعی در تاریخ سال این قیل وقال کہ در سنہ یکہزار و یک صد و نود و شش منظوم و مرقوم شدہ ؎

کردم سخنے بختام کاری مذکور ماند مگر این بیادگاری مشہور
این گفتۂ من اگر تو منظور کنی تاریخ بگیر ہم ز لفظ "منظور"

ابتدا میں پانچ صفحوں کا نثر میں دیباچہ ہے۔ باقی حصہ نظم میں ہے۔ یہ کتاب ایک دلپسند اور شگفتہ طرز میں لکھی گئی ہے۔

فہرست اردو نصاب

اس فہرست کی سرتاج خالق باری ہے۔ اہل ذوق نے اس عقیدہ کے ماتحت کہ وہ امیر خسرو کی تالیف ہے طرح طرح سے اس کی تزئین و تہذیب کی ہے۔ کسی نے اس کے اشعار میں اوزان کے لحاظ سے بے ترتیبی دیکھ کر ہموزن اشعار کو ایک عنوان اور ترتیب کے تحت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے اس کے متفرق قطعات کو علیحدہ منظوم عنوانوں سے سجایا ہے۔ کسی نے اس کی قدیم زبان میں اصلاح دے کر مروجہ زبان میں تبدیل کر دیا ہے۔ بعض نے اس کی قبولیت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر اپنی تالیف کا نام خالق باری رکھ دیا ہے۔ میں سب سے پیشتر خالق باری اور اس کے خوشہ چینوں کا ذکر کرتا ہوں۔

(۲۸) **مطبوع الصبیان** ۔ گویا یہ خالق باری کی قدیم اور مکمل اشاعت ہے جس میں چھپن فصلیں اور دو سو پینتیس ابیات ہیں۔ مروجہ خالق باری اس کا ایک اختصار ہے۔ میں اس کی بعض خصوصیات کا گذشتہ اوراق میں ذکر کر چکا ہوں۔

(۲۹) **مطبوع صبیان از صفی** ۔ دراصل یہ خالق باری ہے جس کے اشعار کو بہ تطابق اوزان عروضی مرتب کیا گیا ہے یعنے ہموزن ابیات کو علیحدہ علیحدہ جمع کر دیا گیا ہے اور جدت یہ کی ہے کہ بہ تقلید نصاب الصبیان بحر و وزن شعروں میں بیان کر دئے ہیں۔ صفی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری

کے دراصل ایک سو ستر اشعار تھے صفی نے ان میں ایک سو بیس اپنی طرف سے اسی مضمون پر اور اضافہ کئے۔ حمد و نعت و دیگر تمہیدی اشعار ملا کر کل میزان تین سو چھپن شعر ہوگئی۔

ابتدا :-

بحمد اللہ کہ از فضل و عنایت ہدایت را رساند او نہایت

حمد و نعت کے بعد صفی کہتے ہیں :-

ز تلمیذاں یکے احباب مسرور کہ گوبند رام بود از نام مشہور
برغبت گفت تا تنظیم و تردیف امیر خسرو دہلی بہ تصنیف
بگفتا نام خالق باری او را و لے ابیات او افتاد بیجا
گر از فن عروضی و قوافی شناور آشنای بحر صافی
بہر بحری کہ باشد کن تو یک جا کہ ابیات پراگندہ است بیجا
برای خاطر آن دوستداری قبول از چشم و سر کردیم کاری
بصد محنت چو بنمودیم تالیف بسعے تام این ابیات تصنیف
لغات چندرا در نظم کردیم بہ تنہی ملحقات آن را ثمر دیم
شمار یکصد و ہفتاد ابیات ز تصنیف بود ابیات اثبات (کذا)
ہمہ ابیات الحاقی بہ تزئین بہ تعداد آمد ند یک صد و عشرین
کنی گر ضم از ان افراد دیگر چنانچہ از قطعۂ عنوان اکثر
چو بیت کہنہ و نو را کنی گنج شو و سیصد و گر پنجاہ و ہم پنج
صفی را گرچہ این رغبت نبودہ برائی خاطر یاران نمودہ

زخوانندہ مرا اینست امید　　دعای عافیت بکنند جاوید

چو ہر کودکان کروند تبیان　　مسمّیٰ یافتہ مطبوع صبیان

اصل کتاب کا آغاز تمہیدی اشعار کے ساتھ یوں ہوتا ہے :-

اول حمد خدا کا یار　　جس بن ہے دو جگ اظہار

فعلن فعلن فعلن فاع　　ہے متدارک کا بستار

خالق باری سرجن ہار　　واحد ایک بدا ن کرتار

یہ تالیف بارھویں صدی کے اواخر کی معلوم ہوتی ہے۔ صفی کے سامنے جو خالق باری ہے وہ وہی ہے جو بارھویں صدی میں رائج تھی اور مروجہ و مطبوعہ خالق باری سے ایک حد تک اختلافی عنصر کی مالک ہے۔

(۳۰) ترمیم شدہ خالق باری مع شرح از منشی محمد بلاقی مدرس مدرسہ بلیرہ رامپور ضلع مظفر نگر۔ مصنف نے خالق باری میں بعض ترمیمیں داخل کر کے مروجہ زبان کے معیار پر لانے کی کوشش کی ہے۔ بعض الفاظ کی حاشیہ میں مع مثالوں کے تشریح کی ہے۔ مثالیں بھاشہ کے ابیات اور دوہروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابتدا میں ایک صفحہ کا دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ میں چھپ چکی ہے۔

(۳۱) خالق باری اکرم از محمد اکرم۔ ۱۲۰۵ھ میں تصنیف ہوئی اور ۱۲۶۳ھ میں مطبع مصطفائی نے چھاپی۔

آغاز :-

بول اے طوطی شکر گفتار　　کھول بحر خفیف میں منقار

فاعلاتن مفاعلن فعلات   پہلے کر حمد میں دو چار لغات
خالق و باری است نام خدا   پاک و پیدا کنندۂ دوسرا

صفحات ۵۹ سطور ۱۹

خاتمہ :-

اگر خواہی کہ باشی واقف احوال تاریخش   زخالق باری اکرم بر آور سال تاریخش
بر آید یکہزار و دو صد و پنج از سن ہجری   نمودم ہو بہو تفصیل از اجمال تاریخش

(۳۲) خالق باری از سید غلام علی شاہ امروہوی المتخلص بہ ولی

ابتدا :-

پیدا کنندہ خالق و باری است پاک ذات   روزی دہندہ باشد رزاق کائنات

کتاب میں عربی و فارسی الفاظ پر پوری توجہ ہے۔ ہندی الفاظ کم دئے ہیں مثلاً ؎

گگڑی خیار باشد و لکڑی چو ہیزم است   مکڑی است عنکبوت و عقرب چو کژدم است

تجنیس کا اکثر لحاظ رکھا گیا ہے چنانچہ خاتمہ میں کہا ہے ؎

ہر لفظ را رعایت تجنیس مشکل است   بر نقص من نگہ نکند ہر کہ کامل است

اس کے بعد کہا ہے ؎

ابیات چند منکہ غلام علی ولی   تالیف تازہ ساخت بنام علی ولی
اصلاح خواہم از ہمہ مردان مصلحین   ترسم اگر ز شر شیاطین عیب چین
بس طول عرض غرض دلیل ملالت است   یک اختصار بہ ز ہزاراں طوالت است

پینتیس صفحات ۔ ۱۳ سطور ۔ مطبع   میں چھپ چکی ہے ۔

(۳۳) **اللہ خدائی از تجلی** ۔ شروع میں تین صفحوں کا ایک منظوم دیباچہ ہے جس میں کہا ہے کہ ہندی و فارسی الفاظ کی شناخت کے لئے بپاس خاطر گھنور پسر شیر شاہ قانون گوی میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ مصنف طبقۂ صوفیہ کا دلدادہ ہے ۔ وہ خواجہ نقشبند سے امداد کا خواستگار ہے ۔ بعد میں شیخ نظام الدین اولیا اور امیر خسرو سے روحانی توجہ کا طالب ہے ۔ اصل کتاب اس شعر سے شروع ہوتی ہے[۵]

ہے صمد پاک اور احد یکہ   جان ام القریٰ کو تو مکہ

کتاب ایک شگفتہ اور خوش آیند رنگ میں لکھی گئی ہے ۔ اس کی ہندی زبان زیادہ تر گوالیاری یا برج سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہ کتاب ہندوستان میں رائج رہی ہے اور کئی مرتبہ چھپ چکی ہے ۔ مطبوعہ نسخوں میں تاریخ تالیف سنہ ۱۰۶۶ھ ہے ۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ایک قلمی نسخہ کی رو سے سنہ ۱۰۶۰ھ لکھتے ہیں۔

۱۶ **صفحات** ۔

ابتدا :۔

سر این نامہ را باسم بدا   کنم اول بنام پاک خدا

(۳۴) **فرح صبیان از شیخ اسحق لاہوری** ۔ یہ وہی شیخ اسحق ہیں جو فارسی نصاب نسب صبیان تالیف سنہ ۱۰۵۷ھ کے مصنف ہیں ۔ فرح صبیان بھی اسی عہد کی تصنیف مانی جاسکتی ہے اور قدامت کے اعتبار سے خالق باری کے بعد آتی ہے ۔

ابتدا :۔

بعد از سپاس و منت بسیار کردگار   صلوٰۃ بر محمد بےحد و بے شمار

اسحٰق بندہ گوید از فضل و لطف سبحان　　این نکتہائی شیرین نامید فرح صبیان

صفحات ۱۵ سطور ۱۲ ــــ زیر نظر نسخہ ۲ سنہ جلوس احمد شاہ کا کتابت شدہ ہے جو ۱۱۶۲ھ کے مطابق ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پنجاب میں یہ تالیف کم از کم گیارھویں اور بارھویں صدی میں تو مقبول رہی ہے۔

(۳۵) **فرح صبیان** - یہ بھی شیخ اسحٰق مذکور الصدر کی یادگار ہے اور رسالۂ بالا سے اگرچہ بحر و وزن وہی ہے مختلف ہے۔ اس کی زبان بھی اردو ہے اگرچہ پنجابی کا بھی اثر موجود ہے۔

افتتاحیہ شعر :-

حمد و ثنا خدا را کو آفرید جان　　کرد اختران معلّق بر سقف آسمان

کتاب کا نام اس شعر میں آتا ہے ؎

مسکین ضعیف بندۂ اسحاق این نکات　　نامید فرح صبیان نادر عجب لغات

رسالہ کے کل سات صفحے ہیں سطور ۱۲ ــــ

خاتمہ :-

ابیات فرح صبیان باذوق ہر کہ خواند　　عجب العجب غرائب نادر لغات داند

(۳۶) **نصاب سہ زبان المعروف بہ صمد باری یا جان پہچان از میر عبدالواسع ہانسوی**

ابتدا :-

صمد پاک نرنجن جان　　نبی پیمبر سیٹھ پچھان

الفاظ متناسب کو جدا جدا عنوانوں کے تحت میں جمع کر دیا ہے مثلاً الفاظ قرابت اعضای جسم انسانی۔ غلہ۔ سبزیاں۔ میوے۔ ادویات وغیرہ۔ آخر میں مصادر

مشہورہ وغیر مشہورہ درج ہیں۔ کتاب کی طرز شگفتہ ہونے کے علاوہ استادانہ اور ماہرانہ ہے۔ تمام کتاب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر مصرع میں عربی۔ فارسی اور ہندی لفظ پابندی کے ساتھ بالترتیب لائے گئے ہیں۔

خاتمہ:-

عبدالواسع سے یہ کتاب   تین زبانوں کا ہے نصاب

مصنف کی زبان ہریانی ہے جو بعض خصائص میں اردو سے مختلف ہے۔ صمد باری جیسا کہ قبل ازیں عرض کر چکا ہوں ہندوستان بالخصوص پنجاب میں بیحد مقبول رہی ہے اور بار بار طبع ہوئی ہے۔

(۴۷) فتح الفہم۔ اس رسالہ میں عربی و فارسی و اردو الفاظ بیان ہوئے ہیں۔ اردو الفاظ قلت سے لائے گئے ہیں۔ کتاب قصیدہ کی طرز میں ہے اور بحر رمل مثمن محذوف و مقصور میں لکھی گئی ہے۔ مصنف جس کے نام سے ہم تاریکی میں ہیں لکھتا ہے کہ یہ مختصر کتاب جو ہر قسم کے الفاظ پر حاوی ہے میں نے بچوں کی سمجھ تیز کرنے کے لئے تالیف کی ہے اس میں فارسی الفاظ زیادہ اور اردو الفاظ کم ہیں۔

آغاز:-

بعد از حمد و ثنائی پادشاہ بے نشان   الذی اوجد عدیماً فی الدہر از انس و جان

خاتمہ:-

این کتابے یادگیر از من بخوان کش نام آن   ہست فتح الفہم بہر فتح فہم طفلکان

زابتدا و انتہا انشائی من تقریر شد   ہائے را بیرون کن (ہ) تاریخ نام کش از ان (کذا)

یہ تالیف بھی پنجاب کی پیداوار معلوم ہوتی ہے

(۳۸) نصاب از مصطفیٰ۔

ابتدا:-

رؤف و رحیم و کریم و غفور   دیاونت داتا اجالا ست نور
خدیو و خداوند داور دھنی   غنی است دھنونت صانع گنی

عربی فارسی اور اردو کا نصاب ہے۔ اشعار کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے اردو نصابوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔

خاتمہ:-

شش و بیست و یکصد و یک ہزار   ز ہجر نبی بود اے کامگار
جہاں شاہ فرخ سیر شاہ بود   دوشنبہ دہم از صفر ماہ بود
کہ آورد این مختصر روبکار   مگر ماند از مصطفیٰ یادگار

(۳۹) فارسی نامۂ کلاں۔

آغاز:-

پالن ہار خدا رب مالک   رسول پیمبر پیک ہے سالک

آٹھ ورق فی صفحہ بیس سطور۔ سنہ ۱۳۳۰ھ میں مطبع قیومی میں چھپ گیا ہے۔

(۴۰) اسمای فارسی از نوندھ رای مولف دستور الصبیان

ابتدا:-

پہلے جانو نام خدائی   رام بہندوی دیوں بتائی

اس کے الفاظ اردو کے مقابلہ میں بھاشہ سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ مؤلف

نے اس رسالہ کا ذکر اپنی مشہور تصنیف دستورالصبیان کے دیباچہ میں کیا ہے۔
طبع ہو چکا ہے

خاتمہ :-

ویسا چناں جنیں ہے ایسا   چہ ہے کیا چنانچہ جیسا

(۱۴) قرآن مصحف۔ شروع کا بیت :-

قرآن مصحف رحمان خدای   نبی پیغمبر لسر بان فدای

سراب دہوکا بہتان دھانہ   نوحہ ماتم روئیں کانسہ

خاتمہ :-

شریف بزرگ مسا سے شام   فجر صبح آخر تمام

کل ایک سو پچاس شعر ہیں

(۲۴) گنج فارسی از مہلہہ

ابتدا :-

واحد نام خدا کا جان   جن نے دی ہم سکو جان

خاتمہ :-

مہلہہ نے کہی کتاب   گنج فارسی کیا خطاب

بلومہارٹ نے فہرست مخطوطات ہندوستانی میں اس کا نام گنج نامہ دیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی تقلید میں جناب نصیر الدین ہاشمی نے یورپ میں دکنی مخطوطات' میں بھی یہی نام اختیار کیا ہے۔ لیکن مصنف نے جیسا کہ خاتمہ کے شعر سے ظاہر ہے گنج فارسی نام رکھا ہے۔

(۴۳) رازق باری از والہ

افتتاحیہ :-

رازق باری حق ہے جان   اس کا نور نبی پہچان
آل اولاد اور یار اصحاب   قرآن بھیجی حق نے کتاب

خاتمہ :-

والہ اننے موتی رولا   فرس لغت کے معنے بولا
جس نے پایا ذہن صافی   رازق باری اس کو کافی

(۴۴) ایزد باری - شروع کتاب کے ابیات :-

ایزد باری ہست خدای   خالق قدرت بے پروای
دوست حبیب رسول محمدؐ   اللہ کے مقبول محمدؐ
آل و اصحاب سمیت درود   ہوان پر از حد افزود
نسخہ نادر غور کرو   ایزد باری نام دھرو
لڑکوں کو ہوتی ارشاد   لفظ لفظ رہے ان کو یاد
اس میں ہیگی تین زبان   تازی ہندی فرس پچھان

یہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔

(۴۵) لغات السعید از محمد حصار۔

ابتدائیہ شعر :-

رب پروردگار پالن بار   صانع وکردگار دان کرتار

اردو فارسی اور عربی لغات بزبان فارسی بیان ہوئے ہیں - چونکہ زبان فارسی

ہے اس لئے چنداں جدید نہیں مانی جاسکتی۔ چودہ صفحات کا رسالہ ہے۔

خاتمہ :-

شد لغات السعید این بنام از محمد حصار گشت تمام

یہ کتاب ایک حد تک مقبول رہی ہے اور کئی مرتبہ چھپی ہے۔

(۴۶) نصاب حسن عرف شمع انجمن از منشی حسن علی ولد محمد اسمٰعیل خاں متوطن بیدر

ان کا تخلص حسن ہے کتاب ہذا مھورہ میں منور حسین اور رحمان علی کے لئے ۱۲۵۴ھ میں بعہد ناصر الدولہ نظام دکن تالیف ہوئی ہے مصنف کے سرپرست سید جلال الدین ہیں۔ میں ضروری اشعار مختلف مقامات سے لے کر یہاں درج کر دیتا ہوں :-

مرا جم تخلص حسن نام دان کہ ابن محمد اسمٰعیل خان (کذا)

وطن گاہ من بلدۂ بیدر است چہ شہری کہ از شہرہا برتر است

چو بگذشت بعد از رسول کبار سن الف مائتین و پنجاہ و چار

بدور شہ ہند و دکھن پناہ سکندر سپہ ناصر الدولہ شاہ

مرتب شد این طرۂ انجمن مسمیٰ باسم نصاب حسن

درین دور اگر دیدۂ حق بین است قدر دان سید جلال الدین است

مرا او خداوند نعمت بود ریاض مرا ابر رحمت بود

لغت چیدہ تالیف کردم شتاب کہ در مھورہ نسخہ شد لاجواب

خصوصاً پی خواندن نور عین نکو بخت یعنی منور حسین

ہم از بہر درس عزیز دلی سعادت نشان یعنی رحمان علی

کتب ذیل اس تصنیف کی ماخذ ہیں :-

لغتہای بسیار در ہر زبان   درین مختصر می نمایم بیان
دری فارسی پہلوی نام نام   ز تازی و ترکی و ہندی تمام
زکشف اللغات و زحل اللغات   ز شرح نصاب و دگر نسخہ جات
ز شرح شرف نامہ و مثنوی   ظہیری نظیری و ہم خسروی
ز شرح گلستان و فرہنگ او   لغتہا نوشتم ز بس جستجو
رشیدی و خاقانی و انوری   موید زفان و دگر سروری
مدار الافاضل و کنز اللغات   لطایف و جامع و تاج و ادات
شب و روز پیش نظر داشتم   جواہر ازان گنج بر داشتم
ز شرح و لغتہا و فرہنگہا   گہرہا جدا کردم از سنگہا
جواہر ز ہر معدن انگیختم   ہمہ را بیک سلک آمیختم

افتتاحیہ شعر :-

بنام خداوند ام الکتاب   حسن کرد انشا کتاب نصاب

اس کتاب میں پانسوتیس اشعار اور بیالیس چھوٹے بڑے مختلف الوزن قطعات ہیں ؎

چونکہ شد از فضل الٰہی ختم کتاب حسن (کذا) یک یک بیتش چوں بشمردم پانصدوسی آمد بشمار

خاتمہ :-

خدایا بحق رسالتمآب   دعای حسن را کنی مستجاب

بعض قطعات میں تناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ جمع کر دیا ہے اور ہر قطعہ کی ابتدا

میں اس کا وزن عروضی سمجھا دیا گیا ہے۔ ایک حد تک الفاظ مترادف کی بھی رعایت کی گئی ہے۔

(۴۷) قادر باری از فیاض عسکری۔ سال تالیف ۱۲۱۰ھ۔ عربی، فارسی و اردو الفاظ ہیں تشریحی زبان بھی اردو ہے۔

آغاز:-

قادر باری اسم صفات — اللہ خدا ہے نام ذات

تعداد اشعار دو سو۔ صفحات ۱۹۔ سطور ۱۱

خاتمہ:-

سب پہ میری طرف سے ہووے سلام — ان کا فیاض عسکری ہے غلام
دو سو بیتوں پہ میں کیا ہوں بس — سن تھا ایک ہزار دو سو دس

طبع ہو چکی ہے۔

(۴۸) نصاب: کتاب و مصنف کا نام معلوم نہیں۔ نسخہ زیر نظر ناقص الطرفین ہے۔ رسالہ کا موضوع لغات ادویہ ہیں عام لغات ضمناً آ گئے ہیں۔ الفاظ ابتثی ترتیب میں ہیں۔ ہر حرف کا علٰحدہ باب ہے مثلاً باب الف۔ باب البار باب التا روغیرہ۔ باب الالف کے ابتدائی ابیات یہ ہیں:-

اساس است چھرا لمح او تلا — کہ انزال بند انگترہ ہینگ را
اساوراں انیسون تکر سونف دان — تو اسرنج شنگرف زاول بدان
ارض دھرتی وانگبیں شہد آکھ — بود ارزن چینہ انگور داکھ
اثر کھوج آسیب د ہکہ بود — کہ ابیض سفید اقرع گنجہ بود

(۴۹) اللہ باری یا ذوق الصبیان از حافظ احسن اللہ احسن کاتب معلم و مہرکن

ابتدا :-

بسم اللہ رحمن رحیما حمد و صلوٰۃ و سلام سلیما

(۵۰) فیض جاری از مولوی حافظ میر شمس الدین محمد مرحوم

ابتدا :-

ہے جو اللہ جان اس کو خدا ہے معک تیرے ساتھ الگ ہے جدا

شعر کے قوافی میں تجنیس کی رعایت کا التزام کیا گیا ہے۔ عربی فارسی اور اردو الفاظ ہیں۔ صفحات ۴۴۔ سطریں ۱۶۔ طبع نولکشور ۱۸۸۲ء

(۵۱) قادر نامۂ غالب

شروع کا بیت :-

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

صفحات ۹۔ سطور ۱۶ ــــ گذشتہ صدی میں بیحد مقبول عام تھا

(۵۲) نصاب مختصر از مولوی قدرت احمد عاصی تخلص۔

لفظ مختصر سے بہ تخرجہ 'سہل' سال تالیف نکلتا ہے۔ عربی و فارسی و اردو کا نصاب ہے۔ مگر اردو الفاظ بہت کم دئے ہیں۔

ابتدا :-

ہست اللہ ایزد و گر گر باز ہم تنگری بکن از بر

طبع مطبع حسنی میر حسن رضوی ۱۲۵۹ھ

(۵۳) نادر الترتیب مع فرہنگ ۱۸۹۵ء از عزیز الدین احمد جلیسری

نظر تخلص ۔ صفحات ۴۴ ۔ سطور ۱۵ ۔ نظر صاحب نے بڑا مشکل کام سرانجام دیا ہے ۔ اس نصاب میں چھ ہزار لغت اور تین سو مصدر بیان کئے ہیں ۔ آخر میں ایک فرہنگ ہے ۔ دو دیباچے نظم و نثر میں ۔ چھ سو بارہ شعر ۔ دو باب اور تیرہ فصلیں ہیں ۔ آخر میں فارسی کے موٹے موٹے قاعدے بیان ہوئے ہیں ۔ کتاب کئی مرتبہ چھپی ہے ۔

آغاز کا بیت :-

حی حق رحمان صمد رب نور احد اللہ خدا   اور پیغمبر نبی احمد محمد مصطفٰے

(۵۴) حمد باری از عبد السمیع رامپوری برای وحید الدین پسر حافظ عبد الکریم برادر الٰہی بخش ۔ یہ وہی عبد السمیع ہیں جنہوں نے انوار ساطعہ لکھی تھی اور اس کی تردید میں براہین قاطعہ وجود میں آئی ۔ ابتدا میں ایک نثری دیباچہ ہے جس میں کہا ہے چونکہ خالق باری پنجابی اور سنسکرت کے لفظوں سے بھری ہوئی ہے جن کے سمجھنے سے بچے قاصر ہیں اس لئے افادۂ عام کی غرض سے یہ کتاب مروجہ اردو میں لکھی گئی ۔

ابتدا :-

حمد باری لکھ کے اور نعت رسول   جو لکھے بیدل کرے دل سے قبول

صفحات ۴۲ ۔ سطور ۱۳ ۔ ۱۴ مع ذیلی حواشی ۔ مطبع مجیدی کانپور

(۵۵) مفید البحث از منشی جمعیت علی ۔ مصنف نے منثور دیباچہ میں کہا

ہے کہ بحث الابیات (یعنی بیت بازی) میں کوئی رسالۂ لغات ایسا نہ تھا جس کی مدد سے طلبا لغت جلد یاد کرسکیں۔ اس لئے بندہ نے یہ رسالہ بترتیب حروف تہجی کتب معتبرہ مثل غیاث اللغات و کشف اللغات وغیرہ سے منتخب کرکے تدوین کیا اور نام مفید البحث رکھا تاکہ یہ لغات طلبہ کے دل پر نقش ہوجائیں۔ اس رسالہ میں دوسودس ابیات اور ایکہزار ستر لغات ہیں۔

ابتدا :۔

اوّل پڑھ تو ای درسی اثیم — بسم اللہ الرحمن الرحیم
مدعا کر بعد اپنا برملا — ہے ترے جو پردۂ دل میں چھپا
اللہ و یزدان و ایزد ہے خدا — اور نبی مرسل ہے مرشد رہنما

تاریخ کتاب :۔

یہ ہے اس کی تاریخ ہجری سنو — کہ بارہ کے اندر رکھو تیس کو
عیاں ہووے اس سے تو کرلو حساب — یہ ہے مات کرنے میں اچھی کتاب

گویا سال تصنیف ۱۳۰۲ھ ہے۔ تعداد صفحات ۲۰۔ سطور ۱۲

(۵۶) تلنگی قیل وقال از افضال۔ اس میں اردو اور تلنگی زبان کے الفاظ ہیں۔

شروع کتاب :۔

رمز نئے سنو یار — ڈیوڑا ساحی حق جبار
بھگوان اللہ رام رحیم — مہادیو آدم ہری کریم

خاتمہ :-

حفظ رکھے جو یہ افضال آوے تلنگی فیل و قال

(۵۷) بالک باری از پنڈت بلرام کشمیری - دیباچہ میں لکھا ہے :-

بفضل ایزد بیچوں کہ ہست ایار انت بحکم راؤ بینی سنگھ و راجۂ بلونت
کہ ہر دو نیر سعدین برج مملکت اند ز نور عدل چو خور رونق جہان دارند
نمود بالک باری بطور ز نو تحریر بشہر الور بلرام پنڈت کشمیر
کہ وقت خواندن آسان بود بہ بتدیان لغات عربی و ہندی و فرس ہر سہ زبان
امید ہست کہ فضلا بجای سہو و خطا کنند کلک ہدایت روان ز روی عطا

اصل کتاب اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

خدای و خالق و اللہ و رب، بدان کرتار مجید اتم و پروردگار پالن ہار

خاتمہ :-

ہزار و چار صد و پنجہ گشت جمع لغات دو صد و شصت و چہار آمدہ ہمہ ابیات
ہزار و ہشت صد و ہشتاد از بکرماجیت متی ز کاتک سد تیرس است و روز ادیت
بوقت نیک بخوبی باختتام رسید کتاب بالک باری بحق رب مجید

(از کتبخانۂ پنجاب یونیورسٹی)

اس موقعہ پر مجھے دو گوجری نصابوں کا ذکر کرنا چاہیئے جن کے متعلق پروفیسر نجیب اشرف نے ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے 'ہندوستانی' میں بابت ماہ اپریل ۱۹۳۱ء اطلاع بہم پہونچائی ہے۔ ان میں پہلے رسالہ

کے ابتدائی شعر ہیں ؎

الله خدا کرتار — الخالق آفرینندہ سرجنہار

الرسول پیغمبر بسیٹھہ — الاصحاب یاران مسیٹھہ

الدنیا گیتی سنسار — الاحمق نادان گوار

الجنت بہشت سرگ — السقر دوزخ نرگ

الیوم روز دیس — الشعر موی کیس

اللیل شب رات — القول گفتار بات

دوسرا رسالہ بیجد اہم معلوم ہوتا ہے جو سات سو اشعار کا حامل ہے۔ اکہتر اوراق۔ فی صفحہ نو مصرع ہیں۔ جو نسخہ پروفیسر صاحب کے زیر نظر ہے ۱۱۵۱ھ کا کتابت شدہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس زمانہ سے قبل کی تالیف ہے۔ گوجری الفاظ کو اصل لغت قرار دیا گیا ہے اور ترتیب آخری حرف کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ ہر لفظ کی حاشیہ میں بزبان عربی تشریح کی گئی ہے۔ شارح نے بعض مقامات پر اپنا نام ابراہیم دیا ہے

ابتدا :-

الا الله پرستیدہ پوجیا — المعلوم دانستہ بوجھیا

المحمد ستودہ بکھانیا — المعروف شناختہ پچھانیا

خاتمہ :-

العطار د استاد گاندھی — الھبوط بادگرد آندھی

الرملہ مادیاں گھوری — الرداء چادر پچھوری

پنجابی زبان کے نصاب

(۵۸) واحد باری

ابتدا :-

واحد باری ایکو سائیں ایکو نام سخن نائیں

یہ رسالہ مختلف بحروں میں خالق باری کی طرز میں لکھا گیا ہے۔ فارسی و پنجابی الفاظ درج ہیں۔ ہر نئی بحر کے عنوان میں ایک ایک فارسی شعر ترکیب بند کے طور پر لایا گیا ہے جو دونوں بحروں میں حد فاصل ہے۔ ۲۶ صفحات۔ سطریں گیارہ۔

خاتمہ :-

واحد باری جگ جگ رہے پڑھے جو فارسی ماں سبھ رہے
سولھاسے اناسی سمت واحد باری کردم تمت

بعض نسخوں میں اناسی کی جگہ 'تراسی' ملتا ہے۔ سولہا سو اناسی بکرمی ۱۶۲۲ء اور ۱۰۳۲ھ کے مساوی ہے۔ ایک نسخہ میں تاریخ ہجری یوں دی ہے :-

واحد باری جان ہوئی طیار سنہ ہجری دا ایہ شمار
اک ہزار اکتالیہ سال ربدا ہویا فضل کمال

پنجابی زبان میں واحد باری کو وہی رتبہ حاصل ہے جو اردو میں خالق باری کو دیا گیا ہے۔ متعدد بار چھپ چکی ہے

(۵۹) رازق باری از اسمٰعیل ۔ حاجی خاں کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ سال تالیف ۱۱۷۱ھ لفظ "اغنک" سے برآمد ہوتا ہے۔ دیباچہ میں کہا ہے بندہ اسمعیل عرض کرتا ہے کہ گذشتہ شعرا نے بچوں کے نصاب بہت لکھے ہیں۔ میں نے بھی یہ چند اشعار لکھ دئے اور کتاب کا نام رازق باری رکھا ہے۔ چنانچہ :-

اول گویم حمد خدا | خالق رازق بے ہمتا
گوید بندہ اسمٰعیل | اندک رخت متاع قلیل
شاعر پیشین بسے کتاب | از پئے طفلاں کرد نصاب
بندہ احقر عدم لیاقت | بیتے چند درخور طاقت
از پئے طفلاں کرد نصاب | رازق باری نام کتاب
ہست زمانہ حاجی خان | صاحب عادل عالیشان
گر تو بخواہی سال تمامش | "اغنک" بشمر زابجد نامش
گوید اسمٰعیل فقیر | حرفے چند قلیل کثیر

اصل کتاب یوں شروع ہوتی ہے :-

رازق باری روزی دیندا | کس ناکس کوں کرم کریندا

اس کے بعد جدا جدا عنوانوں کے ذیل میں ایک ہی جنس و قسم کی اشیا کا ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً پارچات۔ مرغان ۔ اشیاء کانی ۔ اوقات۔ اقوام و پیشہ وران۔ اسپ دستور۔ آلات زراعت۔ فصلیں۔ درخت۔ میوے۔ اسباب خانہ اسمار اقارب ۔ ماہ و روز ۔ اسباب عمارت ۔ آلات نجاری ۔ زیورات۔ اسباب چرخہ

رنگریز۔نعلین دوز۔آوند خانگی۔سرود۔قلعہ۔خوشبوہا۔امراض واسباب کیف۔

عربی و فارسی و پنجابی الفاظ۔

واحد باری اور رازق باری پنجابی نصابوں میں بیحد مقبول رہی ہیں حضرت وارث شاہ نے اپنی مشہور تصنیف ہیر میں ان دونوں کا ذکر اشعار ذیل میں کیا ہے :۔

اک نظم دے درس ہر کرن پڑھدے نام حق نے خالق باریانی
گلستان بوستان نال بہار دانش طوطی نامہ تے رازق باریانی
منشیات نصاب تے ابوالفضلان شاہنامیون واحد باریانی
قران السعدین دیوان حافظ شیرین خسرواں لکھ سوانی

(۶۰) ہندوی فارسی معروف بہ ایزد باری از کھرمل پسر سائیندا س ساکن سنام

ابتدا :۔

ایزد باری سرجن ہار — بزرگ بدا کہون کرتار

مصنف کا نام اس شعر میں آتا ہے

عرض کنندہ کھرمل نام — پسر سائیندا س ساکن سنام

کتاب کی زبان اگرچہ پنجابی ہے لیکن کہیں کہیں اردو کا اثر بھی نمایاں ہے۔آٹھ آٹھ نونو شعروں کے بعد بحر بدل گئی ہے اور دونوں بحروں کے مابین امتیاز کے لئے فارسی شعر لایا گیا ہے

خاتمہ :۔

یاراں سے پنج سن رسول — گشت ختم نسخہ قبول
بندہ عاجز کھرمل نام — ہندوی فارسی کرد تمام

(۶۱) ناصر باری از مفتی شمس الدین

افتتاحیہ :-

ہست ناصر باری اے مرد جواں　　در زبان فارسی ہندوی کہاں

سبب تالیف میں مفتی صاحب کہتے ہیں ؎

شمس دین مفتی فقیر مستمند　　ساختہ تصنیف این اوراق چند

روز دوشنبہ بوقت نیمروز　　شد تمام این نسخہ بس دلفروز

سن ہجری را بداں بے قیل و قال　　یک ہزار و دو صد و ہم ہشت سال

(۶۲) صنعت باری از گنیش داس بدہیرہ قانون گوی گجرات

ابتدا :-

صنعت صانع ہمی گویم　　لغتہا فارسی ہمی جویم

صنعت باری اپرا پار　　دیئے رنگ برنگ بہار

ایشر اللہ ایزد خوان　　تنگری نامش ترکی دان

فلک آسمان دہرت زمیں　　گیتی عالم دیکھ بہ بیں

کل پینتیس صفحات فی صفحہ ۱۲ اسطور

خاتمہ :-

جگ وچ رہیا گنیشا نام　　صنعت باری بھئی تمام

صنعت باری لکھی نجاوے　　عقل فکر سبھہ غوطہ کھاوے

جو کوچھ آیا وچ قیاس　　سو لکھیا ربدی آس

جے پوری تاریخ پوچھائے　　'صنعت' کہتے دو بارہ پہائے

یعنی لفظ صنعت کی تکرار سے ۱۲۲۰ھ پیدا ہوتے ہیں۔

(۶۳) **واسع باری از یکدل** - ان کا نام غالباً نور احمد چشتی ہے جو تحقیقات چشتیہ و دیگر کتب مشہورہ کے مصنف ہیں۔ اس نصاب کی تالیف کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی اور فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

آغاز :-

واسع باری صاحب جان ۔۔۔ واحد ایک شناس پچھان

خاتمہ :-

ہویا ہے یکدل وچ لاہور ۔۔۔ جو اوہ نور سیں ہے پر نور
یکدل کی عمر اٹھاران برس ۔۔۔ ہویا ہے اب فارغ درس
سن ہے باراں سو اک تیس ۔۔۔ آگے احمد کے ہے سیس

(۶۴) **نصاب ضروری از خدا بخش**

شروع کے اشعار :-

حمد و ثنا خدا را وافر ۔۔۔ خالق رازق واہب غافر
زاں پس نعت رسول مکرم ۔۔۔ صلی اللہ علیہ وسلم
باد افضل خدا بر آلش ۔۔۔ بر اصحاب عمیم نوالش
گفت خدا بخش از پئے طفلاں ۔۔۔ مختصری بعبارت آساں
کرد نصاب ضروری نامش ۔۔۔ بتاریخ زماں تمامش

اصل کتاب اس شعر سے شروع ہوئی ہے

غافر باری بخشن والا ۔۔۔ او سدا کم ہے سر دریاں ٹالا

یہ رسالہ مختلف ابواب میں منقسم ہے جن میں الفاظ متناسب درج ہیں مثلاً باب در اجناس عالم - در حیوانات - لبنیات - اسباب چاہ - اسباب زراعت قسم ہای غلہ - بقولات - الاشجار - اقسام شیرینی - اطعمہ - اقربا - ازدواج اعضا و اجزا - ملبوسات - الطیور - الاحجار - معدنیات - سال و ماہ وغیرہ اسباب کوزہ گران - نجاران - بافندگان - گازران - حدادان - کفشگران - مزامیر - اسباب محتشمان - مشمومات - امراض او جاع - بساتین - در لغات شتی در فصول اربعہ -

یہ کتاب پنجابی نصابوں میں خاصہ اہم معلوم ہوتی ہے اور چھپ بھی چکی ہے میرے سامنے جو نسخہ ہے وہ لارنس پریس لاہور کا ہے مطبوعہ ۱۲۸۲ھ صفحات ۳۲ سطور ۲۱

(۶۵) فارسی نامہ از عبدالرحمن ابن محمد قاسم قصوری

مصنف کا بیان ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنے فرزند میاں محمد کے لئے لکھی ہے چنانچہ سہ

اس تیچھے کہندا عبدالرحمن ابن محمد قاسم جان

ساکن ہے اوہ وچ قصور رب رکھے دایم وچ سرور

واسطے خاطر برخوردار کیتی ایہ کتاب طیار

میاں محمد اس کاناں رب رکھے اوسنو وچ اماں

فارسی نامہ نام کتاب اسدے اندر نے دس باب

معلوم ہوتا ہے کہ اس نصاب کی دو اشاعتیں ہیں - پہلی یہی جس میں دس باب

ہیں۔ دوسری اشاعت میں جو چھپ بھی چکی ہے تیرہ باب بتفصیل ذیل ہیں

(۱) خویشان (۲) قوم مقامی (۳) غلہ (۴) درختان (۵) جانوران

(۶) اعضا (۷) طیور (۸) ارض (۹) حساب (۱۰) دوازدہ ماہ

(۱۱) روز (۱۲) وزن (۱۳) دارو

شروع کا شعر :-

اللہ واحد ایک خدا جس پیدا کیتا ارض وسما

خاتمہ :-

ایہہ سب ہویا اچھا کم فارسی نامہ ہویا تم (مطبوعہ)

لیکن ایک مخطوطہ میں یہ خاتمہ ہے ؎

بگو کلمہ طیب صحی صدق جان بہ دنیا رزق درقیامت امان

اس کے بعد یہ شعر آتا ہے ؎

تاریخ این بنائے چو پرسیدم ازخیال گفتا یکے ہزار و دو صد بیست پنج سال

اس شعر میں لفظ بنا سے گمان ہوتا ہے کہ یہ تاریخ تالیف کتاب نہیں ہے بلکہ کسی عمارت کی تاریخ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی نے خاتمہ میں یوں ہی اضافہ کردی ہو۔

(۶۶) **بادسہل** - فارسی اور پنجابی کا رسالہ ہے۔ نہ مصنف کا نام ہے نہ کوئی دیباچہ اور خاتمہ۔

ابتدا :-

بادسہل شناس پچھان خداوند پاون ہاراجان

خاتمہ :-

مبدا اساس درست ہے پورا   پڑھے ریا کمتر ہے تھوڑا

کاتب کا خاتمہ :-

"تمت تمام شد کتاب باد سہل - برای خواندن برخوردار کرمداد ولد چودھری الہ دین تحریر یافت بروز دوشنبہ بوقت چاشت روز ماہ ساون سنہ ہجری ۱۲۳۴ھ - سمت ۱۸۷۴ - صفحات ۱۵ سطریں چودہ

(۶۷) اللہ باری - ابتدا کا شعر :-

اللہ نام واحد ایک جان   نیاز بندگی ناز ہے گمان

اس نصاب کے مصنف اور عہد تصنیف کا مجکو کوئی علم نہیں - غالباً یہ وہی ہے جس کا ذکر ہیر وارث شاہ میں آتا ہے - میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں - پہلا ۱۲۴۶ھ میں نقل ہوا ہے - دوسرا سمت ۱۸۸۷ بکرمی میں

خاتمہ :-

اللہ باری ہوئی تمام   اللہ کرسی سب ہو کام

صفحات بیس سطور سات -

(۶۸) قادر باری از مظفر

ابتدا :-

قادر باری کرن ہار   جو کچھ کرے نہ لاوے بار

دیباچہ میں کہا ہے کہ میرا وطن اصلی 'پاندوکی' ہے - منچر میں پیدا ہوا اور اب اندر کوٹ میں مقیم ہوں جو فیض پور سے ایک کوس پر جانب جنوب واقع ہے:

آکھہ مظفر رب دا نام — تا ہووے سبھ تیرا کام
جدی اصل میرا ٹھانوُ — پانڈوکی ہے اوسدا ناوُ
منجھ وچ تولد میرا — جس وچ کیتا عیش گھنیرا
دانے پانی اوتھوں چایا — اندر کوٹ نویندی آیا
فیض پوروں ہے جاگہ اوہ — دکن پاسے اک کروہ
دل وچ آیا ایہ دھیان — قادر باری کراں بیان
دلوں بنائی جور تمام — برکت نبی علیہ السلام

اصل کتاب اس شعر سے شروع ہوتی ہے :-

عیش مسرت خوشی کو جان — چمن قسم مہتاب پچھان

تعداد اشعار دو سو پینتیس ۔

خاتمہ :-

تمت ہوئی قادر باری — مرشد کیتی مینوں یاری
روز ترجھے چھنچھر وار — ہوئی ماہ ویساکھ تیار
باراں سے ترئی شمار — سنہ ہجری دا ایجہ ہنجار
مظفر عاجز آکھہ سنائی — جیکو اس نوں پھیرے پڑائے
خاتمہ خیر لیاوے یاد — اس نوں رب رکھے دلشاد

(۶۹) رازق باری از مصطفےٰ ۔ شروع کا بیت :-

رازق باری دیون ہار — پاک منزہ پھر ہو کرتار

کتاب ہذا غالباً ۱۸۰۵ھ میں گدڑ وند علاء ایمن آباد میں لکھی گئی ہے

چنانچہ خاتمہ کے اشعار :-

ختم اوڑک مرتب سارا — گشتہ ہو یا حیلہ چارہ
مصنف شاعر مصطفےٰ نام — رازق باری کیتی تمام
ساکن وسدا قریہ پنڈ — دفتر کر تو گدڑ ونڈ
عملہ لگدا امن آباد — سال برس جیا رکھیں یاد
سنہ ہزار ہشتاد کوں اسی — پنج کوں پنج بود کوں سی

اس میں حسب ذیل ابواب ہیں :-

(۱) اسامی ہفتہ (۲) اعضای انسانی (۳) عزیزی وخویشی (۴) پیشہ دران
(۵) چرند پرند (۶) درختان (۷) اسباب خانگی (۸) افعال امریہ

اشعار دوسو

(۷۰) رحمت باری از مولوی رحمت اللہ ساکن کوٹ بھائی ضلع فیروزپور متوفی سنہ ۱۲۷۷ھ

ابتدا :-

حمد ثنا خدا سچے نوں کہاں درود رسول — ہور آل اصحاب جو تابعین اللہ دے مقبول

دیباچہ میں کہا ہے :-

معنے بہت عبارت تھوڑی یاد دں نفع پچھان — عربی فارسی لفظ ضروری سجھ پنجاب زبان
نام جو ایس کتاب دا رحمت باری جان — رحمت باری نال جو ہووے کتاب آسان

اصل کتاب یوں شروع ہوتی ہے :-

واحد احد یک ایک ہے خالق سرجنہار — رازق دانا رب جو پالے بخشنہار غفار

عام لغات و مصادر بیان ہوئے ہیں۔ آخر میں بعض صرف فارسی سے تعلق رکھنے والے قواعد لکھے ہیں۔ تعداد اشعار تین سو تینتیس صفحات ۲۹ سطور ۱۲

خاتمہ :-

پر تقصیر گناہی عبدی بندہ نانوں رحمت اللہ — مہر اللہ تصنیف جو جوڑی سود نفع خلق اللہ

سنہ ۱۲۳۲ھ تاریخ تالیف ہے :-

یک الف تے دو صدسی دو ہزار، دو سے بزی — ہجرۃ گذری نبی پیغمبر صلوٰۃ درود صحی

خاتمہ پر مولانا محمد عبد الرحمن نے مصنف کی بعض حکایات لکھی ہیں جو ان کو ایک کامیاب عامل اور سیانا ظاہر کرتی ہیں۔

(۱۷) اللہ باری از امید۔ سنہ ۱۱۹۶ھ کی تالیف ہے۔ زبان اگرچہ پنجابی ہے لیکن اردو اثر سے بھی خالی نہیں۔

ابتدا :

اللہ باری دیئی پچھان — نبی رسول بسیہہ بخوان

صفحات ۱۲

خاتمہ :-

کہے فقیر امید بچارا — فضل خدا کا اس پر نیارا

اللہ باری ہوئی تمام — دنیا اندر رہے مدام

گیارہ سے چھی نواں ماں — ہجرت سال پیغمبر واں

میرے پاس جو نسخہ ہے کاتب نے اس کی تاریخ کتابت یوں دی ہے:-

اللہ باری لکھی تمام — بیست ہفتم شعبان کرام

ہجری سنہ پیغمبر کہے　　باراں سے بائی اہے　(سنہ ۱۲۲۲ھ)

(۲۷) فارسی نامہ از شیخ محمد

ابتداء:-

اللہ واحد ایک پچھان　　جن پیدا کیتا سبھ جہان

سبب تالیف یں لکھا ہے ؎

ایسوں پچھے ایہہ فقیر　　شیخ محمد پر تقصیر

کردا عرض ایہ ضرور　　آگے یاراں علم و فور

فارسی نامہ کراں تیار　　واسطے پڑھنے خورد و کبار

کرے جو ادہ بھی اوسکوں یاد　　ہووے فہم اور عقل زیاد

خاتمہ:-

فارسی ہندی جوڑ شتاب　　شیخ محمد کی رہے کتاب

یہی شیخ محمد ایک دیوان اور ایک انشا کے مالک بھی معلوم ہوتے ہیں۔ انشا میں وہ اپنے آپ کو شیخ محمد ولد شیخ عصمت اللہ ابن شیخ عمر دراز انصاری بیان کرتے ہیں۔ بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ منتصف اوّل قرن سیزدہم ہے۔ دیوان میں کبھی تخلص شیخ محمد ہے اور کبھی شیخ احمد ہے اور ہر ردیف میں ایک ایک غزل درج ہے۔

فارسی نامہ کے صفحات ۱۸- اور فی صفحہ ۱۴ سطریں ہیں

وارث شاہ نے مذکورۂ بالا خالق باری۔ واحد باری و رازق باری کے علاوہ تین اور نصابوں کا ذکر ہیر و رانجھا میں کیا ہے یعنی (۱) اللہ باری بمصرع

بدرچاچ کریما تے چندنامہ آمدنامیاں تے اللہ باریانی

(۲) اعظم باری ۔ یہ تالیف میری نظر سے نہیں گذری۔ مصرع

زلیخا نال بلند آواز پڑھدے نلدمن تے اعظم باریانی

(۳) صادق باری ۔ یہ کتاب بھی میں نے نہیں دیکھی۔ مصرع

سکندرنامہ تے نال انوار سہیلی حاتم نامہ تے صادق باریانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سسلی میں مسلمانون کا تمدن

حضرات!

مسلمانون نے یورپ کے جن خطون پر ابتداءً قدم رکھا، اور جن کی فضا مین مدتون سطوت اسلامی کا پرچم لہراتا رہا اور تمدن اسلامی کے برکات نازل ہوتے رہے، وہ صقلیہ (سسلی) اور اندلس (اسپین) ہیں، شومئ قسمت کہ یہی دونون خطے آج مسلمانون کے وجود سے خالی ہیں،

ان مین سسلی پر سنہ ۳۲ھ/۶۵۲ع سے سنہ ۱۲۲ھ/۷۳۹ع تک مسلمانون کے تیرہ حملے ہوئے، جن کے نتیجہ مین وہ اسلامی حکومت افریقہ کا باجگذار بنا مگر مواعید پر قائم نہ رہ سکا، تا آنکہ مختلف سیاسی اسباب کی بنا پر جن کے بیان کا یہ موقع نہیں سنہ ۲۱۲ھ/۸۲۷ع مین مسلمانان افریقہ نے اس کو دارالاسلام بنانے کا فیصلہ کیا، اور اسی سال قاضی اسد بن فرات کی سرکردگی مین دس ہزار مسلمانون کا لشکر یہان حملہ آور ہو کر سکونت پذیر ہوگیا، اور سسلی کی یہ اسلامی حکومت جزیرۂ سسلی اور اس کے ارد گرد کے چند جزائر مالٹا وغیرہ اور اٹلی کے وسیع جنوبی حصص کلبریہ ولنگوبرڈا وغیرہ مین پھیلی، ان جزائر و مقامات مین مسلمانون کی خاصی آبادی قائم ہوگئی[1]، اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ کہ

[1] کتاب المالک والمسالک ابن حوقل ص ۱۳۶

کلیسائے روما کے پاپائے اعظم نے ادائے جزیہ کی شرط پر صلح کی ، عربون کی اصطلاح مین ان تمام حصص ملک کو مجازاً صقلیہ کہا گیا،[1]

صقلیہ مین اسلامی حکومت کے حسب ذیل مختلف دور گذرے ہیں ۔

(۱) دولت اغالبہ سنہ ۲۱۲ / ۸۲۷ - سنہ ۲۹۶ / ۹۰۸

(۲) دولت فاطمیہ سنہ ۲۹۶ / ۹۰۸ سنہ ۳۰۰ / ۹۱۲

(۳) طوائف الملوکی یا دولت ابن قرہب سنہ ۳۰۰ / ۹۱۲ - سنہ ۳۰۳ / ۹۱۵

(۴) دولت فاطمیہ سنہ ۳۰۴ / ۹۱۶ - سنہ ۳۳۶ / ۹۴۷

(۵) دولت کلبیہ سنہ ۳۳۶ / ۹۴۷ - سنہ ۴۳۱ / ۱۰۳۹

(۶) طوائف الملوکی سنہ ۴۳۱ / ۱۰۳۹ - سنہ ۴۴۴ / ۱۰۵۲

(۷) صقلیہ مین اسلامی سلطنت کا خاتمہ سنہ ۴۴۴ / ۱۰۵۱ - سنہ ۴۸۴ / ۱۰۹۱

اس کے بعد آخری آٹھوان دور صقلیہ کے مسلمانون کا عیسوی حکومتون کے ماتحت گذرا ، جو سنہ ۴۴۴ / ۱۰۵۱ سے سنہ ۶۰۰ / ۱۲۰۰ تک پر مشتمل ہے ، اور انہی دونون ہجری و عیسوی سنین کی صدیون کے خاتمہ پر صقلیہ و جزائر صقلیہ مسلمانون کے وجود سے خالی کرا لئے گئے ، اور اس طرح صقلیہ کے مسلمانون کی کم و بیش پانسو برس کی تاریخ ہے ، جس کی سیاسی سرگذشت سے یہان بحث نہین ، محض ان کا تمدنی مرقع چند عنوان مباحث ، عہد[1] اسلامی کا تمدنی جغرافیہ ، نظام[2] حکومت ، معیشت[3] اور علوم و آداب مین پیش ہے ،

---

[1] ۔ اس مجازی تعبیر کے لئے دیکھو ابن اثیر حوادث سنہ ۳۱۳ ، ابن عذاری حوادث سنہ ۳۱۳ ، تقویم البلدان ابو الفداء و معجم البلدان یاقوت ذکر جبل البرکان (= الکنو)

تمدّنی جغرافیہ

صقلیہ کے مسلمان

صقلیہ کے ابتدائی حملون مین جو مسلمان یہان آتے رہے، وہ عرب کے مختلف قبائل بنو کندہ، بنو فہر، بنو حنظلہ، اور قبائل اوس و خزرج کے افراد تھے، ان مین سے بیشتر افریقیہ مین قیام پذیر ہوئے، پھر ان کے تعلقات سسلی سے بھی مستقل قائم ہوئے، اور ۲۱۲ھ سے جو مسلمان یہان سکونت پذیر ہوئے وہ عرب[1]، بربر[2] اور موالی[3] تھے، اور آیندہ چل کر یہان کے قدیم باشندون کی ایک بڑی جماعت مسلمانون کی صنف مین داخل ہوگئی جو چوتھی[4] جماعت قرار پائی،

صقلیہ کے عرب قبائل مین بنو تمیم[1] جن مین اغالبہ تھے، اور بنو کلب جن مین کلبیین تھے، یہان کے حکمران خاندان تھے، ان کے علاوہ ذیل کے قبائل اور خانوادے یہان مستقل آباد تھے، جو اپنے انتسابون سے ظاہر ہوتے ہین، فہری، ربعی، بکری، ہمدانی، سہمی، معافری، کنانی، لخمی، قرشی، قیسی، طبری، حضرمی، طرزی اور عامری وغیرہ (ان انتسابات کی تشریح فرداً فرداً کتاب الانساب سمعانی مین موجود ہے، اور صقلیہ مین ان کے وجود کا پتہ صقلیہ کے مختلف اہل علم کی نسبتون سے چلتا ہے) صقلیہ کے بربر قبائل مین بنو کتامہ، اور بنو طبری زیادہ نمایان تھے. لیکن ۴۰۵ھ ۱۰۱۴ء مین بعض سیاسی حالات کے ماتحت صقلیہ سے جلا وطن کر دئے گئے[1]، جماعت موالی بھی یہان کچھ کم با رسوخ اور ممتاز نہ تھی[2]، خصوصاً

[1] نہایۃ الادب نویری در ببلوتھیکا اماری ص ۴۴۴ [2] ابن اثیر ج ۸ ص ۴۹۴، طبع بریل لیڈن ۱۸۶۶ء حوادث سنہ ۳۵۹

شاہی خاندان کے موالی نے جماعت بندی سے تفوق حاصل کرلیا، اسی لئے ایک سیاسی آویزش کے نتیجہ مین ۴۰۵ھ ۱۰۱۴ء مین ان کا استیصال کیا گیا[1]، اور صقلیہ کے نومسلمون کی بھی گروہ بندی ہوگئی تھی[2]،

لیکن صقلیہ کے مسلمانون کی مجموعی تعداد کا بتانا دشوار ہے، واقعات سے ایک اجمالی تخمینہ آپ بھی لگا سکتے ہین، مثلاً سنہ ۳۵۱ھ ۹۶۲ء مین ایک ہی دن سارے جزیرے کے غیر مختون مسلمان بچون کے ختنہ کی تقریب ایک شاہی جشن مسرت کے طور پر انجام پانے لگی، تو جزیرہ مین پندرہ ہزار بچے غیر مختون نکلے[3]، لیکن مجھے اشتباہ ہوتا ہے، کہ شاید یہ فہرست دار الحکومت بلرم کے بچون کی ہو، اسی طرح مسٹر سکاٹ سنہ ۳۲۸ھ ۹۳۸ء مین ایک مارز کی ترائی کی مجموعی آبادی چالیس لاکھ بتاتے ہین، جن مین نصف مسلمان تھے[4]،

صقلیہ کی آبادیان

صقلیہ کے شہر آگسٹس کے عہد تک بے رونق اور ویران ہو چکے تھے[5]، لیکن بیزنطی حکومت نے روم و عرب کی آویزش مین یہان کے جنگی قلعے نئے سرے سے آباد کر لئے[6]، پھر اسلامی حکومت نے مختلف شہرون کو پر رونق بنانے کے علاوہ ان قلعون کو بھی جو قدیم سسلی سے بکثرت چلے آرہے تھے، پُر امن آبادیون مین منتقل کیا، اس طرح صقلیہ کے عہد اسلامی مین تین قسم کی آبادیان ہوگئی تھین، شہر[1]، فوجی[2] قلعے، اور قلعے[3] اور شہر کی درمیانی آبادی، ان کی تعداد الگ الگ مختلف

---

[1] - نہایۃ الادب نویری در ببلوتھیکا، ص ۴۴۴ و ابن اثیر ج ۱۰ ص ۱۳۰ بریل [2] ابن اثیر ج ۱ ص ۱۲۰ بریل [3] ابو الفداء ج ۲ ص ۹۶ طبع حسینیہ مصر، [4] اخبار الاندلس ج ۲ ص ۶۴، [5] اسٹوری آف دی نیشنس ج ۳۰ (سسلی از فریمان) [6] - نزہۃ المشتاق و معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۳ طبع مصر،

مورخین نے مختلف بتائی ہے، جن سے عمومی طور پر اندازہ ہوتا ہے، کہ مجموعی آبادی ۳۵۰ کے قریب تھی، جن مین ۳۵ شہر لبِ ساحل تھے، اوران مین سے ۲۳ بڑے شہر کی حیثیت رکھتے تھے، دوتین اہم شہر اندرون ملک مین بھی تھے[۱]، ان کے نام بیان گنانے کی ضرورت نہیں، اور نہ تمدنی حیثیت پر روشنی ڈالنے کا وقت ہے، صرف ادریسی کے بیان کو استقصا سے دیکھ لیجئے، یہان کے اکثر شہرون کے ذکر مین پر رونق بازارون، عالیشان عمارتون، ہوٹلون، اور حمامون کا تذکرہ نظر آئیگا،

دار الحکومت بلرم

مسلمانون نے فنیقی عہد کے پایہ تخت پنرمس کو دار الحکومت قرار دیا، عربون کے یہان اس کے مختلف نام بنرم، بلرموا، بلرموہ، بلرمہ اور بلیرم وغیرہ ہین، لیکن بالعموم بلرم کہا جاتا ہے، اس عہد مین اس کو وہی شہرت حاصل تھی، جو اندلس مین غرناطہ کو تھی، ۲۱۶ھ / ۸۳۱ء مین مسلمان اس مین داخل ہوئے، اوراس کی فتح کے بعد کچھ دنون کے لئے فوجی مہمین ملتوی کردین[۲]، ملکی نظم ونسق اور شہر کی ترقی مین مصروف ہوئے مسلمانون کے داخلہ کے وقت اس مین تین ہزار باشندے رہ گئے تھے، اسلامی حکومت کے آغاز کے بعد کچھ ہی دن مین اس کی آبادی کئی لاکھ نفوس تک پہنچ گئی[۳]، شہر مین اضافہ کی ضرورت پیش آئی، مسلمانون نے قدیم شہر پناہ کے باہر کئی محلے آباد کرلئے، جو اپنی وسعت مین گویا مستقل شہر تھے، ابن حوقل یہان

۱؎ - نزہۃ المشتاق ادریسی طبع روما ۱۸۷۸ء ص ۲۱ معجم البلدان یاقوت ج ۵ ص ۳۰۲ طبع مصر،

۲؎ ابن اثیر ج ۶ ص ۲۳۸ بریل، ۳؎ اخبار الاندلس ج ۲ ص ۲۳،

۲۶۲ھ / ۹۷۲ء مین پہنچا، اس نے پانچ آبادیان ایسی بتائی ہیں، جو مستقل حیثیت رکھتی تھین، وہ حارۂ بلرم، خالصہ، صقالبہ، حارۃ الجدیدہ، اور حارۃ المسجد ہین ۱؎، دو اور چھوٹے محلے حارۃ الیہود اور حارۃ ابی حماز کا نام بھی تاریخون مین آتا ہے،

حارۂ بلرم کو قصر قدیم بھی کہتے ہین، اغالبہ کے عہد تک یہی حصہ پائے تخت تھا، اس کے بعد سرکاری ضرورتون کے لئے وہ دوسری آبادی خالصہ ۳۲۵ھ / ۹۳۶ء مین تعمیر ہوئی، اس کی خصوصیت ابن حوقل کے بیان مین یہ ہے، کہ " یہان فرمان روائے صقلیہ اور اس کے عمال رہتے ہین، بازار اور ہوٹل وغیرہ قائم نہین کئے گئے ہین، البتہ حمام اور غسلخانے بنا دئے گئے ہین، ایک جامع مسجد بھی ہے جو یہین کے باشندون کے لئے مخصوص ہے، قید خانہ، جہاز سازی کے کارخانے اور دیوان حکومت کی عمارتین بنی ہوئی ہین ۲؎ " اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس حصہ کی تخطیط اس طور پر انجام پائی تھی، کہ عام آبادیون سے مختلط نہ ہونے پائے

بلرم کے شہری خصوصیات

بلرم اپنے عہد اسلامی مین صقلیہ کا شیراز تھا، سربفلک عمارتین، دلفریب تفریح گاہین، نزہت بخش فوارے، پتھرون کی سڑکین، پررونق بازار، عالی شان مہمان سرائین، پرتکلف ہوٹل، اپنے دور مین ایسے ہی جاذب نظر تھے، جس طرح مسٹر اسکاٹ کے بقول آج عروس البلاد (پیرس) مین تہذیب جدید کا آب و رنگ ایک نووارد کی نگاہین خیرہ کر دیتا ہے ۳؎، عرب مورخین مین ابن حوقل یہان کے بازارون

۱؎ - کتاب الممالک والمسالک ابن حوقل ص ۸۳ طبع آخر، ۲؎ کتاب الممالک المسالک ابن حوقل ص ۱۸۲ طبع آخر، ابن اثیر ج ۸ ص ۲۵۳ طبع بریل، لیڈن، نخبۃ الدہر و عجائب البر و البحر شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی طالب الدمشقی در اماری ص ۴۴۱، معجم البلدان ج ۳ ص ۳۹۰ طبع مصر، ۳؎ اخبار الاندلس ج ۲ ص ۶۷ تا ۶۹،

کا حال تعجب سے بیان کرتا ہے۔ کہ بازار کی دکانین ایک ہی وضع و قطع کی قطار در قطار بنی ہوئی ہین، ہر چیز کی فروخت کے لئے الگ الگ حصے مقرر ہین، صرف قصابون کی دکانون کی تعداد ۱۲۷ ہے، بلرم مسجدون کی کثرت مین مشہور تھا " ابن حوقل کہتا ہے "مین نے ایک دن بغور دیکھا، تو صرف اس قدر مسافت مین جہان ایک تیر پہنچ سکتا ہے دس مسجدین موجود تھین، اسی طرح ادریسی نے بلرم کے دو حصون معسکر و بیضا کے درمیان تین میل کی آبادی مین دو سو مسجدین بتائی ہین، اور یاقوت خالصہ کی شہر پناہ کے اردگرد دو سو مسجدین بتاتا ہے، بعض مورخین نے بلرم کی مسجدون کی مجموعی تعداد پانسو سے زیادہ بتائی ہے اسی طرح یہان کثرت سے ہوٹل اور حمام یعنی غسلخانے قائم تھے، اور ارباب تصوف کے لئے خانقاہین اور رباط علیحدہ تھے[1]

ابن جبیر نے بلرم کا دلکش منظر کھینچا ہے، جو اس لحاظ سے زیادہ قابل قدر ہے، کہ وہ ایک اندلسی سیاح تھا، جس کی نگاہون مین قصر الحمراء، اور غرناطہ و قرطبہ کے مناظر موجود تھے؛ اس کے چند جملے یہ ہین،

> بلرم تمدن کا گہوارہ ہے، جس سے ہر قسم کا حسن نمایان ہے، قدیم ہے، خوشنما ہے، نظر فروز ہے، اور گویا روئے زمین پر ایک خوبصورت سا چمن زار ہے، اس کی گلیان اور سڑکین نہایت کشادہ اور وسیع ہین، تمام عمارتین ایک خاص قسم کے پتھر کی بنی ہوئی ہین، اس کے وسط مین ایک نہر جاری ہے، اور اطراف و جوانب مین بھی چار نہرین ہین[2]۔۔۔۔

---

[1] کتاب المسالک والممالک ۸۴، ۸۵، ۸۶ (طبع مصر) معجم البلدان یاقوت، نزہۃ المشتاق ادریسی، رحلۃ ابن جبیر (گب) ذکر صقلیہ و بلرم، [2] رحلۃ ابن جبیر ص ۳۳۱، (گب)،

.... اس شہر کو قرطبہ سے گونہ مشابہت حاصل ہے"

زبان

مسلمانون کے داخلہ سے پیشتر یہان کی دفتری زبان لاطینی اور بول چال کی یونانی تھی، مسلمانون نے دفتری زبان عربی قرار دی، مگر ملک کی قدیم یونانی اور لاطینی زبانین بھی زندہ رکھین[1]،

ادیان

مسلمانون کے داخلہ کے وقت یہان کے لوگ زیادہ ترکیتھولک چند لامذہب اور کچھ یہودی تھے، اور ایک مختصر گروہ بت پرستون کا تھا[2]، مسلمان اپنے ساتھ مذہب اسلام لائے، اسلامی تہذیب کا یہ اثر تھا، کہ لوگ نہ صرف عہد اسلامی مین بلکہ اسلامی سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھی اسلام کے دائرے مین داخل ہوتے رہے، جب راجر اول نے قانوناً اسلام مین داخلہ کا دروازہ بند کردیا[3]، تو بھی لوگ مسلمانون کے فیض صحبت سے اسلام لاتے، اور چھپ چھپ کر عبادت کرتے[4]، مسلمانون نے اپنے عہد مین غیرمسلمون کو مذہبی آزادی دی، اوران کے معابد کے اوقاف کو برقرار رکھا[5]،

صقلیہ کے اسلامی مذاہب وفرق

مذاہب فقہ مین سے ابتداءً یہان مذہب حنفی کو فروغ حاصل ہوا، کہ قاضی اسد کے تلامذہ اور حلقہ بگوشون مین زیادہ حنفی المذہب تھے، مقدسی (سنہ ۳۷۵؁) کا بیان ہے، "اکثرُ اھلِ صقلیہ حنفیونَ" اکثر اہل صقلیہ حنفی ہین[6]" لیکن رفتہ رفتہ مختلف اثرات سے صقلیہ مین مذہب مالکی کو مقبولیت

---

[1] انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا ج ۲۵ ص ۳۲ [2] اسٹوری آف دی نیشنس ج ۳۰ ص ۲ (سلی از زمان)
[3] انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا ج ۲۵ (سسلی) طبع یازدہم، [4] نہایۃ الارب نویری درامادی ص ۴۴۴،
[5] رحلۃ ابن جبیر ص ۳۲۵ گب، [6] انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا ج ۲۵ (سسلی) طبع یازدہم،
[6] احسن التقاسیم ص ۲۳۸ مطبع بریل سنہ ۱۹۰۶ء،

ہوگئی، چنانچہ صقلیہ کے اکثر اہل علم مالکی المذہب تھے، جن کے تراجم ترتیب المدارک، قاضی عیاض، دیباج المذہب، ابن فرحون اور معالم الایمان ابن ناجی وغیرہ میں مذکور ہیں۔

علم کلام میں اسد اور ان کے متبعین سلف صالحین کے متبع تھے[1]، اور مالکیوں کے متعلق تو تاج سبکی کا کلیہ ہے، "ہر مالکی کا اشعری ہونا ضروری ہے[2]"

صقلیہ میں دولت اغالبہ کے بعد اگرچہ دولت فاطمی اسماعیلی قائم ہوئی اور ابتداء حکومت کی جانب سے مذہبی حیثیت سے چند ایسے تغیرات بھی کئے گئے[3]، جن سے اس مذہب کی اشاعت کا امکان تھا، مگر جب بغاوت فرو کرنے کے بعد انہیں دوبارہ اقتدار ہوا، تو اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا چنانچہ اس دور میں ہمیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا ہے جس میں شیعیت کو بجبر رائج کیا گیا ہو، لوگ اپنے قدیم مسلک اہل السنہ والجماعہ پر قائم رہے۔

نظامِ حکومت

صقلیہ کی مرکزی حکومت

صقلیہ کی حیثیت عہد اسلامی میں شمالی افریقہ کی ایک نو آبادی کی تھی، اس لئے اس کی مرکزی حکومت، افریقہ کی حکومت رہی، اغالبہ کے آخر دور میں حاجب صقلیہ یعنی

---

[1] معالم الایمان ج ۲ ص ۱۴، [2] طبقات الشافعیہ الکبریٰ

[3] ابن اثیر ج ۸ ص ۵۳ نہایۃ الارب در اماری ص ۴۲۶،

وزیر صقلیہ کا عہدہ بھی نظر آتا ہے، جو صقلیہ کے والی اور فرمان رواکے درمیان کی کڑی ہوتا، اس کو ولاۃ کے عزل و نصب تک کا اختیار تھا، ابن عذاری نے حکومت افریقہ مین صقلیہ کے دو حاجب نصر بن صمصامہ اور حسن بن نافذ کے نام لکھے ہین، اور ضمناً نہایۃ الارب مین بھی تذکرہ آیا ہے[۱]۔ اور جب فاطمین کا دارالحکومت مصر قرار پایا، تو صقلیہ کا رسمی تعلق بھی مصر سے قائم ہوگیا، لیکن اس عہد تک صقلیہ مین کلبیین کی تقریباً خود مختار موروثی حکومت قائم ہوچکی تھی، اس لئے یہ رشتہ ایک برائے نام قائم تھا،

حکومت صقلیہ مرکزی حکومتین یہان ولاۃ نامزد کرتی تھین، جن کی حیثیت دور حاضر کی اصطلاح مین گورنر جنرل کی کہی جاسکتی ہے، اغالبہ کے دور مین صقلیہ کی ولایت پر بالعموم اغلبی شاہزادے مقرر ہوکر آتے تھے، جن مین کبھی حکومت افریقہ کے ولی عہد بھی ہوتے، اس لئے یہ ولاۃ قدرتاً زیادہ خود مختار تھے، انہین ملکی نظم و نسق کے ماسوا رومی مقبوضات پر حملہ آور ہونے، اور بیرون جزیرہ کی متحارب حکومتون سے صلح کے معاہدے کرنے کے اختیارات بھی حاصل تھے، یہی طرز حکومت عہد فاطمی مین بھی کلبیین کے دور کے آغاز تک قائم رہا[۲]، اور جب کلبیین کا زمانہ آیا، تو یہ موروثی حکومت تقریباً خود مختار ہوگئی، صرف خراج کی ایک متعینہ رقم مرکزی حکومت کو بھیج دی جاتی اور کلبی فرمان رواؤن کو خلافت فاطمی سے ایسے خطابات و خلعت

[۱] - البیان المغرب ترجمہ اردو ص ۱۶۵، نہایۃ الارب باب افریقہ و المغرب حوادث ۲۷۵ھ در اماری ص ۵۰۴، [۲] ابن اثیر ج ۶ ص ۳۵۱، ۴۰۰، ص ۳۵۷ طبع بریل،

عطا ہوتے ۔ جو اس عہد مین سلاطین کو بارگاہِ خلافت سے ملتے تھے، اور یہ رسمی رشتہ بھی اس قدر کمزور ہو چکا تھا، کہ اگر کسی جزئی معاملہ مین بھی حکومت مصر سے اختلاف ہوا، تو کلبی فرمان روانے انقطاع کی تہدید کی، اور حکومت مصر خاموش ہو گئی[۱]، چنانچہ عرب موخین مین ابن حوقل، لسان الدین بن الخطیب اور ابن فضل اللہ العمری وغیرہ کلبی فرمان رواؤن کا تذکرہ "ملوک وسلاطین" ہی کے القاب مین کرتے ہین، تاہم انھون نے اپنی رسمی خود مختاری کا کبھی اعلان نہین کیا ،

ولاۃ صقلیہ کا طرز بود و ماند مشرقی طرز کا شاہانہ تھا، شاہی محلات مین خدم وحشم، غلام و خواجہ سرا رہتے ، فرمان روا کے حضور مین مشرق کے شاہانہ آداب مجلس قائم تھے، شہر مین شاہ کی سواری تزک و احتشام سے نکلتی جس مین چتر و جلوس کا اہتمام رہتا ، چتر و جلوس کے تکلفات فاطمیین کے ذریعہ رائج ہوئے، ولاۃ کی ذاتی ملکیتون کا اندازہ اس سے لگائیے، کہ ثقۃ الدولہ یوسف (۳۷۹ھ/۹۸۹ء - ۳۸۸ھ/۹۹۸ء) جو علالت کی وجہ سے اپنے لڑکے کے حق مین دست بردار ہو چکا تھا، صقلیہ سے ترک سکونت کر کے مصر روانہ ہونے لگا، تو ابن اثیر اور ابو الفدا لکھتے ہین، کہ اس کے پاس ۱۴ ہزار باڑے ایسے تھے، جن مین صرف اونٹ اور گھوڑے باندھے جاتے تھے، خچرون کا باڑہ ان سے علحدہ تھا، اور ۶ لاکھ ستر ہزار دینار نقد اس کے ساتھ مصر منتقل ہوئے[۲]:

[۱] - اعمال الاعلام در یادگاری مضامین اماری ج ۲ ص ۴۷۸، [۲] کتاب اعمال الاعلام فیمن بویع قبل الاسلام در یادگاری ج ۲، ص ۱۶۴، ۲۷۲، ذکر طرز ماند و بود ص ۴۷۸ ذکر قصر بہ عہد ابو الاغلب والی، ۴۹۰ - ذکر خدم وحشم بہ عہد جعفر بن محمد والی، نہایۃ الارب حوادث ۳۸۵ھ در بیلوتھیکا ص ۴۴۳، ۴۴۹، ذکر خواجہ سرا بہ عہد محمد بن خفاجہ والی، ابو الفدا ج ۲ ص ۹۶ ذکر مشرقی طرز شہنشاہی بہ عہد احمد کلبی، ابن اثیر ج ۸ ص ۳۵۶، ذکر آداب مجلس بہ عہد حسن کلبی، کتاب نبذۃ المحتاجہ فی اخبار ملوک صنہاجہ در اماری ص ۲۱۷، ذکر چتر، ابن اثیر ج ۱۰، ص ۱۱، و ابو الفدا ج ۲ ص ۲۰۰ ذکر دولت و ثروت ثقۃ الدولہ ،

صوبون کی تقسیم اوران کی حکومت

صقلیہ کی فتوحات کے ساتھ صوبون مین اضافہ ہوتا گیا، آخرطور پر پانچ صوبے بلرم، جرجنت، مسینا، مازر، اور قصریانہ تھے[۱]، ان کے ولاۃ، والی صقلیہ مقرر کرتا، جو ان کے معتمد ہوتے[۲]، صوبہ جنوبی اٹلی کا انتظام جداگانہ تھا، اولاً ۳۲ھ مین وہان ایک خودمختار والی خلافت عباسیہ کی طرف سے تسلیم کیا گیا[۳]، پھر یہ مقبوضات سسلی کے ایک صوبہ کی حیثیت مین آئے، اس کے بعد پھر اس کے گورنر افریقہ سے آنے لگے، اور پھر تبدیلی ہوئی، اور سسلی ہی کی اسلامی حکومت یہان کی نگران ہوگئی[۴]، سسلی کے اردگرد کے جزائر حکومت صقلیہ کے ماتحت تھے، لیکن مالٹا مین جداگانہ انتظام قائم ہوا، وہان کی حکومت وہین کے باشندون کے سپرد کی گئی، اور ایک مختصر اسلامی دستہ شہر مالٹا مین مقیم رہا[۵]،

حکومت صقلیہ کے مختلف شعبے

حکومت صقلیہ کی اسلامی حکومت چند شعبون مین تقسیم تھی، دیوان الکتاب، یا دیوان الرسائل والانشار (دفتر وزارت) دیوان الخراج (صیغۂ مالیات) صیغۂ عدالت وقضا جس مین ایک اور شعبہ دیوان المظالم تھا، شرطہ (پولیس) دیوان الجیوش (صیغۂ فوج) اور دیوان الصناعہ (صیغۂ جہاز سازی) ان کے لئے علیحدہ عمارتین خالصہ ہی مین بنی ہوئی تھین[۶]، لیکن اغلبی عہدین

---

[۱] - ابن اثیرج ۱۰ ص ۱۳۰، نہایۃ الارب نویری درامارین ص ۴۴۵، ابوالفداءج ۲ ص ۹۸، تمدن عرب لیبان ص ۲۸۱، تاریخ ادب سیدیوص ۲۴۴، ترجمہ اردو، [۲] - ابن اثیرج ۸ ص ۱۳۸، [۳] - ابن اثیرج ۶ ص ۳۷۰، ۳۷۱، [۴] - ابن اثیرج ۷ ص ۰۰، نہایۃ لارب درااماری ص ۴۳۳، و ۴۴۹، البیان المغرب ترجمہ اردو ص ۱۵۶! [۵] ابن اثیرج ۷ ص ۱۲، نہایۃ الارب درااماری ص ۴۴۹، اثار البلاد قزوینی، ص ۳۷۲ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا طبع یازدہم ج ۱۷ ص ۵۱۱ ذکر مالٹا، [۶] کتاب المسالک والممالک ابن حوقل ص ۱۸۷،

صرف چار بڑے عہدون کا پتہ چلتا ہے، یعنی والی[1]، سپہ سالار[2]، قاضی[3] اور صاحب الخمس[4]،

(دیوان الکتاب، یا دیوان الرسائل والانشار)

وزرار صاحب دیوان کہلاتے، اور ان کا لقب کاتب ہوتا، بعضوں کا تذکرہ الوزیر کے لقب سے بھی ملا ہے، وزرار کا تقرر فرمان روایان صقلیہ کرتے، حکومت کے محکمون کی نگرانی ان کے سپرد تھی، قوانین کا انضباط و اجرار کرتے جن مین عوام کی مرضی کا بھی لحاظ رکھا جاتا، ۴۱۰ھ؁ (۱۰۱۹ء؁) مین بعض قوانین کے نفاذ پر شورش ہوئی، جو اس طرح فرو ہوئی، کہ وعدھم ان لا یخرج عن رائھم (اور ان سے وعدہ کیا کہ ان کی مرضی سے باہر نہ جائے گا) مجمع نے نہ صرف اس قانون کے نافذ کرنے والے وزیر بلکہ خود اس وزیر کو مقرر کرنیوالے صاحب حکومت کی معزولی کا مطالبہ کیا جو پورا کیا گیا[1]،

صقلیہ کے وزرا ریا کتاب کا تذکرہ بحیثیت عہدہ دار شاعر کے ابن القطاع نے کیا تھا، جن مین سے بعض کے نام ابن سعید اور اصفہانی نے نقل کئے ہیں، بعض نام عام تاریخون مین آگئے ہین، اور چند نام متفرق طور پر یاقوت اور قفطی وغیرہ سے مل سکتے ہین، اس طرح صقلیہ کے ۲۰ وزرار کے نام دستیاب ہو سکے ہین[2]،

---

[1] نہایۃ الارب درامار ی ص ۴۴۴، ابن اثیر ج ۱۰ ص ۱۳۰،

[2] الالحان المسلیہ دریادگاری اماری ج ۱ ص ۲۲۵، کتاب المشترک وضعاً والمفترق صقعاً، یاقوت درااماری ص ۲۲۳، خریدۃ القصر درااماری از ص ۵۸۹ تا ۵۹۸ و ۶۱۰ وکتاب انبار الرواۃ قفطی درااماری ص ۶۴۷، اور تاج العروس ج ۲ ص ۳۷۳،

(دیوان الخراج یا صیغۂ محاصل)

دیوان الخراج کے افسر اعلےٰ کو "صاحب الخمس" کہتے تھے، جو حکومت کے معزز عہدون مین تھا، ۲۹۹ھ مین حسن بن احمد والی صقلیہ کی قائم مقامی خلیل صاحب الخمس نے کی[1] صاحب الخمس جزیرے کے مداخل و مدارج کا نگران تھا، جس کے ماتحت افسر ہر شہر مین بطور محصل متعین تھے[2]، محاصل کی مدین فقہ اسلامی کے مطابق تھین، صرف قانون عشر رائج نہ تھا، حسن بن محمد باغائی الکاتب نے ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ مین اسی کو رائج کرنا چاہا، اور شورش برپا ہوئی[3]، عیسائیون پر جزیہ عائد تھا، جس کے محصل بعض یورپین بیان کے مطابق عیسائی عہدہ دار تھے[4]، عرب مورخین بھی ایک موقع پر ایک عیسائی سربراہکار کے جزیہ لانے کا تذکرہ کرتے ہین[5]، جزیہ کی مقدار و نوعیت وہی تھی، جو اسلامی قانون مین مذکور ہے۔ یورپین مورخین کی رائے ہے، کہ یہ رقم مجموعی طور پر یہان کی پیشرو حکومت بیزنطی کے عائد کردہ محاصل سے کم تھی، اور ان کی وصولی کے طریقون مین بھی آسانیان تھین[6]،

(صیغۂ عدالت و قضار)

یون تو صقلیہ مین عہدۂ قضار کی بنیاد رسماً و مجازاً اسی وقت پڑی جب فرمانروائے

---

۱ - ابن اثیر ج ۸ ص ۳۸، ۳۹، نہایۃ الارب درامارى ص ۴۳۵ -
۲ - تمدن عرب ص ۲۸۲،
۳ - ابن اثیر ج ۱، ص ۱۳۰، نہایۃ الارب درامارى ص ۴۴۴، ۴ تمدن عرب لیبان ص ۲۸۲،
۵ - ابن اثیر ج ۸ ص ۳۵۶ وغیرہ،
۶ - تمدن عرب لیبان ص ۲۸۲، اخبار الاندلس اسکاٹ ج ۲ ص ۳۴،

افریقہ نے قاضی اسد سے روانگی کے وقت کہا۔ "تم عہدۂ قضا سے معزول نہیں کئے گئے، تمہیں ولایت بھی سپرد ہوئی، اور تمہارا لقب 'قاضی امیر' ہوگا[۱]"، اس کے بعد عہد اغالبہ میں افریقہ سے قضاۃ آتے رہے،

دار القضاۃ کی عمارت شاندار تھی، قاضی ابو عمرو محمد بن میمون (۳؁) جب اپنے عہدہ پر پہنچے تو استقبال کے بعد دار القضا میں ٹھہرائے گئے، مگر اپنی فروتنی اور سادہ مزاجی سے یہ کہکر اس میں فروکش نہ ہو سکے، کہ "یہ اکابر و عظما کی قیام گاہ ہے"، اور ایک دوسرے مکان میں اُٹھ آئے[۲]، قاضی دار الحکومت میں رہتا، اس کے ماتحت صوبوں میں ایک قاضی اور ایک منشی مقرر تھا، عیسائیوں کے لئے جداگانہ عدالتیں قائم تھیں جن میں اسلامی قانون کے بجائے عیسوی قانون رائج تھے[۳]،

صقلیہ میں بعض سیاسی حالات کے باعث عصبیتیں پیدا ہو گئی تھیں، جن سے سازشوں اور باہمی مخالفتوں کی گرم بازاری رہتی، اس لئے جھوٹے مقدمے کثرت سے دائر ہوتے تھے، جن سے یہاں کے قضاۃ کو دشواریوں کا سامنا ہوتا، عثمان بن خزار ایک صالح بزرگ عہدۂ قضا پر معمور ہوئے، تو وہ یہاں کے ان حالات سے ایسے برگشتہ ہوئے، کہ صقلیہ کے تمام باشندوں کی شہادت کلیتہً مردود قرار دے دی اور مقدمات میں باہمی مصالحت کرانے لگے[۴]، لیکن یہ عثمان بن خزار کا کمال تقویٰ تھا، عام

[۱] ۔ معالم الایمان ج ۲ ص ۱۴، ریاض النفوس درالماری ص ۱۸۳ و ۱۸۶،
[۲] ۔ ریاض النفوس مالکی دراماری ص ۱۸۳،
[۳] ۔ تمدن عرب لیبان ص ۱۸۳،
[۴] ۔ معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۶،

قضاۃ ان مشکلات پر حاوی ہوتے' اور جانچ پر تال کر مقدمات کے فیصلے سناتے ؛

یہی وجہ ہے کہ صقلیہ کے عہدۂ قضاء پر افریقہ کے ممتاز و تجربہ کار فقہا مامور کئے جاتے ، جو بالعموم پہلے افریقہ کے صیغۂ عدالت و قضا مین کام کر چکے ہوتے ، مثلاً قاضی ابوالربیع سلیمان بن سالم الکندی القطان المعروف بابن کحالہ المتوفی ۲۸۹ھ سنہ ۲۸۱ھ مین یہان کے عہدۂ قضاء پر آئے ، وہ ورود صقلیہ سے پیشتر اولاً ولایت باجہ کے قاضی تھے ، پھر قیروان کے دیوان المظالم کے افسر مقرر ہوئے ، جس مین سو دینار تک کے مقدمات کی سماعت کا حق انہین حاصل تھا[1] ، اسی طرح مثلاً قاضی ابوالقاسم محمد بن خالد القیسی المعروف بہ طراطری متوفی ۲۹۹ھ صقلیہ کے عہدۂ قضاء پر آنے سے پیشتر قیروان کے محتسب تھے[2] ؛

قضاۃ کا تقرر والی صقلیہ کی طرح براہ راست حکومت افریقہ کی جانب سے ہوتا تھا ، اور حکومت افریقہ مین اس عہدہ کے لئے انتخاب کرنے کا حق وہان کے قاضی القضاۃ کو حاصل تھا ، وہ مختلف ولایتون کی طرح صقلیہ کے لئے بھی قاضی مقرر کرتا[3] ، صقلیہ مین یہ قضاۃ اگرچہ اپنے عہدہ کی ذمہ داریون مین مختار کل تھے ، تاہم والی صقلیہ کے ماتحت ہوتے تھے ، اور قضاۃ کے استعفے قبول کرنے کا اسے حق حاصل تھا ، مثلاً قاضی ابوعمرو محمد بن میمون نے کبر سنی کے باعث جب

---

[1] معالم الایمان ج ۲ ص ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، دیباج المذہب ص ۱۱۹ ، ترتیب المدارک در یادگاری مضامین ج ۱ ص ۲۴۴ ، ۲۴۹ ؛ [2] ریاض النفوس دراماری ص ۱۸۹ ترتیب المدارک ج ۱ ص ۳۲۰ ،

[3] اس طریق کا پتہ معالم الایمان مین افریقہ کے قاضی القضاۃ اور ولایات افریقہ کے قضاۃ کے تراجم کے استقصار سے چلتا ہے ، مثلاً اسی صقلیہ کے قاضی ابن کمالہ کے تذکرہ مین ملتا ہے کہ انہیں باجہ کی قضارت پر ابن طالب قاضی القضاۃ افریقہ نے بھیجا اور دیوان المظالم اور صقلیہ کی قضارت عیسیٰ بن مسکین قاضی القضاۃ افریقہ نے ان کے سپرد کی ، معالم ج ۲ ص ۱۳۶ ، ۱۳۷ ،

خدمت قضاءت سے علٰحدگی چاہی، تو اپنا استعفا والی صقلیہ ہی کی خدمت مین پیش کیا[۱]

صقلیہ کے قضاۃ کا تذکرہ تاریخون مین صقلیہ کے حوادث سنین کے ذیل مین بجز دو ایک ناموں کے موجود نہین، البتہ طبقات مین ایسے فقہا کے نام اور حالات ملے، جو صقلیہ کے عہدۂ قضاء پر مامور ہوئے، ایسے گیارہ فقہا کے نام اب تک دستیاب ہوئے ہین، لیکن ظاہر ہے، صقلیہ کے قضاۃ کی یہ مکمل فہرست نہین، بعض قضاۃ کے سوانح مین ان کے طریق قضاء وغیرہ کی تفصیل بھی ہے، ان قضاۃ کے تذکرے معالم الایمان ج ۲ ص ۱۴، ۱۳۶، ۲۴۷، دیباج المذہب ص ۱۱۹، ۳۳۴ ترتیب المدارک دریادگاری ج ۱ ص ۲۴۴، ۲۴۹، ۳۷۰، ریاض النفوس درامارمی ص ۱۸۹، ۱۹۳، کتاب العبر فی جزمن عبر ذہبی ص ۶۶۸، طبقات العرب دریادگاری ج ۲، ص ۱۹۹، ابن اثیر ج ۸ ص ۳۸، ۳۰۵، نہایۃ الارب درامارمی ۴۳۵، ۴۳۶، الالحان المسیلیہ دریادگاری ج ۱ ص ۲۹۶، خریدۃ القصر درامارمی ص ۲۹۵ اور معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۳ مین موجود ہین،

دیوان المظالم

دیوان المظالم بھی صیغۂ عدالت وقضا کی گویا ایک شاخ تھی، جس مین عمال حکومت کے خلاف استغاثے دائر ہوتے، اور ان کی بدعنوانیون کا تدارک کیا جاتا، صقلیہ کے عہد اسلامی مین دیوان المظالم کا تذکرہ نویری نے کیا ہے، کہ نارمنون نے اسی کے مطابق اپنے عہد مین بھی یہ عدالت قائم کی، نیز عیسائی مورخین بھی بالعموم اس کا تذکرہ کرتے ہین[۲]،

---

[۱] - معالم الایمان ج ۲ ص ۲۴۷،

[۲] - تمدن عرب لیبان، التمدن الاسلامی جرجی زیدان، "عربون کا تمدن"

شرطہ (پولیس)

شرطہ (پولیس) کے افسر اعلیٰ کو "صاحب الشرطہ" کہتے تھے، ابوالفضل احمد بن علی صاحب الشرطہ کا تذکرہ اصفہانی نے کیا ہے[1]، شرطہ کے فرائض تقریباً وہی تھے، جو دور حاضر میں پولیس کے ہیں، ابن المودب القیروانی الشاعر صقلیہ پہنچا، یہاں اس نے ایک جرم کا ارتکاب کیا، گرفتاری کا حکم ہو، وہ روپوش ہوچکا تھا، ایک دن شراب کے نشہ میں مست باہر نکل آیا، صاحب الشرطہ نے گرفتار کرلیا، اور فرماں روائے صقلیہ ثقۃ الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، کہ اسی کی شان میں ہجو لکھ کر یہ مصیبت مول لی تھی، (ابن خلکان ج ۳ ص ترجمۃ یحییٰ بن اکثم)

دارالحبس (قید خانہ)

دارالحبس (جیل خانہ) کا رواج اس عہد تک اسلامی ملکوں میں ہوچکا تھا، صقلیہ کا دارالحبس خالصہ (بلرم) میں قائم تھا، جس کی مستقل عمارت کا تذکرہ ابن حوقل نے کیا ہے[2]،

دیوان الجیوش

اسلامی حکومتوں میں لفظ دیوان کا اطلاق ابتداءً فوجی دفتر ہی پر ہوا، اگرچہ

---

[1] خریدۃ القصر دراماری ص ۵۹۵،

[2] المسالک والممالک ابن حوقل ص ۸۳،

بعد میں دوسرے صیغوں سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے اس کو بھی دیوان الجیش یا دیوان الجیوش کہنے لگے، دولت کلبیہ کے استقلال سے پیشتر تک صقلیہ کی فوج کی فراہمی افریقہ میں ہوتی تھی، اور حسب ضرورت کمک آتی رہتی، حکومت صقلیہ کی نگرانی میں رومی مقبوضات پر مجاہدانہ تاختیں ہوتیں، لوگ ذوق سے شریک ہوتے، خصوصاً اس لئے کہ پاپائے روما کی طرف سے صقلیہ کے خلاف مذہبی جنگ کا اعلان ہوتا[1]،

تاہم صقلیہ میں بھی فوج کا اہتمام رہتا تھا جب ضرورت پڑتی افریقہ کی کمک کے علاوہ یہاں کی فوج کیل کانٹے سے درست کی جاتی[2]، مثلاً احمد کے عہد حکومت میں ابن اثیر ایک موقع پر لکھتا ہے :-

"یہ خبریں امیر احمد امیر صقلیہ تک پہنچیں، اس نے المعز کے پاس افریقہ پیغام بھیجا، اور حقیقت حال سے آگاہ کیا، اور اس سے امداد اور کمک طلب کی، اور خود جنگی بیڑے کی اصلاح و درستی اور ان میں اضافہ کرنا شروع کیا، بری و بحری سپاہ جمع کی، اور ادھر المعز نے فوج کی فراہمی شروع کی[3]......

لیکن دولت کلبیہ کے معاً استقلال کے بعد یہ ذمہ داری حکومت صقلیہ کے سر عائد ہوئی[4]، مثلاً ۳۶۵ھ / ۹۷۵ء میں ابوالقاسم نے اوتھو دوم کے مذہبی حملے کے جواب میں فوج کشی کی، تو ساری فوج صقلیہ میں اکٹھا کی گئی، جس میں جزیرہ کے علماء و

---

[1] - انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا ج ۲، ص ۳۷۲ طبع یازدہم، [2] - ابن اثیر ج ۸ ص ۴۱۱،
[3] - ابن اثیر ج ۸ ص ۴۱۱،
[4] - ابن اثیر ج ۸ ص ۴۹،

صالحین نے بھی شرکت کی[1]،

صقلیہ کی فوج مین قبائلی تقسیم تھی، ۲۱۲ھ کے پہلے حملہ ہی مین دس ہزار سپاہ مین عرب و بربر دونون تھے، فیمی کا رومی لشکر بھی اگرچہ ہمرکاب تھا، مگر اسد نے شرکت جنگ کی ممانعت کردی تھی[2]، مسلمانون کی چند اور قبائلی تقسیمین بھی تھین، جن کا استقصا یہان مقصود نہیں،

اغالبہ کے عہد تک صقلی فوج کی شکل یہ تھی، کہ ایک مختصر لشکر تو فوج کی حیثیت سے رہتا، باقی اپنی اپنی آبادیون مین شہری زندگی بسر کرتی، اور حسب ضرورت زیر علم آجاتی، لیکن رفتہ رفتہ اس نظام مین فرق آیا، امراء، تجار، صناع، کاشتکار اور مزدورون کا طبقہ فوج سے کٹ کر الگ ہوگیا، اور فوجی جماعت کو ترقی دی گئی، اگرچہ اس دور مین بھی صقلیہ کے تمام مسلمان فوج مین شریک ہوجاتے تھے، اس کی مثالین یہان کی سیاسی سرگذشت مین تفصیل سے ملینگی،

سپہ سالار کا مستقل عہدہ فتح بلرم کے بعد ۲۱۶ھ سے قائم ہوا، یہ دو قسم کے لوگ ہوتے، یا تو وہ والی صقلیہ کے کوئی قریبی رشتہ دار، بھائی یا لڑکے ہوتے، جن مین سے اکثر بعد مین ولایت صقلیہ پر بھی مامور ہوتے، دوسرے وہ لوگ تھے، جو افریقہ سے اس منصب پر بھیجے جاتے تھے، لڑائیون مین بالعموم ولاۃ صقلیہ خود شریک ہوتے، صرف ایک والی ابو الاغلب کی مثال اس سے مستثنیٰ ہے، وہ ۱۶ سال (۲۲۱ھ/۸۳۵ء - ۲۳۶ھ/۸۵۰ء) والی رہا، کبھی جنگ مین شریک نہین ہوا[3]،

---

[1] ابن اثیر ج ۸ ص ۹۴ ، [2] معالم الایمان ج ۲ ، ص ۲۳۶ ،

[3] ابن اثیر ج ۷ ص ۴ ، الحلۃ السیراء ابن الابار در اماری ص ۳۳۱ ،

چھاؤنی

صقلیہ مین پہلی اسلامی چھاؤنی مازر مین ۲۱۲ھ مین قائم ہوئی[۱]، اس کے بعد بلرم اور پھر خالصہ مین مستقل معسکر قائم ہوا[۲]، اندرون ملک مین مستحکم قلعون مین چھاؤنیان قائم تھین، ابن القطاع نے اہم قلعون کی تعداد ۱۳ بتائی ہے[۳]، ابن فضل اللہ دمشقی نے ۲۶ اہم قلعون کو نام بنام شمار کیا ہے[۴]، اور ادریسی نے ۵۰ قلعون کا تذکرہ اہمیت سے کیا ہے[۵]،

فوج کا گذارہ

فوج کی تنخواہین بصورت زر دینے کے بجائے بصورت جاگیر دی جاتی تھین، شرعی تقسیم کے رو سے مال غنیمت کا وافر حصہ ملتا تھا[۶]، جو مقامات بزور شمشیر فتح ہوتے، اور وہان کے باشندے ادائے جزیہ سے انکار کر چکے ہوتے، فتح کے بعد وہ مسلمانون مین تقسیم کر دئے جاتے، فوج مین داخلہ کے وقت سپاہیون کو بیش قرار رقمین افریقہ مین دی جاتی تھین، ابراہیم نے ۲۸۹ھ مین افریقہ سے روانگی کے وقت ۲۰، ۲۰ دینار سوارون کو، ۱۰، ۱۰ دینار پیادون مین تقسیم کئے[۷]، اسی طرح ابن اثیر، المعز کے متعلق صقلیہ کے لئے ایک فوج جمع کرنے کے تذکرہ مین لکھتا ہے، جمع الرجال وحشد وفرق فیھم الاموال الجلیلۃ (لڑنے والون کو جمع کیا اور جلیل القدر رقمین ان مین تقسیم کین[۸])

---

[۱]- نہایۃ الارب در اماری ص ۴۲۸،
[۲]- المسالک و الممالک ابن حوقل ص ۸۳، معجم البلدان ج ۲ ص ۲۶۸،
[۳]- معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۵،
[۴]- مسالک الابصار در اماری ص ۱۵۷،
[۵]- نزہۃ المشتاق،
[۶]- ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۱، ۲۰۴، اعمال الاعلام در یادگاری ج ۲ ص ۲۰۴، نہایۃ الارب در اماری ص ۴۳۳ وغیرہ
[۷]- ابن اثیر ج ۷ ص ۱۹۷،
[۸]- ج ۸ ص ۴۱۲،

دیوان دار الصناعہ

صقلیہ کے جہازون، کشتیون، اور اسلحہ کی تیاری افریقہ مین ہوتی تھی، افریقہ سے جو سپاہ آتی، وہ اسلحہ جنگ ساتھ لاتی[۱]، ٹیونس مین دار الصناعہ (جہاز سازی کا کارخانہ) قائم تھا، صقلیہ کی ضرورتین اسی سے پوری ہوتین[۲]،

جب دولت کلبیہ کے عہد مین صیغۂ فوج کی تمام ذمہ داری حکومت صقلیہ ہی پر عائد ہوگئی، تو یہان بھی دار الصناعہ قائم ہوا، ہوسکتا ہے کہ وہ عہد اغالبہ ہی سے ہو، لیکن کوئی تصریحی ذکر نہین ملا، صرف فوجون کی روانگی کے ذیل مین کشتیون کے جمع کرنے کا ذکر آتا ہے، کلبین کے عہد مین اس کا اہتمام ایسے اعلیٰ پیمانہ پر ہوا، کہ حکومت کا ایک مستقل شعبہ "دیوان دار الصناعہ" کہلایا، جو معنًی دیوان الجیوش ہی کے ماتحت تھا، اس کے افسر اعلیٰ کو صاحب دیوان الصناعہ کہا جاتا، ابو الحسن علی بن المعلم صاحب دیوان الصناعہ کا ذکر آتا ہے[۳]،

دار الصناعہ صقلیہ کا مرکزی دار الصناعہ خالصہ (بلرم) مین قائم تھا[۴]، جس کے کاریگر اور مزدور زیادہ تر موالی بنوکتامہ تھے[۵]، جہاز سازی کا خام مسالہ صقلیہ ہی سے حاصل ہوتا، جہاز کے لئے لکڑیان شنت مارکو کے جنگل سے لائی جاتی تھین[۶]، لوہا بلرم کے قریب کے ایک قصبہ بلہرا کے معدن

---

[۱] - ابن اثیر ج ۷ ص ۱۹۷، [۲] ریاض النفوس درامارِی ص ۱۷۷، کتاب المونس ص ۳۲، ابن خلدون ج ۱ ص باب قیادۃ الاساطیل،

[۳] - الالحان المسلیہ دریادگاری ج ۱ ص ۴۹۶، [۴] - ابن حوقل ص ۸۲،

[۵] - ابن اثیر ج ۸ ص ۱۴۹، [۶] - نزہتہ المشتاق ذکر شنت مارکو۔

سے آتا تھا[1]، جہاز کے رسے ایک قسم کی گھاس بربیر سے تیار کئے جاتے تھے،

دوسرا دار الصناعہ مسینا مین قائم تھا، جس مین اسی کی کان سے لوہا آتا تھا،
تیسرا دار الصناعہ اٹلی کے شہر باری مین تھا، جو اٹلی کی اسلامی حکومت کی ضروریات مین مدد دیتا[2]،

جنگی بیڑے

ایک بیڑے مین بالعموم تین قسم کی کشتیان ہوتی تھین صقلیہ کے جنگی بیڑے ایسے جہازون اور کشتیون پر مشتمل ہوتے ا جو لکڑیون سے بنتین، اور لکڑیان لوہے کی میخون سے باہم پیوستہ ہوتین، اور ڈانڈ اور بادبان کے ذریعہ چلائی جاتین، اس دور مین بحر روم مین ایسی ہی کشتیان چلتی تھین[3]، وہ تین قسم کی کشتیان شنی، مراکب اور طریدہ ہیں،

شنی[1] جس کی جمع شوانی و شنیات آتی ہے، اور جسے غراب بھی کہتے ہیں، ایک سو چالیس ڈانڈون سے چلائی جاتی تھین، اور اس پر سوار اور ملاح سوار ہوتے تھے، مراکب[2]، یہ سامان رسد اور اسلحہ کے لئے بیڑے کے ساتھ ہوتین، طریدہ[3] ایسی چھوٹی کشتیون کو کہتے تھے جن پر گھوڑے وغیرہ لیجائے جاتے، دو قسم کی اور کشتیان حربیا اور قطعہ رائج تھین، صقلیہ کے معمولی بیڑون مین بالعموم شوانی و مراکب ہوتین، اور انہین پر سپاہ سوار ہوتی[4]، یہ بڑے امیر البحر کے ماتحت ہوتے

---

[1]۔ نزہتہ المشتاق ذکر بلرم، [2]۔ مسالک الابصار در اماری ص ۱۵۶، نزہتہ المشتاق ذکر مسینا و باری و رحلہ ابن جبیر، [3]۔ سفرنامہ سلیمان تاجر ص ۸۸،
[4]، حوالہ کے لئے ابن اثیر کے ان حوادث مین دیکھا جائے، جس مین صقلیہ کے بحری حملون کا ذکر آیا ہے، ۵۸ھ کے ایک نارمن بیڑے کے ضمن مین ان کا مجموعی تذکرہ بھی ہے، اور کشتیون کی نوعیت کی تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ جزیرہ صقلیہ من حین دخلہا المسلمون در تمدن عرب ضمیمہ ع۲ ص ۹،

جسے امیر البحر یا امیر الاساطیل کہتے تھے،

سپاہیون کے اوزار مین قدیم اسلحہ تلوار، نیزے، تیر اکمان، ڈھال، خود، اور زرہ کا استعمال تھا، محاصرہ شکن آلات مین منجنیق جس سے پتھر برساتے، اور دبابہ کا استعمال تھا، جس سے نقب لگاتے، اور نقب زن اسی مین بیٹھے اندر پہنچ جاتے، دبابہ کے متعلق دور حاضر کے ایک اہل علم کا خیال ہے، کہ وہ موجودہ عسکری آرمیٹنگ سے ظاہری شکل وصورت اور حاجت روائی مین مشابہ تھا[1]، صقلیہ مین ان آلات کا تصریحی ذکر قصریانہ اور سرقوسہ کے محاصرون مین آتا ہے،

آتشین مادے

آتشین مادون مین نفت اور نار یونانیہ کا استعمال تھا، نفت ایک قسم کا آتشین سیال مادہ تھا، جس کو شیشہ کی بوتلون مین بند کرتے، اور ایک گرز اس مین پیوست رکھتے، اور سوار سپاہ ان گرزون کو گھما گھما کر دشمنون پر اچھالتے[2]، نفت صقلیہ ہی سے حاصل ہوتا تھا، اس کے تین بڑے کنوین کوہ اٹنا کے دامن مین تھے، مسلمانون نے اس کے نکالنے کا اہتمام کیا تھا، اسے ان کنوون مین سے کاچھ کاچھ کر نکالنا پڑتا، جس کے لئے ان مین اترنے کی ضرورت تھی، لیکن کنوون کی آتشین لہرون سے سانس لینا محال تھا، ایک خاص قسم کے لبادے تیار کئے گئے تھے، ان کو پہن کر ان مین اترتے، برتن پہلے سے اتارے جاچکے ہوتے، انہین مین سیال مادے کو جمع کر کرکے اوپر بھیجتے جاتے، اس سیال مادہ پر ایک قسم کی جھاگ اٹھتی تھی، اسی کو چھانٹ چھانٹ کر

---

[1] خطط الشام کرد علی ج ۵ ص [2] الفتح القسی ص ۳۸۔۴ ابن خلدون ج ۷، ص ۱۸۸

بوتلون مین بند کرتے[1]، اور ناریونانیہ (آتش یونانی) کے استعمال کا ذکر بالعموم بحری لڑائیون مین ملتا ہے، یہ پانی مین بجھتی نہ تھی، صقلیہ مین اس کے سب سے پہلی مرتبہ استعمال کا ذکر ۲۲۱ھ کی بحری لڑائی مین ملتا ہے[2]، موسیولیبان کی تحقیق مین یہ گندھک گوند اور چربی وغیرہ سے بنتی تھی، اور ایک دوسرے محقق کا خیال ہے کہ نفت اور آتش یونانی دونون ایک ہی چیزین ہین، مگر ظاہر نظر مین اس کی کوئی وقیع دلیل نہین[3]،

خفیہ خبر رسانی

صقلیہ کی اسلامی فوج مین خفیہ خبر رسانی کے وسائل موجود تھے، اسلامی حکومت کے جاسوس، دشمنون کے ملکون سے خبرین لاتے، مثلاً ۴۵۴ھ مین والی صقلیہ خفاجہ کو ایک بیزنطی بیڑے کی قسطنطنیہ سے روانگی کے پیشتر اس کی خبر جاسوسون سے ملی، اسی طرح ۲۸۹ھ ۹۰۱ء مین ابراہیم کے فتح طبرمین کی خبر سے جب قسطنطنیہ مین اضطراب ہوا، اور وہان صقلیہ پر حملہ کی تیاریان ہوئین، تو ابراہیم کو خبر ملی، اور جواباً قسطنطنیہ پر اپنی حملہ آوری کی افواہ مشہور کرائی، اسی طرح صقلیہ کے مختلف شہرون لنتینی وغیرہ کی فتح مین جاسوسون سے مدد ملی، اور نامہ برکبوترون سے خفیہ پیغام رسانی کا کام بھی لیا جاتا، جزیرہ قوصرہ کے مسلمانون نے نارمنون کے مہدیہ پر حملہ آور ہونے کی اطلاع نامہ برکبوتر کے ذریعہ سے وہان پہنچائی اور وقت پر

---

[1] آثار البلاد واخبار العباد قزوینی ص ۱۴۴ ؛

[2] ابن اثیر ج ۶ ص ۲۳۹ ،

[3] تمدن عرب لیبان ص ۲۳۴ و مقالہ جارج یعقوب "مشرق کا اثر مغرب پر" ترجمہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۶ء

تدارک کیا گیا،[1]

اسیرانِ جنگ

صقلیہ کے عہد اسلامی کے دور مین بین الاقوامی دستور جنگ کے مطابق لڑائیون کے ایسے قیدی جنہین متحارب حکومت اپنے کسی معاہدہ سے آزاد نہین کراتی، وہ فتحیاب فوج کے غلام بنائے جاتے، صقلیہ کے اسلامی حکومت کے قبضہ مین بھی ایسے غلام آئے تھے لیکن وہی باشندگان صقلیہ جو کبھی رومی حکومت کے غلام بن کر ایمفی تھیٹر مین درندون کے سامنے شکار بنا کر چھوڑے جاتے تھے[2]، جب اپنے جدید فاتحین مسلمانون کے پاس پہنچے، تو ان کے دوسرے مناظر دکھائی دیئے، اور ان مین سے جس مین جیسی استعداد تھی، ویسے ہی مراتب و مناصب اس نے حاصل کئے،

جوہر صقلی فاتح مصر کا نام اسلامی تاریخ مین روشناس ہے، وہ صقلیہ مین صارب صقلبی کے ہاتھون گرفتار ہوا، اور دست بدست فروخت ہونا، المنصور کے دربار مین پہنچا، اور کچھ ہی دنون بعد القاید ابوالحسن جوہر الصقلی کہلایا[3]، وزارت و سپہ سالاری کے عہدہ پر آیا، اور فتح مصر کے لئے اس شان سے نکلا، کہ خود گھوڑے پر سوار رہے، اور ولیعہد و ارکان دولت اس کی مشایعت مین پیادہ پا ہین، فتح مصر کے بعد شہر قاہرہ کی تخطیط اسی صقلی نے کی، جامع ازہر کی بنیاد اسی صقلی نے ڈالی، اور پھر مصر اسی کی تحریک سے فاطمیون کا پایہ تخت بنا،[4]

[1] - ابن اثیر و نہایہ الارب، [2] - اسٹوری آف دی نیشنس ج ۳۱ سسلی از فریمان

[3] - الحلۃ السیراء در اماری ص ۱۹۷،

[4] - ابن خلدون ج ۴ ص ۱۴۷، ۴۸ و ۵۷ تا ۵۹، خطط مقریزی ج ۲ ص ۲۰۵، ۱۷۹، ج ۴ ص ۹۴ وغیرہ

اسی طرح اس دور مین بہ کثرت صقلی غلام ممتاز عہدون پر مامور ہوئے، مثلاً ابن یانس صقلی العزیز (۳۶۵ھ/۹۷۵ - ۳۸۶ھ/۹۹۶) کے دربار مین تھا، برقہ وطرابلس الغرب کا والی بنا[1]، (۳) بشری الصقلی القائم (۳۲۲ھ/۹۳۴ - ۳۳۴ھ/۹۴۵) کا خادم اور اس کے عہد مین سپہ سالار تھا[2]، (۴) زیدان الصقلی ۲۹۲ھ مین طرابلس الغرب کی ولایت پر مامور ہوا[3]، (۵) قیصر الصقلی المعز (۳۴۱ھ/۹۵۲ - ۳۶۵ھ/۹۷۵) کے عہد مین صوبہ باغایہ کی ولایت پر تھا[4]، (۶) مظفر الصقلی بھی اسی کے عہد مین جوہر کا ماتحت افسر پھر الحاکم (۳۸۶ھ/۹۹۶ - ۴۱۱ھ/۱۰۲۰) کے عہد مین ارکان حکومت مین تھا[5]، (۷) قائد طارق الصقلی ۴۴۰ھ مین دمشق کا والی تھا[6]، (۸) نصیر الصقلی المعز (۳۴۱ھ/۹۵۲ - ۳۶۵ھ/۹۷۵) کے عہد مین ارکان دولت مین تھا، پھر باغایہ کا والی مقرر ہوا[7]، اور (۹) باسل الصقلی عبدالملک بن محمد بن ابی عامر (اندلس) کے عہد (۲۹۳ھ) مین وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز تھا[8]،

[1] - رحلۃ التیجانی دراماری ص ۳۷۵، مراۃ الزمان ابن جوزی دراماری ص ۲۲۶، [2] ایضاً

[3] - ابن خلدون ج ۴ ص ۴۶، [4] - ایضاً

[5] - کتاب المونس ص ۶۱ و ابن خلدون ج ۴ ص ۶۱،

[6] - رحلۃ التیجانی دراماری ص ۳۷۵،

[7] کتاب المونس ص ۶۱،

[8] - البیان المغرب ج ۲ ص ۲۵، ۲۶ طبع پیرس ۱۹۳۰ء،

معیشت

حضرات! اب ہمین تھوڑی دیر کے لئے صقلیہ کے عہد اسلامی کی معیشت پر گفتگو کرنی ہے، کہ معیشت تمدن کا ایک جزو ہے، اور انسانی زندگی کا بڑا حصہ مادی ضروریات ہی کی فراہمی مین صرف ہوتا ہے،

انسان کی معاشی زندگی مین سب سے اہم احتیاج قدرت کے دین ہین ہوتی ہے، اس لئے جو قدرتی سامان ملک مین موجود ہون، معیشت مین سب سے پہلا مدار انہی پر ہوتا ہے،

(قدرتی ذخائر اشیا)

ملک کے قدرتی ذخائر و اشیا مین آب و ہوا، کوہ و دشت، دریا، معادن، حیوانات و نباتات وغیرہ ہین،

آب و ہوا

صقلیہ کی آب و ہوا، بحر روم کی آب و ہوا کے مانند ہے، گرمی سردی کے درجون مین فرق ہے، بارش بالعموم جاڑون مین ہوتی ہے، شمالی ساحل پر بادسموم چلتی ہے، جو مضرت رسان اور خشک کرنے والی ہوتی ہے[1]، شاید ابن حوقل ایسے ہی موسم مین صقلیہ پہنچا ہو، وہ یہان کی آب و ہوا کا سخت شاکی ہے، اس کے خیال مین اس قدر خشکی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا ج ۵ ص ۲۰،

پیدا ہوتی ہے، کہ یہان کے باشندون کی دماغی حالت پر اثر پڑتا ہے، اور اخلاق و عوائد متاثر ہوتے ہین[1]، یہ باد سموم عہد اسلامی مین بھی چلتی تھی، اور کسی سال مضر اثرات دکھاتی تھی[2]،

کوہستانی سلسلے

یہان پہاڑون کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے، خصوصاً دو وسیع سلسلے شمال مشرق مین ہین، اور یون تو پورے جزیرے مین کوہستانی علاقے ہین[3]، ادریسی اور یاقوت نے تقریباً ۲۰ پہاڑون کے نام گنائے ہین، عرب مورخین اور جغرافیہ نویسون کو کوہ اٹنا سے بڑی دلچسپی رہی ہے، اس کے متعلق مختلف دلچسپ روایتین لکھی ہین[4]، اسلامی عہد مین اس کی آتش فشانی جاری تھی، مقدسی (۳۷۶ھ) لکھتا ہے "ہر دس برس مین ایک مرتبہ چار مہینون تک آتش فشانی ہوتی ہے[5]" ابو علی حسن بن یحییٰ کا بیان ہے، "آج کل اس کی آتش فشانی جاری ہے[6]"۔ ابن جبیر نے بھی دھوان نکلتے دیکھا ہے[7]، یہان کے پہاڑون کی بلندی کچھ زیادہ نہین، ہر طرف

۱؎ ۔ معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۵،

۲؎ ۔ تاریخ جزیرہ صقلیہ من حین دخلها المسلمون درراماری ص ۱۷۰،

۳؎ ۔ فریمان سسلی ص ۱۷ و انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ج ۲۵ ص ۲۱ طبع یازدہم،

۴؎ ۔ معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۴، عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات درراماری ص ۱۳۹، تحفۃ الالباب ونخبۃ الاعجاب درراماری ص ۱۷۴، کتاب الاشارات فی معرفۃ المزارات درراماری ص ۵،

۵؎ ۔ احسن التقاسیم ص ۲۴۱، ۶؎ ۔ معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۵، ۷؎ ۔ رحلہ ص ۳۲۷،

سے چڑھ سکتے تھے، سطح بھی اس قدر ہموار اور مٹیالی کہ عمدہ زراعت ہوسکتی تھی، پہاڑون سے چشمے جاری تھے، ابن جبیر نے صرف ایک پہاڑ مین چار سو چشمے دیکھے[1]،

دشت وجنگل عہد اسلامی کے آغاز مین بہ کثرت جنگل، یہان کے پہاڑی سلسلون اپلیٹو، اور ہموار زمین مین لگے ہوتے تھے جن مین غیر بارآور درختون کی کثرت تھی[2]،

دریا پہاڑون کی کثرت کی وجہ سے دریا اور نہرین بہ کثرت تھین، یہ دریا بعض بحر روم سے جا ملے تھے۔ اور بعض ایک دوسرے مین مل گئے تھے، ادریسی کے استقصا سے موخر الذکر قسم کے دریاؤن کی تعداد ۲۳ نکلتی ہے، جو اپنے علاقے کو سیراب کرتے تھے، اس نے ہر ایک کے سرچشمہ، دہانہ اور مسافت کو لکھا ہے، بحر روم مین ملنے والے دریا ۱۳ تھے، ان سے بحر روم کی بڑی کشتیان اندرون ملک مین پہنچ سکتی تھین[3]،

معادن معادن مین سونے، چاندی، پارہ، سیسے، اور لوہے کی کانون کا پتہ چلتا ہے، کوہ آتش فشان سے پھٹکری، معدنی نمک، سرمہ، نوسادر، گندھک اور نفت حاصل ہوتا تھا، قیمتی پتھرون مین سنگ یشب، اور مرمر قابل ذکر ہین، مونگا یہان کے ساحلی سمندر مین موجود تھا[4]،

---

[1] نزہۃ المشتاق ص ۴۲، رحلہ ابن جبیر ص ۳۳۵، [2] معجم البلدان ص ۳۷۵،

[3] نزہۃ المشتاق ص ۲۳ تا ۲۵ و کتاب المسالک والممالک ابن حوقل ص ۸۳، ۸۴،

[4] آثار البلاد قزوینی ۱۴۲، معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۴، ۳۷۵، نخبۃ الدہر دراماری ص ۱۴۶، کتاب التنبیۃ الاشراف مسعودی ۵۹، جغرافیہ زہری دراماری ص ۱۶۰،

حیوانات ونباتات

پالو جانورون مین گائے، بکری، مرغابیان، مینڈھے، خچر، گدہے، گھوڑے تھے، وحشی جانور اگرچہ موجود تھے، مگر عرب مورخین استعجاب سے لکھتے ہین، کہ شیر، چیتا، بھیڑئے سانپ. بچھو اور یہان تک کہ چیونٹے بھی موجود نہین ہین. مچھلیون کے لئے یہ جزیرہ مشہور تھا، بنیاذہ، اورطرابنش کے ساحل پر غیرمعمولی قد کی مچھلیان ہوتی تھین، نباتات مین ہرقسم کے غلون، اورمیوؤن کے علاوہ بعض قیمتی جڑی بوٹیان پیدا ہوتی تھین[1]،

پیدائش دولت

ان قدرتی ذخائر سے مسلمانون نے پیدائش دولت کے مواقع بہم پہنچائے اوران کی کوششین قدرتی ذخائر سے فائدہ اٹھاکر ملک مین زراعت، صنعت اورحرفت کوترقی دینے مین ظاہر ہوئین،

زراعت

یہان کی زرعی کوششون مین ان قدرتی ذخائر کے اثرات دوشکلون مین ظاہر ہوتے، دریاؤن، اورنہرون کی روانی، چراگاہون کی وسعت، اورملک کی نباتی نشوونما کی عمدہ استعداد سے زراعت کے لئے عمدہ پہلو نکلتے، اورجنگلون اور پہاڑون کی کثرت، کوہ اٹنا کی آتش افشانی اور بادسموم کے جھونکون سے زراعت کونقصانات پہنچتے تھے،

[1] معجم البلدان ج ۵ ص ۲۰۷، آثارالبلاد قزوینی ص ۳۴۳، المسالک والممالک ابن حوقل دراماری، خریدۃ العجائب ابن وردی، دراماری ص ۱۵۸، نزہۃ المشتاق ادریسی ذکرشہر لنبیاذہ وطرابنش،

مسلمانون نے ان کے افادی پہلوون سے استفادہ کیا، اور ضرر رسان پہلوؤن اور مواقع کو دور کرنے کی کوشش کی، اور زراعت کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے، چنانچہ غیر آباد قلعون کو آباد کرکے بنجر زمینون کو آباد کیا، کوہستانی علاقہ کی قابل کاشت زمینون مین کاشت کی، پہاڑ کی ہموار اور ٹیلائی سطح کو قابل زراعت بنایا، اور باغ لگائے، مثلاً اصطخری لکھتا ہے :-

"اور کوہ فلان تو وہ ویران پہاڑ تھا، اس مین چشمے اور زمین موجود تھی، چنانچہ مسلمانون کا ایک گروہ پہنچا، اور اس کو آباد کرلیا[1]"

اسی طرح ابن جبیر کہتا ہے :-

"یہان کے تمام پہاڑ بار آور باغ ہین[2]"

لیکن کوہ اٹنا کی آتش افشانی کا تدارک قدرت انسانی مین نہ تھا، ابو علی حسن بن یحیٰی کا بیان ہے، "آج کل اس کی آتش افشانی جاری ہے، جس کی وجہ سے اس کے مضافات مین کسی قسم کی زراعت نہین ہوسکتی[3]" اسی طرح کبھی دریاؤن مین سیلاب آجاتا، اور ان کے ایک دوسرے کے قریب ہونے کی وجہ سے علاقہ کا علاقہ تہ آب ہو جاتا، کبھی باد سموم کے جھونکون سے پوری فصل برباد ہو جاتی، باغون کے پھل گر جاتے، اور کبھی سیاسی انقلابات سے بھی ایسا قحط پڑجاتا، کہ لوگ اپنے بچون تک کو بھون کر کھا جاتے، سنہ ۲۲۷ھ

---

[1] کتاب المسالک والممالک اصطخری ص ۷۱،

[2] رحلہ ابن جبیر ص ۳۲۴، [3] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۵،

مین سب فاطمیون کے خلاف بغاوت تھی ، اسی قسم کی نوبت پہنچی تھی ،[۱]

لیکن ان آفات ارضی وسماوی اور اتفاقی حادثات کو الگ کر دینے کے بعد مجموعی حیثیت سے مسلمانون نے یہان کی زراعت کو حیرت انگیز ترقی دی ، یہی وجہ ہے کہ اس عہد مین اس کی سرسبزی و شادابی ایسی نمایان تھی ، کہ اکثر جغرافیہ نویسون نے اس کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے ، مثلاً ابن حوقل لکھتا ہے ، " یہان پہاڑ اور قلعے زیادہ ہیں ، تمام زمین مزروعہ ہے[۲]"۔ اصطخری لکھتا ہے ، " صقلیہ مین سرسبزی وشادابی ، وسعت رزق ، و زراعت ، اور مویشی وغیرہ اس قدر زیادہ ہیں ، کہ اس کو تمام ساحلی اسلامی ممالک پر تقدم و فضیلت حاصل ہے[۳]"۔ ابن جبیر بلرم کے ذکر مین لکھتا ہے ، " یہ شہر سرسبزی اور وسعت رزق مین اپنی انتہا پر ہے ، بلکہ ایک سرے سے پورا جزیرہ اپنی سرسبزی و شادابی اور وسعت رزق مین حیرت انگیز ممالک مین ہے[۴]" ، اور ادریسی نے تو یہان کے چپہ چپہ کا ذکر کیا ہے ، اس کو استقصا سے دیکھیئے ، ایسے کم مقامات نظر آئینگے ، جہان کی زراعت اچھی نہ بتائی ہو ، کہین لکھتا ہے ۔" ومزارع نامیۃ وجنات کثیرۃ "۔ یہان بڑھنے والی کھیتیان اور بکثرت باغ ہین ، کہین صرف یہ ہے ، " ولھم اجنّۃ کثیرۃ " ، اور ان کے بکثرت باغات ہین ، کسی جگہ ہے ، " بھا میاہ جاریۃ علیھا مزارع " یہان روان

---

[۱] ۔ تاریخ جزیرہ صقلیہ من حین دخلھا المسلمون درامادی ص ۱۷۰ ، ۱۷۳ ،

[۲] ۔ کتاب المسالک والممالک ص ۸۴ [۳] ایضاً ص ۱۷۰ ، [۴] ۔ رحلہ ابن جبیر ،

پانی ہے ، اور اس کے ساحل پر زراعت ہوتی ہے)

جاڑے اور گرمی دونوں موسموں میں زراعت ہوتی تھی[1] فصلی چیزوں میں غلے ، میوے ، اور ترکاریاں تھیں ، غلوں میں گیہوں ، چنا ، مٹر وغیرہ ترکاریوں میں کدو ، بیگن ، ککڑی ، اور پیاز وغیرہ خصوصاً بیگن اور پیاز کی کاشت کا یہاں مخصوص طریقہ رائج تھا ، ان کو ابن العوام اشبیلی نے تفصیل سے درج کیا ہے ، اور تحسین کی ہے ، زعفران بھی یہاں کی پیداوار میں ہے ، یہاں کی خبازی بھی جو خبازی صقلی کہلاتی ہے ، لائق ذکر ہے ، ابن العوام نے اس کی کاشت کا مکمل طریقہ بھی لکھا ہے[2] ، خشک و تر میووں میں سیب ، انگور ، اخروٹ ، چلغوزے ، ناشپاتی ، انجیر ، نارنگی ، لیموں ، زیتون بادام ، شفتالو ، ناریل ، کھجور وغیرہ ہیں ، لکڑیوں میں شاہ بلوط ، اور صنوبر وغیرہ کی لکڑیوں کی پرداخت ہوتی تھی ، خوشبودار و خوشنما درختوں اور پھولوں میں گلاب ، بنفشہ ، مہندی ، سرو اور اسی طرح کے چند اور نام ہیں ، جن سے ہم مانوس نہیں ، ان کا اجمالی ذکر معجم البلدان (ذکر صقلیہ) میں اور مفصل تذکرہ اور پیداوار کے مقاموں کی تعیین ادریسی نے نزہتہ المشتاق میں کی ہے ،

مسلمان یہاں کی ملکی پیداوار کو ترقی دینے کے علاوہ غیر ممالک سے زرعی چیزیں لائے ، مثلاً کپاس کے درخت شام سے آئے ، روئی کا پودا

---

[1] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۴ ،

[2] کتاب الفلاحۃ درامار ی ص ۵۴۶ ، و معجم البلدان ج ۵ ص ۳۰۴ ،

سرزمین یورپ مین پہلی مرتبہ صقلیہ اور اندلس کے ذریعہ پہنچا ، ابن سعید، ابوعبداللہ محمد بن ابوبکر زہری ، ادریسی اور ابن العوام اشبیلی نے تذکرہ کیا ہے ، اور اس کی کاشت مین اہل صقلیہ کے بعض اصول بیان کئے ہین ، نیشکر کی کاشت عربون نے اہل چین سے سیکھی ، افریقہ مین پہلے طرابلس الغرب ، اور وہان سے صقلیہ لائے ، اسی طرح غیر ممالک کی حسب ذیل زرعی چیزین مسلمانون کے ذریعہ صقلیہ مین داخل ہوئین ، لیمون ترش ، شیرین ، خربوزہ ، شفتالو اور عقاقیر طبیہ وغیرہ[۱] ،

صنعت و حرفت

صنعت و حرفت کی ترقی کا مدار اس عہد مین رسل و رسائل اور باربرداری کے وسیع نظام نہ ہونے کے باعث ملک کے قدرتی ذخائر و خام پیداوار پر تھا ، مسلمانون نے یہان کے معدنون ، پہاڑون ، جنگلون ، دریاؤن اور سمندر سے انتفاع کیا ، معدنیات کے انتفاع سے کان کنی اور آہنگری کے پیشون کا رواج تھا ، چاندی ، لوہا ، تانبا ، گندھک ، اور نمک نکالتے تھے ، پہاڑون سے سنگتراشی اور جنگلون سے نجاری کے پیشے قائم تھے ، ان صنعتون اور مصنوعات کا ذکر ادریسی وغیرہ نے کیا ہے ، نباتی اشیا مین قابل ذکر یہان کی کاغذسازی ہے ، ایک قسم کی گھانس بر بیر سے کاغذ بناتے تھے ، ابن حوقل کا بیان ہے ، " اسی گھانس

[۱] - کتاب الجغرافیہ زہری در اماری ص ۱۵۹ ، کتاب الفلاحہ اشبیلی در اماری ص ۲۴۵ ، نزہۃ المشتاق ادریسی ص ۳۵ ، تاریخ الزراعۃ فی بلاد العالم العربی در المجمع العربی دمشق ج ۷ ، ص ۱۱۲ وغیرہ ،

سے مصر مین بھی کاغذ بناتے ہین ۔ اب تک مصری کاغذ سے بہتر کوئی دوسرا کاغذ دیکھنے مین نہین آیا تھا ، یہان بھی اسی نمونہ کا کاغذ تیار ہوتا ہے[1]" ابوالفدا نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے[2] ، مختلف نبات اور پھل پھول سے دہنیات و عطریات کی کشید ہوتی تھی[3] ، صقلیہ کے شاداب انگور مشہور تھے ، مسینا مین شراب کی کشید ہوتی تھی[4] ، انگور کے شیرے سے فالودہ کی قسم کا ایک قوام مصنب تیار کرتے تھے ، یہ صقلیہ ہی کی خاص صنعت تھی ، اس کے تیار کرنے کا نسخہ اور اجزا ابن العوام نے بیان کئے ہین ، آخر مین لکھتا ہے " صقلیہ مین اسی طرح تیار کیا جاتا ہے ۔ اور اس کا یہی صحیح نسخہ ہے ، ابن بسال کا بیان ہے کہ اس قسم کے قوامون مین اس سے بہتر قوام مین نے نہین دیکھا[5]"

عربون کے اشیائے خوردنی مین ایک قسم کا حلوا یا مٹھائی آطریہ تھی ، یہ بلرم مین تیار کیا جاتا تھا[6] ،

گھانس کی عمدہ چٹائیان بھی بنی جاتی تھین ، ابن جبیر کہتا ہے " اس سے عمدہ بنی ہوئی چٹائی دیکھنے مین نہین آئی[7] ، دریا اور سمندر سے ماہی گیری و صدف ریزی

---

[1] ۔ کتاب المسالک والممالک ابن حوقل ص ۱۸۵ ، [2] ۔ تقویم البلدان ،

[3] کتاب الهدی ابن سعید در اماری ص ۱۳۷ و جغرافیہ ابوبکر زہری در اماری

[4] ۔ تقویم البلدان ص ۱۹۳ ،

[5] کتاب الفلاحہ در اماری ص ۵۴۷ ،

[6] ۔ نزہۃ المشتاق ،

[7] ۔ رحلہ

کو ترقی ہوئی[۱] ، ابن الوردی لکھتا ہے ، " اس کے سمندر کے ساحل پر مونگا نکالا جاتا ہے ، جو گویا سمندر کے ساحلی کنارے پر زمین کی طرح اگتا ہے[۲] "

ریشم کے کیڑون کی پرورش انجیر کے درختون پر کرتے تھے ، یہ طریقہ مسلمانون نے اندلس مین رائج کیا ، وہان سے صقلیہ لائے ، ان کیڑون اور روئی کی پیداوار سے پارچہ بافی کو ترقی ہوئی ، مسلمانان صقلیہ کا یہ پیشہ درجۂ کمال پر تھا ابن حوقل نیپلز کے کپڑون کے متعلق لکھتا ہے ، "مین نے تمام اقطار عالم مین اس کپڑے کے مانند کوئی کپڑا نہین دیکھا ، اور نہ ایسے کاریگر تمام روے زمین پر[۳] " ، اسی طرح مقدسی نے یہان کے ایک قسم کے کپڑے کا تذکرہ کیا ہے ، جو ایک دن مین کئی رنگ بدلتا تھا[۴] ، یورپین مورخین کو اعتراف ہے ، کہ کپڑے بُننے کا فن یورپ نے صقلیہ سے سیکھا[۵] اسی طرح کہتے ہین کپڑے رنگنے کا فن یورپ نے صقلیہ سے سیکھا[۶] ، فن رنگسازی پر ایک صقلی اہل علم نے ایک کتاب بھی لکھی ہے ، جو ٹیونس کے کتب خانہ مین موجود ہے ،

فن تعمیر

فن تعمیر اگرچہ فنون جمیلہ کی ایک شاخ ہے ، تاہم صنعت کے لحاظ سے یہان بھی اس کا تذکرہ ناموزون نہ ہوگا ،

تعمیر کے لئے جن مسالون کی عموماً ضرورت پڑتی ہے ، وہ ہر جگہ کم و بیش پائے جاتے ہین ، اس لئے عہد قدیم سے اکثر متمدن اقوام اپنا کوئی نہ کوئی طرز

---

۱ - نزہۃ المشتاق ص ۲۶ ، ۲ - خریدۃ العجائب ص ۱۸۵ در اماری ،

۳ - المسالک و الممالک در اماری ص ۱۱ ، ۴ - احسن التقاسیم ص ۲۴۰ ،

۵ - تاریخ عرب سدیو ص ۶ - تمدن عرب لیبان ص ۲۸۲ ،

رکھتی تھیں۔ جن میں سے تعمیر کے مختلف فارسی، مصری، یونانی اور رومی طرز وغیرہ عہد اسلامی کے آغاز میں بھی موجود تھے، مسلمانوں نے ان میں اپنی ذہنی استعداد سے اضافے کئے، جن سے ایک مخصوص "اسلامی طرز تعمیر" کی بنا پڑی،

مسلمانوں کے داخلۂ صقلیہ کے وقت تک اسلامی طرز تعمیر کی بنا پڑ چکی تھی، وہ صقلیہ میں مشرقی طرز ملے ہوئے اسلامی طرز کو اپنے ساتھ لائے، اور یہاں یونانی، رومی اور بیزنطی طرزوں کے مشاہدہ کا موقع ملا، اور اپنی استعداد سے مشرقی و مغربی طرزوں میں آمیزش کی، اور ایک مستقل طرز کے بانی بنے، جس کو لیبان "صقلیہ کا شرقی عربی طرز" کہتے ہیں[۱]۔

صقلیہ کے اسلامی طرز کے چند خصوصیات بیان کئے جاتے ہیں، مثلاً مسلمانوں نے عمارتوں میں سب سے پہلی مرتبہ اسی صقلیہ میں اینٹ کے بجائے پتھر استعمال کئے، جس کو انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ "تاریخ فن تعمیر" میں اسلامی فن تعمیر کی تفصیل میں بیان کیا گیا ہے[۲]،

دوسری خصوصیت ستونی طرز (Column) کو صقلیہ میں معراج کمال پر پہنچانا ہے، انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں ہے،

"یونانیوں نے ستونوں کی ایجاد کی، رومیوں نے ترقی دی،
مسلمانوں نے ان پر نوکدار محرابیں بنائیں، اور صقلیہ کے
مسلمانوں نے انہی عناصر سے ایک بلند و حسین طرز ایجاد کیا،

---

[۱] تمدن عرب ص ۵۰۱۔ [۲] انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ج ۲ ص ۳۲۴ طبع یازدہم،

جو مختلف حیثیات سے پرشوکت وشان، سادہ اور حسین وجمیل تھا[1]،

اسی طرح آرائشی طاقچون کا استعمال یہان دسوین، گیارھوین صدی عیسوی مین پایا جاتا ہے، اسلامی عہد مین دیوارون پر مختلف نقش ونگار بناتے، خوبصورت مصنوعی بیلین چڑھائی جاتین، اور خط کوفی و طغری مین آیات قرآنی لکھی جاتین[2]،

سسلی مین جب تک مسلمان موجود رہے، اسلامی طرز تعمیر اور مسلمان معمارون کو مقبولیت حاصل رہی، نارمن خود کسی تمدن کے حامل نہ تھے، وہ تقریباً ایک ہی زمانہ مین انگلستان اور سسلی دونون جگہ آئے، انگلستان مین تو انہین اپنے اس طرز کو رواج دینے کا موقع ملا، جسے انہون نے لمبارڈ اور فرانسیسیون سے حاصل کرلیا تھا، مگر صقلیہ مین انسائیکلو پیڈیا بریطانیکا کے مقالہ نگار کے بقول انہین کسی قسم کے اضافہ و ترمیم کی ہمت نہین ہوئی، حالانکہ انگلستان اور سسلی کے باہم تعلقات موجود تھے، اور وہ یہان انگلستان کے جدید نارمن طرز کو رواج دے سکتے تھے، لیکن یہان انہون نے جتنی عمارتین بنوائین، وہ سب مسلمان معمارون اور مہندسین ہی کے ہاتھون تعمیر ہوئین، چنانچہ پلرمو، مونریل، سیفلو، اور مسینا کے شاہی محل اور گرجے خالص اسلامی طرز کے ہین،

صقلیہ مین عہد اسلامی کی مشہور عمارتین قصر زیزہ، قو بع قصر سعد، و جعفر اور چند مساجد بلرم و ثرمہ وغیرہ ہین، اور نارمن عہد کے اسلامی طرز کی عمارتون مین قصر ابیض و کنیسہ انطاکی وغیرہ معروف ہین،

---

[1] ج ۹ ص ۵۵ ۵ طبع یازدہم، [2] رحلہ ابن جبیر، تمدن عرب ص ۴۸۴،

قصر زیزہ، بلرم کا مشہور قصر تھا۔ یورپ کے مورخین اس کا بالعموم اسی نام کے ساتھ تذکرہ کرتے ہین[۱]، لیکن عربی ماخذون مین اس نام کا کوئی قصر مذکور نہین لسان الدین ابن الخطیب نے ایک قصر عزیز کا نام لیا ہے، خیال ہوتا ہے زیزہ اسی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے، قصر عزیز خلیفہ فاطمی العزیز کی طرف منسوب تھا لسان الدین ابن الخطیب نے ۳۷۲ھ کے ذیل مین اس کا تذکرہ کیا ہے اور العزیز کا سال جلوس ۳۶۵ھ ہے، اس لئے قصر عزیز کی تعمیر کا زمانہ ۳۶۵ھ سے ۳۷۲ھ کے اندر ہے، جن کے مطابق عیسوی سنین ۹۷۵ء سے ۹۸۲ء ہوتے ہین، موسیو لیبان بھی زیزہ کا زمانۂ تعمیر دسوین صدی عیسوی قرار دیتے ہین[۲]، لیکن ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہین، اس کو تھیوڈوسس راہب نے جو ۸۶۵ء کی سیراکیوز کی جنگ مین گرفتار ہو کر بلرمو گیا تھا، دیکھا تھا[۲] شاید لیبان کی مسامحت ہو، جس کی تصحیح انھی کے محولہ بالا بیان سے ہو جاتی ہے تھیوڈوسس نے بلرم کے کسی دوسرے قصر کا تذکرہ کیا ہوگا، جس کو زیزہ پر منطبق کیا گیا، ورنہ دسوین صدی کی عمارت نوین صدی مین کیونکر دیکھی جا سکتی ہے اس لئے اگر زیزہ دسوین صدی کی عمارت ہے (جس کی عربی ماخذ سے تائید و تطبیق ہوتی ہے، اور بظاہر تغلیط کی کوئی وجہ موجود نہین) تو وہ صقلیہ کے عہد کلبی کا قصر عزیز ہی ہے[۳]،

---

۱ - انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا ج ۲، ص ۴۲۳، مقالہ فن تعمیر طبع یازدہم، تمدن عرب ص ۲۸۲، ۴۹۴

۲ - اعمال الاعلام دریادگاری ج ۲ ص ۴۷۸، تمدن عرب ص ۴۹۲،

۳ - اسی لئے مین نے اس کا اردو املا، تمدن عرب کے اردو املا "ضیزہ" کے بجائے "زیزہ" اختیار کیا، جو "عزیز" یا "العزیز" سے زیادہ قریب ہے،

قصر لوبع کا تذکرہ بھی جو اسی کے پاس ہے، یورپین مورخین کے یہان آیا ہے، اس کے متعلق بھی عربی ماخذون سے بعض احتمالات پیش نظر ہین، لیکن ابھی وہ اس لائق نہین، کہ پیش خدمت ہون، لیبان نے ان قصرون کے کھنڈر دیکھے تھے، نقشہ کھینچا ہے، ادریسی نے بلرم کے بعض قصرون کا پرشکوہ الفاظ مین تذکرہ کیا ہے، اگرچہ نامون کی تصریح نہین، مگر جائے وقوع اور صفات کے لحاظ سے بہرصورت انہی قصرون کا تذکرہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح ابن جبیر صقلیہ کے ان شاہی محلون کی تعریف و توصیف مین رطب اللسان ہے، جن مین نارمن فرمانروا سکونت پذیر تھا، اور یہ تحقیق معلوم ہے، کہ ان مین سے بقول ادریسی بجز ایک قصر کے جسے راجر دوم نے تعمیر کرایا تھا، سب کے سب عہد اسلامی کی یادگار تھے۔ افسوس ہے، کہ ادریسی اور ابن جبیر کے اقتباسات پڑھنے کا موقع نہین کہ ان قصرون کی جلالت شان کا صحیح اندازہ ہوتا[1]،

قصر سعد بلرم سے ایک فرسخ پر واقع تھا، ابن جبیر کے بیان کے رو سے اس کا طرز تعمیر اس قدیم وضع کا معلوم ہوتا ہے، جو مسلمانون نے ابتدا جزیرہ مین رائج کیا، قصر مین داخلہ کے لئے لوہے کا ایک پھاٹک تھا، اور اندر کشادہ اور وسیع قیام گاہین اور دومنزلہ عمارتین تھین، قصر کے بلند حصہ پر ایک مسجد تھی، جو ابن جبیر کے بقول دنیا کی خوبصورت ترین مساجد مین تھی، قصر کے سامنے ایک کشادہ سڑک تھی، جو قصر کے چارون طرف گھومتی تھی، ابن جبیر کے

---

[1] ۔ نزہتہ المشتاق ادریسی ص ۲۳؛ رحلہ ابن جبیر ۳۳۳، گب،

عہد تک یہ قصر اچھے حال مین تھا ،

قصر جعفر - قصر سعد سے ایک میل پر واقع تھا ، یہ بھی اپنے طرز اور خصوصیات مین اسی کے مثل تھا ، ابن جبیر کے عہد تک اس کے فوارہ سے پانی اچھلتا رہتا تھا[1] ، بہ ظاہر یہ دونون قصر عہد اغالبہ کی یادگار تھے ، اور کیا عجب کہ تھیوڈوسس نے انہی کا نظارہ کیا ہو ،

ابن جبیر نے بلرم اور بعض دوسرے شہرون کی مسجدون کی تعریف کی ہے، جن مین سے بعض کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے ، کہ ان مین شیشے اور تانبے کی چالیس قندیلین آویزان تھین ، اور اسی نے نارمن عہد کی بعض اسلامی طرز کی عمارتون ، قصر ابیض ، مسینا ، اور کنیسہ انطاکی بلرم کی بھی تعریف کی ہے خصوصاً کنیسہ انطاکی کی بیحد توصیف کی ہے ، اس مین سونا پانی کی طرح بہایا گیا تھا ، سنہری ، روپہلی ، قلعی ، طلائی پچی کاری ، رنگ آمیزی اور قیمتی رنگین پتھرون کے استعمال وغیرہ قابل ذکر ہین ، یہ سب کچھ مسلمان مہندسین اور معمارون ہی کے موئے قلم کے یادگار شاہکار تھے[2] ،

صقلیہ کے عہد اسلامی کی یادگارین جس طرح مٹائی گئین ، بقول بعض عیسائی مورخین اس کی مثال دوسری جگہ نظر نہین آتی ، جو یادگارین باقی رہ گئی ہیں ، ان پر ایک مقالہ پروفیسر اے ، سیلیتس نے یادگاری مضامین اماری مین

---

[1] - رحلہ ابن جبیر ص ۳۲۹ گب ،

[2] - ایضاً ص ۳۳۲ ، ۳۳۳ گب ،

لکھا ہے، جس کے مباحث زبان کی اجنبیت کے باعث ابھی تک معلوم نہ کر سکا[1]، چند دیواروں، کھڑکیوں، اور محرابوں کی، تصویریں بھی چھاپی ہین، عمارتون کے یہ ٹکڑے سسلی کے عجائب خانے مین محفوظ ہین، ان تصویرون مین بعض مخروطی شکل کی ہین، بعض مستطیل ہین، اور بعض نکیلی معلوم ہوتی ہین، محرابون کی ساخت سے پتہ چلتا ہے، کہ پتھر کی ترشی ہین، کھڑکیان بھی سنگی اور جالی دار ہین، جالیون کے اقسام پر تو عبور نہین، تاہم سب ایک دوسرے سے مختلف ہین، بعض بظاہر بھدی شکل کی ہین، لیکن اکثر کی تراش خراش، خوبصورت، نازک اور اپنے اندر کشش رکھنے والی ہے، جن پر بے ساختہ نگاہ اٹھ جاتی ہے، بعض ٹکڑون مین آیات قرآنی مثلاً "نصر من اللہ و فتح قریب" پاکیزہ خط مین نقش ہین، بعض نقش خط طغرا مین ہین، اور بعض کلیساؤن کی تصویرین بھی چھپی ہین، یہ مختلف ٹکڑے مختلف شہرون بلرم (پلرمو) طبرمین (ٹاورمینا) سرقوسہ (سیراکیوز) اور مسینا کی مختلف عمارتون کے ہین[2]،

[1] - اسی طرح شاک اور بیکر نے سسلی کے اسلامی فن تعمیر پر جو کچھ لکھا ہے ابھی تک وہ نظر سے نہین گذر سکا، ڈاکٹر سر اقبال، ڈاکٹر برکت علی قریشی، پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور، اور ڈاکٹر حسین ہمدانی سورت کا شکر گذار ہون، کہ ان مین سے اول الذکر نے اس خطبہ کی قرات سے پہلے زبانی گفتگو مین شاک کی تصنیف کے دیکھنے کی ہدایت فرمائی، اور موخر الذکر دونون اہل علم نے اس خطبہ کی قرات کے بعد جن مین تمہیداً ماخذون کو بھی بتایا گیا تھا، ان دونون کی کتابون سے مقرر کو آگاہ کیا،

[2] - یادگاری مضامین ورا ماری ج ۲ ص ۴۹۵، ۵۰۸،

مہندسین صقلیہ

صقلیہ کے ترقی یافتہ اسلامی فن تعمیر کے لحاظ سے یہان کے مہندسین و باکمال معمارون کی کثیر تعداد ہونی چاہیئے تھی، مگر اس وقت تک اہل صنعت کے طبقات و تراجم کا رواج نہ تھا، اس لئے صرف ایسے چند مہندسین کے نام معلوم ہوسکے، جنھون کسی دوسرے علم مین کمال حاصل تھا، یا کہین کہین بعض ایسے نام نظر آئے، جن کا تذکرہ اسلامی ممالک کی بعض عمارتون کے ضمن مین آگیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ دوسرے اسلامی ممالک مین بھی ان کے خدمات کی قدر تھی، جن مہندسین کے نام معلوم ہوسکے، ان کی مجموعی تعداد صرف ۸ ہے، جن مین سے بعض جامع اشبیلیہ، فصیل طرابلس الغرب، رسدخانہ مصر، اور جامع طرابلس الغرب وغیرہ کے معمار ہین، ان کے تذکرے کے لئے دیکھئے خطط مقریزی (ج ۱ ص ۲۰۶) اخبار مصر ابن میسر (ج ۲ ص ۶۴) رحلۃ التیجانی (در اماری ص ۳۸۸، ۳۹۰) اخبار العلماء باخبار الحکماء قفطی (ص ۱۸۹) الحان المسلیہ ابن سعید (در یادگاری مضامین ج ۱ ص ۲۹۵) اور خریدۃ القصر اصفہانی (در اماری ص ۵۹۶)

مال غنیمت

صقلیہ مین مسلمانون کے لئے پیدائش و حصول دولت کا ذریعہ لڑائیون کا مال غنیمت بھی تھا، مین اس موقع پر صقلیہ کے اسلامی و عیسوی محاربات کے اسباب و علل اور ان کی تفصیلات مین نہ جاؤنگا، کہ اس کا تعلق سیاسیات سے ہے، مجھے صرف کہنا یہ ہے، کہ ان لڑائیون کا سلسلہ مختلف اسباب و علل کے باعث قریب قریب قائم رہتا، یہ لڑائیان صقلیہ کے رومی مقبوضات کے علاوہ زیادہ تر اٹلی مین پیش آتین، صقلیہ کے

عام مسلمان ان میں شریک ہو کر وافر دولت حاصل کرتے، کہ مال غنیمت کی قانونی تقسیم کے رو سے حکومت کے حصہ کے علاوہ عام مجاہدین کو بھی حصہ ملتا، صقلیہ کے مال غنیمت کی قدر و قیمت کا اندازہ بعض موقعوں کے مال غنیمت سے کیجئے، مثلاً ۳۱۳ھ/۹۲۵ء میں ابو جعفر احمد ابن عبید کی سرکردگی میں اٹلی کے مختلف شہروں پر حملے ہوئے، اور مال غنیمت جمع ہوا، ابو جعفر نے اس میں سے ایک واجب حصہ خلافت فاطمی کے دربار میں نذر کیا، عبیداللہ فاطمی کے ایک خادم نے دربار میں زر و جواہر، بیش قیمت ریشم، اور دولت و ثروت کا انبار دیکھ کر ابو جعفر کی دیانت کی تعریف کی، تو عبیداللہ نے روک کر کہا "بخدا اس نے اونٹ کے دو کانوں کے سوا مجھے کچھ نہیں دیا"[1]،

اسی طرح صقلیہ کے مختلف شہروں قصریانہ و سرقوسہ وغیرہ کی فتح میں بے دریغ دولت ہاتھ آئی[2]، اور اٹلی پر عہد اسلامی کے زوال سے کچھ ہی پہلے تک مسلسل حملے ہوتے رہے، اور مشکل سے ایسا حملہ کوئی ہوگا، جس میں وافر دولت نہ ملی ہو،

تجارت

تجارت، پیدائش و حصول دولت کا متعارف ذریعہ ہے، اس میں پہلی ضرورت ذرائع آمد و رفت اور بار برداریوں کی آسانیوں کی ہوتی ہے، ذرائع آمد و رفت میں بری و بحری دونوں راستے تھے، ایک شہر سے دوسرے شہر تک کی سڑکیں صاف، کشادہ نہیں، جن پر پتھر بچھائے گئے

---

[1] - البیان المغرب (ترجمہ اردو) ص ۲۶۵،

[2] - ابن اثیر ج ۷ ص ۴۲، ۴۳، ۲۲۲، اعمال الاعلام در یادگاری ج ۲ ص ۴۷۴،

تھے[1] بحری راستہ دوسرے ممالک سے تھا، نیز اندرون ملک کے دریاؤن مین بھی کشتیون سے آمد و رفت قائم تھی، یہی وجہ ہے، کہ صقلیہ کے عہد اسلامی مین یہان بکثرت بندرگاہین تھین، جن سے معاشی و اقتصادی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، ادریسی نے سب کو یکجا اور ان کی جائے وقوع اور ایک سے دوسرے تک کی مسافت بیان کی ہے، ان کی مجموعی تعداد ایک سو بارہ ہے[2]،

بار برداری کے ذرائع مین کشتیان، جہاز، جانور اور قلی تھے، اندرون ملک مین گھوڑون اور دوسرے جانورون پر سامان لادتے، اور لے جاتے، جہازون اور کشتیون پر جانور اور قلی دونون سامان لادتے تھے[3]

مبادلہ کی ضرورت حصول دولت و ارتفاع حاجت کے لئے ہوتی ہے جس مین تجارت کی ابتدا، منڈیون کا قیام، معیار تبادلہ کے لئے زر، ناپ اور تول کی تعیین، وسعت تجارت کے لئے دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات کا قیام، اور اسباب تجارت کے لئے درآمد، برآمد کا ہونا ضروری ہے،

تجارت کی ابتدا صقلیہ مین عہد اسلامی سے پیشتر محض غلہ کی تجارت تھی، اور اس کی تجارت بھی رومیون کے مصر فتح کرنے کے بعد ماند پڑگئی تھی، یورپین مورخین کے بقول مسلمانون نے یہان کی تجارت نئے سرے سے زندہ کی، اور زراعت صنعت اور حرفت کو ترقی دے کر

---

[1] - رحلہ ابن جبیر ص ۳۲۹، معجم البلدان ج ۲ ص ۲۶۹،

[2] - نزہتہ المشتاق ص ۷۵ تا

[3] - نزہتہ المشتاق و رحلہ ابن جبیر،

غیر معمولی تجارتی فروغ حاصل کیا[1]،

تجارتی منڈیان

مسلمانون نے یہان تجارتی منڈیان قائم کین جن سے مراد لین دین کا بازار ہے، یہ بازار دو قسم کے تھے، اندرون ملک مین خردہ فروشون کی دوکانین اور ساحل کی تجارتی گودیان جہان درآمد برآمد کا مال جمع ہوتا، صقلیہ کے اکثر شہرون مین کاروبار کا بازار گرم تھا، ادریسی نے مشکل سے کسی بڑے یا اوسط درجہ کے شہر کے متعلق مثلاً یہ نہ لکھا ہو، "وبھا اسواق جامعة لاصناف الصنائع وضروب المتاجر" یہان ایسے بازار ہین، جس مین صنعت و تجارت کی ہر قسم کی چیزین موجود رہتی ہین، یا "بھا الاسواق العامرة" یہان معمور بازار ہین، بازارون کے لئے اہتمام کا انداز اس سے ہوتا ہے، کہ بلرم مین ہر صنف کے لئے جدا جدا بازار تھے، جن مین ایک ہی وضع کے مکانات بنائے گئے تھے[2]، اور درآمد برآمد کی بڑی گودیان شمال مشرق ساحل پر مسینا مین، جنوب مشرق مین سرقوسہ مین، مغربی ساحل پر مازر، اور اسی طرح بلرم، بیناؤ، طرابنش، لیاج، قرینس، میلاص اور شکلہ وغیرہ مین قائم تھین، ادریسی نے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کیا ہے، مثلاً مسینا کے متعلق لکھتا ہے،

"یہان تمام ساحلی ممالک روم سے آکر لنگر انداز ہوتی ہے، اور

---

[1] - سسلی از فرمیان تمدن عرب لیبان ص ۲۸۳،

[2] - نزہتہ المشتاق ص ۲۸، ۲۹، ۳۰، وغیرہ، والمسالک والممالک ابن حوقل ص ۸۵،

بڑے بڑے جہاز لنگر انداز ہوتے ہین ، اور تمام بلاد روم و ممالک اسلام کے تجار آتے ہین، سامان (تجارت) عمدہ اور آنے والون کی تعداد بہت ہے [1]"

زر - سکون مین عام معیار سونا تھا ، جو خواہ بغداد کا مسکوک ہوتا ، یا افریقہ یا اندلس کا ، تاہم افریقہ کا سکہ زیادہ روان تھا ، افریقہ کا سکہ دوسرے سکون سے کسی قدر مختلف بھی تھا ، اغالبہ کے بعد فاطمی سکہ روان تھا ، جو جنوب سے دمشق تک رائج تھا ۔ اس سکہ کا بلند درجہ دینار تھا ؛ پھر اس کا چوتھا ، آٹھوان اور سولھوان حصہ متعین تھا ، آخری حصہ کو خرنوبہ کہتے تھے [2] ۔ دونت قلبیہ نے اپنا سکہ بھی جاری کیا تھا ، جو غالباً افریقی دینار اور اس کے حصص کے مثل تھا ، اس کے ایک سکہ رباعی کی تصویر جرجی زیدان نے الہلال مین شائع کی تھی ، ان سکون پر کلمہ طیبہ سنہ ہجری اور فرمان روا کا نام مسکوک تھا ، نارمنون نے بھی اپنا سکہ اسی قسم کا سکہ مسکوک کرایا تھا ، راجر اول کے دربار مین تو کلمۂ توحید کے ساتھ کلمۂ رسالت بھی سکہ پر مسکوک ہوگیا تھا ، راجر دوم نے اقرار رسالت کو حذف کر دیا ، پھر پاپائے روما سے شاہ کا خطاب ملنے پر کلمۂ توحید بھی مٹا دیا گیا ، ان سکون پر فرمان رواؤن کے خطابات عربی ہی مین تھے ، راجر دوم کا نام یون تھا ، "المتعز باللہ الملك المعظم راجر الثانی" ولیم اول نے ذیل کے الفاظ کندہ کرائے ، "الهادی بامر اللہ الملك المعظم" اس کے عہد تک کے سکہ پر سنہ ہجری

[1] ص ۲۶ ۔ [2] احسن التقاسیم مقدسی ص ۲۷۰ ۔

مسکوک ملا ہے، یہ سکے پلرمو، اور اٹلی کے عجائب خانون مین آج بھی موجود ہین[۱]
ابن جبیر نے اس عہد مین دینار مومنیہ بھی یہان چلتے دیکھا[۲]،

ناپ تول کا معیار قفیز اور رطل پر قائم تھا، قفیز ۲۲ ثمن کا اور ثمن ۶ مد کا ہوتا تھا، مد عہد نبوی کا تھا، اور مد نبوی کہلاتا، مشرقی و مغربی رطلون مین فرق تھا، بعض چیزون کی تول ایک دوسرے رطل سے ہوتی تھی جو متعارف رطل سے، ا درہم کم تھا، تولنے کے باٹ شیشے کے ہوتے تھے[۳]،

غیر ممالک سے تجارتی تعلقات قائم تھے، یورپین مورخین کا بیان ہے، کہ اٹلی مین مسلمانون کی تجارتی کوٹھیان قائم تھین[۴]،

ادریسی صقلیہ کے مختلف شہرون کے متعلق لکھتا ہے، ویجہز الی قلوریہ وغیرہا بلاد النصاریٰ" یہان کا سامان قلوریہ، اور دوسرے عیسوی ملکون کو جاتا ہے[۵]،
اندلس سے بھی تجارتی تعلقات قائم تھے، فرمان روایان اندلس اپنے تجارتی جہاز صقلیہ بھیجتے[۶]، شمالی افریقہ کے ساحلی مقامات سے تو دن رات کی آمد و رفت تھی، دور کے شہرون سفاقس وغیرہ بھی تجارتی جہاز آتے جاتے[۷]،

---

۱ - مقالہ لی ہورتھس در یادگاری اماری ص ۱ ص ۳۰،

۲ - رحلہ ابن جبیر، ۳ - احسن التقاسیم ص ۲۷۰،

۴ - تاریخ عرب سدیو ص ۲۷۷، ۵ - نزہۃ المشتاق ص ۶۵۳،

۶ - مسالک الابصار ابن فضل اللہ الدمشقی در اماری ص ۶۵۳،

۷ - معجم البلدان ج ۵ ص ۸۲،

اس لئے دراصل صقلیہ اس زمانے مین مشرق ومغرب ایورپ وافریقہ اور یورپ وایشیا کی تجارت کا سنگم تھا، جس کا سلسلہ نارمنون کے عہد مین بھی قائم رہا، اور اس عہد مین بھی تجارت پیشہ زیادہ تر مسلمان ہی رہے، جو مختلف ملکون کو جہاز لے جاتے، ابن جبیر نے ایک دن طرابنش کے ساحل سے اندلس سبتہ اور اسکندریہ کے لئے تین جہاز ایک ساتھ کھلتے دیکھے، اور بیان کیا "سب جہازون پر مسلمان تاجر اور حاجی سوار ہین[1]۔

برآمد درآمد۔ یہان کے اشیائے برآمد مین غلہ کی مختلف قسمون کے علاوہ خشک وتر میوے، مچھلیان، شہد، مٹھائی یا حلوا، لکڑی، لوہا، مونگا، موتی، گندھک، نوسادر اور کپڑے وغیرہ ہین۔ جو چیز جس شہر کے مضافات کی پیداوار ہوتی، وہین کے بندر سے لادی جاتی، ادریسی نے سب کو نام بنام گنایا ہے، اور جو چیز جہان جاتی، اس کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً خشک وتر میوے، مچھلیان، افریقہ اور یورپ کو، شہد یورپ کو، نوسادر مصر کو، لیکن مقدسی کی روایت کے بموجب مصر مین صقلیہ کے نوسادر کی مانگ ۳۷۶ھ کے بعد قریب قریب بند ہوگئی تھی۔ بعض دوسری مصری چیزون سے اس کی ضرورت رفع ہونے لگی، اسی طرح مٹھائی یا حلوائے اطریہ یورپ کو جاتا، اور صقلیہ کا کپڑا تو قریب قریب اکثر متمدن ملکون مین جاتا تھا، یہان تک کہ دولت کلبیہ کے عہد مین صقلیہ کے اس مشہور کپڑے

---

[1] رحلہ ابن جبیر ص ۳۳۴۔

جو دن مین کئی رنگ بدلتا تھا، صرف شاہانہ ذوق انفرادیت سے ممنوع قرار دے دی گئی تھی، مقدسی لکھتا ہے،

صقلیہ.... سے نفیس کپڑے بھیجے جاتے ہین،..... اور سلطان نے دوسرے ملکون کو اس کپڑے کی برآمد ممنوع قرار دے دی ہے، البتہ جو اس سے چھپ چھپا کر لیجایا جائے[1]

(تقسیم دولت)

ملک مین زراعت، صنعت، حرفت، اور تجارت کے کاروبار سے آبادی کے مختلف طبقے کسان، زمیندار، صناع، تاجر، اور مزدور پیدا ہو گئے تھے، پھر نظام حکومت کے لحاظ سے عمال و ملازمین حکومت 'موالی' اور 'غلامون' کے طبقے تھے، لڑائیون کی شرکت کے لئے مجاہدین کی جماعت تھی، اور اسی معیار و فرق مراتب کے لحاظ سے ان مین دولت کی تقسیم تھی' اور اسی لحاظ سے امیر و غریب کے طبقے بھی قائم ہو گئے تھے،

(صرف دولت)

جس ملک کی زراعت، صنعت، حرفت اور تجارت اس درجہ فروغ پر ہو، اور اعلےٰ نظام حکومت قائم ہو، اس ملک کا معیار زندگی بہر حال بلند ہوگا'

---

[1] احسن التقاسیم مقدسی ص ۲۳۹، ۲۴۱، و نزہتہ المشتاق ذکر مدن صقلیہ،

اور تقسیم دولت کے اصول سے غریب طبقہ کو بھی اس قدر مہیا ہو جائیگا، کہ فارغ البالی کی زندگی بسر ہو،

پھر جب کسی قوم مین دولت و ثروات کی بہتات ہوتی ہے، تو تعیشات و تکلفات کے دروازے بھی کھل جاتے ہین، اور طرز زندگی کے محاسن سے ہر چیز مین خوش سلیقگی آجاتی ہے، اور فراغ بالی اور حسن معاشرت سے جمانی حسن و جمال بھی پیدا ہو جاتا ہے، عام معاشرتی بلندی کا اجمالی نقشہ بلرم کے تذکرہ مین گذرا ہے، حسن معاشرت و تکلفات و تعیشات اور اس سے ملک کی عام خوشحالی کا، ذیل کے دو عرب مورخین کے بیانون سے اندازہ لگائیے، صاحب کتاب ہیئۃ الاشکال الارض کا صقلیہ کے اسلامی عہد کے متعلق بیان ہے:-

"یہان کے لوگ اپنے ہمسایون کے درمیان، سامان، لباس اور دیگر حالات کے لحاظ سے صفائی و ستھرائی مین مشہور ہین، اور لوگون مین احسان، حسن صورت، معاشی اعتدال پسندی، مروت اور عمدہ معاشرت کی وجہ سے ممتاز ہین[1]"

اسی طرح ابن جبیر نے بلرم کی مسیحی عورتون کی ایک ٹولی کو سرِ راہ گذرتے دیکھا، اور اس متحرک گلدستہ کی تصویر چند خطوط کھینچ کر اتاری، اس کا بیان ہے، کہ ان عورتون نے مسلمان عورتون کا طرز زندگی اختیار کر لیا تھا، جس

---

[1] کتاب ہیئۃ اشکال الارض و مقادرہا فی الطول والعرض در امار ی ص ۱۲،

سے صقلیہ کی مسلمان عورتون کے پر تکلف طرز معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"اس شہر مین مسیحی عورتون کی وضع قطع بالکل مسلمان خواتین کے ایسی ہے، یعنی وہ بھی بڑی شان سے نکلتی ہین، سنہرے حریر کے کپڑون مین ملبوس، عمدہ، نرم، اور نازک، اور جواہر ٹکے ہوئے چادرون مین سمٹی سمٹائی رہتی ہین، جسم پر زرنار چادرین، اور چہرون پر رنگین نقاب اور پیرون مین سنہرے موزے ہوتے ہین، غرض مسلمان عورتون کی آرائش کے تمام سامانون، زیورون سے آراستہ مہندی لگائے، کپڑے عطر مین بسائے، اسی شان سے ایک دن گرجے کی طرف چلتی دکھائی دین[ا]"

بس یہی ہے صقلیہ کے عہد اسلامی کی معاشی زندگی کا ایک آئینہ،

علوم و آداب

حضرات! میرا خیال ہے، صقلیہ کے اسلامی تمدن مین اس کے علوم و آداب کا بیان سب سے اہم ہے، کہ اس سرزمین سے بڑے بڑے ائمہ فن، محدثین، فقہا، متکلمین، صوفیہ، اور ارباب ادب پیدا ہوئے، جن

[ا] رحلہ ابن جبیر ص ۳۴۴،

مین سے کچھ سسلی سے اسلامی سلطنت کے خاتمہ پر ہجرت کر گئے ، لیکن بہتون نے عہد اسلامی مین اور اس کے بعد بھی اسی سرزمین کو اپنی آخری خوابگاہ بنایا ۔ مگر آج وہان کسی مسلمان کی قبر کا نشان تک باقی نہین ،

صقلیہ مین مسلمانون کے داخلہ کے وقت تک اسلامی علوم و آداب مین سے علوم قرآن ، حدیث ، فقہ ، اصول فقہ ، اصول حدیث ، کلام و مناظرہ ، مغازی ، تاریخ ، رجال ، صرف ، نحو ، ادب ، لغت ، اور طب کی تدوین ہو چکی تھی ، مسلمان انہی علوم کو لے کر یہان پہنچے ، اور انہی کی نشر و اشاعت کی ، اور انہی کو فروغ حاصل ہوا ، پھر کچھ دنون کے بعد جب علوم عقلیہ کا عام رواج ہوا ، تو مسلمانان صقلیہ نے بھی ان علوم کی جانب نگاہ اٹھائی ، لیکن ابھی محو نظارہ ہی تھے ، کہ اسلامی سلطنت صقلیہ کی شمع حیات گل ہو گئی ، یہی وجہ ہے کہ مسلمانان صقلیہ کے علوم و آداب مین انہی اول الذکر اسلامی علوم کو حقیقی عظمت حاصل ہے ، تاہم علوم عقلیہ کا صفحہ بھی سادہ نہین ،

صقلیہ مین علمی ترقی کے اسباب

صقلیہ کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہان کی سیاسی فضا اوائل ہی سے نہایت مکدر اور پریشان رہی ، جس مین علوم و آداب کی داغ بیل ڈال کر اس کو نشو و نما دینا ، اس وقت ناممکن ہوتا ، اگر اتفاقاً آغاز ہی سے اس کے سامان بھی مہیا نہ ہو گئے ہوتے ،

یہ عجیب اتفاق ہے ، کہ مسلمانون کا سب سے پہلا قافلہ جو سکونت پذیر ہونے کے لئے یہان آیا ، وہ ایک ایسی شخصیت کی سالاری مین آیا ، جو خود سرچشمہ

علوم و معارف تھا؛ جب وہ افریقہ سے صقلیہ روانہ ہونے لگا، تو اس کی ذاتی کشش اور اس کے علمی رشتۂ مودت سے افریقہ کے اکابر اہل علم اس کے ہمرکاب ہوگئے، صاحب ریاض النفوس کا بیان ہے،

"ہمارے مشائخ کہتے ہین، کہ جب اسد فوج لے کر سوسہ روانہ ہوئے کہ صقلیہ کے جہاز پر سوار ہون، تو ان کے ساتھ اہل علم کی ایک ممتاز جماعت روانہ ہوگئی"

یہان تک کہ شیخ عبد الرحیم المستجاب (جن کے متعلق امام سحنون صاحب المدونۃ الکبری کی رائے ہے کہ "مین نے ابن قاسم، اشہب، ابن وہب، علی بن زیاد، بہلول بن راشد، اور ابن اشرس (جیسے اکابر ملت) کو دیکھا، مگر عبد الرحیم کے مثل کسی کو نہ پایا،) وہ بھی اپنے گوشۂ عافیت سے نکل پڑے، اور صقلیہ روانہ ہونے پر آمادہ ہوئے، مگر امام سحنون نے افریقہ کے قیام کی ترجیح بعض دوسری ضرورتون کو پیش کرکے ثابت کی، اور یہ سفر ملتوی ہوگیا[1]،

(۲) صقلیہ مین علمی ترقی کا دوسرا سبب یہان کی اسلامی حکومت کا یہان کے اہل علم کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر دینا ہے، ابن حوقل لکھتا ہے

"دار الحکومت کے باشندون مین اساتذہ کی تعداد زیادہ ہے، چنانچہ صرف بلرم مین ۳۰۰ اساتذہ ہین، مین نے اس کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا، کہ اساتذہ دشمن کے حملہ کے موقع پر جہاد مین

---

[1] ریاض النفوس در امادی ص ۱۸۵،

شرکت کرنے پر مکلف نہین ہین[1]،

(۳) تیسرا سبب۔ یہان کے ارباب حکومت کا خود اہل علم و صاحب ذوق ہونا تھا، یہ لوگ صرف شعر و شاعری ہی سے دلچسپی نہ رکھتے تھے جو بالعموم ارباب دولت کا تفریحی مشغلہ ہوتا ہے، بلکہ بعض مختلف علوم حدیث و فقہ مین صاحب کمال گذرے ہین، اور دولت فاطمیہ و کلبیہ کے دور مین تو عام امرار و عہدہ داران حکومت اہل علم و ارباب حکومت مین تھے۔ جن کا تذکرہ طبقات مین ارباب علم و ادب کی حیثیت سے ملتا ہے[2]، صقلیہ کی علمی ترقیون مین ان ولاۃ، امرار، اور عہدہ دارون کا نمایان حصہ رہا، خود صاحب کمال تھے۔ علمار و شعرا کے قدردان ہوتے، سرپرستی کرتے، اور دور دور کے ارباب کمال کھنچ کھنچ کر صقلیہ پہنچتے[3]،

(۴) چوتھا سبب اس کی جغرافیانہ جائے وقوع ہے، اس زمانہ مین اندلس، افریقہ، مصر و شام، اسلامی علوم و آداب کے مرکز تھے، جو ارباب

---

[1] ۔ معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۶، لیکن جو اہل علم جہاد کی شرکت کرنا چاہتے کر سکتے تھے، چنانچہ بعض اہل علم کے سوانح مین نظر آتا ہے کہ وہ خدمت علم مین بھی مصروف تھے، اور خدمت جہاد کا شرف بھی حاصل کرتے تھے، (دیباج المذہب ابن فرحون ص ۲۷۴) اس طرح ۳۹۵ھ کے حوادث مین ابن اثیر نے علمأ و صالحین کے جنگ مین شریک ہونے کی تصریح کی ہے، (ابن اثیر ج ۸ ص ۴۹۰،)

[2] ۔ الحلۃ السیراء ابن الابار در اماری ص ۳۲۷، ۳۳۰، ابو سحان المسنیہ در یادگاری ج ۱ ص ۲۹۳ وغیرہ،

[3] ۔ مسالک الابصار ابن فضل اللہ در اماری ص ۱۵۲،

علم شام و مصر سے اندلس یا اندلس سے شام و مصر کے سفر مین ادھر سے گذرتے یہان بھی ہو لیتے، چنانچہ ایسے اہل علم کے نام معلوم ہین، جنھون نے یہان اثنائے راہ مین مہینون اور کبھی سالون قیام کرکے جزیرہ کو اپنے علم و فضل سے خیر و برکت کا سرچشمہ بنایا، (مثلاً ابوحفص عمرو بن حسن الہوپرینی وغیرہ)

(۵) **پانچوان سبب**۔ رفتہ رفتہ اس کا وقار علمی حاصل کرلینا ہے، لوگ یہان کے اہل علم سے استفادہ کے لئے دور دور سے آتے، مثلاً ایک صقلی اہل علم طاہر بن محمد بن رقبانی کے حالات مین قفطی کا بیان ہے :-

"یہ صقلیہ کے باشندے تھے، اور یہین اقامت گزین تھے، ان کے عہد مین عربی علم ادب کے نثر و نظم مین ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا عالم موجود نہ تھا، ہر مقام سے آکر اہل علم نے ان کی طرف رجوع کیا، اور ان کو بحر ذخار پایا[1]"

(۶) **چھٹا سبب** یہ تھا، کہ اگر افریقہ مین کسی صاحب فضل کی پذیرائی باقی نہ رہتی، یا پذیرائی کے مواقع جاتے رہتے، تو وہ صقلیہ کی علمی منزلت کے اثر سے یہان کا رخ کرتا، یا اندلس مین کسی صاحب علم کے لئے حالات ناسازگار ہو گئے، تو اس نے صقلیہ کی راہ لی، اور یہین توطن اختیار کرلیا، چنانچہ صقلیہ کے متوطنین مین شیخ براذعی سعید بن فتحون قرطبی اور ابن رشیق قیروانی جیسے ارباب علم و فضل ہین،

---

[1] مختصر کتاب انباء الرواۃ علی انباء النحاۃ درامادی ص ۲۴۵۔

صقلیہ مین علمی ترقیون کے یہی اسباب تھے، جن کے باعث صقلیہ نے اپنے دور مین ایک ممتاز علمی جگہ حاصل کی، اور عرب مورخین نے اس کی علمی منزلت کا اعتراف کیا، سمعانی متوفی ۵۶۲ھ کا بیان نسبت "صقلی" کی تشریح مین ہے :-

یہ نسبت جزیرہ صقلیہ کی طرف ہے، اور یہان سے مسلمان اہل علم کی ایک کثیر جماعت نکلی، جن مین متقدمین بھی ہین، اور دور حاضر کے علما بھی، اور یہ آج کل فرنگیون کے قبضہ مین ہے[۱]"

صاحب نخبۃ الدہر لکھتا ہے :-

"صقلیہ جب مسلمانون کے قبضہ مین تھا، تو علمی ترقی اور علما و ادبا، اور فضلا کی کثرت مین اندلس کے مانند تھا[۲]"

ابن فضل اللہ الدمشقی لکھتا ہے :-

صقلیہ نے جو خوشبو پھیلائی، اور جو ذہانت بخشی ہے، وہ اس کے فخر کے لئے کافی ہے، "تاریخ و ادب کی کتابون مین اس کا بہترین حصہ محفوظ ہے، عہد اسلامی مین بیدار مغز بادشاہ اور بڑے بڑے ادبا موجود تھے، جن مین سے ایسا کوئی نہ تھا، جس کے پاس سفر کرکے لوگ پہنچتے نہ ہون، جاکر مدح نہ کرتے ہون، اور صلہ نہ پاتے ہون[۳]"

۱۔ کتاب الانساب ورق ۳۵۴، ۲۔ نخبۃ الدہر و عجائب البر والبحر درامار ی ص ۱۴۴،

۳۔ مسالک الابصار فی ممالک الامصار درامار ی ص ۱۵۲،

صقلیہ مین تعلیم کا نظام

یورپین مورخین تو "پالرمو اور مسینا کی یونیورسٹیون" کا تذکرہ کرتے ہین، لیکن ہمین ان مرعوب کن الفاظ کی ضرورت نہین، یہ "اسلامی یونیورسٹیان" صقلیہ کی مسجدون ہی مین قائم تھین، اس وقت تک درسگاہون کے لئے جداگانہ عمارتون کا دستور نہ تھا، اگر درسگاہ کے مقصد ہی سے عمارتین بنائی جاتین، تو بھی وہ مسجدون کی شکل کی ہوتین، اور بلرم مین کثرت مساجد کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ یہ مسجدین درسگاہ کے لئے بھی بنائی جاتی تھین، ابن حوقل لکھتا ہے :-

> ان دس مسجدون مین جن کا مین نے تذکرہ کیا، ایک مسجد ابو محمد قفصی کی ہے، جس مین وہ نماز پڑھتے ہین، اور اسی کے پہلو مین بیس قدم پر ایک دوسری مسجد ہے، جس کو انھون نے اپنے لڑکے کی تعلیم گاہ کے لئے تعمیر کرایا ہے [۱]

ان درسگاہون مین تعلیم کا طریقہ وہی تھا، جو اس عہد مین تمام اسلامی ملکون مین بطریق املاء و سماع جاری تھا، لیکن ان درسگاہون اور ان کے اساتذہ کا کیا نظام تھا، اس کا کوئی تصریحی تذکرہ نظر سے نہین گذرا، قیاسات قائم کئے جا سکتے ہین، تاہم اساتذہ و معلمین کے متعلق اتنا معلوم ہے، کہ ان مین فرق مراتب و امتیاز ان کے عہدون کے لحاظ سے بھی قائم تھا، بعض اہل علم کے تذکرہ مین ملتا ہے، "من اھل صقلیہ مقیمین بھا واحد

---

[۱] معجم البلدان ج ۵ ص ۳۷۵ ،

رؤساء المعلمین " (یہ اہل صقلیہ مین تھے ، وہین قیام پذیر تھے ، اور صدر اساتذہ مین سے ایک تھے[1]) کتابون کے درس و تدریس کے اجازت نامے اور سندین دوسرے اسلامی ملکون کی طرح یہان بھی رائج تھین ، جو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھین ، صحاح جوہری کی سند ابن القطاع الصقلی متوفی ۵۱۵ھ کو صقلیہ مین اپنے استاذ ابوبکر محمد بن البر الصقلی سے ملی ، اس کے بعد وہ مصر پہنچا ، اس وقت تک صحاح کی سند مصر مین عمومیت سے داخل نہین ہوئی تھی ، ابن القطاع یہان ہاتھون ہاتھ لیا گیا ، اور شائقین علم کا مرجع بن گیا[2] یہان تک کہ جذبۂ رشک مین تسہیل الروایۃ کی افواہین بھی اس کے متعلق مشہور ہوگئین ،

حضرات ! صقلیہ مین مسلمانون نے اپنے چند صد سالہ دور مین جن علوم و آداب کی خدمت کی ، وہ علوم قرآن ، حدیث ، فقہ ، کلام ، تصوف ، تاریخ ، ادب ، نحو ، شعر و شاعری ، طب ، فلسفہ ، منطق ، ریاضیات ، ہندسہ ، جغرافیہ ، اور طبیعات ہین ، ان کی الگ الگ مختصراً سرگذشت حسب ذیل ہے ،

(علوم قرآن)

علوم قرآن مین تیسری سے پانچوین صدی ہجری تک فن قرائت ، تفسیر اور فن ناسخ منسوخ ، اہم علوم تھے ، درس و تدریس ، اور سلسلہ روایت مین وہی

---

[1] مختصر کتاب انبار الرواۃ علی انبار النحاۃ در اماری ص ۲۴۸ ،

[2] معجم الادبار ج ۵ ص ۱۰۷ ،

اہتمام تھا، جو فن حدیث مین برتا جاتا تھا[1]، ان علوم کے ارباب کمال کو "مقری" کا لقب دیا جاتا، مقری کے لئے دوسرے علوم دینیہ یعنی حدیث وغیرہ مین دستگاہ رکھنا ضروری تھا[2]،

صقلیہ کے چند اہل علم اس نسبت سے مشہور ہوئے، یہ ارباب کمال صقلیہ کی مسجدوان مین مسند درس بچھاتے تھے، اور اکثر مسجدون مین درس قرآن جاری تھا۔ ابن جبیر لکھتا ہے :-

"اور مسجدین تو بہت ہین، اور اکثر مسجدین اساتذۂ قرآن کی خطبہ گاہ ہین[3]"

صقلیہ کے ان مقرین اور بعض ایسے علمار کے جن کے علوم قرأت وتفسیر ہین، ۱۲ نام مل سکے ہین، جن مین زیادہ تر چوتھی پانچوین صدی ہجری مین گذرے ہین، صاحب تصنیف علمائے قرآن اور ان کی کتابین جن مین سے بعض عالم اسلامی مین اساس فن سمجھی گئین حسب ذیل ہین :-

(۱) ابوطاہر اسمعیل بن خلف الصقلی متوفی ۴۵۵ھ۔ ابن بشکوال، اور ابن خلکان نے توصیف کی ہے، کہ "علوم وآداب مین امام اور فن قرأت مین کامل الفن تھے"، چند کتابین لکھین، کتاب[1] الاکتفا فی القرأت، کتاب[2] العنوان فی القرأت، جس کے متعلق ابن خلکان کہتا ہے، "لوگون کو اس فن مین اس

---

[1] - الناسخ والمنسوخ ابوجعفر النحاس،

[2] - کتاب الانساب سمعانی ورق ۵۴۰،

[3] - رحلہ ابن جبیر،

کتاب پر اعتماد ہے ، اس کا ایک نسخہ ہندوستان مین بھی بانکی پور کے کتب خانہ مین موجود ہے ، لیکن وہ کتاب العیون فی القرأت کے نام سے ہے ، جو ۶۵۲ھ کا مکتوب ہے ، تیسری تصنیف کتاب[۳] اعراب القرأت ۹ اجزا مین ، اور چوتھی کتاب[۴] المختصر لکتاب الحجۃ فی القران لابی علی الفارسی ہے[۱]

(۲) ابو عبداللہ محمد بن ابو الفرج الذکی المازری (۵۱۶ھ) کی کتاب الاستیلا علم قرأت مین شہرت رکھتی ہے[۲]

(۳) ابن فحام الصقلی (۴۵۴ھ ۔ ۵۱۶ھ) کے متعلق سلمان بن عبدالعزیز الاندلسی کا بیان ہے ، " مین نے کسی کو فن قرأت مین ان سے زیادہ عالم و ماہر نہین دیکھا ، نہ مشرق مین نہ مغرب مین "، ان کی چند کتابین ہین ، التجوید[۱] لبغیۃ المزید فی القرأت السبع ، کتاب[۲] التجرید فی القرأت اور کتاب[۳] مفردات القران[۳]

(۴) ابو عمرو عثمان بن علی السرقوسی کی چند کتابون کا تذکرہ آتا ہے ، جن مین کتاب مخارج الحروف کا نام معلوم ہے[۴]

---

[۱] ۔ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۳۴ : معجم الادبار یاقوت ج ۲ ، ص ۲۷۳ ، بغیۃ الوعاۃ سیوطی ۱۹۵ ، کشف الظنون ج ۱ ص ۱۲۲ ، ۱۲۳ ، فہرست کتب خانۂ بانکی پور ج ۱۸ ص ۱۸۱ تا ۱۸۳ ، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۱۲۹،۱۳

[۲] ۔ معالم الایمان ج ۳ ص ۲۵۱ ، ترتیب المدارک عیاض در یادگاری ج ۱ ص ۳۸۱ ،

[۳] ۔ حسن المحاضرہ سیوطی ص ۲۱۱ ، کشف الظنون ج ۱ ص ۲۵۵ ، ج ۲ ص ۲۸۸ ، مختصر کتاب انبار الرواۃ علی انبار النحاۃ قفطی ۔ وتلخیص ذہبی در اماری ص ۶۴۵ ،

[۴] ۔ معجم الادبار ج ۵ ص ۳۸ تا ۴۳ ، مختصر انبار الرواۃ قفطی در اماری ،

(۵) حجۃ الدین ابن ظفر الصقلی (ســـہ) کے متعلق اصفہانی لکھتا ہے

تفسیر و ادب مین امام تھے، اپنے ہمعصر اہل علم پر سبقت لے گئے" علوم قرآن مین ذیل کی کتابین ہین، التفسیر الکبیر[۱]، کتاب[۲] ینبوع الحیاۃ فی تفسیر الذکر الحکیم، یہ کتب خانہ خدیویہ مصر مین ۳ جلدون مین ناقص موجود ہے، کتاب[۳] فوائد الوحی الموجز الی فرائد الوحی الموجز، کتاب[۴] اسالیب الغائیہ فی احکام الایہ، کتاب[۵] اکسیر فی کیمیا التفسیر اور کتاب[۶] البرہانیہ فی شرح الاسمار الحسنیٰ[۱]،

ان کے علاوہ مختلف صقلی مقریین کے تذکرے خریدۃ القصر اصفہانی[۲]، مختصر انبار الرواۃ[۳]، کتاب المقفی مقریزی[۴]، اور بغیۃ الوعاۃ سیوطی[۵] مین آئے ہین،

صقلیہ مین قرأت سبع مین سے قرأت نافع کا رواج تھا، یہی قرأت تمام مغرب مین رائج تھی[۶]،

---

[۱] - دیکھو کتاب المقفی مقریزی در اماری ص ۶۶۴ - ۶۶۵، ابن خلکان ج ۲ ص ۳۵۳، معجم الادباء یاقوت ج ۷ ص ۱۰۲، خریدۃ القصر اصفہانی در اماری ص ۶۰۵، بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۵۹، العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین ابوالفدا ج ۳ ص ۴۹، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۶، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱، ص ۳۲۳

[۲] - در اماری ص ۵۸۲، ۵۹۷،

[۳] - در اماری ص ۶۴۷، ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰،

[۴] - در اماری ص ۶۶۳، ۶۶۴،

[۵] - ص ۴۰،

[۶] - احسن التقاسیم مقدسی ص ۲۳۸،

(علم حدیث)

یون تو صقلیہ کے چند ابتدائی حملون مین بعض صحابۂ کرام اور تابعین کے ورود
صقلیہ کی روائتین موجود ہین ، اور حضرت ابوالیقظان عمار بن یاسر کی ایک روایت
بھی حضرت ابوغسالہ المعافری سے ایسی منقول ہے ، جو انھون نے سرزمین صقلیہ
مین بیان کی[1] ، اور صقلیہ پر ابتدائی حملون کا آغاز ہی ایک نوجوان صحابی حضرت معاویہ
بن خدیج کی سرکردگی مین ہوا ، جن کی حدیثین بھی کتب احادیث مین مروی ہین[2] ،
لیکن ان صحابہ کے ورود کا تذکرہ صقلیہ کے علم حدیث کے بیان مین محض
تیمناً و تبرکاً ہی آسکتا ہے ، تاہم ایسے بکثرت صحابہ کا تعلق جو ان حملون مین صقلیہ
تشریف لائے ، اور مورخین نے ان کے نام بہ سلسلہ ورود افریقہ قلمبند کئے
ہین ، صقلیہ کے علم حدیث سے بالواسطہ یون ہوتا ہے ، کہ افریقہ مین انھی
کی شمع فیض سے علم حدیث کی روشنی پھیلی اور اس کی شعاعین سرزمین صقلیہ
تک پہنچین ،

محدثین کا ورود صقلیہ

چنانچہ دوسری صدی کے اواخر اور تیسری
صدی کے اوائل تک افریقہ مین بہ کثرت محدثین
پیدا ہو چکے تھے ، اور ان مین سے کچھ لوگ قاضی اسد کی معیت مین صقلیہ

---

[1] ۔ کتاب معالم الایمان ج ص ، کتاب الاسمار والکنی دولابی ج ۱ ص ۳۶ ، مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۶۲ ،

[2] ۔ امام احمد بن حنبل نے ان کا مسند بھی قائم کیا ہے ، ج ۳ ص ۱۰۴ تا ۲۰۴ ،

آئے، اور یہان ان کا سلسلۂ روایت وسماع جاری رہا، جنہین مین نے صقلیہ کے تیسری صدی کے محدثین مین شمار کیا ہے،

احادیث کے مجموعے صقلیہ مین

پھر جیسے جیسے احادیث کے مجموعے صحاح سنن، ومسانید منضبط ہوئے، وہ افریقہ اور وہان سے صقلیہ آتے گئے، مؤطا امام مالک حدیث کا وہ سب سے پہلا مجموعہ ہے، جو بظاہر افریقہ مین کتابی شکل مین داخل ہوا، اور یہان سے صقلیہ پہنچا، موطا کے سب سے بڑے قدردان اسد بن فرات تھے، جنہون نے امام مالک سے اس کا درس لیا تھا، چنانچہ صقلیہ مین اسکا درس مسلسل جاری رہا، اور بعض بزرگون نے تو اپنی زندگی کا ایک حصہ اسی کے نذر کردیا، شیخ ابوسعید لقمان بن یوسف الغسانی التونسی خود فرماتے ہین، کہ انہون نے کامل چودہ برس تک صقلیہ مین موطا کا درس دیا[1]،

صحیحین مین سے صحیح مسلم کے متعلق تو صقلیہ کو یہ فخر حاصل ہے، کہ اس کی سب سے پہلی شرح کتاب العلم اسی صقلیہ کے ایک محدث امام مازری نے لکھی، جس کا تذکرہ آگے آئیگا، ترمذی کو صقلیہ مین سب سے پہلی مرتبہ شیخ ابوحفص عمرو بن حسن الہوزینی الاندلسی نے روشناس[2] کیا، اور سنن ابی داؤد مین تو اٹلی کے ایک محدث کی روایتین موجود ہین، وہ ابوالعباس القلوری

[1] ریاض النفوس در اماری ص ۱۹۲،

[2] کتاب مسالک الابصار ابن فضل اللہ الدمشقی در اماری ص ۶۵۵،

متوفی ۳۲۵ھ ، ہیں ، قلوری کی نسبت قلوریہ یعنی کلبریہ کی جانب ہے ،

سنن ابی داؤد میں ان کی روایتیں زیادہ تر اسی کنیت و نسبت سے مروی ہیں ، بعض روایتوں میں محمد بن عمرو بن العباس کا نام آیا ہے، لیکن اکثر تلامذہ "محمد بن عمرو بن عبید" نام لیتے ہیں ، تلامذہ کی فہرست میں امام ابو داؤد کے علاوہ مشہور مفسر و مورخ امام ابن جریر طبری ابوبکر البزاز وغیرہ ہیں [۱] ،

دور اول ، ان کے علاوہ صقلیہ کے علم حدیث کے دور اول یعنی تیسری و چوتھی صدی میں مجھے سولہ محدثین کے نام معلوم ہو سکے ، جن کے تذکرے ترتیب المدارک قاضی عیاض [۲] ، کتاب الانساب سمعانی [۳] طبقات ابی العرب [۴] دیباج المذہب ابن فرحون [۵] ، معالم الایمان ابن ناجی [۶] ، کتاب العبر فی خبر من عبر ذہبی [۷] ، کتاب المقفی مقریزی [۸] التاریخ الکبیر ابن عساکر [۹] ، اور بغیۃ الوعاۃ سیوطی [۱۰] ، میں آئے ہیں ، اور ان کے شیوخ و تلامذہ کی مفصل فہرست درج کی گئی ہے ، جن میں بعض ایسے محدثین ہیں ، جو صقلیہ کے حملوں اور اس کے مفتوح ہونے کے بعد افریقہ سے یہاں تشریف لائے ، اور یہیں بود و باش اختیار کرلی ، اور ان کے فیض صحبت سے صقلیہ میں علم حدیث کا ذوق پیدا

---

۱ - تہذیب التہذیب ج ۲؛ ص ۱۴۶ ، ۱۴۷ ، ۲ - در یادگاری ج ۱ ص ۲۶۹ ، ۳۰۱ ، ۳۸۰ ، ۳۰۷ ، ۳۷۹ ، ۳۷۵ ، ۳۸۲ ، ۳ ورق ۳۵۴ ، ۴ - در اماری ج ۲ ص ۹۹ ۵ ۸۸ ، ۲۵۹

۶ ج ۳ ص ۱۴۴ ، ۱۸۱ ، ۷ در اماری ص ۶۴۸ ، ۸ در اماری ص ۶۶۴ ،

۹ - ج ۴ ص ۲۴۵ ، ۱۰ - ص ۳۲۵ ، ۴۰۰ ،

ہُوا ، اور پھر اسی مین چوتھی صدی کے ایسے محدثین ہین ، جن کے تلامذہ پانچوین صدی مین صقلیہ کے شیوخ حدیث تھے ،

دور ثانی یعنی پانچوین صدی ہجری مین گیارہ محدثین کے اسمار معلوم ہو سکے ، یہ وہ محدثین ہین ، جنہون نے یہین کے اہل علم سے تعلیم و تربیت پائی اور علم و فن کی خدمت مین مصروف ہوئے ، ان مین چند صاحب[1] تصنیف بھی ہین ، مثلاً ابوبکر علی بن داؤد السمنطاری متوفی ۴۶۴ھ کے متعلق ابن القطاع کہتا ہے ، "فقہ ، و حدیث مین عمدہ کتابین تالیف کین ، جو اپنی ترتیب و بیان مین غایت درجہ بہتر ہین[1]" (۲) ابوبکر محمد بن سابق الصقلی متوفی ۴۷۳ھ نے موطا کی شرح المسالک لکھی[2] ، اسی طرح اس عہد کے دیگر محدثین صقلیہ کے حالات ذیل کے ماخذون مین ہین ، ترتیب المدارک عیاض[3] ، نیل الابتہاج[4] ، کتاب الانساب سمعانی[5] ، بغیۃ الوعاۃ سیوطی[6] ، مختصر انبار الرواۃ[7] قفطی[8] ، جذوۃ المقتبس حمیدی[8] ، کتاب المقفی مقریزی[9] ،

دور ثالث یعنی چھٹی اور ساتوین صدی ہجری ، اس دور مین اگرچہ اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا ، تاہم صقلیہ سے مسلمانون کے جلاوطن ہونے کے کچھ دنون پیشتر تک اسلامی تہذیب و تمدن کو اس دور مین بھی تفوق حاصل

---

[1] ، معجم البلدان ج ۵ ص ۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ذکر سمنطار در صقلیہ ،

[2] کتاب درامارى ص ۸ ۷ ۵ ، و تزئین الممالک بمناقب مالک ص ۵۸ ،

[3] دریادگاری ج ۱ ص ۳۷۵ ، ۳۷۹ ، [4] برحاشیہ دیباج ۱۸۴ ، [5] ورق ۴ ۴ ۵ ۳ ،

[6] ص ۱۶۱ ، ۲۲۳ ، ۳ ، ۵ ۷ ، [7] درامارى ص ۶۴۶ ، ۶۴۸ ، [8] ص ، [9] درامارى ص ۶۶۳ ،

رہا ، اور اگرچہ اس دور کے اکثر اہل علم یہان سے ہجرت کر گئے تھے ، پھر بھی ان کا گہوارۂ علمی صقلیہ ہی تھا ، اور ہجرت کے بعد انہون نے یا ان کے خاندان نے اپنے اجڑے وطن سے اپنا انتساب باقی رکھا ،

اس دور کے محدثین مین سب سے پہلا نام امام مازری یعنی ابو عبداللہ محمد بن علی بن عمر التیمی متوفی ۵۳۶ھ کا آتا ہے ، ابن خلکان کہتا ہے ،" یہ ان اعلام مین ہین ، جن کی جانب حدیث وکلام مین انگلیان اٹھتی ہین ' ...... ارباب فضل مین ہین ، اور مختلف علوم مین دستگاہ رکھتے ہین " ، ابن فرحون کہتا ہے :-

> " وہ اہل افریقہ و ماوراے مغرب کے امام ہین ، امام ان کا لقب قرار پاچکا ہے ، کوئی شخص انہین بغیر امام مازری کے جان نہین سکتا " ،

امام مازری کی مختلف علوم مین تالیفات ہین ، علم حدیث مین ان کی شہرہ آفاق تالیف مسلم کی شرح کتاب المعلم ہے ، اس کا نام مختلف مورخین نے مختلف لکھا ہے ، جس مین لفظ " المعلم " جزو مشترک ہے ،

کتاب المعلم سے پیشتر مسلم پر جس قدر کتابین لکھی گئین ، ان کی حیثیت استدراک کی تھی ، المعلم مسلم کی سب سے پہلی شرح ہے ، جو دراصل ان حواشی و تعلیقات کا مجموعہ ہے ، جو امام مازری نے اپنے تلامذہ کو مسلم کے درس مین املا کرائے تھے ، اسی کو مدون کر کے کتاب المعلم کے نام سے موسوم کیا ، اس کا صرف ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر مین محفوظ ہے ، اس کے بعد

مسلم پر جس نے قلم اٹھایا، کتاب المعلم اس کے لئے دلیل راہ بنی، چنانچہ اکمال المعلم بفوائد مسلم قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ، اکمال اکمال المعلم وشتانی متوفی ۸۲۷ھ اور مکمل اکمال الاکمال سنوسی متوفی ۸۹۵ھ اسی کے نقوش ہین، موخر الذکر کتاب چند سال گذرے شائع ہوگئی ہے،

ڈاکٹر گریفینی نے کتاب المعلم پر ایک بسیط مقالہ لکھا ہے، جس کے مباحث زبان کی اجنبیت کے باعث ابھی تک معلوم نہ کرسکا، اس مین عربی متن کے چند اقتباسات بھی ہین، جو خدیویہ نسخہ سے منقول ہین، ان مین مثلاً ذیل کے مباحث ہین، تقدیر صحیح مسلم، لفظ ارادہ وعزم کا فرق، حقیقت کذب، معتزلہ کی نفی قدر، راوی ابوزرعہ کی تحقیق، مومن و فاسق کے دخول جنت کی حقیقت، لفظ مسح کی تحقیق، وغیرہ یاقوت نے امام مازری کو شارح موطا لکھا ہے، لیکن کسی بنیادی روایت سے اس کی تصدیق نہین ہوئی، شاید اس نے التباساً شارح مسلم کے بجائے شارح موطا لکھ دیا ہو،

امام مازری کی علم حدیث مین ایک دوسری کتاب "تعلیقات بر روایت جوزقی" کا تذکرہ ازہار الریاض مین آیا ہے، جوزقی کی ایک کتاب "کتاب الصحیح المخرج علی صحیح مسلم" کا تذکرہ، تذکرۃ الحفاظ مین ہے، کیا عجب کہ یہ حواشی اسی پر ثبت ہون[1]،

---

[1] امام مازری کے حالات اور ان مباحث کے لئے دیکھئے دیباج المذہب (ص ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۷) ابن خلکان ج ۲ ص ۸۱۶، ۲۸۷، وج ۳ ص ۱۱۶) تذکرہ الحفاظ (ج ۴ ص ۱۰۱، وج ۲ ص ۲۱۹) طبقات الشافعیۃ الکبری سبکی (ج ص ۱۲۴) کتاب المقفی المقریزی (دراماری ۶۶۵) مراۃ الخیال یافعی ج ۲ ص ۲۶۷، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر (ج ۱ ص ۲۷۰ تا ۲۷۲، ۲۲۶) مقالی شمالی افریقہ پر چند کتابین' اینڈ فاکنان (دریادکاری ج ۲ ص ۹۲) و مقالہ کتاب المعلم گریفینی (دریادگاری ج ص) معجم البلدان یاقوت (ذکر شہر مازر) اور امام مازری کے تلامذہ کے لئے دیکھئے تاریخ الادبیہ لبعض الدولۃ الموحدیہ زرکشی (دراماری س ۵۲۲) دیباج المذہب ص ۲۸، ۲۸۶ اور التکملہ ابن ابار (ص ۲۲۴)

ان کے علاوہ اس دور مین اور پانچ محدثین کے نام ملتے ہین، ان کے حالات کے لئے دیکھئے دیباج المذہب ابن فرحون (ص ۲۸۱) نیل الابتہاج (ص ۲۲۷) کتاب المقفی مقریزی (در اماری ص ۶۶۷، ۶۶۵) بغیۃ الوعاۃ (در اماری ص ۶۷۶) اور کتاب الوافی بالوفیات صفدی (در اماری ص ۶۵۹)

(علم فقہ)

فرق و مذاہب کے بیان مین گذر چکا ہے، کہ قاضی اسد کے تلامذہ و حلقۂ ارادت کے حنفی المذہب ہونے کے باعث ابتداءً یہان فقہ حنفی کا رواج رہا، پھر افریقہ مین مذہب مالکی کی اشاعت اور وہان کے اہل علم کی یہان سے کثرت آمد و رفت کی وجہ سے یہان بھی فقہ مالکی کو فروغ حاصل ہوا نیز یہان کے عہدۂ قضاء پر مالکی فقہا کے مسلسل سرفراز ہونے کے باعث بھی اس مذہب کو یہان ترقی حاصل ہوئی، قاضی صقلیہ ابن کحالہ متوفی ۲۸۹ھ کے حالات مین ہے، "صقلیہ کے عہدۂ قضاء پر مامور تھے، یہان علم کی کثیر اشاعت کی، اور انہی سے مذہب مالکی کو یہان فروغ حاصل ہوا[1]"

اور یہ اتفاق کی بات ہے، کہ صقلیہ کے فقہا کے حالات مین جو کتابین اس وقت تک دستیاب ہوئی ہین، وہ زیادہ تر مالکی مصنفین کی ہین، اور طبقات مالکیہ ہی مین ہین، اس لئے صقلیہ کے حنفی فقہا کے نام بجز ایک دو مثلاً

[1] ۔ دیباج المذہب ص ۱۱۹،

اسد کے شاگرد ابو یحییٰ احمد بن محمد بن قادم متوفی ۲۲۷ھ[1] کے اور معلوم نہین، اور بعض فقہا کے متعلق اگر کہین تصریح ملتی ہے، کہ وہ حنفی فقہا مین تھے، تو اسی کے ساتھ طبقات مالکیہ مین بھی مالکی حیثیت سے ان کا نام موجود ہے، مثلاً قاضی ابو عمرو محمد بن میمون کو ان کے شاگرد ابو العرب نے اپنی طبقات مین حنفی المذہب لکھا ہے[3] لیکن دوسری طرف ابن فرحون نے بھی ان کا تذکرہ ان کے مالکی المذہب ہونے کی حیثیت سے اپنی دیباج مین کیا ہے[2]، یہی وجہ ہے کہ صقلیہ کے جتنے فقہا کے نام معلوم ہو سکے، ان مین قریب قریب سب کے سب فقہ مالکی کو صقلیہ مین فروغ دینے والے تھے، جنھون نے فقہ مالکی پر مستند کتابین لکھین، اور یہ کتابین بھی زیادہ تر فقہ مالکی کی مشہور کتاب المدونۃ الکبریٰ کی شرح استدراک اور نقد مین ہین،

ذیل مین صقلیہ کے فقہا اور ان کی تالیفات بہ طبقات پیش ہین، یہ کتابین فقہ کے مختلف شعبون، فقہ، اصول فقہ، اور علم فرائض مین ہین،

دور اول
تیسری چوتھی صدی ہجری

اس دور مین نو فقہا کے نام معلوم ہو سکے، جن مین بعض ایسے ہین، جنھون نے افریقہ سے آکر یہان توطن اختیار کیا، اور یہین پیوند زمین ہوئے، ان مین سے صاحب تصنیف اور ان کی تصنیفات حسب ذیل ہین :-

---

[1] - ریاض النفوس درا ماری ص ۱۸۵، معالم الایمان ج ۲ ص ۷۲، طبقات ابی العرب دریادگاری ج ۲ ص ۸۷ و ۱۰۳،

[2] - دریادگاری ج ۲ ص ۹۹،   [3] - ص ۲۳۴،

(۱) ابن براذعی القیروانی متوفی بصقلیہ نے صقلیہ مین ذیل کی کتابین لکھین، مطول التہذیب، مختصر التہذیب، افریقہ مین انہون نے المدونہ کا ایک اختصار مختصر التہذیب لکھا تھا، اسی پر وہ دونون کتابین لکھین، قاضی عیاض کہتے ہین، "یہ طلبائے اندلس ومغرب مین مقبول عام ہین۔" معالم مین ہے، "ہمارے زمانے مین تمام مشرق ومغرب مین مقبول ہے"، تیسرا رسالہ کتاب الشرح والتمامات، چوتھا کتاب اختصار الشرح اور پانچوان تمہید مسائل المدونہ ہے، خیال ہوتا ہے، کہ شاید تیسرا اور چوتھا رسالہ اول الذکر دونون رسالون کے نام ہون [۱]،

(۲) ابن الحکار الصقلی کی تین کتابون کے نام معلوم ہین، شرح المدونہ تقریباً ۱۳۰۰ اجزار ہین، انتقاد علی التونسی الف مسئلہ، یہ ابن اسحٰق تونسی کی شرح المدونہ پر نقد ہے، مختصر کتاب التمامات لبراذعی [۲]، بقیہ فقہا کے لئے جو فقہ وعلم فرائض مین شہرت رکھتے تھے، دیکھیے ترتیب المدارک (دریادگاری ج ۱ ص ۳۷۰، ۴۴۲، ۲۴۹، ۳۷۵، ۳۸۵) معالم الایمان (ج ۲ ص ۳۶ ج ۳ ص ۱۸۳) دیباج المذہب ص ۱۱۹، البیان المغرب ج ۱ ترجمہ اردو ص ۲۲۲

دور ثانی پانچوین صدی ہجری	اس دور کے ۱۶ فقہا کے نام ملے، جن مین سے بعض اسلامی سلطنت کے زوال پر یہان سے ہجرت

[۱] - معالم الایمان ج ۳ ص ۱۸۴ تا ۱۸۹، وترتیب المدارک دریادگاری،

[۲] - دیباج ص ۸۸، ترتیب المدارک دریادگاری ج ۱ ص ۳۸۳،

کر گئے، شیخ ابو محمد عبد الحق بن محمد بن ہارون السہمی الصقلی متوفی ۴۶۶ھ اسی دور کے ممتاز اہل علم میں ہیں، قاضی عیاض کہتے ہیں، "نہایت عمدہ تالیفات ہیں" ابن عمار المتکلم کا بیان ہے، "ہر علم وفن کے مشہور امام ہیں، لوگوں پر سبقت رکھتے تھے، اصول و فروع کے استاذ ہیں" فقہ میں النکت[۱] والفروق لمسائل المدونہ جو المدونہ پر پہلا استدراک ہے، تہذیب[۲] المطالب شرح مدونہ جزء[۳] فی بسط الفاظ المدونہ اور استدراک[۴] علی البراذعی ان کی تصنیفات ہیں، سفر حج میں امام الحرمین سے تحریری مذاکرہ رہا تھا، یہ تحریر قاضی عیاض کی نظر سے گذری تھی[۱]، (۲) علی بن مفرج الصقلی متوفی ۴۷۰ھ بھی صاحب تصنیف ہیں، کسی کتاب کا نام معلوم نہیں، البہجۃ العلمیہ میں براذعی کی ایک تصنیف ان کی طرف منسوب ہو گئی ہے[۲]، (۳) ابن ظفر الصقلی کی بعض کتابیں فقہ میں ہیں، (۴) ابن یونس الصقلی متوفی ۴۵۱ھ کی جو فقہ و فرائض میں امام و ماہر کہے گئے، ایک کتاب شرح المدونہ اور دوسری علم فرائض میں تھی، اور (۵) ابو عبد اللہ محمد بن ابی الفرج الذکی المازری کے دو رسالے، ایک اعتراضات پر فتاوی سیوری اور دوسرا تعلیق بر فقہ مالکی ہیں، اور اسی طرح چند اور فقہا اس دور میں ہیں، جن میں سے اکثر کو قاضی عیاض نے مشاہیر فقہائے صقلیہ میں بتایا ہے اور ان کا مشغلہ درس و تدریس تھا، حالات کے لئے دیکھئے، معالم الایمان

[۱] دیباج المذہب ص ترتیب المدارک در یادگاری ج ۱ ص ۳۷۶،

[۲] ترتیب المدارک در یادگاری ج ۱ ص ۲۸۳، دمقالہ بارونفس" قسطنطنیہ اور قاہرہ کے کتبخانے در یادگاری

(ج ۲ ص ۲۵۰) ترتیب المدارک دریادگاری ج ۱ ص ۳۸۰، ۳۸۴، ۳۸۵) بغیتہ الوعاۃ سیوطی (ص ۹۰) نیل الابتہاج (برحاشیہ دیباج ص ۱۸۴) کتاب المقفی مقریزی (درامارہ ص ۶۶۵) معجم البلدان (ج ۵ ص ۱۳۲) انتخاب سلوان المطاع (درامارہ ص ۶۸۹)

دور ثالث
چھٹی صدی ہجری

فقہ کے تیسرے دور کا آغاز علم حدیث کی طرح امام مازری متوفی ۵۳۶ھ ہی سے کیا جاسکتا ہے، قابل ذکر امر یہ ہے، کہ انہیں "امام" کا لقب تبحر فقہی کے باعث ملا تھا، ابن فرحون کہتا ہے، "جو شیوخ افریقہ فقہ کی تحقیق و تدقیق، رتبۂ اجتہاد و دقت نظر اور اصول و علوم دین کے درس میں مشہور تھے، ان کا انہی پر خاتمہ ہوا، انہوں نے ان امور میں تقدم حاصل کیا، اور اپنے تمام ہمعصروں پر سبقت لے گئے، ان کے زمانہ میں تمام روے زمین پر فقہ مالکی میں ان سے زیادہ تفقہ رکھنے والا، ان سے زیادہ مذہب سے آشنا کوئی دوسرا موجود نہ تھا"

فقہ و اصول فقہ میں ان کی ذیل کی کتابیں ہیں:- شرح[۱] کتاب التلقین' لابی محمد عبدالوہاب بن علی البغدادی المالکی متوفی ۴۲۲ھ۔ ابن فرحون کہتا ہے "اس کتاب کے مثل مالکیوں کے پاس کوئی دوسری کتاب موجود نہیں" ایضاح[۲] المحصول من برہان الاصول' امام الحرمین ابو المعالی الجوینی متوفی ۴۷۸ھ کی مشہور کتاب البرہان فی اصول الفقہ کی مبسوط شرح ہے، اور بعض مسائل میں امام الحرمین کے نقد بر فقہ مالکی کا جواب نقد ہے، مجموعۂ[۳] فتاوی اور تعلیقات[۴] بر مدونہ[۵]

ے۔ دیباج المذہب ص ۲۸۰، طبقات الشافعیہ سبکی ترجمہ امام الحرمین، مقالہ شمالی افریقہ وصقلیہ پر چند کتابیں اینڈمند فاگنان پروفیسر الجزائر دریادگاری ج ۲ ص ۲۹۲

اسی طرح اس دور کے گیارہ اور فقہا ہیں، جن کے علم وفضل اور تفقہ کو مورخین نے بیان کیا ہے، ان کے تذکرے معالم الایمان ج ۲ ص ۱۴۱، رفع الاصر عن قضاۃ مصر ابن حجر عسقلانی، اخبار مصر ابن میسر ج ۲ ص ۴۷، معجم البلدان یاقوت (ج ۵ ص ۲۱۶، ذکر شہر میناؤ جفلود) خریدۃ القصر اصفہانی (دراماری) کتاب المقفی مقریزی (دراماری ص ۶۶۴) میں آئے ہیں،

دور رابع

فقہائے صقلیہ کا ایک چوتھا دور بھی قائم ہو سکتا ہے، یہ وہ فقہا ہیں جو ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں صقلیہ کی طرف منسوب ہیں، جن میں سے اگرچہ بعضوں نے تو شاید صقلیہ کی سرزمین پر کبھی قدم بھی نہ رکھا ہو، لیکن جب انہوں نے اپنے خاندان کے اجڑے وطن سے اپنا انتساب قائم رکھ کر اس کی یاد تازہ رکھی، تو ان کے اس اجڑے وطن کی سرگذشت میں انہیں کیوں نہ یاد کر لیا جائے۔ ایسے تقریباً ۴، ۵ فقہا ہیں جن میں شیخ ابوعبداللہ فخر الدین محمد بن محمد الصقلی قاضی دمیاط متوفی ۶۲۷ھ صاحب تصنیف بھی ہیں، ان کی ایک کتاب التنجیز فی تصحیح التعجیز فقہ شافعی میں ہے، جو ابن یونس الموصلی متوفی ۶۷۱ھ کی کتاب التعجیز فی مختصر الوجیز پر نقد واستدراک ہے، اور ابن حیون الشکلی ابوعبداللہ محمد بن علی وہ آخری فقیہ ہیں، جنہوں نے اپنے انتساب سے صقلیہ کے اسلامی علم وفن کی یاد تازہ رکھی، اور عجب کیا کہ انہی پر صقلیہ کے انتساب کا خاتمہ ہوا ہو، ۹۶۰ھ میں وفات پائی، ان فقہا کے حالات عنوان الدرایہ فیمن عرف من العلماء فی المایۃ السابعۃ بجایہ (ص ۱۳۱، ۱۶۹) طبقات الشافعیہ (ج ۶ ص ۱۳۱) کتاب المقفی مقریزی (دراماری ص ۶۶۵)

مقالہ فاگنان (دریادگاری ج ۲ ص ۱۰۸) مین ملین گے ،

(علم کلام ومناظرہ)

علم کلام مین صقلیہ کے اہل علم، سلف صالحین کے متبع اور مسلکاً اشعری تھے، قاضی اسد کے متعلق بعض افواہین ایسی مشہور ہوئی تھین ، کہ انھون نے سلف صالحین کے مسلک سے تجاوز کیا ، لیکن مستند مورخین اور اہل علم نے اس کی تردید کی ، اور بتایا کہ ان کا دامن بدعات سے ہمیشہ پاک رہا ، اور مسئلہ خلق قرآن اور رویت باری کے متعلق ان کے معتقدات و اقوال استشہاداً پیش کئے[1] ، اور مالکیون کے متعلق تو معلوم ہے ، کہ ان کا اشعری ہونا ضرور ہے ،

اس لئے صقلیہ مین مذہب حنفی و مالکی دونون کے متبعین علم کلام مین سلف صالحین کا مسلک رکھتے اور اشعری کہلاتے تھے ، اور صقلی اہل علم نے علم کلام مین جو کتابین لکھین وہ اشعری مذہب ہی پر ہین ، صقلیہ کے چھ سات ایسے اہل علم کے نام معلوم ہین جو علم کلام مین تبحر رکھتے تھے ، اور اس فن مین کتابین لکھین، (۱) ابو محمد عبدالحق بن محمد بن ہارون السہمی نے اسلامی عقائد کے بیان مین ایک رسالہ لکھا[2] ، (۲) ابن ظفر الصقلی کی تصنیفات مین کتاب التسخیر جو کتاب المقتفی مین کتاب التسخیر کے نام سے ہے ، کتاب[2] المعادات ، کتاب[3] الجنہ فی اعتقاد اہل السنہ اور کتاب[4] معاتبۃ الجری علی معاقبۃ البری فی اعتقاد ابی حنیفہ والاشعری

---

[1] - معالم الایمان ج ۲ ص ۱۳ ، دیباج المذہب ص ۹۸ ، ترتیب المدارک دریادگاری ج ا ص ۲۴۲ و ج ۲ ص ۲۴۵ ، [2] - ترتیب المدارک ج ا ص ۷۸۴ ،

۴ رسالے ہین[1]، (۵) ابن ابی الفرج الذکی الصقلی متوفی سنہ ۵۳۰ھ صقلیہ کے مناظرین مین تھے، طبیعت کسی قدر تیز اور مناظرہ پسند تھی، انہون نے مشرق کا سفر کیا، ملک شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے، ملک شاہ کے دربار مین امام غزالی سے علماء کا جو مشہور مناظرہ ہوا تھا، اس مین معترضین کی صف مین یہ بھی تھے، پھر مشرق کی سیاحت کے لئے نکلے، خراسان و غزنی پہنچے، اور اس کے بعد اسی صقلی اہل علم کے متعلق بہ تعیین معلوم ہے، کہ اس نے سرزمین ہند کو بھی اپنے ورود سے مشرف کیا، ان سفرون مین جہان جہان گئے، علماء سے مناظرہ کرتے رہے، سمعانی نے ان کے بعض دلچسپ واقعات بیان کئے ہین، جنہین سیوطی نے نقل کیا ہے[2]،

(۶) امام مازری متوفی سنہ ۵۳۶ھ مسلک اشعری سے سرمو تجاوز نہ کرنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہون نے اپنی تصنیف ایضاح البرہان فی اصول الفقہ مین امام الحرمین پر ایسے مواقع پر شدید نکتہ چینی کی ہے، جہان اشاعرہ کے عمومی مسلک سے انحراف نظر آیا ہے، ان دونون کے اختلافی مسائل مین ایک مسئلہ استرسال بھی اہل علم کے درمیان شہرت رکھتا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہین[3]، کلام مین امام مازری کی چند مستقل کتابین بھی ہین، جن مین ایک کتاب[1] الکشف و انباہ علی المترجم بالاحیاء ہے، جو امام غزالی کے رد مین ہے[1]،

---

[1] سلوان المطاع در امادی ص ۶۸۸، ۶۹۰، وکتاب المقفی مقریزی در امادی ص ۶۶۶

[2] ترتیب المدارک در یادگاری ج ۱ ص ۳۸۲، بغیۃ الوعاۃ ص ۹۰، [3] طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۲۶۴

علامہ سبکی نے اس رسالہ کے کچھ اقتباسات درج کئے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ امام مازری نے امام غزالی اور ان کی تالیفات پر تبصرہ کرتے ہوئے موحدین فلاسفہ، متصوفہ، اور اصحاب اشارات کے مذہب پر روشنی ڈالی ہے، کہ امام مازری کے الفاظ میں امام غزالی کی تصنیفات انہی مسائل پر مشتمل ہیں، نیز انھوں نے مختلف مذاہب کے باہمی اختلاف کا تذکرہ کرکے امام غزالی کے بعض مسلک کی تردید کی ہے۔ علامہ سبکی نے امام مازری کے اعتراضات کا خلاصہ نقل کیا ہے، جس کی تلخیص مولانا شبلی مرحوم نے الغزالی میں درج کی ہے[1]

ان کی دو اور کتابیں کتاب کشف الغطاء عن لمس الخطاء اور النکتۃ القطعیۃ فی الرد علی الحاشویہ امام غزالی کے رد میں ہیں، مقری صاحب نفح الطیب نے تذکرہ کیا ہے[2]،

حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی وہ سب سے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فلسفہ کے خلاف علم اٹھایا، اور تردید کرنی چاہی، لیکن اس میں شبہ نہیں، کہ یہ پہلا اقدام تھا، توازن میں بے باکی نہ آسکی، علامہ ابن تیمیہ نے اسی نقش اول پر بیباکی اور بے مرعوبی سے عمارت کھڑی کی، اور کامیاب ہوئے لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں، یہاں صرف یہ دکھانا ہے، کہ امام مازری ہی وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے امام غزالی کی غلطیاں محسوس کیں، اور پھر قاضی عیاض، محدث ابن صلاح، اور ابن جوزی وغیرہ نے انہی کے نقش قدم کی پیروی کی،

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ترجمہ امام غزالیؒ [2] ازہار الریاض فی اخبار عیاض در یادگار ی مازری ج ۲ ص ص ۹۴،

امام مازری کی علم کلام مین ایک اور تصنیف نظم الفرائد فی علم العقائد بھی ہے[1]
اور کتاب الصلہ ابن بشکوال (درامازی ص ۱۷۸) اور ترتیب المدارک
(دریاد گاری ج ۱ ص ۲۷۹) مین ایک دو صقلی اہل علم کے اور نام ہین، جو
علم کلام مین مشہور تھے،

(علم تصوف)

صقلیہ کے مختصر اسلامی دور مین بعض باکمال صوفیہ بھی اس کی خاک سے
اٹھے، اور اپنی تصنیفات و اسوۂ عمل سے مسلمانان صقلیہ کی روحانی تسکین کا
ذریعہ بنے، اور مسلمانون اور اسلامی حکومت نے بھی ان بزرگون کے مقاصد
کی تکمیل مین سہولتین بہم پہنچائین، اور رباط تعمیر کرا کر قیمتی جاگیرین وقف کین،
لیکن بدقسمتی سے یہ خانقاہین اور جاگیرون کے اوقاف مفاسد کا ذریعہ
بن گئے، اور ان پر نا اہلون اور خود غرضون کا تسلط ہو گیا، ابن حوقل نے
ان خانقاہون کے رازِ درون کا پردہ چاک کیا ہے، اور نہایت سخت حملے
کئے ہین[2]، مگر صقلیہ کا سنجیدہ خیال طبقہ خدع و فریب کے ان مظاہر سے متاثر
نہ تھا، وہ تصوف کی حقیقی منزلت سے آگاہ تھا، اسی دور کے ایک معزز عہدہ دار
نے اپنے ایک قطعہ مین تصوف پر اظہار خیال کیا ہے، وہ کہتا ہے، "تصوف
صوف کے کپڑے پہننے کا نام نہین اور نہ تصوف شور و شغب اور رقص و

---

[1] دیباج ص ۲۸۰،

[2] کتاب المسالک والممالک ابن حوقل ص ۸۵

طرب کو کہتے ہین ، تصوف نام ہے اخلاص و تصفیہ قلب کا ، اور علم حق ، قرآن اور دین کے اتباع کا .... [۵]"

نیز اس عہد مین صقلیہ حقیقی حاملین تصوف سے بھی خالی نہ تھا ، تقریباً ۱۱ ، ۱۲ ایسے بزرگون کے حالات دستیاب ہوئے ، جو اپنے زہد و ورع ، تقدس اور اخلاص و احسان سے مقبول انام تھے ، اور شیخ ابوالسری ، شیخ ابوہارون الاندلسی ، اور شیخ جنید بغدادی رحمہم اللہ کے حلقۂ ارادت سے فیضیاب ہوئے ، ان مین سے پانچ بزرگون کا زمانہ تیسری چوتھی صدی ہجری ہے ، جن کے حالات معالم الایمان (ج ۳ ص ۱۸۱ تا ۱۸۳) اور ریاض النفوس (درامارى ص ۱۹۱ ، ۱۹۴ ، ۱۸۶) مین ہین ، اور چھ بزرگون کے نام جو پانچوین چھٹی صدی مین گذرے ہین ، جذوۃ المقتبس (درامارى ص ۵۷۸) کتاب المقفی مقریزی (درامارى ص ۶۶۳) معجم البلدان (ج ۵ ص ۱۳۱) الالحان المسیلہ (دریادگاری ج ۱ ص ۲۹۷) اور ریاض النفوس (درامارى ص ۱۸۸) مین آئے ہیں ،

پہلے دور کے صوفیہ مین سے شیخ ابوالقاسم البکری الصقلی نے تصوف مین اپنی تالیفات بھی یادگار چھوڑی ہین ، یہ تصوف و زہد و اصلاح و تقوی مین یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے ، علوم دینیہ مین بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے ، تصوف مین ان کا مسلک ہندوستان کے سرچشمۂ معارف حضرت مجدد الف ثانی سے مشابہ تھا ، صاحب معالم کا بیان ہے ، " تصوف کی بنیاد انھون

[۵] ۔ سیرۃ القصر اصفہانی درامارى ص ۵۹۰ ،

نے کتاب وسنت اور اس چیز پر قائم کی جس پر سلف اول تھے، اور آرار و استحسان کو ترک کیا، ان کی تصنیفات میں کتاب جواہر الالفاظ وظہور الانوار المعروف بہ انوار صقلی ہے، اس کا ایک نسخہ لیڈن کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں متبعین اسلام کے اوصاف بتا کر "عرفان حق" "معرفت دین" "معرفت دشمنان دین" اور "معرفت دنیا و اہل دنیا" کو اصل تصوف قرار دیا ہے،

دوسری کتاب تحفۃ الاولیار و مراتب احوال الاصفیار ہے، اور تیسری کتاب کرامات الاولیار والمتبعین من الصحابۃ والتابعین ومن تبعہم باحسان ہے، ان میں سے اول الذکر میں اولیار وصوفیہ کے حالات وتراجم ہیں، اور دوسری میں فقہا کی جماعت کو خطاب کر کے کرامات اولیار کے ممکن الوقوع ہونے کے دلائل سمجھائے ہیں[1]،

(علم تاریخ)

علم تاریخ میں صقلی اہل علم کی صرف چند کتابیں معلوم ہیں،

تاریخ ممالک میں اولاً ابن القطاع الصقلی، اور ابو علی حسن بن یحیی کی تاریخیں ہیں، اور دونوں تاریخ صقلیہ کے نام سے موسوم ہیں، ابو علی کی تاریخ کا تذکرہ یاقوت (۶۲۶ھ) اور قزوینی (۲۸۲ھ) نے کیا ہے اور موخر الذکر کی کتاب کے ایک نسخہ کا پتہ حسن حسنی عبدالوہاب (جامع تیونس)

---

[1] معالم الایمان ج ۳ ص ۱۸۱ تا ۱۸۳ و اقتباس کتاب جواہر الالفاظ در اماری ص ۶۹۸ تا ۶۹۹

کے پاس چلا ہے، تیسری کتاب ابن احمد بن الصقلی متوفی ۵۲۷ھ کی تاریخ جزیرۃ الخضرا ہے جو اندلس کے کسی عہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، حاجی خلیفہ نے تذکرہ کیا ہے، اور ابن رشیق القیروانی کی تاریخ القیروان بھی لائق ذکر ہے، کہ وہ سسلی ہی مین تالیف پائی، جیسا کہ مین اپنے ایک مقالہ مین بتفصیل دکھا چکا ہون[۱]،

سیرت و طبقات مین ابن ظفر الصقلی کی چند کتابین جن مین ایک کتاب خیر البشر بخیر البشر (حاجی خلیفہ نے خبر البشر لکھا ہے) جس مین آنحضرت صلعم کے متعلق صحف سماوی کی پیشینگوئیان درج ہین، اس کا تذکرہ ابن ظفر نے اپنے ضمیمہ سلوان المطاع اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون مین کیا ہے، اس کے چند نسخے کتب خانۂ پیرس، کتب خانۂ عارف حکمت بک مدینہ منورہ مین (جس کا تذکرہ معارف کے مقالہ "حجاز کے کتب خانے" مین آیا ہے) اور کتب خانۂ خدیویہ مصر مین ہین؛ اور ۱۸۶۳ء مین مصر سے شائع بھی ہو چکی ہے، (اکتفار القنوع بما ہو المطبوع) دوسری کتاب اعلام النبوۃ ہے (کشف الظنون) اور تیسری کتاب انبار نجبار الانبار ہے، جو طبقات مین ہے، اس کے دو نسخے پیرس، اور کتب خانہ عارف حکمت بے مین، اور اس کا مختصر برلن اور گوٹا کے کتب خانون مین ہے، مصر سے چھپ بھی چکی ہے، طبقات مین شیخ ابو عتیق سمنطاری متوفی ۴۶۴ھ کی دو کتابین اخبار العلماء اور

---

[۱] - معارف ج ۲۳، ۲۴ علا تا ۳،

اخبار الصالحین ہین، موخر الذکر کو یاقوت نے دس مجلدات مین بتایا ہے[۱]،

تذکرۂ شعراء مین ابن القطاع الصقلی متوفی ۵۱۵ھ کی دو کتابین ہین جن مین ایک الدرۃ الخطیرہ فی المختار من شعراء الجزیرہ ہے، جو جزیرۂ صقلیہ کے شعراء کے ذکر مین ہے، اس مین ۱۷۰ شعرائے صقلیہ کے حالات اور تقریبا ان کے ۲۰ ہزار اشعار تھے، عماد الدین اصفہانی نے اپنی خریدۃ القصر وجریدۃ العصر مین اور ابن سعید نے کتاب المغرب کے ایک ٹکڑے اور الحان المسلیہ فی حلی جزیرۃ صقلیہ مین اقتباسات درج کئے ہین، جو برٹش میوزیم اور پیرس کے کتب خانون مین ہین، اور اب اس کے ایک اختصار المنتحل من الدرۃ الخطیرۃ لاسحٰق بن اغلب کا پتہ کتب خانہ تیموریہ مین چلا ہے، اور دوسری کتاب لمح الملح ہے، جس مین اسی طرح پر شعرائے اندلس کے حالات ہین، کشف الظنون اور ابن القطاع کے سوانح مین تذکرہ آیا ہے، اور تذکرہ شعراء و ادبا مین ایک اور کتاب ابن بشرون الصقلی کی المختار فی النظم و النثر لافاضل اہل العصر ہے، جس مین اپنے ہم عصر شعراء و ادباء کے حالات و نمونہ کلام درج کئے ہین، حاجی خلیفہ نے تذکرہ کیا ہے، اور ابن خلکان اور عماد الدین کے ماخذ مین ہے،

علم ادب

اسلامی سسلی کی علمی ترقیون مین علم ادب کو نمایان جگہ حاصل ہے، تمام

---

[۱] معجم البلدان ج ۵ ص ۱۳۱،

اصناف ادب، شعر و شاعری، انشا پردازی، اور ان کے متعلقہ علوم عروض وقوافی اور نحو ولغت مین سیکڑون ارباب کمال شعرا ر، انشا پرداز اور فن لغت ونحو ودیگر علوم کے ماہرین پیدا ہوئے ،

اس علمی ترقی کا سب سے بڑا سبب وہی یہان کے حکمران طبقہ کا ذوق ادب تھا، فرمانروایان صقلیہ، عہدہ داران حکومت اور امرا ورؤسا خود علم ادب پر عبور رکھتے، اور ارباب ادب کے قدردان ہوتے، اس سے ملک مین ادب کے مذاق کو ترقی ہوتی، اور دوسرے ممالک کے شعرا حکمران طبقہ کی داد و دہش کے افسانے سن کر صقلیہ آتے، اور یہان کی بزم علمی کی رونق بڑھاتے، یہی وجہ ہے، کہ صقلیہ کے علوم دینیہ کے حاملین سے ارباب ادب کی تعداد کہین زیادہ ہے، اور یہ صرف اسلامی دور پر موقوف نہین، نارمن عہد حکومت مین بھی راجر اول کے تعصب آمیز زمانہ کو خارج کرکے نارمن فرمانروایان صقلیہ اسلامی تہذیب وتمدن سے اس درجہ مانوس ہوگئے، کہ ان کے دربار مشرقی سلاطین کے دربارون کے مثل بن گئے، اور یہی صورت حال جرمن عہد مین بھی قائم رہی،

شاہی خانوادہ مین ذوق ادب

چنانچہ اغلبی عہد کے فرمان رواؤن مین عبداللہ بن محمد، ابوالاغلب، اور اغلبی شاہزادہ مجیر بن ابراہیم صقلیہ کے ممتاز شعرا مین ہین، موخر الذکر مسینا اور جنوبی اٹلی کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا، رومیون کے ہاتھ گرفتار رہا، اور قفس ہی سے طائر روح پرواز کرگئی، وطن کی یاد مین اس کی ایک پردرد

اور الم انگیز نظم قیدخانہ کی سلاخون سے نکل کر باہر پھیلی، اور افریقہ اور صقلیہ تک پہنچی، اصفہانی نے یہ نظم نقل کی ہے،

اسی طرح خانوادۂ کلبیہ مین ایسے کم فرمان روا گذرے ہین، جو خود شاعر نہ ہون، اور بعض کلبی شاہزادے بھی ممتاز شعراء مین تھے، اصفہانی وغیرہ نے ان کی شاعری کی ستائش کی ہے، اور نمونۂ کلام درج کیا ہے، ان مین سے چند یہ ہین، (۱) امیر ابو الحسین احمد (۲) امیر ثقۃ الدولہ (۳) امیر تاج الدولہ (۴) ابو القاسم عبداللہ بن الکلبی (۵) امیر ابو محمد عمار بن منصور الکلبی (۶) امیر مستخلص الدولہ عبدالرحمن بن حسن کلبی (۷) امیر ابو محمد قاسم بن نزار الکلبی اور ابو محمد جعفر بن طیب الکلبی وغیرہ[۱]،

عہدہ داران حکومت مین ذوق ادب اور عہدہ دار شعراء

اسی طرح ذیل کے اکابر عہدہ دار اسلامی اور نارمن دورون مین یہان کے ممتاز شعراء مین ہین، ابن القطاع اور اصفہانی نے توصیف کے ساتھ نمونۂ کلام درج کیا، وہ القائد سند الدولہ ابو الفتوح بن قائد بدیر المکلاتی صاحب سلطان (۲) ابو الفضل احمد بن علی الفہری صاحب الشرطہ (۳) القائد ابو محمد حسن بن عمر بن منکود (۴) امیر شیخ الدولہ عبدالرحمن اللولو (۵) ابو عبداللہ حسن بن القائد (۶) ابو عبداللہ محمد بن الحسن بن الطزی صاحب دیوان الانشاو الرسائل ہین، ان کے تذکرے

---

[۱] مسالک الابصار ابن فضل اللہ درامار ی ص ۵۴۷، الحان المسلیہ دریادگاری ج ۱ ص ۲۹۴، خریدۃ القصر اصفہانی درامار ی ص ۵۹۲ تا ۵۹۸، ابن خلکان ترجمہ یحییٰ بن اکثم،

خریدۃ القصر (دراماری ص ۵۹۹، ۵۹۵، ۵۹۶، ۶۰۴،۶۰۴) اور مختصر انبار الرواۃ (دراماری ص) مین آئے ہین، اسی طرح تقریباً بیس اکیس کتاب و وزرار کے نام ملے ہین، جو بلند پایہ انشا پرداز تھے، اور شاعری مین کمال رکھتے تھے، نیز کوئی نہ کوئی ان کی امتیازی خصوصیت تھی، مثلاً کوئی فن نحو کا امام تھا، کسی کو لغت پر عبور تھا، کوئی فن انشار کے کمال کے ساتھ معمہ سازی و چیستان نویسی مین مشہور تھا، کوئی مختلف صنعتون کے استعمال پر قادر تھا، اور انہی مین بعض صاحب تصانیف و مقالات بھی تھے، جن کو مورخین نے بیان کیا ہے[1]،

شعرائے دربار شعرار کی ایک کثیر تعداد دربار سے بھی وابستہ تھی، جہان وہ منہ مانگی مراد پاتے، اکثر مورخین نے تذکرہ کیا ہے مثلاً تاج الدولہ کے متعلق ہے،

"یہ سخی اور مہربان فرمان روا تھا، علمار و شعرار ہر جگہ سے اس کے پاس آتے، ان کی قدر و منزلت کرتا، اور بخششون سے مالامال کرتا،"

لیکن ان درباری شعرار کے صرف چند نام معلوم ہو سکے، مثلاً

(۱) ابو محمد عبد اللہ بن محمد المعروف بابن قاضی میلہ، ثقۃ الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا، ابن خلکان نے اس کے بعض قصیدے اس کی شان مین نقل

---

[1] الحان المسلیہ دریادگاری ج ۱ ص ۲۹۵، ۲۹۶، خریدۃ القصر دراماری ص ۵۸۹ تا ۵۹۸، ۶۱۰ کتاب انبار الرواۃ دراماری ص ۶۴۷ وغیرہ،

کئے ہین (ج ۳ ص ۱۸۲ تا ۱۸۵) (۲) محمد بن عبدون السوسی تاج الدولہ اس کے ایک ایک شعر پر زر و جواہر نثار کرتا[1]، (۳) ابن المودب القیروانی ثقۃ الدولہ کے عہد مین آیا، اور قصیدہ پیش کیا[2]، (۴) ابو الحسن ابن الخیاط الصقلی، تاج الدولہ کے دامن سے وابستہ تھا، دولت کلبیہ کے زوال کے بعد ابن ثمنہ کی مدح سرائی کی[3]،

ارباب علم ادب و شعر

صقلیہ کے ارباب علم ادب وشعر کے دو دور سہولت کے لئے قائم کئے جا سکتے ہین، یعنی دور[1] اول عہد اسلامی، اور دور[2] ثانی عہد عیسوی، اور پھر ہر دور مین دو قسم کے ارباب ادب لائے جا سکتے ہین، یعنی وہ ادبار جو اصناف ادب و متعلقات مثلاً انشار، نحو، لغت، اور عروض وغیرہ مین صاحب کمال ہین، عام ازین کہ وہ شاعر بھی ہون، اور دوسرے وہ ارباب ذوق ہین جنھین مورخین نے صرف شاعر ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے،

دور اول
یعنی عہد اسلامی کے ادبار

اس طرح اگر دور اوّل یعنی عہد اسلامی کے ادبار کو دیکھا جائے، تو ان کی تعداد مذکورہ بالا ارباب علم کو چھوڑ کر ۲۷ ہوتی ہے، جنھین مورخین نے علم ادب

---

[1] رحلۃ التیجانی درامارت ص ۲۷۹، [2] ابن خلکان ج ۳ ص ترجمہ یحیٰی بن اکثم،
[3] الالحان المسلیہ دریا درگاری ج ۱ ص ۲۹۸،

کے ماہرین کی حیثیت سے جگہ دی ہے، کسی کو ماہر لغت، کسی کو امام علوم ادب، کسی کو علم نحو مین یکتائے زمانہ کہا ہے، اور کسی کو عروضی کا خطاب دیا، ان ارباب ادب مین چند صاحب تالیفات بھی تھے، مثلاً عثمان بن علی السرقوسی اللغوی النحوی کی علم نحو وغیرہ مین کتابین تھین[1]، ابوحفص عمر بن خلف بن مکی الصقلی الخطیب اللغوی النحوی کے خطبات مدون ہوئے. قفطی نے ابن نباتہ متوفی ۴۲۵ھ جیسے بلند پایہ ادیب پر اس کو ترجیح دی، فن لغت مین اس کی ایک کتاب تثقیف اللسان ہے، جو امام نووی کی کتاب تہذیب الاسماء کے ماخذون مین ہے، کشف الظنون مین اس کا نام سقیف اللسان چھپ گیا ہے[2]،

ابو الحسن علی بن عبدالرحمٰن بن ابی بشائر الصقلی کو اسکندریہ مین امام نحو تسلیم کیا جاتا تھا، اس کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ مرتب تھا[3]، ابن فحام الصقلی النحوی کی نحو مین تالیفات ہین[4]، ابو عمران موسی بن اصبغ القرطبی اللغوی الادیب متوطن صقلیہ نے آٹھ ہزار اشعار کے مجموعہ مین نحو کے مسائل مبتدیون کے لئے منضبط کئے[5]، ابن رشیق القیروانی متوطن صقلیہ کی ذیل کی چند کتابین صقلیہ مین تالیف پائین، کتاب الشذور فی اللغۃ[1]، میزان العمل[2]، الروضۃ الموشیہ[3]، کتاب المساوی[4]، انموذج اللغۃ[5]، اور دیوان[6] ابن رشیق

[1] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۳، کتاب المقفی مقریزی درامارى ص ۶۶۳، [2] بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۳۶۲ کشف الظنون ج ۲ ص ۲۸، خریدۃ القصر درامارى ص ۵۹۷، کتاب انباہ الرواۃ درامارى ص ۶۴۴، [3] اخبار الملوک ونزہۃ المالک والمملوک فی طبقات الشعراء المتقدمین درامارى ص ۶۱۲، کتاب انباء الرواۃ درامارى ص ۶۴۴، خریدۃ القصر ص ۵۷۹) ۵۸۰، معجم البلدان ذکر بلنونہ در صقلیہ، [4] مختصر انباہ الرواۃ درامارى ص ۶۴۵، [5] بغیۃ الوعاۃ ص ۴۰۰،

چند قصیدون اور نظمون کا مقام نظم بھی متحقق طور پر صقلیہ[1] ہے، عمر بن علی بن عمر السرقوسی کی نحو، لغت، اور عروض مین کتابین تھین[2]،

ادبائے متقدمین کا خاتمہ ابن القطاع، ابو القاسم محمد بن علی الصقلی النحوی اللغوی الادیب متوفی ۵۱۵ھ پر ہوتا ہے، جس نے اپنی تالیف سے جزیرہ کے بہ کثرت شعرار کو زندہ جاوید بنا دیا، ۴۳۳ھ مین صقلیہ میں پیدا ہوا، یہین تعلیم و تربیت پائی، اور یہین فضیلت علمی کے بلند درجہ پر فائز ہوا، یاقوت لکھتا ہے، "یہ اپنے وقت مین اپنے وطن، اور مصر مین علم عربی اور فنون ادب کا امام تھا[3]،"

علوم ادب مین ذیل کی کتابین ہین، حواشی[4] بر صحاح جوہری، صحاح کے مشہور محشی ابو محمد بن بری النحوی کے حواشی کی بنیاد ابن القطاع کے انہی حواشی پر ہے[5]، کتاب[6] الافعال، در سہ جلد، ابن القوطیہ اور ابن طریف کی کتاب الافعال مین اصلاح و تہذیب کے بعد اس کو مرتب کیا، ابن خلکان کہتا ہے،" ابن القوطیہ کی کتاب الافعال سے بہتر ہے، چند نسخون کا پتہ چلا ہے، ایک رام پور کے کتب خانہ مین ابنیۃ الافعال والاسمار والمصادر کے نام سے ۸۵۱ھ کا مکتوب ہے، دوسرا نسخہ میلان اور تیسرا اسکوریال

---

[1] معارف ج ۲۳، [4] کلو ج ۴ ۲ ص ۱-۳، [2] مختصر انبار الرواۃ درامار ی ص ۶۴۷،

[3] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰، معجم الادبار ج ۵ ص ۱۰۷، خریدۃ القصر درا ماری ۵۸۹ھ، بغیۃ الوعاۃ ص ۳۳۲،

[4] معجم الادبار ج ۶ ص ۳۴۱، ج ۵ ص ۱۰۷،

مین ہے، میلان کے نسخہ سے گریفینی نے چند اقتباسات شائع کئے ہین[۱]، کتاب[۲]
الاسمار اس مین اسمار کے اوزان وابنیہ جمع کئے ہین، ابن خلکان کہتا ہے،
"اس سے اس کی کثرت اطلاع کا ثبوت ملتا ہے[۳]"، کتاب[۳] الابنیہ کا حاجی خلیفہ
نے ذکر کیا ہے، جس مین افعال واسمار دونون کے اوزان مشترک درج ہین[۴]
عجب کیا ہے، کہ رام پور کے کتب خانہ مین اسی کا نسخہ ہو، نام سے اشتباہ[۵]
ہوتا ہے۔ کتاب[۶] السیف، تلوار کے اسمار وصفات کے بیان مین
(کشف الظنون) کتاب القصار و اسمائہم وصفاتہم دھوبیون کے اسمار و
صفات مین (کشف الظنون) کتاب[۷] العروض والقوافی اور کتاب[۸] فرائد
الشذور وقلائد النور، شعروشاعری مین ہے، یاقوت نے تذکرہ کیا ہے[۹]،
اور اس دور کے بقیہ ادبار کے تذکرے ذیل کے مقامات مین دیکھیے[۱۰]
عیون الانبار فی طبقات الاطبار (ج ۱ ص ۱۸۹) بغیۃ الوعاۃ (ص ۲۲۴)
۷۵، ۲۵۶، ۶۴، ۲۲۵، ۳۳۲، کتاب انبار الرواۃ (درامار ی ص ۶۴۵
۶۴۶، ۸۴۶) ابن عساکر (سنہ ۳۹۱) الوافی بالوفیات درامار ی، ابن خلکان
(تذکرہ ابوالعلار، صاعد، ابوطاہر اسمعیل) خریدۃ القصر (درامار ی ص ۵۷۹
۵۸۰، ۶۰۳) ترتیب المدارک (دریادگاری ج ۱ ص ۳۸۲، ۳۷۶)
معجم الادبار (ج ۵ ص ۱۱۵) الالحان المسلیہ (دریادگاری ج ۱ ص ۲۹۷-۳۰۳)

۱- فہرست کتب خانۂ رام پور ومقالہ گریفینی دریادگاری ج ۱ ص ۴۳۲،
۲- ج ۲، ص ۲۰، ومعجم الادبار ج ۵ ص ۱۰۷، ۳- کشف الظنون ج ۲ ص ۲۸۳،
۴- معجم الادبار ج ۵ ص ۱۰۸،

شعرائے متقدمین

عہد اسلامی کے شعرار کے ۳۶ نام ایسے معلوم ہوسکے ہین، جن کے شعروشاعری کی ارباب تذکرہ نے مدح سرائی کی ہے، اور نمونۂ کلام درج کیا ہے، اور جن شعرار کو اصناف شاعری مین سے کسی خاص صنف مین شہرت تھی، یاکوئی خاص کمال حاصل تھا، اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے، ان شعرار کے تذکرے کتاب الالحان المسلیہ (دریادگاری ج ا ص ۲۹۹، ۳۰۴، ۲۹۸، ۲۹۷) خریدۃ القصر (درااماری ص ۵۸۹، ۶۱۰، ۶۰۳، ۵۸۱، ۶۰۱، ۵۹۸) اور ترتیب المدارک (دریادگاری ج ا ص ۲۸۲) مین آئے ہین،

اس دور مین بعض شعرار صاحب دیوان بھی گذرے ہین، جن مین ایک ابوالعرب مصعب الطبقلی متوفی ۵۰۶ھ ہے، تذکرہ نگارون نے اس کو صقلیہ کے ممتازترین شعرا مین جگہ دی ہے، صقلیہ مین اس سے شعرو شاعری کا بازار گرم تھا، المعتمد نے اس کو اشبیلیہ آنے کی دعوت دی، مگر وطن چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا، آخر نارمنی فتنہ سے گھبرا کر ۴۶۵ھ مین وطن کو خیرباد کہ دینے پر مجبور ہوا، اور المعتمد کے دربار سے وابستہ ہوگیا، حاجی خلیفہ نے اس کے دیوان کا تذکرہ کیا ہے[1]،

اس دور کا خاتمہ صقلیہ کے مشہور شاعر ابن حمدیس السرقوسی، ابومحمد عبدالجبار

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۷، مسالک الابصار دراماری ص ۶۵۵، ۶۵۶، الالحان المسلیہ دریادگاری ج ا ص ۲۹۶، نفح الطیب ج ص کشف الظنون ج ا ص ۵۲۳،

بن ابوبکر الازدی پر ہوتا ہے ، (۴۴۷ھ - ۵۲۷ھ) عربی علم ادب و شعر میں پانچوین صدی کے ممتاز و باکمال اساتذۂ فن شعرا مین گذرا ہے جس کی شاعری کا غلغلہ مغرب سے مشرق تک بلند ہوا ، اور اس کے ہم عصر ناقدین فن نے فن شعر مین اس کی فضیلت و برتری کا اعتراف کیا[۱]،

ابن حمدیس کا جب آفتاب کمال طلوع ہوا ، تو اسلامی صقلیہ اجڑ چکا تھا اپنے بوڑھے باپ کو صقلیہ مین چھوڑ کر صقلیہ سے نکل پڑا ، اور مختلف جگہ ہوتا اشبیلیہ مین المعتمد کے دربار سے وابستہ ہوگیا ، اس کی شاعری کا بڑا حصہ اسی دربار کی قصیدہ خوانی مین ہے ، اور کچھ حصہ وطن کی یاد مین ہے ،

اپنا دیوان خود مرتب کیا تھا ، جو دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے ، پہلی مرتبہ تاریخ صقلیہ کے محسن اماری نے ۱۸۸۳ء مین پلرمو سے شائع کیا ، پھر ۱۸۹۷ء مین روم سے دوسرا اڈیشن نکلا[۲]،

ابن حمدیس کی شاعری کا صحیح اندازہ اس کے نمونۂ کلام سے ہو سکتا ہے ، جس کی یہان گنجائش نہین ، تاہم یہ دیکھا جا سکتا ہے ، کہ اس کے خیالات کی بلندی ، معانی کی وسعت ، کلام کے زور ، عربی زبان پر قدرت ، الفاظ

۱۔ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۵ ، التکملہ ابن الابار ص ۶۲۷ ، المعجب مراکشی ص ۱۳۱تا ۱۳۴ کتاب الذخیرہ ابن بسام در تاریخ بنی عباد دوزی ج ۳ ص ۵۴ ، الحان المسلیہ در یادگاری ج ۱ ص ۲۹۹ ، نفح الطیب ج ۲ ص ۵۳۰ ، ۲۲۹ ، ۴۸۱ وغیرہ و انتخاب دیوان حمدیس در اماری ،

۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تذکرہ ابن حمدیس ، و یادگاری مضامین ج ۱ ص ۴۰۲ ،

کے شکوہ، فقروں میں دروبست، بندش کی دلفریب چستی، تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت سے عربی علم ادب کے ناقدین اس کی طرف متوجہ ہوئے، اور جب اس کی شاعری پر نقد کرنے لگے۔ اور کلام کے نمونے سامنے آئے تو ناقدین ادب کی تنقید میں بھی شاعرانہ طرز ادا، ندرت تشبیہ، اور لطف استعارات کے ساتھ قلمبند ہوئیں: المنصور شاہ حماہ لکھتا ہے:-

"وہ یگانۂ دہر تھا، علمی گھوڑ دوڑ اور بزم و رزم کے میدان میں اس کا مقابلہ ممکن نہیں، علم و حکمت کی اشاعت میں کوئی اس کی گرد کو نہیں پہنچا، علماء، فضلا کے درمیان نہایت مشہور تھا کہ ایک بہترین قادر الکلام شاعر تھا۔"[1]

ابن فضل اللہ العمری کا بیان ہے:-

"وہ ایک ایسی صبح ہے، جس کو تاریکیاں زنگ آلود نہیں کرتیں اور ایسا خالص پانی ہے، جس کو گندگیاں گدلا نہیں کرتیں، وہ ایسا اسپ اصیل ہے، جس کے پاس بھی آگے بڑھنے والے گھوڑے نہیں پھٹک سکتے، ایک ایسا بادل ہے، جس کو بجلیاں حرکت میں نہیں لاسکتیں، اس کی بارآور شاخ ٹوٹ نہیں سکتی، اس کی شب ماہ اندھیری نہیں ہوسکتی، اس کے

---

[1] اخبار الملوک و نزہۃ الممالک والملوک درامارے ص ۶۱۲

راستہ پر بہت کم لوگ چلے ہین، اس کے آسمان پر جن لوگون نے اپنے روشن چاند منور کئے، وہ شاذ ہین"

اس کے بعد کتاب الذخیرہ ابن بسام سے اس کے متعلق ذیل کی رائے نقل کرتا ہے:-

"وہ ایک ایسا ماہر شاعر ہے، جو نادر معانی کی چاند ماری پر نشانہ لگاتا ہے، نہایت مناسب تشبیہات کے استعمال پر قادر ہے اور الفاظ کے دریا مین غوطہ لگا کر نادر معانی کے موتی رولتا ہے"[1]

اسی طرح ابن خلکان اور ابن الابار وغیرہ اس کی شاعری پر تقریباً اسی طرح رائے ظاہر کرتے ہین[2]

دور ثانی
عیسوی عہد حکومت کے مسلمان ادبار وشعرار

صقلیہ مین دولت اسلامی کے خاتمہ کے بعد راجر اول کے عہد حکومت تک مسلمانان صقلیہ پر عام دور ابتلا رہا، ادبار وشعرار بھی اس کے پنجۂ ظلم سے نہ بچ سکے، ابو حفص عمر بن حسن الصقلی اسی عہد مین قید خانہ مین ڈال دیا گیا، اس نے راجر کے پاس چند قصائد بھیجے، مگر وہ ان لطافتون سے آگاہ نہ تھا، اسے رہائی نصیب نہیں ہوئی[3]

لیکن راجر دوم کی پرورش صقلیہ کے اسلامی آب وہوا مین ہوئی، اور

---

[1] کتاب مسالک الابصار درا ماری ص ۶۵۳
[2] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۴۱، التکملہ ابن الابار ص ۶۴۰
[3] خریدۃ القصر درا ماری ص ۵۸۷، مختصر اخبار الرواۃ درا ماری ص ۶۴۷

وہ اسلامی تہذیب وتمدن کا دلدادہ بن گیا، زبان عربی پر کامل قدرت حاصل کی، دفتری زبان عربی ہی رہی، سکہ پر عربی حروف کندہ تھے، القاب و خطابات عربی تھے، طرز معاشرت اور طریق حکومت بھی اسلامی ہی تھا، اس لئے قدرۃً عرب شعرا کی قدردانی کا وقت بھی آ پہنچا، جس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ جرمن فرمان روا مینفریڈ کے عہد (۱۲۶۶ء/۶۶۵ھ) تک قائم رہا، چنانچہ پاپائے روما اور بعض یورپین مورخین کی اصطلاح میں بعض حیثیات سے یہ پورا دور بھی گویا صقلیہ کا اسلامی دور ہے[1]، اسی کا اثر تھا کہ اگر راجر اول نے ایک عرب شاعر کو قید خانہ میں ڈال دیا، تو راجر دوم ایک دوسرے عرب شاعر کو صرف ایک قصیدہ کے صلہ میں نہ صرف قید سے رہا کرتا ہے، بلکہ انعام و اکرام سے سرفراز کرتا ہے[2]، اور نفس قصیدہ گوئی اس درجہ مؤثر تصور کرلی جاتی ہے، کہ یحیی بن تیفاسی القفصی نارمن حکومت کے ایک دشمن حکومت کا قصیدہ خوان جب اتفاقاً گرفتار ہوتا ہے، تو صرف اسی قصیدہ خوانی کے جرم میں تہ تیغ کردیا جاتا ہے[3]،

چنانچہ نارمن دربار میں بھی شعروشاعری کا وہی غلغلہ سنائی دینے لگتا ہے، جو اس سے چند دن پہلے بلرم کے قصر میں بلند تھا، اور اس کی آواز بازگشت بھی ابھی خاموش نہیں ہوئی تھی، نارمن دربار کے شعراء میں (۱) عبدالرحمن

---

[1] ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۹ ص ۸۱، انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا ج ۲۸ ص ۱۷۶، (ولیم نہ ص ۱۸۲ و ج ۱۱ ص ۴۸)

[2] مسالک الابصار درامّاری ص ۱۵۲، [3] خریدۃ القصر درامّاری ص ۵۹۹،

بن محمد بن عمر البشیری ، (۲) ابن بشرون الصقلی ، (۳) قاضی عبد الرحمٰن بن رمضان اور (۴) ابو الضیا سراج بن احمد بن رجار الصقلی، وغیرہ ہین ،جن کے قصاید بھی نارمن فرمان رواؤن کی شان بین تذکرۂ شعرا ہین منقول ہین[1]، شریف ادریسی بھی اسی دربار سے وابستہ تھا ،اگرچہ اس کی شہرت علم جغرافیہ مین ہے ، مگر وہ ایک مخصوص طرز انشا کا مالک بھی سمجھا جاتا ہے ، ابن بشرون نے اس کے انشار پر تبصرہ کیا ہے[2]،

چھٹی ساتوین صدی کے ادبار ، لغویین ، وعلمائے نحو ، اورشعرا مین گیارہ اہل علم کے نام نظر آتے ہین ،جن کے تذکرے انبار الرواۃ (در اماری ص ۶۴۵) الالحان المسلیہ (دریادگاری ج ا ص ۳۰۰)عنوان الدرایہ (ص ۱۲۱ ، ۱۶۹) خریدۃ القصر (در اماری ۶۰۴ ، ۶۰۶ ، ابن خلکان ج ۳ ص ۶۳)اورمقالہ حسن حسنی عبد الوہاب (دریادگاری ج ۲ ص ۴۹۲) مین آئے ہین ، اسی دور مین امام مازری کی بھی چند ادبی کتابین ہین ،جن کا تذکرہ ابن خلکان نے کیا ہے ، (ج ۲ ص ۲۸۷) اور ابن ظفر الصقلی کا مشہور ادبی شاہکار سلوان المطاع فی عدوان الطباع بھی اسی دور مین صقلیہ مین مرتب ہوا ،جو ایک صقلی مسلمان قائد کے تعمیل حکم مین لکھا گیا ،اس کتاب کے نسخے پیرس اور آکسفورڈ مین موجود ہین ، لیکن دونون مین کسی قدر فرق بھی ہے ،جس سے معلوم ہوتا ہے ، کہ ابن ظفر نے بعد مین اس کے دیباچہ

---

[1] خریدۃ القصر در اماری ص ۵۸۲ ، ۵۸۳ ، ۵۸۱ ، ۶۰۱ ، [2] خریدۃ القصر در اماری ص ۶۱۱ ،

مین کچھ ردو بدل کیا ، آکسفورڈ کا نسخہ اسی کتاب کا ہے، جو صفلیہ مین اولاً تالیف ہوئی ، سلوان المطاع کا طرز تحریر مقامات حریری کے طرز پر ، اور طرز بیان و واقعات کلیلہ دمنہ کے طرز پر ہین ، مصنف نے اس کے آخر مین دو جزؤن کا ایک ضمیمہ بھی منسلک کیا ہے ،

صقلیہ کا یہ علمی تحفہ عالم اسلامی مین مقبول ہوا ، اولاً تاج الدین ابوعبداللہ بن النجاری متوفی ۷۹۹ھ نے اس کو عربی نظم مین منتقل کیا ، ایک دوسرے اہل علم نے اس کی حکایتون کو کسی قدر مقدم و موخر کرکے فارسی مین ریاض الملوک فی ریاضت السلوک کے نام سے موسوم کیا ، ترکی مین شیخ الاسلام محمد امین ۱۱۶۷ھ نے ترجمہ کیا ، پھر مائیکل اماری نے ایطالوی ترجمہ ۱۸۵۱ء مین شائع کیا ، اور اصل کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۲۷۸ھ مین مصر سے پھر ۱۲۷۹ھ مین ٹیونس سے اور آخر مین بیروت سے شائع ہوا ؛

ابن ظفر کی چند اور ادبی کتابین ہین ، جن کے موضوع و مبحث کی تفصیل انہون نے خود الگ الگ بیان کی ہے ، وہ کتابین حسب ذیل ہین ، ملح اللغۃ ، کتاب السفر ، کتاب التنقیب ، کتاب ادہام الخواص ، کتاب کشف الکشف ، کتاب الجود والعواقب ، کتاب الحوذ الواقیہ والعوذ الراقیہ ، کتاب ریاض الذکری ، کتاب النصائح ، کتاب مالک الاذکار فی مسالک الافکار ، کتاب الفوائد و ابتیان فی النحو[1]

[1] اقتباس سلوان المطاع در اماری ص ۶۸۹ تا ۶۹۱ ، کتاب المقفی مقریزی در اماری ص ۶۶۶ ، کشف الظنون ج ۲ ص ۳۱ ، اکتفاء القنوع بما ہو المطبوع ص ۳۸۷ ،

ابن ظفر ایک قادر الکلام انشا پرداز تھے، عربی لغت، ادب پر وسیع نگاہ تھی، اور اس دور مین عربی ادب مین جو مقفی و مسجع عبارت آرائی تھی، اس مین باکمال سمجھے جاتے تھے، اسلوب بیان، طرز تحریر، اور طریق انشا وہی ہے جو چھٹی صدی مین عام بلند پایہ عرب ادبار کے درمیان رائج تھا،

(علوم عقلیات وریاضیات وطبعیات)

علوم و آداب کے بیان کی ابتدا مین اشارہ کیا جاچکا ہے، کہ مسلمانان صقلیہ کو ان علوم کی جانب توجہ کرنے کا موقع نہین ملا، تاہم کچھ نشانات مل جاتے ہین،

طب مسلمانون نے صدر اول کے خاتمہ یعنی علوم اسلامیہ کی تدوین کے بعد سب سے پہلے علم طب پر توجہ کی، چنانچہ صقلیہ مین بھی کسی قدر اسی مین رونق نظر آتی ہے، اور صقلیہ کے چند اطبار اور ان کی تالیفات کا پتہ چلتا ہے،

صقلیہ کے اطبا نے طب کی جو مستقل خدمت انجام دی، ان مین اندلس مین عبدالرحمن الناصر کے عہد مین ابن جلجل (ســـہ) کی نگرانی مین ایک طبی ادارہ مین بعض طبی خدمات انجام دیتا ہے، اطبار کی ایک جماعت اس ادارہ مین طبی تحقیقات مین مصروف تھی، طب یونانی کی اصطلاحون اور دواؤن کے نام عربی مین منتقل کررہی تھی، اس ادارہ مین ایک صقلی

طبیب ابوعبداللہ بھی تھا، جو عبدالرحمٰن الناصر کے عہد سے المستنصر کے زمانہ تک اس سے وابستہ رہا[1]،

صقلیہ کے اطبا نے طب مین جو کتابین لکھین، ان مین سے چند کا پتہ دور حاضر مین چلا ہے، حسب ذیل ہین :-

(۱) ابوسعید بن ابراہیم الطبیب الصقلی کی ایک کتاب المنجح فی التداوی من صنوف الامراض والشکاوی کے دو نسخے بولڈین اور پیرس کے کتبخانون مین ہین، اماری نے اپنے مجموعہ مین کچھ اقتباسات نقل کئے ہین، (ص ۶۹۴) مصنف کے زمانہ کا پتہ نہین تاہم اس کی اس کتاب کے دیباچہ کی نوعیت سے اس کا زمانہ قدیم معلوم ہوتا ہے ؛ وہ لکھتا ہے، کہ اس کتاب کی تالیف سے پہلے طب مین جس قدر کتابین ہین، ان مین یا تو مفرد دواؤن کے خواص ہین، یا ایسی کتابین ہین جن مین مختلف امراض کا علاج مفردات سے بتایا گیا ہے، مصنف اپنے بیان کے مطابق وہ پہلا شخص ہے، جس نے ان دونون امور کو اس تالیف مین جمع کیا،

(۲) صقلیہ کے مشہور محدث امام مازری علم طب مین بھی کمال رکھتے تھے ابن فرحون کا بیان ہے "جس طرح فقہ مین لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہین، اسی طرح طب مین بھی خلائق کے مرجوعہ ہین[2]"

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۴۶ ،

[2] دیباج ج ۱ ص ۲۸۰ ابن فرحون ،

(۳) شیخ ابوبکر الصقلی الطبیب کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ شیخ عزالدین جو بیمارستان نوری دمشق کے طبیب حاذق تھے، اور ابن ابی اصیبعہ جو عیون الانبار فی طبقات الاطبار کا مصنف ہے، دونوں انہی کے تلامذہ مین تھے[۱]

اطبائے صقلیہ کا ایک خاندان

اسی طرح اطبائے صقلیہ کا ایک خاندان صقلیہ سے ہجرت کرکے افریقہ آیا، اور مراکش کے فرمانروا ابوالفارس عبدالعزیز بن ابی الحسن کے دربار سے وابستہ ہوگیا، اس خاندان مین حاذق اطبار گذرے ہین، جنھون نے طب مین اپنی یادگارین چھوڑی ہین۔ (۴) ابومحمد عبدالسلام بن ابراہیم الصقلی الطبیب متوفی ۷۲۲ھ وہ پہلے طبیب ہین، جو اس خاندان کے افریقہ مین آئے، ان کی ایک کتاب فن جراحت مین ہے، جس کا ایک نسخہ جامع زیتون ٹیونس مین موجود ہے، (۵) ابوالعباس احمد بن عبدالسلام الشریف الصقلی الطبیب کی دو کتابین معلوم ہین، شرح ارجوزہ لابن سینا اس کا ایک نسخہ مدرسہ صادقیہ ٹیونس کے طلبائے قدیم کی ایسوسی ایشن مین ۱۱۷۲ھ کا مکتوب موجود ہے، کتاب الاطبار فی الامراض من الفرق الی القدم اس مین سر سے پیر تک کے تمام اعضا کے امراض وعلاج کو بیان کیا ہے، اس کے دو نسخے ہین، ایک لیڈن مین، دوسرا ٹیونس مین،

---

[۱] - عیون الانبار ج ۲ ص ۲۶۶،

(۶) ابوعبداللہ محمد بن عثمان الطبیب الصقلی کی بھی دو کتابین ہین المختصر[1] الفارسی جو امام رازی کے اتباع مین المنصوری کی طرح ابوالفارس کی طرف منسوب ہے، اس مین طب کی دو قسمون علمی و عملی، علم بالکلیات، و عمل بالمعالجات مین تقسیم کرکے اول کو تین مقالون اور دوسرے کو سات مقالون مین بیان کیا ہے، اس کے کئی نسخے جامع زیتون ٹیونس وغیرہ مین موجود ہین، کتاب[2] منہاج الدکان کا ایک نسخہ جامع زیتون مین ۱۱۶۲ھ کا مکتوب ہے[1]،

نارمن دربار مین عرب و یہودی دونون طبیب تھے، ابن جبیر ولیم ثانی کے متعلق لکھتا ہے، کہ وہ اطبا کا نہایت حریص ہے، اپنے پاس سے جدا ہونے نہین دیتا[2]، اور یورپ کے ایک عجائب خانہ مین ولیم ثانی کی ایک تصویر ہے، جس مین ایک عرب طبیب ولیم کے بستر موت کے سامنے اپنے آلات رکھے عمل جراحی کر رہا ہے، یہ تصویر الہلال والمقتطف مین نظر آئی تھی،

(علم جغرافیہ)

علم جغرافیہ سے صقلیہ کے اہل علم کی دلچسپی کا اندازہ ان روایتون سے

---

[1] مقالہ حسن حسنی عبدالوہاب دریادگاری ج ۲ ص ۴۸۶ تا ۴۹۱ و مقالہ گریفینی ج ۱ ص ۴۴۵، دبلونھیکا اماری ص ۶۹۷، [2] رحلہ ابن جبیر ذکر صقلیہ

ہوتا ہے، جو صقلی اہل علم جغرافیہ نویسون سے صقلیہ کے متعلق جغرافی حالات بیان کیا کرتے تھے، اور ان کے حوالے جغرافیہ کی بعض کتابون مین درج ہوگئے ہین[1]، اسی طرح یہ بھی معلوم ہے، کہ اس وقت تک علم جغرافیہ مین جو کتابین تالیف ہوئی تھین، وہ صقلیہ کے اہل علم مین متداول تھین، ادریسی نے صقلیہ مین ان کے موجود ہونے کا تذکرہ نام بنام کیا ہے[2]،

مشہور عرب سیاح صقلیہ مین

مشہور عرب سیاحون مین ابن حوقل اور ابن جبیر صقلیہ آئے، اور اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا، اور ابن حوقل نے اپنے سفر نامہ مین، صقلیہ کے تذکرہ کے علاوہ، بلرم کے حالات مین ایک مستقل رسالہ لکھا؛ جو ۱۸۴۵ء مین پیرس سے طبع ہوچکا ہے، (اکتفار القنوع) لیکن میری نظر سے نہین گذرا، اس کے ایک رسالہ کا تذکرہ "محاسن اہل صقلیہ" کے نام سے معجم البلدان (ج ۵ ص ۳۷۶) مین آیا ہے، شاید مطبوعہ رسالہ یہی ہو، ابن جبیر ۵۸۰ھ مین یہان آیا، اور دو مہینون سے زیادہ مقیم رہا، صقلیہ کے مسلمانون سے اس کے مراسم قائم ہوئے، اس کے سفر نامہ کا سب سے پہلا حصہ صقلیہ ہی کے متعلق ۱۸۴۶ء مین فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا، پھر پورا سفر نامہ ۱۸۵۲ء پھر ۱۸۹۶ء اور آخر مین ۱۹۰۷ء مین گب میموریل کی جانب سے اہتمام سے چھپا،

---

[1] کتاب تحفۃ الباب ونخبۃ الاعجاب در اماری ص ۸۷، کتاب الاشارات فی معرفۃ المزارات در اماری ص ۵۷، معجم البلدان ج ۵ ص ۲۷۵، [2] نزہۃ المشتاق ص ۵،

عرب جغرافیہ نویسون مین ابو عبد اللہ محمد بن محمد المعروف بہ شریف ادریسی کا نام اسلامی علم جغرافیہ کی تاریخ مین زرین حروف مین لکھا جائیگا، اسے علوم عقلیہ مین دستگاہ کامل تھی، اور اسی تعلق سے صقلیہ آیا، راجر دوم نے قدر افزائی کی، اور اپنی شہرہ آفاق کتاب نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق، راجر ہی کے لیئے تالیف کی، جو یورپ کے مختلف کتب خانون پیرس، آکسفورڈ، اور قسطنطنیہ وغیرہ مین محفوظ ہے، اس کے شائع شدہ حصص مین اولاً ۱۵۹۲ء مین اسی کا ایک عربی اختصار روم سے نکلا، پھر مختلف مستشرقین کے اہتمام مین مختلف حصے مختلف وقتون مین شائع ہوئے، جن مین سے پہلا حصہ شام و فلسطین کے متعلق ۱۸۲۸ء مین پھر مغرب، سوڈان، مصر، اور اندلس کے حصہ کو ڈوزی نے ۱۸۶۴ء مین لیڈن سے چھاپا، اس کے بعد ۱۸۸۵ء مین ایطالوی ترجمہ کے ساتھ ایطالیہ و صقلیہ کے حالات چھپے، اور اسی طرح اس کے مختلف ترجمے کہین مع اصل، کہین صرف ترجمہ مختلف مقامات سے شائع ہوئے،

شریف ادریسی راجر دوم (سنہ) کی وفات کے بعد بھی یہین مقیم رہا، ولیم (۱۱۶۶ء / ۵۶۱ھ - ۱۱۸۹ء / ۵۸۵ھ) نے بھی اس کی قدر کی، اور اس کے نام پر بھی جغرافیہ مین ایک کتاب روض الانس و نزہۃ النفس کے نام سے لکھی، جو اصفہانی کے بیان کے مطابق نزہۃ المشتاق سے زیادہ ضخیم تھی، مگر اس تالیف کا تذکرہ کسی اور جگہ نظر سے نہین گذرا[1]،

---

[1] الوافی بالوفیات صفدی در اماری ص ۶۵۷، ۶۵۸ خریدۃ القصر در اماری ص ۶۱۱، نزہۃ المشتاق ص ۳ تا ۶

(علم ہیئت وریاضیات)

علم ہیئت عربون کا محبوب فن رہا ہے، جہان رہے فلک پیمائی کرتے نظر آئے، ادریسی کا وہ کرہ لائق ذکر ہے جو یہان تیار ہوا تھا، چار لاکھ درہم کے وزن کی ایک نقرئی اینٹ اس کے سپرد کی گئی، جس کو پگھلا کر اصول ہیئت کے روسے اولاً آسمان کی شکل کے چند دائرے بنائے گئے، اوران کو طبق درطبق پیوست کر کے کرہ کی شکل مین تیار کیا گیا، جو گویا مختلف طبق افلاک تھے، اور ایک دوسرا مدور کرہ زمین کا تیار ہوا، اوراسی عظیم الشان سانچے پر دنیا کے تمام پہاڑون، دریاؤن، وادیون اوران کے نشیب و فراز کی تصویر اتاری گئی، اس کے بنانے والے صقلی اہل علم تھے[1]

مسلمانان صقلیہ اپنے اصول ہیئت وریاضیات سے مذہبی امور مین عملی فائدہ بھی اٹھاتے تھے، صقلیہ کے عین الاوقات کا تذکرہ ادریسی اورابن فضل اللہ العمری نے کیا ہے، یہ ایک گھڑیال تھا، جو ایک چشمہ مین لگا ہوا تھا، اور شہر کے مسلمانون کو نماز کے اوقات سے مطلع کرتا تھا[2]

صقلیہ کے ہیئت دان ومنجمین کے چند نام معلوم ہوسکے ہین، وہ یہ ہین:- (۱) ابوحفص عمر بن حسن بن القونی المنجم، (۲) ابوعبداللہ محمد

---

[1] نزہتہ المشتاق ص ۵، [2] ایضاً ص ومسالک الابصار ابن فضل اللہ العمری دراماری ص

بن عیسیٰ الصقلی المنجم ، (۳) احمد بن مفرج المہندس الصقلی ، (۴) ابو محمد عبد الکریم الصقلی المنجم اور ابو محمد عبد المعطی بن محمد السرقوسی[1]، اور اسی طرح وہ مہندسین بھی اسی زمرہ مین داخل ہین، جن کا تذکرہ اس سے پہلے گذر چکا ،

کیمیا سازی (کیمسٹری)

اس زمانہ مین معمولی دھاتون مین تغیر و تبدل اور آمیزش کرکے اسے سونے اور چاندی مین منتقل کرنے کا امکان تصور کیا جاتا تھا، اس کیمیاگری کا خبط صقلیہ کے بے فکرون مین بھی موجود تھا ، ابن المودب الشاعر کے متعلق تصریح ملتی ہے ، کہ جب وہ جرم کی پاداش سے روپوش ہوا، تو چند اپنے ہی ہم مشرب دوستوں کے گھر مین پناہ لی ، جو مخفی مکانون مین بیٹھے دھاتون کو الٹ پھیر کرکے کیمیاگری کی دھن مین لگے رہتے[2]

لیکن اس کے ماسوا مسلمانون کی توجہ کیمیا سازی پر بھی مبذول تھی، اس موضوع پر بعض کتابین بھی مثلاً کتاب سر الکیمیا[1] ، اور کتاب عمل الاصباغ[2] والمداد و الحبر ہین، اول الذکر کتاب ابن بشرون الصقلی کی ہے جس کا

---

[1] ۔ اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۸۹ ، خریدۃ القصر در اماری ص ۵۹۶ ، اخبار مصر ابن میسر ج ۲ ص ۶۴ ، [2] ابن خلکان ج ۲ ترجمہ یحیٰی بن اکثم ،

ایک نسخہ ٹیونس مین محفوظ ہے ، اور آخرالذکر کسی نا معلوم صقلی مصنف کی ہے ، اس کا بھی ایک نسخہ ٹیونس ہی مین ہے ، اس مین رنگسازی اور روشنائی بنانے کے طریقے درج ہین ، گریفینی نے کچھ اقتباس شائع کیا ہے جس مین روشنائی کی مختلف قسمین ، مختلف نسخے ، اور بنانے کی مختلف ترکیبین بیان کی گئی ہین[1] ،

(فلسفہ ، و منطق)

فلسفہ و منطق کو سب سے آخر مین اس لئے جگہ دی ، کہ اس کا تعلق زیادہ تر صقلیہ کے عیسوی عہد کے مسلمان اہل علم سے ہے ، صقلیہ کے عہد اسلامی مین بجز ایک دو نامون سعید بن فتحون القرطبی ، اور ابو محمد عبد المعطی بن محمد السرقوسی کے ابھی تک علم مین نہین آئے ، سعید بن فتحون ، کے توطن پذیر ہونے کا تذکرہ گذر چکا ہے ، اندلس سے اس کی ہجرت کا سبب اس کے بعض فلسفیانہ میلان ہی تھے ، المنصور بن ابی عامر نے اسی جرم مین قید و بند مین ڈالا ، اور رہائی پاکر اس نے صقلیہ کو اپنا مامن بنایا ، اور یہان اپنے مشاغل مین مصروف رہا فلسفہ مین اس کی دو کتابین معلوم ہین ، ایک شجرۃ الحکمۃ ہے ، جس مین علوم

---

[1] - یادگاری مضامین ج ۱ ص ۵۴۴ ،

فلسفہ کے مبادی و مقدمات کا بیان ہے، اور دوسرا رسالہ تعدیل علوم پر ہے، جس مین جوہر و عرض کے انقسام کے بعد علوم کے بتدریج وجود پذیر ہونے تک بحث کی ہے[1]، اور ابو محمد عبد المعطی بن محمد السر قوسی علم منطق کا عالم تھا[2]،

لیکن صقلیہ کے نارمن اور جرمن دور مین مسلمانان صقلیہ ہی یونانی فلسفہ کے مذاہب کے علمبردار تھے، اور کلیسا کے پادری اسلام سے منجملہ دیگر مذہبی اختلافات کے مسلمانون کے اس ذوق فلسفہ کے باعث بھی بیزار تھے، کیونکہ مسلمانون کے اثر سے عیسائیون کے طبقون خصوصاً فرمانروا خاندان مین ان علوم کی مقبولیت حاصل ہوئی، مثلاً راجر دوم (۴۹۹ھ ۱۱۰۵ء - ۵۴۹ھ ۱۱۵۴ء) کو ادریسی، ابن فضل اللہ الدمشقی، اور صفدی نے "محب علوم فلسفیہ و عقلیہ" لکھا ہے، اور فلاسفہ اور ماہرین علوم عقلیہ کا قدردان بتایا ہے،

اسی طرح فریڈرک دوم (۵۹۵ھ ۱۱۹۸ء - ۶۴۸ھ ۱۲۵۰ء) فرمان روائے صقلیہ عربی زبان و عربی علوم کا قدردان تھا، علوم فلسفہ و منطق صقلیہ مین اس نے مسلمان اہل علم سے سبقاً سبقاً حاصل کئے، اور جب اسلامی ممالک پر چڑھائیون مین جاتا، تو یہ اہل علم بھی اس کے ساتھ ہوتے، ابن جوزی نے بیت المقدس کا واقعہ لکھا ہے، کہ "جب موذن نے اذان دی تو سب کے سب فراش، غلام، اور استاذ اس کے پاس سے اٹھ گئے، یہ استاذ اس کے ساتھ صقلیہ سے آیا تھا، جو اس کو فلسفہ کا درس

---

[1] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۵۶، طبقات الامم ص ۶۸، [2] الحلل المسلیہ دریادگاری ج ۱ ص ۲۹۷،

دیتا تھا،" فریڈرک نے ان علوم کا اس کثرت سے مطالعہ کیا، کہ رفتہ رفتہ عیسائیت سے برگشتہ ہو کر لا مذہب ہو گیا، صاحب جامع التواریخ کا بیان ہے، "اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دہری ہے، عیسائیت کا مذاق اڑایا کرتا ہے[۱]" اور پاپائے روما نے تو یہ کہ کر کہ وہ دین نصرانی سے خارج ہو کر مسلمانوں کی طرف مائل ہے، اس کے قتل کا فیصلہ دے دیا، مقریزی اور ابوالفداء وغیرہ نے بھی اس کے علوم عقلیہ میں تبحر کا تذکرہ کیا ہے،

وہ علمی شکوک وشبہات میں اپنے ہمعصر مسلمان سلاطین الکامل وغیرہ سے استمداد کرتا، چنانچہ ایک مرتبہ علم ریاضی، حکمت اور ہندسہ کے مسائل قلمبند کر کے اس کے پاس استفسار کے طور پر بھیجے، الکامل کی طرف سے شیخ علم الدین نے تسلی بخش جوابات بھیج دئے، اسی طرح اہل علم مسلمان سفراء سے بھی رجوع کرتا، الکامل کے سفیر امیر فخر الدین اور فریڈرک میں دقیق علمی مباحث زیر بحث رہے، شیخ جمال الدین متوفی ۶۹۷ھ سے بھی جو ملک الظاہر کے سفیر تھے، اس نے علمی شکوک رفع کئے، انہوں نے علم منطق میں ایک رسالہ اسی کے نام معنون کر کے "انبروریہ" (انبرور یعنی امپرر) لکھ کر اسے دے دیا تھا[۲]،

اسی سلسلہ میں فریڈرک کی ایک اہم یادگار ابن سبعین متوفی ۶۶۹ھ کی کتاب المسائل الصقلیہ یا الفوائد الصقلیات ہے جو فریڈریک کے چند فلسفیانہ سوالات

---

[۱] درامادی ص ۵۱۵، ۵۱۶، [۲] ابوالفداء ج ۴ ص ۳۳، کتاب السلوک لمعرفۃ دول الملوک درامادی ص ۵۲۲

قدامت عالم، اور ماہیت روح وغیرہ کے جواب مین ہے، اس کے دو نسخے بوڈلین اور آکسفورڈ مین ہین، اماری نے کچھ اقتباس شائع کیا ہے،

سسلی کے عہد عیسوی بین اسلامی تہذیب وتمدن

بیان بالا سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ سسلی کے اس عیسوی دور مین جب تک وہ مسلمانون کے وجود سے خالی نہین ہوا، عیسائیون نے اسلامی تہذیب وتمدن کو ہمہ گیری سے قبول کر لیا تھا، اس لئے مناسب ہے کہ اس مبحث کے خاتمہ پر چند اشارات اس جانب بھی کر دئے جائین،

سسلی کی اسلامی سلطنت کی تباہی کے اسباب کیا ہین، یہ میرے دائرۂ بحث سے خارج ہے، الغرض جب راجر اول کو سسلی پر تسلط حاصل ہوا، اور ۴۴۴ھ سے ۴۸۴ھ تک بین اس نے صقلیہ کے چپہ چپہ پر مسیحی علم بلند کر دیا، تو اس کے بعد اس کی خدمت مسیحیت کا دور شروع ہوا، راجر کو عیسائیون کی طرف سے "محافظ دین مسیحیت" کا وقیع خطاب ملا ہے، وہ واقعی اس کا پورا مستحق تھا، اس نے ان تمام معاہدون کے برخلاف جو فتح صقلیہ کے وقت مختلف اسلامی شہرون سے کئے تھے، صقلیہ کے مسلمانون کے مذہب اسلام کے استیصال کا حتمی تہیہ کر لیا، اولاً جنوبی اٹلی، ناروے، اور فرانس کی عیسائی قومون کو صقلیہ بین لاکر آباد کیا، پھر اسلام مین داخلہ کا دروازہ قانوناً بند کیا، مسلمان نظام حکومت سے

الگ ہو ہی چکے تھے، معیشت کے تمام دروازے بھی ان پر بند ہو گئے، اور اس کے مختلف شعبوں صنعت، حرفت، اور تجارت سے انہیں الگ کر کے ان کی جگہ نو آباد عیسائیون کو برسر اقتدار لانا شروع کیا، راجر کو ایک طویل عہد تک فرمانروائی کا موقع ملا، اور وہ اپنے عہد مین اسی طرح صقلیہ کے مسلمانون کے سیاسی و معاشی وجود کا خاتمہ کرتا رہا، نویری، ابن اثیر، اور ابوالفدا، بیک زبان لکھتے ہین،

"راجر سارے جزیرہ کا مالک ہو گیا، اور یورپین قومون کو مسلمانون کے ساتھ آباد کیا، اور وہان کے مسلمان باشندون کے لئے کوئی حمام، کوئی دکان، کوئی پن چکی، اور کوئی تنور (یعنی تجارت، صنعت، حرفت اور زمینداری وغیرہ) باقی نہین چھوڑا[۱]"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نارمنون کے دور کے آغاز کے ساتھ مسلمانون کے مصائب کی ابتدا کے ساتھ سارے جزیرہ مین بھی ابتری پھیل گئی، کیونکہ نارمن نہ خود کسی مدنیت کے حامل تھے، نہ کسی اعلیٰ نظام حکومت کے قائم کرنے کا انہین تجربہ تھا، اور نہ ملک کی معاشی حالت کو سنبھالنے کی استعداد رکھتے تھے، تاہم راجر اول خدمت مسیحیت اور نشہ فتحمندی کے جوش مین اسی حکمت عملی پر گامزن رہا، اور کچھ نہ کچھ کر لے گیا، لیکن اس کے عہد حکومت

[۱] نہایت الارب در اماری ص ۴۴۸، و ابن اثیر و ابوالفدا،

کے بعد وہ جوش وخروش کچھ سرد پڑا ، اور کچھ دوسرے حالات ایسے پیدا ہو گئے ، کہ اس کے جانشینون پر اس کی حکمت عملی کی ناکامی جلد آشکارا ہو گئی اور نظر آیا کہ نظام حکومت سنبھالنے والا اور معیشت کے ذرائع بہم پہنچانے والا جزیرہ مین بجز مسلمانون کے کوئی اور موجود نہین ، اور خصوصاً اس لئے کہ اسی اثنا مین نارمن حکومت اور بعض دول یورپ مین جنگ چھڑ گئی[۱] ، اور راجر دوم کو صقلیہ کے معاملات پر توجہ کرنے کا کم موقع ملنے لگا ، بالاخر اس نے اپنی حکمت عملی بدلی ، اور مسلمانون کو نظام حکومت مین شرکت کرنے کی دعوت دی ، اور خود اسلامی مدنیت اختیار کر لینے پر آمادہ ہو گیا نویری وغیرہ لکھتے ہین :-

"اس کے بعد اس کا لڑکا راجر تخت پر بیٹھا ، اس نے مسلمان سلاطین کا طریق عمل اختیار کیا ، اور اسی پر گامزن ہوا ، چنانچہ کوتل گھوڑے ، عورتون کا حجاب ، سلاح و اوزار کی زیب و زینت اور باڈی گارڈ (جاندار یہ) وغیرہ کو خود بھی اختیار کیا ، اور عام عیسایون کے عادات و اطوار سے کنارہ کش ہو گیا ، کیونکہ ان چیزون سے وہ لوگ ناآشنائے محض تھے ، نیز اس نے دیوان المظالم قائم کیا ، . . . . . . اور مسلمانون کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آیا ، اور ان

---

[۱] ۔ انسائیکلوپیڈیا ج ۲۳ ص ۴۵۳ ،

کو عہدے دے کر اپنے گرد جمع کیا، اور عیسائیون کو ان پر دست انداز ہونے سے روک دیا، ان حالات کی بنا پر مسلمان بھی اس سے محبت کرنے لگے[1]،

اسی زمانہ سے "صقلیہ کا عیسوی اسلامی عہد" شروع ہوتا ہے، دونون قومین ملک مین مشترکہ زندگی بسر کرتی ہین، اور ایک دوسرے کے رنج و راحت مین شریک رہتی ہین،

کچھ دنون تک یہی حالات قائم رہے، اس اثنا مین نارمن حکومت نے ایک طرف اسلامی ملکون مین فتوحات حاصل کین، دوسری طرف دول یورپ مین بین الاقوامی وقار حاصل کر لیا،

اس کے بعد اور نئے حالات پیش آتے ہین، اور اس کے نتیجہ مین صقلیہ مین بھی ایک نئی تبدیلی ظاہر ہوتی ہے، یعنی نارمن حکومت اور دول یورپ خصوصاً سلطنت کلیسا کے باہمی تعلقات سے مسیحیت کی خدمت کا تخیل تازہ ہوتا ہے، اور اسلام و عیسائیت کے مذہبی تعصبات کی دبی ہوئی چنگاریون کو پوپون کی مقدس عبا کے دامن کے جھونکون سے ہوا لگتی ہے، اسلام و عیسایت مین امتیاز پیدا ہوتا ہے، اور اس کا سب سے پہلا مظاہرہ ایک عیسائی پر مسلمان ہوجانے کا شبہ کرنا اور اس جرم مین پوپون کے فیصلہ کے مطابق اسے نذر آتش کر دینے مین پیش

---

[1] - نہایۃ الارب نویری در اماری ص ۸ ۴ ۴ ،

آتا ہے ، اگرچہ بظاہر اس کا تعلق مسلمانون سے کچھ معلوم نہین ہوتا ، مگر ابن اثیر کی اس واقعہ پر ذیل کی رائے سنئے :۔

" یہ پہلی مصیبت تھی ، جو صقلیہ مین مسلمانون پر ٹوٹی ، اس کے بعد خدا نے راجر کو کم مہلت دی اور وہ اسی سال ماہ ذی الحجہ کی دسوین تک انتقال کرگیا[۱] "

اور اسی زمانہ مین یہ پیش آتا کہ اگر افریقہ کا کوئی اسلامی مفتوح شہر بغاوت کرتا ، اور وہان عیسائی آبادی ہوتی تو کہا جاتا ،

" اگر ایک عیسائی بھی مارا گیا ، تو صقلیہ کے تمام مسلمانون کی جائداد و املاک قرق کرلی جائیگی ، اور تمام مسلمانون کو قتل کردیا جائیگا "

اور وہ وقت بھی آپہنچا ، کہ صقلیہ کے گلی کوچون مین اسلام و پیغمبر اسلام کے متعلق نا ملائم کلمات اکثر سنائی دینے لگے ، اور اس طرح رفتہ رفتہ مسلمانون کے جڑے ہوئے دل بھی ٹوٹ گئے ،

لیکن ایک طرف اسلام سے یہ بیزاری ہے ، اور دوسری طرف یہ سن کر تعجب کیجئے ، اسلامی تمدن ساری عیسائی آبادی مین چھا جاتا ہے ، اور تمام نو آباد عیسائی اسلامی مدنیت کے پرستار بنتے جاتے ہین ، اور چونکہ اسلامی مدنیت کے حامل یہی مسلمان تھے ، اس لئے ہر حیثیت سے اس

---

[۱] ۔ ابن اثیر ج ۱۱ ص حوادث سنہ ۵۴۸ھ

وقت بھی ان کی پذیرائی ہے، لیکن یہ نظر آتا ہے، کہ اگر دنیاوی جاہ حشم درکار ہے، تو اپنے آقاؤن کی خوشنودی کے لئے خواہ اسلام ترک کرین، یا اسلام رکھین، تو کتمان ایمان کرلین، ورنہ بدرجہ اقل اسلام یا پیغمبر اسلام کے محاسن پر کبھی کوئی لفظ نہ نکالین، چنانچہ جب ابن جبیر صقلیہ پہنچا، تو بھی دونون متضاد گردوپیش تھے، جن مین مسلمانان صقلیہ گھرے ہوئے تھے، ایک طرف اسلامی تمدن کی پذیرائی تھی، دوسری طرف مذہب اسلام اور شہادت کلمۂ اسلام سے بیزاری، ابن جبیر نے ان دونون نقشون کو جدا جدا دکھایا ہے، پہلے اسلامی تہذیب و تمدن کی خدمت کا مختصراً نظارہ کیجیے، لکھتا ہے :۔

"یہان کے فرمانروا کے حالات تعجب انگیز ہین، وہ ایک نیک سیرت فرمانروا ہے، مسلمانون کو خدمات پر سرفراز کرتا ہے، مسلمان خواجہ سراؤن کو اپنے یہان نوکر رکھتا ہے"...... مسلمانون پر کامل اعتماد رکھتا ہے، اور اپنے تمام حالات و اہم مشاغل مین اسے انہین سے تسکین ہوتی ہے، یہان تک کہ اس کے باورچی خانہ کا داروغہ بھی ایک مسلمان ہی ہے، .... اس کے وزراء و حجّاب سب مسلمان ہین، مسلمانون مین سے اکثر اس کے ارباب حکومت اور اس کے ندمائے خاص ہین، اور درحقیقت اس مملکت کی رونق انہی مسلمانون سے قائم ہے، یہی لوگ رئیسانہ طور و طریق کے

ساتھ عیش وتنعم سے زندگی گذارتے ہین، اور یہی لوگ قیمتی لباسون عمدہ سواریون، خدم وحشم، اور اتباع اور حاشیہ نشینون کے ساتھ رہتے سہتے ہین، ......اس کے محل مین بہ کثرت کنیز اور غلام ہین، عیسائی فرمانرواؤن مین اس سے زیادہ عیش پرست اس سے زیادہ طمطراق رکھنے والا، اور اس سے زیادہ مرفہ الحال کوئی دوسرا موجود نہین، وہ شاہانہ شان وشوکت، ترتیب قوانین، طرز حکومت، عہدہ دارون کے مراتب کی تعیین اور زیب وزینت وغیرہ کے اظہار مین سلاطین اسلام کے مشابہ ہے، اس کی مملکت بڑی ہے، اور اس کے دربار سے اطبا وہیئت دان وابستہ ہین .....اس کے وہ تمام خدام اور خواجہ سرا جو محل مین اس کے ساتھ رہتے ہین، مسلمان ہین، اور وہ سب کے سب یا ان مین سے اکثر اپنا ایمان چھپائے ہین، ..... اس سلطنت کے اعیان اور اس کے صوبون کے والی بھی مسلمان ہی ہین"

جس قوم کی تہذیب وتمدن کی محبوبیت کا یہ عالم ہے، اب اسی زمانہ مین اس قوم کے دردناک مصائب اور مذہبی آزادی پر ظالمانہ پابندی کی روداد بھی سنئے، کہتا ہے:-

"اس شہر کے زمانۂ قیام مین ہم کو اس جزیرہ کے باشندون کی وہ بری حالت جو عیسائیون کی وجہ سے ہوئی ہے، اور

ان کی ذلت و مسکنت اور ذمیون کی طرح رہنے، اور بادشاہ کی ایسی سختی جو ان کے بدبخت بچون اور عورتون کو دین سے برگشتہ کرنے کے متعلق کی جارہی ہے، دردانگیز طریقہ پر معلوم ہوئی اس تشدد نے بعض اوقات ان کے بوڑھون کے ساتھ ایسی ذلت انگیز سزا کی صورت اختیار کرلی جو ان کے مذہب چھوڑنے کا سبب بن گئی، چنانچہ انہی قریبی سالون کا قصہ ہے، کہ اس ظالم بادشاہ کے دارالسلطنت کے ایک فقیہ کو جس کا نام ابن زرعہ تھا، سرکاری ملازمون نے مطالبہ ادا کرنے کے لئے اس قدر تنگ کیا، کہ وہ دائرہ اسلام سے نکل کر عیسایت کے دائرہ مین آگیا، انجیل خوب یاد کرلی، رومیون کی سیرتون کا مطالعہ کیا، اور ان کی شریعت کے قوانین ازبر کرلئے، نتیجہ یہ ہوا، کہ وہ ان قسیسون مین شامل ہوگیا، جن سے عیسائیت کے احکام کے متعلق فتوی پوچھا جاتا ہے، اور چونکہ وہ پہلے سے اسلامی شریعت کے احکام سے بھی واقف تھا، اس لئے جب اسلامی شریعت کا کوئی مسئلہ آتا، تو اس کے متعلق بھی اسی سے فتوٰی پوچھا جاتا، اور ان دونون شریعتون کے احکام کے متعلق اس کا فتوٰی نافذ کیا جاتا، اس کے گھر کے سامنے ایک مسجد تھی، جس کو اس نے گرجا بنالیا، . . . . .

اسی زمانہ مین ابوالقاسم احمد بن حمود المعروف بابن الجحر . . . .

اس ظالم بادشاہ کے زیر عتاب تھے، اس نے ان کے دشمنون
کے ایک مطالبہ کی وجہ سے ان کو انہین کے گھر مین نظر بند کر دیا
تھا . . . . . اور بعض جھوٹے الزامات . . . . کی پاداش
مین وہ عنقریب ہلاک کر دئیے جاتے، لیکن ان کے پہرے
والون نے ان کی صفائی دی، ان پر بہت سے تاوانات
بھی جن کی تعداد تقریباً ۳۰ ہزار مومنیہ دینار تھی، لگائے گئے،
اوران کے تمام گھر بار اوران کی تمام ملکیت جو انھون نے
اسلاف سے پائی تھی، ضبط کر لی گئی تھی، . . . . . ہم نے ان
سے ملاقات کی، تو انہون نے اپنی اور اس جزیرہ کے لوگون
کی دلخراش اندرونی حالت بیان کی، مثلاً انہون نے کہا "مین
یہ پسند کرتا تھا، کہ کاش مین اور میرے خاندان کے لوگ فروخت
کر دئیے جاتے، تو اس مصیبت سے جس مین ہم لوگ مبتلا ہین
نجات پا جاتے، اور مسلمانون کے ملک مین پہنچ جاتے"، . . . . .
ہم ان سے ایسی حالت مین جدا ہوئے، کہ خود روتے تھے،
اور لوگون کو رلاتے تھے، ہم نے شہر مین ان کے اور ان کے
بھائیون اور خاندان کے گھر دیکھے تھے، جو شاندار معلوم ہوتے
تھے،

اس جزیرہ کے باشندون کی سب سے بڑی مصیبت یہ
ہے، کہ ایک آدمی اگر اپنے لڑکے یا بیوی پر غصہ کرتا ہے،

یا ماں اپنی لڑکی پر غصہ کرتی ہے، تو یہ سب اس کے عار سے گرجے میں جا کر عیسائی ہو جاتے ہیں، اور اب بیٹا باپ کے ہاتھ سے اور لڑکی ماں کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، ....

ہم نے ان کی سب سے عجیب ورد انگیز حالت یہ دیکھی کہ اس شہر کے اعیان میں سے ایک شخص نے اپنے بیٹے کو ہمارے حاجی رفقا میں سے ایک کے پاس بھیجا، کہ وہ ان کی باکرہ قریب البلوغ لڑکی سے نکاح کرنا منظور کر لیں، لیکن اگر وہ نکاح کرنا پسند نہ کریں تو اپنے شہر میں جس سے پسند کریں نکاح کر دیں، لیکن اس کو اپنے ساتھ لے جائیں، وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے چھوڑنے پر راضی ہے، تاکہ اس آزمائش سے نجات پائے، اور مسلمانوں کے شہر میں پہنچ جائے، ....

.... وہ شخص راضی ہو گیا، اور ہم کو اس حالت پر سخت تعجب ہوا جو انسان کو ایسی عزیز چیز کی قربانی پر مجبور کر دیتی ہے، اور اس کو ایسے شخص کے سپرد کر دیتا ہے، جو اس کو پردیس میں لے جائے، اور اس پر صبر کرتا ہے، اور اس کے شوق کا مقابلہ کرتا ہے، اسی طرح اس لڑکی پر تعجب ہوا، کہ اپنے اعزہ کی جدائی حرمت اسلام کی خاطر گوارا کرتی ہے، چنانچہ جب باپ نے اس سے اپنے ارادہ کے متعلق مشورہ کیا، تو اس نے کہا کہ اگر

آپ مجھے روک لینگے، تو آپ سے اس کا مواخذہ ہوگا' یہ لڑکی ماں باپ کے پاس تھی، اور اس کے چھوٹے بھائی اور بہن تھے......"

یہاں کے عاقبت اندیش لوگوں کو یہ خوف ہے، کہ جزیرہ اقریطس کے مسلمانوں پر پہلے جو مصیبت نازل ہوئی، وہ ان سب پر نازل نہ ہو جائے، کیونکہ اس جزیرہ کے تمام لوگوں کو اس ظالمانہ حکومت نے رفتہ رفتہ عیسائی بننے پر مجبور کر دیا، خدا کو جس کی نجات منظور تھی، وہ تو بھاگ گئے، اور کافروں پر خدا کا عذاب نازل ہو گیا[1]"

ابن جبیر کو کیا معلوم تھا، کہ ان عاقبت اندیش لوگوں کا یہ خوف ایک سو اسی سال کے اندر ہی پیش آجائیگا، وہ خطرہ کس شکل میں صحیح نکلا، ابن خلدون کی زبان سے سنئے :-

"سلطان ابوزکریا نے صاحب جزیرہ صقلیہ سے مسلمانوں کے لئے یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ شہر اور بیرون شہر میں سب کے سب (عیسائیوں کے ساتھ) شریک ہو کر رہیں گے، چنانچہ وہ اسی طرح آباد ہو گئے تھے، لیکن جب سلطان کے وفات پانے کی خبر وہاں پہنچی، تو عیسائی ان پر مظالم کرنے

[1] - رحلہ ابن جبیر از ص ۳۲۰ تا ۳۲۳،

کے لئے ٹوٹ پڑے، اور وہ پھر قلعوں اور پتھریلی زمینوں مین پناہ گزین ہو گئے، اور اپنے اوپر بنو عبس کے پرجوش شخص کو سردار مقرر کیا، اور صقلیہ کے جابر بادشاہ نے ان کے کوہستانی قلعون میں ان کا محاصرہ کیا، اور ان کو گھیر کر قلعہ سے نیچے اتارا، اور ان کو سمندر کے پار لوجارہ مین لے جا کر انہیں آباد کر دیا، اور جزیرون پر قابض ہو گیا، اور کلمۂ کفر کو رائج کر کے کلمۂ اسلام کو مٹا دیا[۱]"

پھر ان جلا وطن بدبخت مسلمانون کو اٹلی کی ان نو آبادیون لوسیرا و نوسیرا مین بالآخر کیا پیش آیا، اس کو ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ مین دیکھئے، کہ:

"مسلمانان صقلیہ قلب ایطالیہ مین رہ کر اپنے مذہب اور اپنی معاشرت کو قائم رکھتے تھے، یہانتک کہ تیرھوین صدی کے آخر مین خاندان آنجو نے ان کا قطعی استیصال کر دیا[۲]"

اور انسائیکلو پیڈیا بریطانیکا میں کہا گیا ہے:-

"شروع مین انہین مذہبی آزادی حاصل رہی، لیکن وہ ۱۳۰۰ء مین جبریہ عیسائی بنا لئے گئے[۳]"

---

[۱] - ابن خلدون ج ۶ ص ۲۸۰،

[۲] - ج ۹ ص ۱۸۳،

[۳] - ج ۵ ص ۹۲۳ (چارلس اول و دوم) و ج ۷ ص ۹۶ (نوسیرا)،

یہی ہے ان مسلمانان صقلیہ کا آخری انجام جنہون نے یورپ مین اپنی تہذیب و تمدن اور علوم و آداب کی ایسی داغ بیل ڈالی، جو جدید یورپ کے جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم و آداب کی بنیادون مین سے ایک ہے، جن کی تفصیل کی یہان گنجائش نہین، لیکن ان کے ان احسانات کے باوجود اس قوم کا ایک متنفس یورپ کے چپہ سے محض تنگ نظر و ننگ انسانیت علمبرداران مسیحیت کے جہل و تعصب کی بدولت حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا، اور پورا جزیرہ صقلیہ مع اپنے وسیع معنی اطلاق کے مسلمانون کے وجود سے خالی ہوگیا، اور اس ساری سرزمین مین ایک متنفس بھی کلمۂ اسلام کا پڑھنے والا باقی نہین چھوڑا گیا، انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا کی بھی یہی شہادت ہے، سسلی کا مقالہ نگار لکھتا ہے :۔

"پوپون نے عیسائیت کے فروغ مین اپنی آخری کوششین صرف کر دین، اور اب صقلیہ کی سرزمین پر سسلی کے مخصوص باشندے رہ گئے، اور سب کے سب ایک قوم اور ایک مذہب کے سلسلہ میں داخل ہو گئے[1]"

مسلمانان صقلیہ کے اس حسرت ناک انجام کے سات سو برس بعد بیسوین صدی مین ہمارا ایک دردمند شاعر سسلی سے گذرا، خوبصورت جزیرہ پر نظر پڑتے ہی صقلیہ کی یاد تازہ ہوگئی، اور وفور جذبات مین سسلی کو

---

[1] ج ۲۵ ص ۳۵، (سسلی) طبع یازدہم،

مخاطب کر کے صقلیہ کی تہذیب حجازی کو جو اب عہد رفتہ کا ایک فراموش شدہ واقعہ اور تاریخ اسلام کی ایک گم شدہ کڑی بن چکی تھی، یاد کر کے اشکبار ہُوا،

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے، تہذیبِ حجازی کا مزار

بس آج اس تہذیبِ حجازی کے لوح مزار کے یہی چند نقوش صفحۂ قرطاس پر باقی رہ گئے ہیں،

سید ریاست علی ندوی

مناصب اکبری اور اُن کی تنخواہین

اس مضمون مین منصب سے میری مراد وہ منصب ہین جو اکبر اعظم نے ایک خاص نظام کے ماتحت ہندوستان مین قائم کئے تھے، یہ نظام چونکہ اکبر کے جانشینون کے عہد مین بھی بہ تغیر یا بلا تغیر برابر جاری رہا، اس لئے تاریخی، سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے اتنا مہتم بالشان ہے اور مانا گیا ہے کہ سو سوا سو برس سے برابر علما و متعلمین تاریخ کا تختہ مشق چلا آتا ہے، مغاربہ نے بالخصوص اس نظام کی گتھیان سلجھانے کی بڑی بڑی کوششین کین اور یہ بھی سچ ہے، کہ بڑا حصہ مواد کا اس باب مین انہین کی قلم کا رہین منت ہے، بلکہ انہین کی بعض تالیفات یا تعلیقات اب تک اس موضوع پر حجت و سند تصور کی جاتی ہین، مگر مجھے ان چیزون کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو مین نے دیکھا کہ مسئلہ ابھی لاینحل ہے، بلکہ ان تحریرون نے راہ تحقیق کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا ہے، اس لئے جہان تک مجھ سے ہو سکا میں نے توفیق و تطبیق کی راہ پر چل کر اس نظام کے سمجھنے کی کوشش کی، ممکن ہے جو کچھ مین سمجھا ہون غلط ہو، لیکن یہ بہر حال صحیح ہے، کہ جو کچھ اب تک اس نظام کے متعلق سمجھا اور لکھا گیا ہے اس سے

میری رائے یا تحقیق مختلف اور بہت مختلف ہے، مین نے چاہا تھا کہ اپنا فہم اس نظام کے متعلق بہ تفصیل اہل علم کی خدمت مین پیش کرون لیکن مضمون کی طوالت اور قلت وقت نے اجازت نہ دی اس لئے اس وقت صرف تنخواہ و مناصب کے ایک جزو کے متعلق کچھ عرض کرونگا اور وہ بھی بالاجمال، لیکن یہ مضمون اس قدر خشک اور بے نمک ہے کہ مجھے ڈر ہے کہین یہی چند اوراق سامعین کے لئے اجیرن نہ ہو جائین، مگر ہرچہ باد اباد مین اب موضوع کی طرف آتا ہون،

کہتے ہین کہ اکبر نے جب دیکھا کہ امرا کی خیانت و عیش پسندی کی وجہ سے فوج کی حالت خراب و اصلاح طلب ہے تو اس نے سابقہ فوجی نظام کا نقشہ بدلا اور نئے نئے آئین بنائے، اور ردّ و بدل ہوتے ہوتے آخر اس کے عہد کے چالیسوین سال مین اس نظام نے وہ صورت پائی جو اس وقت عام طور پر اس کی طرف منسوب ہے اور آئین اکبری وغیرہ کتابون مین ملتا ہے، اصل مدعا اس نظام کا تھا فوج کی اصلاح و ترتیب لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان مین اہل علم بھی صاحب طبل و علم ہوتے تھے اور ہو سکتے تھے، منصب کا لفظ پہلے سے بھی ارباب سیف و قلم دونون کے لئے استعمال ہو رہا تھا، اس لئے اکبر نے بھی سرداری و سپہ سالاری کا دروازہ اہل قلم کے لئے بند نہین کیا، لیکن اصول کچھ ایسے باندھے کہ صاحب شمشیر و اہل قلم باہم ہم منصب بھی رہین اور مختلف الحیثیت بھی، اور جب ضرورت ہو نہایت آسانی کے ساتھ

ایک آدمی ایک گروہ سے دوسرے جرگہ مین منتقل ہو سکے، اسی لئے ہم اکبر کے اس نظام میں اصحاب سیف و ارباب قلم دونون کو دوش بدوش منصب دارون کے جرگے مین پاتے ہین مگر جو لوگ اس نظام کی حقیقت سے واقف نہین ہین وہ تمام اہل مناصب کو فی وقت واحد صاحب فوج و سپاہ سمجھ لیتے ہین حالانکہ بعض اوقات خالص سپاہی بھی صاحب سپاہ نہیں ہوتے تھے،

فوج کا نظام اور اس کی ترتیب طبعاً مناصب سپاہ مین ارتقائی ترتیب چاہتی ہے اسی لئے ہمیشہ ہر قوم اور ہر ملک مین پائی گئی ہے، اکبر نے اس مین صرف اتنی جدت کی کہ ان ارتقائی مراتب کو ۶۶ مین تقسیم کیا جو دہ باشی سے بڑھتے چڑھتے دہ ہزاری تک پہنچتے تھے، جن مین سے پنجہزاری سے اوپر کے مناصب کو، جو صرف شاہزادون سے مخصوص کر دئے گئے تھے، درجۂ اول مین رکھ کر اس نے باقی مناصب کو باستثنائے یوزباشی تین درجون مین تقسیم کیا، اول دوم اور سوم، اصول اول کا یہ رکھا کہ منصب کو اعداد محض یا اعداد نسبی سے اور اس کے درجے یا گریڈ کو سوارون کے شمار سے ظاہر کیا جائے، اس طرح کہ اگر سوارون کا شمار اعداد منصب کے برابر ہے تو منصب درجۂ اول مین شمار کیا جائے، اور اگر سوارون کا شمار اعداد منصب کا نصف یا نصف سے زیادہ ہو تو درجۂ دوم ورنہ درجۂ سوم سمجھا جائے، مثلاً پنجہزاری پنجہزار سوار، پنجہزاری چار ہزار سوار، پنجہزاری دو ہزار سوار، ان مین پنجہزاری ہر جگہ منصب ہے، اور پانچ، چار اور دو

ہزار سوار کی قید منصب کے اول دوم سوم درجون کو ظاہر کرتی ہے، اس قرارداد کے بعد اس نے اور مستزاد کیا کہ جو کوئی ازروی ضابطہ اپنے منصب کی فوج آپ بہم پہنچائیگا تو وہ واقعی منصب دار ہوگا اور اگر کوئی ازروئے ضابطہ کسی اور منصب دار کی مرتب فوج کے کسی حصہ پر فرائض سری و سرداری انجام دیگا تو وہ داخلی یا منصب دار داخلی کے نام سے موسوم ہوگا، اس تقسیم در تقسیم کے بعد اس نے ہر ہر منصب، منصب کے ہر درجے اور ہر درجے کے داخلیون کی تنخواہ یا اس کا ضابطہ مقرر کیا، اور اس کا نام تنخواہ ذات رکھا، یہی اس وقت میرا موضوع بحث ہے تابینانِ منصب اور ان کی تنخواہ سے مین بالکل الگ بحث کرون گا،

ابو الفضل نے آئین منصب مین امارہ نویسی کے ساتھ ساتھ ہر ہر منصب کا ماہانہ لکھا ہے، اس ماہانہ کی رقم کو اب تک سب یہی سمجھتے ہین اور سمجھتے آئے ہین کہ یہ رقوم منصب کا ماہانہ ذات ہین، اور اس سے بڑے بڑے اہم سیاسی و اقتصادی نتائج نکالے جاتے ہین، مگر مجھے اس سے اتفاق نہین، میری تحقیق یا رائے مین یہ رقوم جو ابو الفضل نے مناصب کے مقابل ماہوارہ کے نام سے درج کی ہین وہ سب بلا استثنا مجموعہ ہین تنخواہ ذات اور دواب شاہی کے مصارف کا، تنخواہ ذات کے بھی دو حصے ہوتے تھے، یا یون کہئے کہ دو قسمین قسم اول ان لوگون کی تنخواہ جو اپنے منصب کی فوج خود بہم نہین پہنچاتے تھے یعنی داخلی ہوتے تھے۔ دوسرے وہ کہ اپنے منصب کی فوج آپ بہم پہنچاتے تھے، یہی

آخر الذکر ارباب منصب چونکہ افراد کاملہ ہوتے تھے، ابوالفضل نے انہین کی ماہانہ تنخواہ کے ساتھ دواب شاہی کے مصارف شامل کرکے منصب کا ماہانہ دکھا دیا ہے، اور اسی مصرف کی شمولیت کی وجہ سے منصب دارون کی تنخواہین بہت بڑی بڑی معلوم ہوتی ہین، حالانکہ وہ محض مناصب یا ارباب مناصب کی ماہانہ تنخواہین نہین جیساکہ سمجھ لیا گیا ہے،

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان مین ماہانہ منصب کا یہ ضابطہ اس لئے کہ معمول بہا تھا سب کو معلوم تھا، لیکن وہ زمانہ گزر گیا، وہ بساط الٹ گئی، اس لئے اس زمانہ کی اصطلاحات بھی بھول بسر گیٔن یا کم از کم ان پر اتنی اور کچھ ایسی گرد پڑ گئی ہے کہ اب سامنے بھی آتی ہین تو خردبین کے بغیر دکھائی نہین دیتین اسی لئے جو کچھ مین نے کہا ہے وہ محتاج حجت سند ہے، اس لئے پہلے حجت کو لیجئے،

مین یہ بیان کرچکا ہون کہ از روئے ضابطہ منصب داران داخلی کے خلاف منصب داران واقعی اپنے منصب کی فوج کے گھوڑے آپ بہم پہنچاتے تھے، ان کا شمار ہمیشہ پورا رکھتے تھے، اور اسپ وسوار دونون کو باساز ویراق بھی، اس لئے طبعاً ان کو داخلیون سے کچھ زیادہ ملنا چاہئے تھا، چنانچہ ملتا تھا، جیساکہ مین عنقریب یوزباشی کی تنخواہ کے ضمن مین بیان کرون گا، اور وہی بیان تنخواہ ذات دو قسم ہونے کی سند ہوگی، اب لیجئے دواب شاہی کو،

ہر زمانہ مین لوگ خاص کر حکام و امرا اپنی اپنی حیثیت کے موافق

کچھ خاصہ و لوازمہ رکھتے آئے ہین، مغلون کے عہد حکومت مین اس کا اور بھی زیادہ اہتمام تھا، آئین اکبری مین بھی جا بجا خاصہ کا لفظ آیا ہے اور زمانہ کا خاصہ یا لوازمہ تھا، یہی ہاتھی گھوڑے وغیرہ لوگون نے جو دیکھا کہ جدول مناصب مین ہر ہر منصب کے ساتھ کچھ کچھ تعداد گھوڑون، ہاتھیون، اونٹون، بیلون، خچرون، چھکڑون کی لکھی ہے، خیال کر لیا کہ یہ خاصۂ منصب ہے جو ہر منصب دار کو اکبری ضابطہ کے موافق رکھنا پڑتا تھا، لیکن یہ صحیح نہین یہ ہاتھی گھوڑے جو اس جدول مین مرقوم ہین مغلیہ عہد مین دواب شاہی کہلاتے تھے، ابو الفضل نے ان کی خوراک کی رقم کو بھی تنخواہ ذات کے ساتھ شامل کر کے اس کے لئے ماہانہ یا ماہوار کا لفظ استعمال کیا اور یہی اصطلاح تمام عہد مغلیہ مین قائم رہی یہ میرا وہم نہین بلکہ حقیقت ہے، ابو الفضل خود آئین فیل خانہ مین لکھتا ہے :-

"بہر یکے از امرا حلقہ ہا سپرد و دیدبانی فرمود کہ خورش از سرکار والا تنخواہ شود"

ملاحظہ ہو خورش کے لئے تنخواہ کا لفظ برتا ہے۔ پھر آئین خاصہ فیلان مین کہتا ہے :-

"چنانکہ ہر حلقہ بدیدبانی یکے از امرا باز گردد ہمان طور ہر فیل خاصہ بہ تیاقداری امیرے نامزد"

پھر آئین غرامت مین ہے :-

"در ہر ماہ دو کاروان رفتہ اندازہ فربہی و لاغری خاصہ فیلان برگیرند

و از امرا باز یافت شود"

پھر آئین مراتب خیول مین ہے :-

"بدیدبانی آن امرا و دیگر منصبداران و بزرگ احدیان بازگزاشته اند
علیق و قضیم از سرکار اعلی بر گیرند"

مین مانتا ہون کہ مذکورۂ بالا فقرے بصراحت تمام میرے دعوے کو پایۂ ثبوت تک نہین پہونچاتے لیکن یہ میرا قصور نہین۔ قصور ہے تو ابو الفضل کا کہ پردہ داری کرتا ہے، یا مبہم لکھتا ہے۔ ہان اس ابہام کی توضیح میرا فرض ہے، ملاحظہ فرمائیے گھر کا بھیدی ملا عبد الحمید لاہوری پادشاہنامہ مین کہتا ہے:-

"کارگزاران اِصطبل و فیل خانہ خیول و فیول برسم معتاد از نظر مقدس
مے گزرانند، ضابطۂ گزشتن معتاد و بازخواست زرے کہ
بجہت خوراک دواب از سرکار فیض آثار تن مے شود بر تقدیر
زبونی و لاغری جانداران از مصنوعاتِ بادشاہِ دانش دستگاہ
حضرت عرش آشیانی است"

اب بھی اگر میرا دعوےٰ پایۂ ثبوت کو نہین پہنچا ہے، تو شہادت اعداد و شمار ابھی باقی ہے جو انشاء اللہ برہان قاطع ثابت ہوگی، مگر ابھی اس کے استعمال کا وقت نہین آیا ہے،

اب تک جن لوگون نے نظام منصب سے بحث کی ہے، وہ مستشرق تھے یا مشارقہ سب کا بالاتفاق یہی فیصلہ رہا ہے کہ مناصب

کی تنخواہ اگرچہ تدریجی انداز مین اترتی یا چڑھتی چلی گئی ہے لیکن کسی اصول وضابطہ کے تحت مین مقرر نہین کی گئی، من مانی آ۔بی ٹریری جو چاہی مقرر کردی ہے، اگرچہ ہمارا زمانہ کثرت راے کا زمانہ ہے، وہ جو کچھ کر دے مان لینا چاہیئے۔ لیکن مین اس کثرت رائے کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہین، مین کسی اصول وضابطہ کی اچھائی برائی کا تو ذمہ لیتا نہین، لیکن یہ ثابت کرنے کے لئے البتہ تیار ہون کہ نہ صرف تنخواہ ذات بلکہ ماہانہ منصب کی برآورد کا ایک قاعدہ اور ضابطہ تھا۔ اور آئین اکبری کے اعداد مین اب بھی پایا جاتا ہے، مگر وہی بات، ذرا خردبین کی ضرورت ہے، اسی لئے مین نے چشمہ لگا کر دیکھا تو قاعدہ یہ نظر آیا، منصب × ۲ + سوار × ۲ + رقم خوراک دواب = ماہانہ منصب۔ حضرات یاد رہے کہ یہ وہی تین اجزا ماہانہ منصب کے ہین جو مین ابھی بیان کر آیا ہون،

حضرات یہ قاعدہ یا فارمولہ میری گھڑت نہین، اگرچہ ایسی گھڑت مین بھی کوئی عیب نہین ہے جو میزان امتحان مین پوری اتر جائے مگر یہ ضابطہ خود ابوالفضل نے آئین منصب مین بیان کر دیا ہے، وہ کہتا ہے :۔

"یوزباشی یازدہ گونہ باشد نخست آنکہ باوے صد سوار بودہ باشد ماہوارہ ہفصد روپیہ یازدہم آنکہ باوے سوارے نبود، پانصد روپیہ ونہ میانی را در ہر دہ سوار بست روپیہ افزودہ گردد"

جب یوزباشی با صد سوار ۷۰۰ پاتا تھا، اور یوزباشی داخلی بے سوار کو ۵۰۰ ملتے تھے تو نتیجہ یہ ہے کہ سو سواروں پر دو سو روپے منصبدار کا حق ہوتے تھے، یعنی فی سوار دو روپے، یہی نتیجہ دس سواروں پر بیس روپے سے نکلتا ہے، رہا خرچ دواب جب اس کو حساب کرکے نکالا تو ۲۰۳ روپے نکلا، اس اضافہ یعنی ۳ روپے کو ذرا حساب سے خارج کر دیجئے اور پھر دیکھ لیجئے کہ ہم نے جو ضابطہ بیان کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں، (منصب یوزباشی یعنی صد × ۲ + صد سوار × ۲ + خوراک دواب = ۷۰۰، یہی یوزباشی با صد سوار کا ماہوارہ ابوالفضل نے لکھا ہے) رہا تین تیرہ کا حذف: اس قسم کی بیشی تقریباً ہر منصب کے ماہوارہ مین پائی جاتی ہے، اس نے مجھے بہت دنون پریشان رکھا، اور آخر یہ معلوم ہوا کہ دواب کی خوراک کی رقم تحقیقی نہین بلکہ تقریبی ہوتی تھی، چنانچہ ضابطہ عالمگیری نام بیاض قلمی مین ہے:-

"مبلغے کہ بنا بر دواب بموجب حساب قرار مے یابد آنرا از تنخواہ و ہم طلب سراسری نمودہ بوجب تنخواہ درحصۂ دواب مے گیرند"

یہ سراسری وہی لفظ ہے جسے ہم سرسری یا تقریبی کہتے ہین، یہی وجہ ہے کہ ہم آئین مین دواب کا خرچ ہر منصب کا تقریبی پاتے ہین،

اب یہان طبعاً یہ سوال ہوگا کہ اگر ماہانہ منصب کا یہی ضابطہ یا فارمولا تھا یا ہے تو یہ دیگر مناصب کے ماہانہ مین بھی پایا جاتا ہے اس

لئے اب مین اس کے ثبوت کی طرف آتا ہون ،

مغلیہ عہد کی تمام تاریخ مین ہمین دو فہرست مناصب کی ایسی ملتی ہین جن مین ان کا ماہانہ یا سالانہ پایا جاتا ہے ، ایک یہی آئین کی فہرست ہے جسے اس وقت تمام مشارقہ و مغاربہ منصب دارون کی ماہانہ تنخواہ ذات کی فہرست مان رہے ہین دوسری فہرست وہ ہے جو ضوابط عالمگیری مین ملتی ہے ، اور اس مین مناصب کی سالانہ تنخواہین درج ہین۔ اس فہرست کو سب عالمگیر اور اس کے بعد کے زمانہ کے لئے مخصوص جانتے ہین۔ بلاک مین یا ارون کسی کی تخصیص کی ضرورت نہین ، انڈین مغلز مین میرے نزدیک یہی مناصب یا ارباب مناصب کی تنخواہ ذات (سالانہ) کی فہرست ہے ، جو اکبر کے زمانہ سے لے کر عالمگیر اور اس کے بعد کے زمانہ تک برابر عمل مین رہی ، اور یہ خود اکبر کی ساختہ پرداختہ تھی اور آئین کی فہرست کے بعد بھی نہین بنائی گئی تھی ، بلکہ اُسی فہرست مین سے خوراک دواب کو الگ کر کے تنخواہ ذات اس فہرست مین الگ دکھادی گئی ہے ، اسی لئے اس کے ساتھ تنخواہ ذات کا لفظ لکھا ہوا ہے ، جو آئین کی فہرست کے ساتھ نہین ہے ، یہ میری تحقیق ہے ، اگر مین یہ ثابت کر سکا تو وہ ضابطہ یا فارمولہ جو ابھی محتاج ثبوت ہے خود بخود ثابت ہو جائیگا ،

لوگون کا یہ بیان کہ موخرالذکر فہرست عالمگیر اور اس کے بعد کے زمانہ کے متعلق ہے میرے نزدیک یہ صحیح نہین ، اس لئے کہ مین دیکھتا

ہون کہ شاہجہان کیا وہ جہانگیر کے عہد حکومت مین بھی زیر عمل تھی، عبدالحمید لاہوری بادشاہنامہ مین لکھتا ہے :-

"مقرر گشت کہ پس از انجام مہم و حصول فیروزی سوائے چہل کرور دام سابق کہ سی و ہشت کرور طلب منصب سی ہزاری ذات و بیست ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ بود و دو کرور انعام، دہ کرور دام دیگر از محال دکن بجلدوے فتح۔ تن گردد کہ مجموعہ پنجاہ کرور دام بودہ باشد ۱۹۱ جلد دوم"

ان اعداد کی جب ہم تحلیل کرتے ہین تو بالکل فہرست ثانی الذکر کے مطابق پاتے ہین، اس دلیل اور اس قسم کی دیگر امثلہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ جہانگیر کے زمانہ مین ثانی الذکر فہرست تنخواہ کے لئے معمول بہ تھی، فادر فرانسس کاترو نے اپنی "تاریخ مین اتفاق سے ہزاری کی تنخواہ لکھی ہے وہ بھی ثانی الذکر فہرست کے مطابق ہے، اور یہی نہین کہ اس کے مطابق ہے بلکہ وہ "تنخواہون کے اس سسٹم کی بابت لکھتا ہے کہ تنخواہ کا یہ ضابطہ اکبر نے بنایا تھا جس کو پھر کبھی کسی نے بدلنے کا خیال نہین کیا (صفحہ ۲۳۱) کیا اس کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوسکتا ہے کہ فہرست ثانی یعنی ضابطۂ عالمگیری کی فہرست عالمگیر اور اس کے بعد کے زمانہ کی بابت ہے، اسی حقیقت سے ہم ایک اور اہم تاریخی نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ ضابطۂ عالمگیری مین جو قواعد و ضوابط سلطنت ملتے ہین ان سب کو عالمگیر کی طرف منسوب کرنا غلطی ہے، یہ غلطی بھی بہت عام

جس نے مغلیہ عہد کی تاریخ مین ایک تلاطم بپا کر دیا ہے؛

اب ہمین یہ دیکھنا چاہیئے کہ مناصب کی تنخواہ ذات کے تعین کا واقعی کوئی ضابطہ تھا یا یونہی من مانی تنخواہین مقرر کر دی گئی تھین [illegible] [illegible] فہرست اور اس دوسری فہرست مین [illegible] ہے یا نہین؟ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہین کہ دواب کی خوراک کی رقم تقریبی ہی تھی، اس کا امتحان کرنے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ متناسب اعداد و رقوم مین اگر تقریبی غیر متناسب رقوم شامل کر دی جائین تو ان کا تناسب مفقود ہو جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ مناصب کے ماہوارون مین تناسب نہین پایا جاتا، پہلی غلطی غلطی کرنے والون نے یہ کی کہ ماہانہ مناصب کو جس مین [illegible] دواب کی رقم بھی شامل تھی تنخواہ ذات ٹھہرا لیا دوسری غلطی جو اس کو لازم تھی یہ ہوئی کہ وہ آئین کی رقوم مین تناسب ڈھونڈنے لگے، اور جب ان مین تناسب نظر نہ آیا تو حکم لگا دیا کہ اکبر کے مناصب ذات کی تنخواہ مین نہ واقعی تناسب ہے نہ وہ کسی ضابطہ کے تحت مین مقرر کی گئی تھین حالانکہ مناصب کی تنخواہ ذات کی فہرست فہرست ثانی ہے، اور اسی مین تناسب ڈھونڈنا چاہیئے تھا،

آئین کی فہرست کے خلاف اس فہرست مین مناصب کی تنخواہ داموں مین لکھی ہے اور اس مین ہفت ہزاری سے ہزار پانصدی تک ہر منصب اور منصب کے ہر درجہ کی تنخواہ کا ضابطہ موجود ہے، اور ہم نے دامون کو روپیے کی صورت مین بدل لیا ہے پھر بھی تناسب

صاف نظر آتا ہے، جس سے کوئی انکار نہین کرسکتا، رہا ضابطۂ ماہانہ منصب وہ آئین کے مناصب کاملہ کے اعداد مین غور کرنے سے یہ نکلتا ہے کہ منصب × ۶ برابر ہے ماہانہ منصب کے اور ماہانہ منصب × ۱۲ اس کا سالانہ ہے، پھر اس مین سے تنخواہ ذات نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ منصب کی سالانہ رقم کو دو دفعہ $\frac{1}{12}$ کیجئے منصب کی سالانہ تنخواہ ذات نکل آئیگی، یہ $\frac{1}{12}$ کا قاعدہ بلا استثنا تمام مناصب کی تنخواہ ذات مین جاری ہوا ہے اور ہوسکتا ہے،

اس ضابطہ کے متعلق دو سوال ہوسکتے ہین اول یہ کہ منصب ×۶ یعنی چہ یہ چھ کہان سے پیدا ہوگیا، دوسرے یہ کہ جب یہ ضابطہ تھا یا ہے تو ہزار پانصدی سے آگے کیون نہین چلتا جبکہ $\frac{1}{12}$ کا عمل برابر یکسان چلا جاتا ہے، سوال اول کے متعلق مین کہونگا کہ منصب وسوار کی ہر ہر اکائی پر دو دو روپیہ خود ابوالفضل بتا چکا ہے، چار تو یہ ہو گئے، خوراک دواب جب مناصب کی نکالی تو ہر منصب کے دوچند سے زیادہ نکلی، اس زیادتی کے ساتھ ہم نے وہی عمل کیا جو یوزباشی کی خوراک دواب کے ۲ روپون کے ساتھ کیا تھا، اس لئے یہ دوان چارون کے ساتھ مل کر چھ ہوگئے،

دوسرے شبہ کے متعلق یہ کہ مذکورۂ بالا ضابطہ تنخواہ دوازدہ ماہہ کا ضابطہ ہے ہزار پانصدی سے نیچے کے بھی جو منصب دوازدہ ماہہ ہین مثلاً صدو پنجاہی، دو بیستی، بیستی ان مین بھی یہ ضابطہ برابر چلتا ہے

باقی مناصب ہی دوازدہ ماہہ نہین پھر یہ ضابطہ ان مین کیسے چل سکتا ہے
ان مین کوئی دہ ماہہ ہے کوئی نہ ماہہ، بعض ہشت ماہہ ہین اور بعض شش
ماہہ، ان مناصب کے لیئے اگر کہا جاتا یا کہا جائے کہ ان کی تنخواہ مین
تناسب نہین پایا جاتا، تو فی الجملہ ایک بات ہوتی اس لیئے کہ ان
مناصب ناقصہ کی تنخواہ ذات کا کوئی ضابطہ باوجود کوشش بلیغ اب تک
میری سمجھ مین نہین آیا ہے، اگرچہ ہندسون کا انداز اور $\frac{1}{12}$ کے عمل کا
ان مناصب مین بھی برابر جاری ہونا ہی پتہ دیتا ہے، کہ ان کے لیئے
بھی کوئی ضابطہ ضرور ہے، کیونکہ باوجود اس اختلاف کے بھی فہرست
ثانی کے اعداد اکثر تحقیقی اور کمتر تقریبی طور پر آئین ہی کے ہندسون
سے پیدا ہوتے ہین، یہ تمام ہندسے باقاعدہ نکلے ہوئے اس وقت
میرے پاس موجود ہین، اگر کسی کو ان حقائق کا علم نہ ہو اور وہ مان لے
کہ ضابطہ عالمگیری مین جو تنخواہ و مناصب کی فہرست
وہ بجاے خود مستقل ہے تو پھر خواہ مخواہ اسی قسم کی باتین ماننی یا فرض کرنی
پڑینگی کہ یہ فہرست عالمگیر اور اس کے بعد کے زمانہ کی بابت ہے، اس
زمانہ کی مناصب کی تنخواہین اکبر کے زمانہ کی نسبت جو آئین مین درج ہین
اصولاً بھی کم ہوگئی تھین اور وہ بھی بارہ مہینے کی جگہ سال بھر مین صرف
چار چار پانچ پانچ مہینے کی ملتی تھین بلکہ اس سے بھی کم، انہین قلیل تنخواہون
مین منصبدار گھوڑے، ہاتھی اور باربرداری کے جانور جو آئین مین درج
ہین انہین رکھنے پڑتے تھے، دواب شاہی کی خوراک الگ ادا کرنی ہوتی

تھی، چھوٹی چھوٹی کٹوتیاں اس پر مستزاد تھیں۔ چنانچہ اروِن نے اپنی کتاب میں اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں اور ہمارے ماڈرن اسکالرز میں برابر تسلیم کی جاتی ہیں۔ دادا کے کام پوتے کی طرف منسوب ہیں، یہی نہیں بلکہ صحیح اور معقول باتوں کو بھی اپنی غلط فہمی کی وجہ سے غلط طریقہ پر بیان کیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ نظام و اقتصادیات کی تاریخ بالخصوص کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔

شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن دہلوی

عربی علم اللغۃ کی تاریخ

معززین! میرے مضمون کا عنوان "عربی علم اللغۃ کی تاریخ" ہے
جس پر مؤرخانہ اور ناقدانہ حیثیتون سے نظر ڈالنے کی کوشش کی جائیگی،
ظاہر ہے کہ یہ ایک "خشک" مضمون ہے جس کو انشا پردازی کی
لطافتون سے "تر" نہین کیا جا سکتا، شیشہ اور شراب دو لطیف
چیزین ہین، اور اس اشتراک سے شاعر کی قوتِ متخیلہ فائدہ اٹھاکر
شیشہ کو "شرابِ بے ساغر" اور شراب کو "ساغرِ بے شراب" کہہ
سکتی ہے، لیکن ادب و تاریخ کے درمیان ایسی کوئی مشترک خصوصیت
نہین جس کی بنا پر ایک اشعر العلماء یا اعلم الشعراء ادب کو "واقعات کی
کھتونی" اور تاریخ کو "حسن و عشق کی داستان" کہہ سکے۔ صاحب
ابن عباد نے میری ہی زبان سے کہا ہے،

دعتنی عیناکِ نحو الصبیٰ　　دعاءً تکرّر فی کل ساعۃ
فلولا، وحقّکِ، عذر المشیب　　لقلتُ لعینیکِ، سمعاً وطاعۃ

معززین! بنابرین مین چند کلمات اختصار کے ساتھ عرض کرنے

کے لئے کھڑا ہوا ہون ، شاید ہمنشینون کا "کمال" (جمال نہین) اور سخن شناسون کا "سکوت" اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے میرے "عارفانہ" اقرار جہل یا "جاہلانہ" ادعائے عرفان کی تائید کر دے،

زبانِ عرب کی وسعت

معززین ! بلا پرواے لومۂ لائم ، اور بلا خوف الزام عصبیت یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ عربی زبان تمام زبانون سے زیادہ وسیع ، زیادہ خالص ، اور زیادہ کامل زبان ہے ، یہ دعویٰ کہان تک صحیح ہے ؟ اس کے جواب مین صحاح جوہری کے ۴۰ ہزار ، اور لسان العرب ابن مکرم اور قاموس مجدالدین فیروزآبادی کے ۶۰ ہزار مادے پیش کئے جا سکتے ہین ، اور اگر عربی الفاظ کے محض ابنیہ پر دار و مدار رکھا جائے تو اعداد و شمار کا دائرہ حیرت انگیز طور پر وسیع ہو کر ایک کروڑ تئیس ۲۳ لاکھ ، پانچ ہزار ، چار سو ، بارہ ، تک پہنچ جاتا ہے ، جو امام فنِ ادب خلیل بن احمد بصری کی کتاب العین سے ثابت ہے ،

زبان مین یہ بے انتہا وسعت خصوصیاتِ ذیل کی وجہ سے پیدا ہوئی ،

(۱) کثرتِ مترادفات و اضداد :-

اگرچہ عرب یونانیون کی طرح فلسفہ اور چینیون کی طرح صنائع کے ماہر

نہ تھے، تاہم ان کی زبان مین مترادفات اور اضداد کی بڑی کثرت ہے، سال کے ۲۴ نام ہین، نور کے ۲۱، ظلمت کے ۵۲، آفتاب کے ۲۹، ابر کے ۵۰، بارش کے ۶۴، کنوین کے ۸۸، پانی کے ۱۷۰، شراب کے ۱۰۰، شیر کے ۵۰۰[1]، سانپ کے ۱۰۰، صفات کے مترادفات کا بھی یہی حال ہے،

(۲) یعنے مفرد اور غیر مفرد سب کے لئے مفرد الفاظ وضع کئے گئے ہین، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی مین ابتدا ہی سے معانی پر توجہ رہی ہے، اور سامع کا افادہ احوال و مواقع کے اختلاف سے پیش نظر رہا ہے، بخلاف اس کے یونانی اور موجودہ یورپ کی دوسری زبانون مین ضرورت کے وقت معانی سامنے آئے اور الفاظ تراش لئے گئے ہین، وہ پہلے سے وضع نہین ہوئے

(۳) تراکیب :-

علم البلاغۃ بے مثل ہے، جس کی وجہ سے ایجاز و اعجاز کے وہ مناظر سامنے آتے ہین جو دوسری زبانون کو میسر نہین، اور زبانون کے علم بدیع مین تشبیہ و مجاز کے علاوہ کیا موجود ہے؟

(۴) اعراب :- یعنی عاملون کے بدلنے سے اواخر کلمات کے

---

[1] - جرجی زیدان نے ۳۵۰ لکھا ہے، لیکن کشف الظنون (ج ۱ ۷۹) میں ابوسہل ہروی کی اس موضوع پر ایک ضخیم تالیف کا ذکر ہے جس مین ۶۰۰ نام ہین،

رفع، نصب، جر کا بدلنا، یہ خصوصیت قدیم زبانون مین سے اشوری، عربی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت مین پائی جاتی ہے، بعد کی زبانون مین اعراب مفقود ہے، اس وقت حبشی اور جرمن زبانون مین اعراب کا وجود نظر آتا ہے،

(۵) وقتِ تعبیر:-

الفاظ و تراکیب سے طریقۂ تعبیر مین بڑا فرق پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معنے کے لئے ایک خاص لفظ موجود ہے، ایک معنے کے لئے متعدد الفاظ بھی ہین جن مین اس معنے کے ہر تنوع کا لحاظ رکھا گیا ہے، مزیداتِ افعال اور مشارکت کے صیغون سے ایک لفظ متعدد معانی کو ادا کر دیتا ہے،

(۶) بعض الفاظ بذاتِ خود ایسے ہین جن مین ہر ایک کثیر معانی کو ادا کرتا ہے،

(۷) سجع وغیرہ،

(۸) حکایتِ اصوات:-

اس کا تعلق زبان کی موسیقیت سے ہے، بعض الفاظ کے حروف اور ان کی ترکیب و ترتیب مجموعی طور پر کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ لفظ بولنے کے ساتھ ہی اس کے معنے ذہن مین آجاتے ہین۔

لغت کے معنے

معززین! عربی زبان کے سب سے بڑے لغت لسان العرب[1] ابن مکرم میں لفظ لغت کے حسب ذیل معنے لکھے ہیں:-

"لغت لِسْن (زبان یا بولی) کو کہتے ہیں، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ چند آوازیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہر قوم اپنا مقصد ظاہر کرتی ہے، یہ لَغَوْتُ سے جس کے معنے تَکَلَّمْتُ (میں نے کلام کیا) کے ہیں، فعلة کا وزن ہے، اس کی اصل لغوة تھی. لغو بولنے کو کہتے ہیں، محاورہ ہے، هٰذِهٖ لغاتهم الّتى يلغون بها یعنے ينطقون، لِغوی پرندوں کی آواز کو کہتے ہیں

لغت کی تعریف

معززین! انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں کتابِ لغت یا "قاموس" (DICTIONARY) پر جو مضمون ہے، اس میں لائنس

---

[1] ص ۱۱۸ ج ۲۰،

(Benjamin E. Smith) اور اسمتھ (Rev. Ponsonby A. Lyons)
نے یہ تعریف لکھی ہے[1]؛

"قاموس (Dictionary) اپنے عام اور مشہور معنے کے لحاظ سے وہ کتاب ہے جو کسی زبان، لہجہ یا مضمون کے الفاظ کو مجتمع کرے، حروفِ تہجی یا کسی دوسری ترتیب پر مرتب ہو، اور جس کے اندر اسی یا کسی دوسری زبان مین ان الفاظ کی تشریحات ہون، (Dictionarium) ادنیٰ یا جدید "لاطینیت" کا ایک لفظ ہے (Dictio) جس سے یہ لفظ نکلا ہے، قدیم لاطینی مین ایک "لفظ" کو کہتے تھے، یونانی مین اس کا ہم معنے لفظ (Lexicon) ہے، جو الفاظ کی کتاب (ڈکشنری) پر اطلاق ہوتا ہے"، (Glossary) کے مشہور معنے ان الفاظ کا اجتماع ہے جو غیر مستعمل یا بیرونی ہون، اور تشریح کے متقاضی ہون"؛

لغت کی تقسیم

معززین! لیکن قاموس (ڈکشنری) کی ترتیبی حیثیت سے علما نے جو قسمین قرار دی ہین ان سے مذکورۂ بالا تعریف مین بڑی وسعت

---

[1] ص ۱۸۶ ج ۸ طبع یازدہم،

پیدا ہو جاتی ہے، وہ اقسام حسب ذیل ہیں :-

(۱) قاموس موجز (Vocabulary) وہ کتاب ہے جس میں الفاظ کم اور کسی خاص مضمون کے متعلق ہوں، یا الفاظ بلا تشریح ہوں، یا بعض الفاظ کی تشریح ہو، یا جزئی تشریحات ہوں،

(۲) فہرس کلمات مشروحہ (Glossary) وہ کتاب ہے جس میں کسی خاص مضمون کے اصطلاحی الفاظ کی تشریح اور فہرست ہو،

(۳) فہرست (Index) وہ کتاب ہے جس میں کسی مصنف یا کتاب کے الفاظ کی ابجدی[1] ترتیب مع حوالجات ہو،

(۴) فہرست (Concordance) وہ کتاب ہے جس میں ہر لفظ کے تحت میں اس جملہ کا بھی حوالہ دیا جائے جس کے اندر وہ لفظ پایا جاتا ہے،

(۵) مرتب قاموس موخر (Classed Glossary) وہ کتاب ہے جس میں الفاظ کسی خاص ترتیب سے عنوانات (Heads) یا تقسیمات و ذیلی تقسیمات (Subdivisions) کے ذیل میں اپنی فطرت یا معنے کے لحاظ سے مرتب ہوں،

(۶) قاموس (Dictionary) وہ کتاب ہے جس

---

[1] یعنی معجمی یا ہجائی،

ہیں کتاب نمبر ۵ کے خصوصیات کے ساتھ ساتھ کافی تشریحات بھی ہوں '

عربی میں ان تمام اقسام پر کتابیں موجود ہیں، جن کی تفصیل آگے آتی ہے '

لغت کا مواد

معززین! لغت کی کتابیں کیونکر مدون ہوئیں اور ان کا مواد کس طرح فراہم کیا گیا؟ اس کا جواب انسان کے قلم کی تر زبان کے بجائے، صحرا کے کانٹوں کی خشک زبان دے گی جس نے لیلائے لغت کے مجنونوں کے ذوق آبلہ پائی کو خون کے سرخ قطروں سے ہمیشہ تازہ و شاداب رکھا تھا، متعدد اکابر تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس ذوق و شوق کے نذر کیا' اور برسوں حجاز و نجد کے بیابانوں کی خاک چھانی، چنانچہ اکثر کتب ادب میں ان کا تذکرہ موجود ہے' ریاشی (م ۲۵۷ھ) نے ان بیابان نوردوں کی " علمی تشنگی " کی یوں ترجمانی کی ہے [1]

" ہم نے لغت (زبان) گوہ لڑانے والوں اور چوہے

---

[1] فہرست ندیم ص ۸۶ '

کھانے والوں سے لی ہے،

اس سلسلہ مین اگر احاطہ و استقصا سے کام لیا جاتے تو یہ خود ایک بڑا مضمون ہوجائیگا، اس لئے اجمالاً کچھ عرض کیا جاتا ہے،

لغت کے مواد کی فراہمی مین تین قسم کے اشخاص نظر آتے ہین۔

(۱) شہری، جو دیہات مین گئے، مثلاً سیبویہ (سنہ ۱۷۷ھ) یونس بن حبیب (سنہ ۱۸۳ھ)، لحیانی، اموی، نضر بن شمیل (سنہ ۲۰۴ھ)، ابن کناسہ (سنہ ۲۰۷ھ)، ابوزید (سنہ ۲۱۵ھ) اثرم (سنہ ۲۳۲ھ)، قاسم بن معن، ثابت ابن سکیت (سنہ ۲۴۴ھ)، ابوالہندام، ریاشی (سنہ ۲۵۷ھ)، جوہری (سنہ ۳۹۸ھ) وغیرہ

(۲) دیہاتی جو شہرون مین آئے، مثلاً ابو زیاد کلابی، مہدی کے زمانہ مین بغداد آیا اور ۴۰ سال مقیم رہ کر وفات پائی، ابوالبیدا بصرہ مین مقیم ہوا، یہ لڑکون کو اجرت پر تعلیم دیتا تھا، ابوشمخ حیرہ مین ٹھیرا، ابوحیرا نے بھی وہین سکونت اختیار کی ابوالجاموس، آل سلیمان بن علی کے پاس بصرہ آتا جاتا تھا ابن المقفع اسی کا شاگرد ہے، ابوشبلی عقیلی نے ہارون الرشید سے مل کر برامکہ سے توسل پیدا کیا، ابودعامہ عبسی بھی مدت

تک شہروں میں رہ کر برامکہ کے دربار سے متعلق ہو گیا تھا، ابو مسحل اور ابو ضمضم کلابی، حسن بن سہل کے پاس بغداد آئے تھے، حرمازی نے بصرہ میں اقامت اختیار کی تھی، ابو العمیثل اپنے ملک سے بہت دور، عبداللہ بن طاہر کے بچوں کو خراسان میں تعلیم دیتا تھا، ربعیہ نے بصرہ اور ابن ابی صبح نے بغداد میں طرح اقامت ڈالی تھی، ابو معلم شیبانی، شعر و لغت کا سب سے بڑا عالم بصرہ میں سکونت پذیر تھا،

(۳) دیہاتی جنہوں نے دیہاتوں میں سلسلۂ درس جاری کیا، مثلاً ابو مالک عمرو بن کرکرہ دیہات میں پڑھاتا اور شہر میں کتابیں فروخت کرتا تھا، اس کو تمام لغت ازبر یاد تھی، اسی کا ہم رتبہ ابو عرار تھا جو بنو عجل کا ایک فصیح بدوی تھا، ابو ثروان وحشی بنی عکل کا ایک فصیح بدوی دیہات میں تعلیم دیتا تھا، ابو سوار غنوی، ابو عبیدہ وغیرہ کا استاد تھا، ابو الخطاب بهدلی سے اصمعی نے لغت سیکھے اور اس کو سند مانا، ابو مہدیہ اساتذۂ بصرہ کا استاد تھا، ابو مسہر نے ابو عطیہ کو تعلیم دی تھی،

چوتھی قسم ان شہریوں کی ہے جنہوں نے شہروں میں تعلیم و تدریس کا طریقہ اختیار کیا، لیکن چونکہ یہ چیز بہت عام تھی اس کا لکھنا لاحاصل ہے، البتہ اس موقع پر یونس بن حبیب (۱۸۳ھ) کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، اس کا مدرسہ بصرہ میں تھا جس میں

عام طلباء اور علماے ادب کے علاوہ بڑے بڑے فصیح بدوی بھی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور ساتھ ہی دیہاتون سے وفود کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، اس امتیاز خاص کی وجہ سے بصرہ نہ صرف معادنِ لغت (عرب کے دیہات) کی ہمسری کرنے لگا، بلکہ ایک حد تک اپنے پرانے استادون کا معلم بھی بن گیا[1]،

لغت کی ترتیب

معززین! عربی زبان مین لغت کی جو کتابین الفاظ پر مرتب ہوئین اُن مین چند قسم کی ترتیب تھی،

(۱) ترتیب ہجائی یا معجمی یعنی الف، ب ت ث الخ لیکن یہ بھی دو قسم کی تھی،

(الف) ابتدائی حرف کے مطابق، اس کا نام ترتیب دریدی رکھتے ہین، کیونکہ اس کا موجد ابن درید (سنہ ۳۲۱ھ) تھا، اور جمہرہ کی یہی ترتیب ہے، بارع، منضد، مجمل، محیط، نزہۃ الانفس، اساس البلاغۃ، المغرب وغیرہ اسی طرح مرتب ہین،

[1] یہ تمام تفصیل فہرست ندیم کی ورق گردانی کا نتیجہ ہے،

(ب) اخیر حرف کے مطابق، اس کا نام ہم نے ترتیب جوہری رکھا ہے، کیونکہ ابو نصر جوہری (۳۹۸ھ) مصنف صحاح نے اس کو ایجاد کیا تھا، صحاح، عباب، لسان العرب، قاموس وغیرہ کی یہی ترتیب ہے، اور اس سے شعراء کو قافیہ ڈھونڈنے مین بڑی آسانی ہوتی ہے،

(۲) ترتیب خلیلی، یہ مخارج حروف کے لحاظ سے ہندی حروف ہجا کے مطابق ہے، عربی مین اس کا موجد خلیل بن احمد (۱۷۰ھ) تھا، اس کی کتاب العین اسی طرح مرتب ہے، محکم، تہذیب، کتاب الجیم ہروی (حرف جیم کے سوا) کی بھی یہی ترتیب تھی،

(۳) ترتیب مفضلی، مفضل بن سلمہ نے جو ابن الاعرابی (۲۳۱ھ) کا شاگرد تھا۔ البارع فن لغت مین ایک کتاب لکھی تھی جو تمام نہین ہوئی، اس کی ترتیب یہ تھی، الف، ہ، ع، ح، غ، خ[1] یہ ترتیب ابن مکرم کے بیان کے مطابق سیبویہ (۱۷۷ھ) کی ہے[2]، لیکن چونکہ سیبویہ کو ہمارے مضمون سے کوئی تعلق نہین ہے، ہم نے اس کا ذکر نہین کیا ہے (سیبویہ کے ہان خ، غ سے مقدم ہے)

(۴) ترتیب ہنائی، علی بن حسن ہنائی نے منضد کے نام سے

---

[1] فہرست ندیم ص ۱۰۹، [2] لسان العرب دیباچہ ص ۸ ج ۱،

ایک لغت لکھی تھی جو حروفِ ہجا پر مرتب تھی، لیکن اسی مصنف نے مجرد الغریب کو جس میں عربی کے غریب لغات جمع کئے ہیں، ایک نئے عنوان سے مرتب کیا، مادے کتاب العین کے مطابق تھے یعنی پہلے ثلاثی، پھر رباعی، پھر خماسی، اور الفاظ کے ابتدائی حروف میں خلیل کے خلاف حروف ہجا کا تتبع تھا، اور با اینہمہ مخارج کا بھی لحاظ رکھا تھا، اس طرح یہ ترتیب بہ یک وقت ہجائی بھی تھی اور خلیلی بھی[1]،

معززین! ان ترتیبوں کی زمانی ترتیب پر بھی ایک اجمالی نگاہ ضروری ہے، سب سے پہلے ترتیبِ خلیلی وجود پذیر ہوئی (۱۷۰ھ) پھر ترتیب مفضلی (بعد ۲۳۱ھ)، پھر ترتیبِ ہنائی (بعد ۳۰۷ھ) پھر ترتیب ہجائی میں سے ترتیب دریدی (۳۲۱ھ)، اور پھر ترتیب جوہری (۳۹۸ھ)،

مفتاح الالفاظ

(Key-words)

معززین! اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

---

[1] لسان العرب دیباچہ ج ۱، ص ۸، ایضاً ص ۱۲،

کہ عربی لغت مین اعراب حرکتی، اور لفظی کے علاوہ مفتاح الالفاظ کا بھی رواج تھا، یہ اصطلاح خاکسار کی وضع کردہ ہے، جو شاید کتب لغت مین نہ ملے، لفظی اعراب کی ابتدا، چوتھی صدی کے اواخر مین ہوئی، اور جوہری (۳۹۸ھ) نے صحاح مین اس کو رواج دیا، اس کے سوبرس بعد یعنی پانچوین صدی کے آخر مین حاشیہ پر تقییدات کا رواج ہوا، چنانچہ صحاح جوہری پر تبریزی (۵۰۲ھ) اور ابن برّی (۵۸۲ھ) نے جو حاشیے لکھے تھے اسی قسم کے تھے، پھر آٹھوین صدی کے وسط مین محمد بن ابوبکر رازی نے صحاح کے خلاصہ "مختار الصحاح" لکھنے کے دوران مین مفتاح الالفاظ (Key-words) کا طریقہ ایجاد کیا، اس نے بیس وزن مقرر کئے اور صحاح کے ان الفاظ پر جو جوہری سے رہ گئے تھے یا حرکتی اعراب لگایا، یا ان اوزان مین سے ایک وزن پر لکھ دیا،[1] یہ کتاب ۷۶۰ھ مین ختم ہوئی، نوین صدی مین "تقیید بالالفاظ المشہورۃ" (مفتاح الالفاظ) اچھی طرح رائج ہوگئی، چنانچہ فیروزآبادی (۸۱۶ھ) نے قاموس مین اس کو اختیار کیا، اور بعد کے مولفین نے ان کی پیروی کی، یہ طریقہ ایسا مقبول ہوا کہ جن لوگون نے اس کو ترک کیا، نکتہ چینی کا مورد بنے، چنانچہ حاجی خلیفہ

---

[1] کشف الظنون ۵۷، ج ۱

نے مصباح منیر کے مصنف احمد فیومی (سنہ ۷۷۰ھ) پر اسی لحاظ سے نکتہ چینی کی ہے[۱]

لغت کا انداز

معززین! لغت کی کتابین مواد کے لحاظ سے متعدد اور مختلف طرز مین لکھی گئین،

(۱) قطرب (سنہ ۲۰۶ھ)، وشار، ابراہیم لخمی، ابن زبیر، قزاز (سنہ ۴۱۲ھ)، ابن عدیس، ابو محمد بطلیوسی (سنہ ۵۲۱ھ) ابو حفص قضاعی (سنہ ۵۷۰ھ)، جمال الدین نحوی (سنہ ۶۷۲ھ) فیروزآبادی (سنہ ۸۱۶ھ)، ابن جماعہ (سنہ ۹۱۹ھ) نے مثلثات لکھے، ان کتابون مین دو الفاظ تھے جن کے ۳ معنے ۳ حرکتون (زبر، زیر، پیش) کے بدلنے سے پیدا ہوجاتے ہین، مُطرِّز بادردی (سنہ ۳۴۵ھ) اور ابن خالویہ (سنہ ۳۷۰ھ) نے کتاب العشرات کے نام سے تصنیفات کین، ان مین ایک معنے کے دس دس الفاظ تھے، ابوالطیب لغوی (سنہ ۳۵۱ھ) نے ابدال مین یہ جدت کی کہ ایک معنے کے

---

[۱] کشف الظنون ۴۵۰ ج ۲،

ایسے الفاظ لئے جن مین صرف ایک دو حرفون کا فرق تھا، ورنہ باہم بہت ملتے جلتے ہوئے تھے[۱]۔

(۲) مفضل بن سلمہ (بعد ۲۳۱ھ) نے کتاب الفاخر مین وہ امثال اور محاورات لکھے جن کو عوام بے سوچے سمجھے استعمال کرتے ہین، اس سلسلہ مین وہ مثل کو لکھ کر اس کی تشریح کرتا ہے[۲]، محمد بن علی عراقی (۵۶۱ھ) نے نزہۃ الانفس مین ابو القاسم نصر بن صفار کے اصرار سے یہی طریقہ اختیار کیا ہے، وہ مثل کا قصہ بھی لکھتا ہے[۳]،

(۳) ابو العباس محمد بن یزید مبرد (۲۸۵ھ) نے کامل مین نظم، نثر، امثال، نصیحتین، خطبے، رسالے، سب کچھ جمع کیا، اور غریب کلام و مغلق معانی کی تفسیر کی، اور اعراب کی تشریح کا بھی خیال رکھا، یہ بڑی اہم کتاب ہے، لیکن فہرست (ص ۸۸) مین نام کے سوا کچھ نہین، اور معجم یاقوت (۱۴۳ ج ۷) مین صرف اتنا ہے کہ یہ مبرد کی سب سے مشہور تصنیف ہے، مواد کی نوعیت کے لحاظ سے ادب

---

[۱] کشف الظنون ص ۴۵ ج ۱،

[۲] ایضاً ۲۹۲ ج ۲،

[۳] ایضاً ۵۹۳ ج ۲،

اور لغت کے ذخیرے اتنے برابر کے ہین کہ یاقوت اس کو ادب کی کتاب کہتا ہے، اور چلپی لغت کی ،

(۴) صاحب ابن عباد وزیر (۳۸۵ھ) نے محیط مین الفاظ زیادہ لکھے ہین، لیکن شواہد کم ہین[1]،

(۵) ابن فارس (۳۹۵ھ) نے مجمل مین اوائل حروف کے لحاظ سے ابواب اور باقی کے لحاظ سے فصلین رکھی ہین، اس مین صرف صحیح اور واضح کلام ہے، وحشی اور غیر مستعمل نہین[2]، یہ مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے[3]، لیکن یاقوت نے ان خوبیون کے باوجود اس کے حالات کو مجمل ہی رکھا ہے ، زمخشری (۵۳۸ھ) کی اساس اور مطرزی (۶۱۰ھ) کی مغرب کا بھی یہی انداز ہے،

(۶) ابن سیدہ (۴۵۸ھ) نے مخصص مین جو محکم سے قبل لکھی تھی، الفاظ کے بجائے معانی پر توجہ کی، اسی وجہ سے وہ فقہ اللغۃ مین شمار ہوتی ہے، یہ کتاب العین کی ترتیب پر مرتب ہے،

(۷) زمخشری (۵۳۸ھ) نے اساس البلاغت مین الفاظ کے

---

[1] - ابن خلکان ۷۵ ج ۱،

[2] - کشف الظنون ۲۸۷ ج ۲،

[3] - ابن خلکان ۳۵ ج ۱،

مستقل معانی اور اشتقاقات سے قطع نظر کرتے ہوئے، الفاظ کا صحیح استعمال بتلایا ہے، اور اس کے لئے جملے نقل کئے ہین، چونکہ یہ بڑا اہم کام تھا، اور موجودہ مذاق کے مطابق تھا، انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگارون نے اس کتاب کو بڑی وقعت دی ہے، اور اس کو "منتخب الفاظ اور جملون کا بیش بہا خزانہ" کہا ہے[۱]،

(۸) ابوطاہر سرقسطی (۵۳۸ھ) زمخشری کے حقیقی معاصر نے مسلسل کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس مین ۵۰ فصلین ہین، ہر فصل ایک شعر سے شروع ہوتی ہے، شعر کے ہر لفظ کے معنے ایسے لفظ مین ہوتے ہین جس کے دو معنے ہون، پھر اس دوسرے لفظ کی تشریح بھی ایسے لفظ سے ہوتی ہے جس کے دو معنے ہون، یون ہی یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے، اس کتاب کا ذکر کشف الظنون مین نہین ملا، ۲۲۰ صفحات ہین مصر کے کتبخانۂ خدیویہ مین اس کا قلمی نسخہ ہے،

(۹) ابومنصور جوالیقی (۵۳۹ھ) نے المعرّب نام ایک تصنیف کی، اس مین وہ عجمی الفاظ حروف معجم پر مرتب ہین، جو عربی بنا لئے گئے ہین، ابن خلکان نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۱۹۷ ج ۸ طبع ۱۱،

اس باب مین اس سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہین[۱]،

(۱۰) ناصرالدین مُطرزی (سنہ ۶۱۰ھ) اقناع مین مفرد الفاظ کو اجناس پر مرتب کیا ہے[۲]،

مصنفین لغت

معززین اللغت کے مصنفین خواہ وہ کسی دور سے متعلق ہون موادِ تحریر کے لحاظ سے بعض مورخانہ حیثیت رکھتے تھے، یعنی وہ لغت کے مورخ تھے، اور قدماء کے اقوال اکثر بلا نقد وجرح نقل کرتے تھے، اور بعض ناقد (CRITIC) بھی تھے، جو قدیم اقوال کی صحت یا عدمِ صحت پر آزادانہ اپنی رائے رکھتے تھے، فہرست وغیرہ مین ضمناً ان کا تذکرہ آتا ہے،

یہ مصنفین ۶ دورون پر منقسم ہین،

(۱) عباسیہ کے دورِ اول (سنہ ۱۳۲ھ - سنہ ۲۳۲ھ) مین لغت کے الفاظ پر معانی، اصول اور اشتقاق کے لحاظ سے توجہ ہوئی، اور علماء ادب و لغت نے خاص خاص مضامین کے الفاظ کتابون مین یکجا کئے، یعنے بہ الفاظِ دیگر معاجم معنویہ

---

[۱]۔ ابن خلکان ۲۴۲ ج ۲، [۲]۔ کشف الظنون ۱۳۲ ج ۱،

(Subject- books) وجود مین آئین، جن کی پیدائش لغت کے قانونِ فطرت کے بالکل مطابق تھی، خلق الانسان، خلق الفرس، اسماء الوحوش، خیل، الشاء، ابل، النخل والکرم، المیاہ والجبال، نوادر، امثال، اضداد، لغات، فروق غریب القرآن، غریب الحدیث، وغیرہ عنوانات پر فصیح بدویون سے مل کر الفاظ جمع کئے گئے، اس دور کے مشہور مصنفین یہ ہین :-

خلیل بن احمد (سنہ ۱۷۰ھ)، یونس (سنہ ۱۸۳ھ)، مورج (سنہ ۱۹۵ھ)، کسائی (سنہ ۱۹۷ھ)، نضر بن شمیل (سنہ ۲۰۴ھ) ابو عمرو شیبانی (سنہ ۲۰۶ھ)، قطرب (سنہ ۲۰۶ھ) ابن کناسہ (سنہ ۲۰۷ھ)، فرّار (سنہ ۲۰۷ھ)، ابوعبیدہ (سنہ ۲۱۰ھ) اصمعی (سنہ ۲۱۳ھ)، ابوزید (سنہ ۲۱۵ھ)، ابونصر باہلی (سنہ ۲۲۰ھ) اخفش (سنہ ۲۲۱ھ)، قاسم بن سلام (سنہ ۲۲۴ھ)، عتبی (سنہ ۲۲۸ھ) اثرم (سنہ ۲۳۰ھ)، احمد بن حاتم (سنہ ۲۳۱ھ)، ابن سعدان (سنہ ۲۳۱ھ)،

(۲) عباسیہ کے دورِ دوم (سنہ ۲۳۲ھ - سنہ ۳۳۴ھ) مین عنوانات بالا پر تصنیفات کے علاوہ الفاظ کی بعض ایسی کتابین بھی عالم وجود مین آئین، جنھون نے آگے چل کر معاجم لغویہ کا سنگ بنیاد رکھا، اس دور کے مشاہیر یہ تھے :-

ابو مروان قرطبی (سنہ ۲۲۹ھ)، ابو العیثل (سنہ ۲۴۰ھ)، ابن سکیت (سنہ ۲۴۶ھ)، ابو محلم شیبانی (سنہ ۲۴۸ھ)، ابو حاتم سجستانی (سنہ ۲۵۵ھ)، ابو عمرو ہروی (سنہ ۲۵۵ھ)، ریاشی (سنہ ۲۵۷ھ)، ابن قتیبہ (سنہ ۲۷۰ھ)، ابو سعید سکری (سنہ ۲۷۵ھ)، مبرد (سنہ ۲۸۵ھ)، ابو حنیفہ دینوری (سنہ ۲۹۰ھ)، ثعلب (سنہ ۲۹۱ھ) مفضل بن سلمہ (اواخر قرن ثالث)، ابو الحسن ھُنائی (اوائل قرن رابع)، زجاج (سنہ ۳۱۰ھ)، محمد بن یزیدی (سنہ ۳۱۰ھ)، اخفش صغیر (سنہ ۳۱۵ھ)، ابن درید (سنہ ۳۲۱ھ) نفطویہ (سنہ ۳۲۳ھ)، عبد الرحمٰن ہمدانی (سنہ ۳۲۷ھ)، ابوبکر ابن انباری (سنہ ۳۲۸ھ)، ابن درستویہ (سنہ ۳۳۰ھ)،

(۳) عباسیہ کے دور سوم (سنہ ۳۳۴ھ - سنہ ۴۴۷ھ) مین معاجم لغویہ کی تدوین ہوئی، یعنی علمار لغت نے الفاظ کے معانی اور تلفظ پر کتابین لکھین، جو حروفِ معجم یا معانی کے لحاظ سے مرتب تھین، اس عہد کے نامور علمار یہ ہین :-

ابو القاسم زجاجی (سنہ ۳۳۷ھ)، مطرز بادردی (سنہ ۳۴۵ھ) ابو طیب لغوی (سنہ ۳۵۱ھ)، ابو علی قالی (سنہ ۳۵۶ھ)، ازہری (سنہ ۳۷۰ھ)، ابن خالویہ (سنہ ۳۷۰ھ)، ابو احمد عسکری (سنہ ۳۸۲ھ) صاحب ابن عباد (سنہ ۳۸۵ھ)، ابن فارس (سنہ ۳۹۵ھ)، ابو ہلال عسکری (سنہ ۳۹۵ھ)، ابو الحسین بن زکریا (سنہ ۳۹۵ھ)

جوہری (سنہ ۳۹۸ھ)، جناوہ (سنہ ۳۹۹ھ)، قزاز (سنہ ۴۱۲ھ)
ثمانی (سنہ ۴۱۵ھ)، صاعد (سنہ ۴۱۷ھ)، ابن السید قیسی
(سنہ ۴۲۷ھ)، ثعالبی (سنہ ۴۳۰ھ)، تبانی (سنہ ۴۳۶ھ)،
شریف مرتضیٰ (سنہ ۴۳۶ھ)، ابن سِیدَہ (سنہ ۴۵۸ھ)،

(۴) عباسیہ کے دور چہارم (سنہ ۴۴۷ھ - سنہ ۶۵۶ھ) میں بعض خاص قسم کے معاجم لکھے گئے، اس عہد کے مشاہیر یہ ہیں:-
ابو العباس جرجانی (سنہ ۴۸۲ھ)، بدیع الزمان نطنزی (سنہ ۴۹۹ھ)
راغب اصفہانی (سنہ ۵۰۲ھ)، مَیدانی (سنہ ۵۱۸ھ)، زمخشری
(سنہ ۵۳۸ھ)، ابو طاہر سَرَقُسطی (سنہ ۵۳۸ھ)، جوالیقی (سنہ ۵۳۹ھ)
ابن شجری (سنہ ۵۴۲ھ)، ابو جعفر مقسری (سنہ ۵۴۴ھ)،
محمد بن علی عراقی (سنہ ۵۶۱ھ)، نشوان بن سعید (سنہ ۵۷۳ھ)،
کمال الدین انباری (سنہ ۵۷۷ھ)، ابن بَرّی مقدسی
(سنہ ۵۸۲ھ)، یوسف بلوی (اواخر قرن ششم واوائل ہفتم)
ناصر مُطَرِزی (سنہ ۶۱۰ھ)، دقیقی (سنہ ۶۱۴ھ)، صنعانی
(سنہ ۶۵۰ھ)

(۵) مغلوں کے عہد (سنہ ۶۵۶ھ - سنہ ۹۲۳ھ) میں اگرچہ زیادہ تر کتب لغت کی شرحیں تیار ہوئیں، تاہم بعض مستند اور مشہور کتابوں کا اضافہ بھی ہوا، اس دور کے اساطین، ابن مکرم (سنہ ۷۱۱ھ)، احمد بن محمد فیومی (سنہ ۷۷۰ھ) مجد الدین

فیروزابادی (۸۱۷ھ) تھے،

(۶) سلاطین عثمانیہ کے دور (۹۲۳ھ - ۱۳۰۰ھ) مین شہاب الدین خفاجی (۱۰۶۹ھ)، یوسف بدیعی (۱۰۷۳ھ)، اور مرتضیٰ زَبِیدی (۱۲۰۵ھ) سے بڑھ کر لغت کا کوئی عالم پیدا نہین ہوًا،

لغت کے اقسام

معززین! اگر مین انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگارون کی طرح اقسام لغت پر ایک مضمون لکھون تو شاید علم اللغۃ کا ایک "ماوراء الطبیعۃ" (METAPHYSICS) پیدا ہو جائے، اور میرے مضمون کا "تاریخ" کے بجائے "فہرست" مین شمار ہو، اس لئے مین تفصیل سے اعراض کرتے ہوئے اجمال پر اکتفا کرتا ہون، اور صرف انہی کتابون کو لیتا ہون جن کا لغت سے براہ راست تعلق ہے، یا ان کا بالواسطہ تعلق آسانی کے ساتھ سمجھ مین آسکتا ہے، دنیا کے بزرگترین ذخیرہ کتب کے فہرست ساز حاجی خلیفہ چلپی کی طرح مجھ کو بھی کتابون کو فنون پر تقسیم کرنے کی سعادت حاصل ہے، اور ان کی طرح مین یہ بھی کہ سکتا ہون کہ بعض کتابون مین دو حیثیتین ایسی برابر کی جمع ہو جاتی ہین جس سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کو

کس فن مین داخل کیا جائے، تاہم مین نے اپنی قوتِ فیصلہ پر غلط یا صحیح طور پر اعتماد کرکے یہ کام انجام دیا ہے، اور آپ حضرات کے "ردوقبول" سے اب تک بے نیاز نہین ہوا ہون،

معززین! مواد کے لحاظ سے قوامیس یا معاجم کی ابتدائی قسمین صرف دو ہین، (۱) معاجم لفظیہ (WORD - BOOKS) اور معاجم معنویہ (Subject - books)، ترتیب کے لحاظ سے اگرچہ معاجم معنویہ مقدم ہین، کیونکہ وہ پہلے پیدا ہوئین، تاھم چونکہ معاجم لفظیہ کو لغت سے زیادہ تعلق ہے اس لئے ہم انہی کو مقدم کرتے ہین، اس سلسلہ مین پہلے معاجم کا مطلب سمجھ لینا چاہیئے، معاجم سے مراد لغت کی وہ کتابین ہین جن مین الفاظ حروف معجم یا مشابہ و قریب معانی کے لحاظ سے مرتب ہون، اب اگر الفاظ ہجے کے اعتبار سے ابجدی (حرفی یا ہجائی) ترتیب پر مرتب ہین تو ایسی کتابین معاجم لفظی کہلائینگی، اور اگر مفرداتِ لغت، معانی کے اعتبار سے جمع ہین تو ایسی کتابون کو معاجم معنوی کہا جائے گا،

(۱) معاجم لفظیہ
(WORD - BOOKS)

معززین! یہ معاجم حد و شمار سے زائد ہین، تاہم ان مین سے جو زیادہ ضخیم، زیادہ مشہور، اور زیادہ مستند ہین، ان کی تعداد مسٹر لین

(LANE) نے اپنے قاموس عربی و انگریزی (Arabic-English Lexicon) کے دیباچہ مین ۳۲ بتلائی ہے[۱]، لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگارون نے ان مین سے صرف سات کو لیا ہے، جو حسب ذیل ہین، العین، صحاح، محکم، اساس، لسان العرب، قاموس، تاج العروس، ہمارے نزدیک یہ تعداد ۲۰ تک پہنچتی ہے، جس کو ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہین، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، معاجم کی ترقی تیسرے دور مین ہوئی تھی، لیکن در اصل ان کی ابتدار کا زمانہ پہلا دور تھا، اور دوسرا دور بھی کلیتہً ان سے خالی نہ تھا، اس بنار پر ہم یہان ان سب پر اس طرح نظر ڈالنا چاہتے ہین کہ مختلف معاجم پر تبصرہ کے ساتھ ساتھ ان کی مسلسل تاریخ بھی منظرِ عام پر آجائے،

(۱) کتاب العین :-

تمام علمار کی تصریح کے مطابق یہ لغت کا پہلا معجم ہے، جو دورِ اول مین تصنیف ہوا تھا، اس کا مصنف مشہور امامِ لغت خلیل بن احمد فراہیدی تھا، اس کے سنہ وفات میں مختلف اقوال ہین، فہرست (تصنیف ۳۷۷ھ) میں ۱۷۰ھ، معجم الادبار یاقوت (۶۲۶ھ) مین ۱۶۰ھ اور ۱۷۰ھ، ابن خلکان (۶۸۱ھ) مین ۱۷۰ھ، ۱۷۵ھ، ۱۶۰ھ، ۱۳۰ھ، چلپی (۱۰۶۷ھ) مین ۱۷۵ھ منقول ہے، ان مین ۱۳۰ھ قطعاً غلط ہے، ابن خلکان نے

[۱] انسائیکلوپیڈیا ص ۱۹۷ ج ۸ طبع ۱۱

ابن جوزی کے حوالہ سے اس کی تردید کی ہے کہ یہ واقدی کی روایت ہے، ۱۶۰ھ بھی زیادہ مشہور نہین، البتہ ۱۷۰ھ اور ۱۷۵ھ زیادہ تر منقول ہین، ۱۷۰ھ فہرست مین ہے جو ان سب سے قدیم ہے، ۱۷۵ھ چلپی اور زبیدی (۱۲۰۵ھ) نے اختیار کیا ہے جو متاخرین مین ہین، انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگارون نے احتیاطاً قبل ۱۷۵ھ لکھ دیا ہے کہ دونون روایتین جمع ہوجائین،

العین کس کی تصنیف ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے، فہرست کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے، کہ اس کی نسبت خلیل کی طرف روایات سے ثابت نہین، دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل نے پوری کتاب مکمل کرلی تھی، اور لیث بن مظفر نے صرف تحریر مین اس کی امداد کی تھی[1]، معجم الادبا (۱۸۲ ج ۴) مین ہے کہ خلیل نے صرف ایک حصہ لکھا تھا، لیث بن نصر نے اس کو مکمل کیا، (پورا نام لیث بن مظفر بن نصر تھا)، ابن خلکان (۱۷۲ ج ۱) مین ہے کہ خلیل نے ابتدائی حصے لکھے تھے، اور عین نام رکھا تھا، پھر اس کا انتقال ہوگیا، تو اس کے شاگردون نضر بن شمیل، موَرج سدوسی، نصر بن علی جھضمی وغیرہ نے پورا کیا، پھر ابتدائی حصہ بھی

---

[1] فہرست ندیم ص ۶۴-۶۵،

بدل ڈالا، اسی لئے کتاب مین بہت سی ایسی خامیان ہین جن کی خلیل سے توقع نہین، ابن درستویہ نے اس بحث پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، ابن خلدون (۸۰۸ھ) اس کے متعلق بالکل خاموش ہے، طبقات النحاۃ مزہر (۴۷ ج ۱) اور چلپی (ص ۲۸۹، ۲۹۰ ج ۲) مین ہے کہ اکثرون نے اس کو خلیل کی تصنیف نہین مانا ہے، بعض نے لیث بن نصر کو اس کا مصنف بتایا ہے بعض نے ابتدار سے آخر حرف عین تک خلیل کو اور باقی کا لیث کو مصنف تسلیم کیا ہے، (یہ غلط ہے کیونکہ حرف العین ہی سے کتاب شروع ہوئی تھی، البتہ اگر غین ہو تو صحیح ہو سکتا ہے جیسا کہ مزہر مین ہے) ابن المعتز کے قول کے مطابق یہ کتاب جل گئی تھی، نصر نے آدھی کتاب یادداشت سے لکھائی جس کا وہ حافظ تھا، پھر باقی حصہ علمار کی ایک جماعت سے مکمل کرایا، اس کا ذکر یاقوت نے معجم الادبار مین کیا ہے، (یہ بھی غلط ہے، یاقوت نے خلیل اور نصر دونون کے حالات مین یہ نہین لکھا ہے، البتہ ابن خلکان مین کسی قدر اختلاف کے ساتھ ہے،) غرض

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

حقیقت یہ ہے کہ خلیل نے اس کے ابواب مرتب کر لئے تھے، کہین کہین کچھ لکھنا رہ گیا تھا، یہ کام اس کی وفات کے بعد چند علمار نے انجام دیا، ابو الطیب لغوی اور محمد بن حسن زبیدی کی تحریرین

اس باب مین نہایت صاف اور صریح ہین، اور ان کو چلپی نے نقل کیا ہے، انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگارون نے اسی بناء پر اس کو "عام طور پر خلیل کی طرف منسوب" لکھا ہے، (ص ۱۹۷ ج ۸ طبع ۱۱)

کتاب العین کی وجہ تسمیہ فہرست مین مذکور نہین، معجم الادباء اور ابن خلکان بھی خاموش ہین، البتہ ابن خلدون نے مقدمہ مین لکھا ہے کہ کتاب مین جو پہلا کلمہ یا لفظ ہوتا تھا، متقدمین وہی کتاب کا نام رکھ دیتے تھے، چونکہ خلیل کی کتاب حرف عین سے شروع ہوتی ہے اسی کا نام کتاب العین ہوا[۱]،

کتاب کی ترتیب مخارج کے لحاظ سے ہے، اور یہ عربی مین ایک خاص جدت ہے، عربی مین حروف تہجی اور حروف ابجد کی ترتیب رائج تھی، (ان دونون ترتیبون مین فرق ہے، لیکن فہرست ساز اور تاریخ نگار اس کو ملحوظ نہین رکھتے، اس لئے یہان دونون کو ایک سمجھنا چاہئیے) مخارج کی ترتیب ہندوستان کا اختراع تھا، ولیمز (MONIER WILLIAMS) نے اپنی سنسکرت گرامر مین لکھا ہے کہ ہندو سنسکرت کے حروف حلق سے شروع کرتے ہین اور ہونٹ پر ختم کرتے ہین، خلیل نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا، اس نے پہلے حلق، پھر زبان، پھر دانت، پھر ہونٹ، کے حروف لئے ہین

---

[۱] - مقدمہ ابن خلدون ص ۶۲۸،

اور حروف علت کو آخر مین رکھا ہے، کیونکہ وہ حروف ہوائی ہین، یہ تمام تفصیل بعد کی کتابون سے معلوم ہوتی ہے جو کتاب العین کے بعد اسی ترتیب سے لکھی گئین، اور آج بھی موجود ہین،

حروف کی ترتیب کیا تھی؟ اس کا فہرست سے یہ جواب ملتا ہے،

ع ح ہ خ غ ق ک ج ش ض ص س ز ط د ت ظ ذ ث ر ل ن ف م و ا ی، ہمارے نسخہ مین ب نہین ہے، لیکن جرجی زیدان نے فہرست کا جو نسخہ سامنے رکھا ہے اس مین ب موجود ہے، لیکن ان حروف مین چند غلطیان ہین جو شاید سہو کتابت کا نتیجہ ہین، لسان العرب کے دیباچہ مین (ص ۶ ج ۱) بالکل صحیح ترتیب نقل کی ہے، لیکن اخیر مین کچھ فرق ہوگیا ہے، یعنی م، ی، و، الف ہے، کتاب العین کی ترتیب پر ابو الفرج مغاربی نے چند اشعار کہے ہین ان مین ص سے پہلے ض ہے[1]، جو مخارج کی ترتیب کے لحاظ سے صحیح ہے، ابن سیدہ کی محکم کی ترتیب بھی یہی "خلیلی ترتیب" تھی، اس کے متعلق دو شاعرون نے اشعار لکھے ہین جن مین حروف کے بجائے الفاظ کی مثالین دی ہین، اس سے تحریف و تصحیف کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے، ایک گمنام شاعر نے پہلے ضر، پھر صدلا، اور ناصر الدین محمد بن قرناص نے پہلے ضوابط

---

[1] - کشف الظنون ۲۹۱ ج ۲،

پھر صراط کی مثال دی ہے، اسی طرح س کے بجائے ز ہے، ت کے بجائے ث اور ث کے بجائے ت، یہاں ابوالفرج نے غلطی کی ہے، فہرست میں س نا غلط ہے، یہاں س ہونی چاہئے، تینوں شاعروں کے ہاں یہی ہے، ف کے بعد ہمارے نسخہ (فہرست) میں ب نہیں ہے، حالانکہ ہونی چاہئے، اس کو تینوں شاعروں نے لکھا ہے، ب کے بعد م و ا ی ابوالفرج کے اشعار میں ہے اور فہرست کے مطابق ہے، لیکن باقی شاعروں نے م ا ی و لکھا ہے، اب یا تو یہاں عین اور محکم کی ترتیب میں فرق ہے، جیسا کہ ابن مکرم نے تصریح کی ہے[۱]، اور یا عین کے کاتبوں سے غلطی ہوگئی ہے، (محکم میں غلطی نہیں ہوسکتی، وہاں شاعروں نے مثالیں دی ہیں)

کتاب العین کا مقصدِ تصنیف ابن خلکان نے ایک قدیم حوالہ سے بتایا ہے، حمزہ اصفہانی (تقریباً سنہ ۳۵۰ھ) نے التنبیہ علیٰ حدوث التصحیف میں عین کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک قوم (عرب) کی زبان کا پورا احاطہ کرتی ہے[۲]، ابن خلدون نے اس پر مجملاً لکھا ہے، لیکن حافظ جلال الدین سیوطی نے طبقات النحاۃ اور مزہر میں حمزہ کے دعوے کو ثابت کر دیا ہے، حمزہ نے اپنی دوسری تصنیف موازنہ[۳] میں غالباً کتاب العین کا وہ حصہ نقل کیا تھا جہاں

[۱] دیباچہ لسان العرب ص ۷، ج ۱ [۲] ابن خلکان ص ۷۳، ج ۱، حمزہ کی اس کتاب کا نام فہرست میں التنبیہ علیٰ حروف المصحف لکھا ہے جو غالباً سہو کتابت ہے، (ص ۱۹۹)

[۳] اس کتاب کا ذکر فہرست میں نہیں ہے، لیکن یہ کتاب مصر کے کتبخانہ خدیویہ میں موجود ہے، پورا نام یہ ہے کتاب الخصائص والموازنہ بین العربیہ والفارسیہ)

کلام عرب کے ابنیہ شمار کئے گئے ہین، حافظ صاحب نے ان کو اپنے طبقات اور مزہر مین نقل کیا ہے، اور اس طرح گو تعین اور موازنہ دستیاب نہین ہوتین تاہم حمزہ کا دعویٰ اب بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح اس کی زندگی مین ثابت تھا، حافظ صاحب کی تحریر کے مطابق کتاب العین مین مستعمل وغیر مستعمل کلام عرب کے ابنیہ ایک کروڑ تئیس لاکھ، پانچ ہزار، چار سو بارہ ہین[۵۱]، سیوطی نے طبقات النحاۃ مین بڑی جرأت کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خلیل نے اپنی کتاب کو خود مکمل کیا تھا[۵۲]، یہ نتیجہ خواہ کسی قدر صحیح کیون نہ ہو لیکن اس کا جواب سیوطی کے پاس بھی نہین ہے کہ کتاب مین نحو کے جو مسائل آگئے ہین وہ اہل کوفہ کے مذہب کے مطابق ہین، اور سیبویہ نے خلیل سے بصرہ والون کا جو مذہب نقل کیا ہے اس کے خلاف ہین،

بہرحال کتاب العین اب تقریباً ناپید ہے، ابتداءً ملوکِ طاہریہ کے کتب خانہ مین تھی، ۲۴۸ھ (سنہ ۲۴۸ھ) مین خراسان سے ایک تاجر اس کو بصرہ لایا، اور ۵۰ دینار پر فروخت کیا، ۴۸ جزء مین تھی، یہ ابن درید (سنہ ۳۲۱ھ) کا بیان فہرست (ص ۴۶) مین منقول ہے،

---

۵۱ - مزہر ص ۴۵ ج ۱،

۵۲ - بُغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ ص ۲۴۵،

(۲) الجمہرۃ :-

یہ دوسرا معجم ہے جو عباسیہ کے دوسرے دور مین تصنیف ہوا اس کا مصنف ابو بکر محمد بن حسن بن دزید لغوی تھا، جس نے ۳۲۱ھ مین وفات پائی، یہ حروف تہجی پر مرتب ہے، اس کا انداز یہ ہے کہ ایک مادہ کو لکھ کر اس کے شواہد نقل کرتا ہے، اور پھر ان شواہد مین اگر کوئی دوسرا مشکل لفظ آجاتا ہے تو اس کے لئے بھی شاہد پیش کرتا، لیکن یہ سلسلہ زیادہ آگے نہین بڑھتا، مادہ کے معکوسات بھی لکھتا ہے، الفاظ کے ابتدائی حروف کی ترتیب کے علاوہ باقی ترتیب کتاب العین کی طرح ہے، یعنی ثنائی، ثلاثی، رباعی، خماسی، وغیرہ مادے بالترتیب درج ہین، چونکہ یہ بالکل جدید انداز تھا مسعودی نے مروج الذہب (ص ۳۰۴ ذکر قاہر باللہ) مین لکھا ہے کہ "اس نے لغت مین ایسی چیزین ایجاد کی ہین جو متقدمین کے ہان نہ تھین" یہ صرف حق دوستی نہین ہے، بلکہ واقعہ ہے،

جمہرہ معتبر کتاب ہے، اس کے قلمی نسخے لندن، پیرس، آستانہ مصر وغیرہ مین محفوظ ہین اور اب ہندوستان مین چھپ بھی گئی ہے،

(۳) البارع :

یہ تیسرا معجم ہے جو تیسرے دور مین لکھا گیا، اور یہیں سے معاجم کی بنیاد پڑی، مصنف کا نام ابو علی اسماعیل بن قاسم بغدادی ہے، جو قالی کے نام سے مشہور تھا، یہ ابن درید کا شاگرد تھا،

سنہ ۳۵۶ھ میں وفات پائی، البارع بہت بڑی کتاب ہے، حروف تہجی پر مرتب ہے، یاقوت نے لکھا ہے کہ اس میں تین ہزار ورق ہیں[1]، ابن خلکان میں پانچ ہزار کی تصریح[2] ہے، پہلی روایت کے مطابق ۶ ہزار اور دوسری کے موافق ۱۰ ہزار صفحات ہوئے، اسی بنا پر امہات مطولہ میں اس کا شمار ہے، کرانکو (KRENKOW) کا گمان ہے کہ یہ لغت کی سب سے بڑی کتاب ہے[3]، لیکن جرجی زیدان نے تمدن اسلامی (ص ۳۰۵ ج ۲) میں لکھا ہے کہ یہ ۵۰۰ ورق یعنی ایک ہزار صفحات کی ہے، جو یقیناً مصنف کی مسامحت ہے، البارع کے متعلق معجم میں یاقوت نے بعض اکابر کے اقوال نقل کئے ہیں، ابوبکر زبیدی کہتے ہیں کہ قدماء میں سے کسی نے ایسی تالیف نہیں کی، ابو محمد عزلی کا قول کہ احاطہ و استیعاب کے لحاظ سے اس کے مثل کوئی تصنیف نہیں، اس کے سو جزء ہیں، سیوطی نے مزہر (۵۵ ج ۱) میں تصریح کی ہے کہ یہ صحیح ترین کتاب ہے، افسوس ہے کہ ایسی گرانبہا کتاب کا کوئی کامل نسخہ پبلک کتب خانوں میں نہیں ہے، پیرس لائبریری میں کچھ حصہ محفوظ ہے، البتہ لندن کے ایک ذاتی کتب خانہ میں سنہ ۴۰۳ھ

---

[1] معجم الادباء ص ۳۵۲ ج ۲،

[2] ابن خلکان ۴۷ ج ۱،

[3] تذکرۃ النوادر ص ۱۱۱، یہ حال کی تصنیف ہے،

کا لکھا ہوا ایک نسخہ ہے، جس کو کرانکوے نے دیکھا تھا، قالی کے
کسی شاگرد کا املاء ہے، اور مقام کتابت بلاد اندلس،

(۴) تہذیب اللغۃ :-

ابو منصور محمد بن احمد ازہری (سنہ ۳۷۰ھ) اس کا مصنف تھا،
ابن خلکان (ص ۵۰۲ ج ۱) مین ہے کہ یہ منتخب کتابون مین سے ہے،
دس جلدون سے زیادہ ہوگی، اور دوسری جگہ ابوزکریا تبریزی کے
حال (ص ۲۲۳ ج ۲) مین لکھا ہے کہ اس کو تہذیب کا نسخہ ملا
جو چند ہلکی (لطاف) جلدون مین تھا، ابن مکرم نے اس کو اجمل الکتب
(سب سے اچھی کتاب) کہا ہے[۱]، اور مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے
کہ ۱۶ جلدون مین ہے[۲]، اس کتاب کی ترتیب کتاب العین کی طرح
مخارج حروف پر ہے، عین کی ترتیب کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور
وہان مصنف فہرست یا کاتب کی لغزشین بھی دکھائی گئی ہین، اس
مقام پر کشف الظنون (ص ۳۵۱ ج ۱) کے مصنف کا تسامح بیان
کیا جاتا ہے، اس نے جو حروف گنائے ہین ان مین سے بعض صحیح
نہین ہین، ممکن ہے کہ سہو کتابت ہو، اس کتاب کے قلمی نسخے
آستانہ، حلب اور مصر مین ہین، چند اجزاء بانکی پور اور رامپور

---

[۱] - دیباچہ لسان العرب،

[۲] - تاج العروس، مقدمہ ص ۳،

مین بھی موجود ہین ،

(۵) محیط :-

یہ صاحب ابن عباد کی تصنیف ہے ، جو آل بویہ کا مشہور وزیر تھا، ۳۸۵ھ مین وفات پائی ، صاحب کے حالات مین اگرچہ یاقوت نے ۶۹ صفحات (معجم ۳ ۲۷۳ - ۳۴۲) صرف کر دئیے ہین ، لیکن اس کتاب کے متعلق صرف ایک فقرہ ہے ، اور وہ یہ کہ دس جلدون مین ہے[1]، ابن خلکان (۷۵ ج ۱) مین ۷ جلدون کی تصریح ہے ، اور لکھا ہے کہ حروف تہجی پر مرتب ہے ، اسی مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس مین الفاظ زیادہ اور شواہد کم ہین ، اس لئے لغت کا کافی حصہ اس کے اندر آگیا ہے ،

(۶) صحاح :-

اس کتاب کا پورا نام " تاج اللغۃ وصحاح العربیہ " ہے ، ابونصر اسماعیل بن حماد جوہری (۳۹۸ھ) اس کا مؤلف تھا ، چونکہ علماء لغت مین جوہری کی شخصیت نہایت ممتاز ہے اور اس کے حالات بہت کم ملتے ہین ، ہم نے چند مستند ماخذون سے اس کے متعلق مواد فراہم کیا ہے جو بلحاظ ترتیب تاریخی حسب ذیل ہے :-

(۱) صحاح جوہری ۳۹۸ھ (۲) یتیمۃ الدہر ج ۴ ثعالبی ۴۲۹ھ

---

[1] معجم الادباء ۳۱۵ ج ۱ ،

(۳) دُمیۃ القصر باخرزی (۴۶۷ھ)، (۴) معجم الادبار یاقوت ۶۲۶ھ
(۵) لسان العرب ابن مکرم (۷۱۱ھ) (۶) مقدمہ ابن خلدون
(۸۰۸ھ) (۷) و (۸) طبقات النحاۃ و مزہر سیوطی (۹۱۱ھ)
(۹) کشف الظنون چلپی (۱۰۶۷ھ) (۱۰) تاج العروس زبیدی
(۱۲۰۵ھ)، اگر ماخذون کی ترتیب سے حالات لکھے جائین تو
مواد منتشر ہوجائیگا، اس لئے اس سے اعراض کیا جاتا ہے،
جوہری کے حالات کا سب سے پہلا ماخذ اس کی صحاح کا دیباچہ
ہے، یہ اگرچہ چند سطرون مین ہے لیکن اس سے کئی اہم باتین
معلوم ہوتی ہین، مثلاً اس نے عراق مین لغت کی تعلیم پائی، (بعد
تحصیلھا بالعراق روایتا) اور دیہاتون مین جاکر عرب عاربہ
سے اس کو حاصل کیا، (مشافھتی بھا العرب العاربۃ
فی دیارھم بالبادیۃ) یہ دیار عرب کون تھے؟ اس کا جواب یاقوت
نے معجم الادبار (ص ۲۶۷ ج ۲) مین یہ دیا ہے کہ وہ بلاد ربیعہ اور
مضر مین رہا تھا، دُمیۃ القصر وعصرۃ اھل العصر (ص ۳۰)
مین جو جوہری کے حالات کا تیسرا ماخذ ہے، ائمہ ادب کے سلسلہ مین
اس کا ذکر آیا ہے، چند اشعار نقل کئے ہین، اور صحاح کا نام بھی لیا ہے
دمیہ کے مصنف علی بن حسن باخرزی (۴۶۷ھ) کی کنیت ابو الحسن
تھی، یاقوت نے ابو الحسین لکھ کر غلطی کی ہے،
جوہری کے سنہ وفات مین بڑا اختلاف ہے، یاقوت نے معجم

(۲۶۹ ج ۲) مین لکھا ہے کہ مین نے تاریخِ ولادت و وفات ہر چند تلاش کی لیکن پتہ نہ چلا، سیوطی نے ابن فضل اللہ کی مسالک سے ۳۹۳ سن وفات لکھا ہے[1]، جو کشف الظنون (۴۷ ج ۲) مین بھی ہے، سیوطی نے دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ سنہ ۴۰۰ھ کے حدود مین وفات پائی تھی، لیکن جبکہ یاقوت نے دمشق مین ملک معظم ایوبی کے پاس صحاح کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا تھا، جس کا سال کتابت سنہ ۳۹۶ھ تھا[2]، تو مسالک کی روایت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟ غالباً انہی وجوہ سے بعضون نے سنہ ۳۹۸ھ کو سال وفات مانا ہے، اور انسائیکلوپیڈیا مین بھی یہی ہے، وفات کا واقعہ وہی پرواز کی کوشش ہے، لیکن معجم اور چلپی مین ذرا سا اختلاف ہے معجم مین دو کِنواڑ اور چلپی مین دو دفتیان باندھ کر اڑنا درج ہے

جوہری درحقیقت لغت کا جوہری تھا، صحاح سے پیشتر جو کتابین تصنیف ہوئی تھین ان مین صحیح اور غلط سب قسم کے لغات تھے، جوہری پہلا شخص ہے جس نے اپنی تصنیف مین صرف صحیح لغات لکھے، دیباچہ مین خود کہتا ہے (ما صحّ عندی من ھذہ اللغة) اور اسی بنا پر کتاب کا نام صحاح رکھا[3]، اس مین ۴۰ ہزار مادّے ہین[4]، اس کی ترتیب عمدہ ہے

---

[1] طبقات النحاة ۱۹۵،

[2] معجم الادبا ص ۲۷۰ ج ۲،

[3] مزہر ۶۰ ج ۱،

[4] تاج العروس ۲۳ مقدمہ ج ۱،

لیکن کتاب مختصر ہے[1]، مصنّف کے قول کے مطابق حروف معجم کی تعداد اور ترتیب کے موافق مرتب ہے، (علیٰ عدد حروف المعجم وترتیبها) لیکن اس ترتیب مین ایک جدت ہے' (علیٰ ترتیب لم اسبق علیه) جس کو مصنّف نے مجمل رکھا ہے، یہ ترتیب اواخر حروف کے مطابق ہے، اور جوہری کی خاص ایجاد ہے، اس سے شعراء کو قوافی تلاش کرنے مین سہولت ہوتی ہے، لسان العرب، خلاصۃ المحکم، قاموس، سب اسی انداز پر مرتب ہین، جو اس ترتیب کی مقبولیت کا ثبوت ہے، ہم نے اوپر اس کا نام "ترتیب جوہری" رکھا ہے،

جوہری نے لفظی اعراب کا طریقہ بھی ایجاد کیا، یعنی وہ لفظ لکھنے کے بعد لکھتے ہین بالکسر، بالفتح، وغیرہ جس سے الفاظ کا صحیح تلفظ معلوم ہوتا ہے، گو تلفظ کی صحت کے لئے آگے چل کر اس سے بہتر کوششین ہوئیں تاہم ابتدا جوہری ہی سے ہوئی وَالفضل للمتقدم! کہین کہین صحاح مین جہان مصنّف سے لفظی اعراب رہ گیا تھا، اس کو تبریزی اور ابن بری نے حواشی مین لکھا، چنانچہ صحاح کا ایسا نسخہ امیر ازبک کے کتب خانہ مین تھا، جو ۸ جلدون مین یاقوت رومی (امین الدین موصلی ؟) کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور خوش قسمتی سے مرتضیٰ زبیدی کے ہاتھ آیا[2]

---

[1] - لسان العرب دیباچہ ص ۳ ج ۱،

[2] - تاج العروس ص ۲ ج ۱"

صحاح کے نسخے خاص مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کئی تھے،
(۱) نسخۂ دمشق، یہ ملک معظم بن عادل بن ایوب والی دمشق کے پاس تھا
سنہ ۳۹۶ھ کا لکھا ہوا تھا، (معجم ۲۷۰ ج ۲)،
(۲) نسخۂ نیشاپور و جرجان، یہ ابو محمد اسماعیل بن محمد بن عبدوس کے
پاس تھا، ثعالبی نے یتیمۃ الدہر مین لکھا ہے کہ ۱۰۰ نیشاپوری دینار کے
عوض فروخت ہوا، اور جرجان پہنچایا گیا، (معجم ۲۷۱ ج ۲)،
(۳) ایک نسخہ جو مصنف کے ہاتھ کا نہ تھا، باب الضاد تک لکھا ہوا تھا،
چونکہ یہین تک مصنف کے سامنے مبیضہ ہو کر پڑھا گیا تھا، مصنف نے
اس پر اپنے دستخط کئے تھے، یہ نسخہ "سماع" کہلاتا تھا، (معجم ۲۷۱ ج ۲)
اسی سلسلہ مین بعض اور نسخون کا ذکر بھی مناسب ہے،
(۴) نسخۂ حسن بن یعقوب نیشاپوری، اس پر حواشی بھی تھے،
(۵) نسخۂ حسین بن مسعود، یہ ایک جلد مین تھا، نسخۂ حسن سے منقول
تھا، اور ان کا اجازت نامہ خاص ان کے ہاتھ کا کتاب کی پشت پر لکھا
ہوا تھا، اس کا سال کتابت سنہ ۴۷۱ھ سمجھنا چاہئے، کیونکہ اجازت نامہ
کی یہی تاریخ ہے، (معجم ۲۷۲، ج ۲)،
(۶) نسخۂ یاقوت رومی (؟) یہ ۸ جلدون مین تھا، اس پر ابن بری وغیرہ
کے حواشی تھے، امیر ازبک کے کتبخانہ مین تھا، سنہ کتابت سنہ ۶۱۸ھ
سے پہلے ہو گا، کیونکہ امین الدین یاقوت موصلی کاتب کی وفات اسی سنہ
مین ہوئی ہے، یہ یاقوت حموی نہین ہے، جیسا کہ نام سے دھوکا ہوتا

ہے[1]، امین الدین نے صحاح کے بہت سے نسخے لکھے تھے، ہر نسخہ ایک جلد مین تھا، اور ۱۰۰ دینار کو فروخت ہوتا تھا، یاقوت کے ساتھ "رونی" کا لفظ یا تو کاتب کی غلطی ہے، اور یا زبیدی کو خود مغالطہ ہُوا ہے،

صحاح کے متعلق علمار لغت نے جو رائین دی ہین ان مین ابوزکریا تبریزی، ثعالبی، اور یاقوت، خاص طور پر ممتاز ہین، تبریزی کہتے ہین کہ اس کتاب کی ترتیب اچھی ہے، الفاظ آسانی سے نکل آتے ہین، بہت سی عمدہ باتین اور مشکل لغات کی تفسیر مل جاتی ہین، (مزہر ۶۰ ج ۱)[2] ثعلبی (۴۲۹ھ) کی کتاب یتیمۃ الدہر جو جوہری کے حالات کا دوسرا ماخذ ہے، اس کے چوتھے حصہ مین جوہری کا تذکرہ ہے، اس نے حسب روایت سیوطی[2] یہ لکھا ہے کہ جوہری نادرۂ روزگار اور لغت کا امام تھا، اسی نے کتاب الصحاح لکھی ہے، چلپی کے مطابق ثعالبی نے صحاح کی نسبت یہ جملے لکھے ہین، "یہ صحاح ادب پر جو کچھ اس سے پہلے لکھا گیا سب کی سردار ہے، یہ بڑی جامع کتاب ہے[3]"، (ہمارے پیش نظر یتیمۃ کا چوتھا حصہ نہین ہے) یاقوت کہتے ہین "یہ کتاب جو آج لوگون کے ہاتھون مین ہے اور جس کو وہ مستند سمجھتے ہین،

---

[1] - ابن خلکان ۲۰۷ ج ۲، [2] - مزہر ۶۰ ج ۱،

[3] - کشف الظنون ۷۵ ج ۲،

جوہری کی بہترین تصنیف ہے، اس کی ترتیب سے مصنف کی سلیم المذاقی اور قابلیت ظاہر ہوتی ہے، یہ جمہرۃ، تہذیب اللغۃ اور مجمل سے بہتر ہے[1]۔

(۷) مجمل :- ابو الحسین احمد بن فارس قزوینی نے اس کو مرتب کیا تھا، یہ جوہری کا معاصر تھا (مزہر ۶۱ ج ۱)، اس کے سنہ وفات مین اختلاف ہے، معجم الادباء (ص ۶ ج ۲) مین ۳۶۰ھ اور ۳۶۹ھ کی دو روائتین لکھی ہین لیکن ان کو غیر معتبر کہا ہے، ابن خلکان (۳۵ ج ۱) مین ۳۹۰ھ ہے، لیکن کتاب الفصیح پر خود مصنف (ابن فارس) کی تحریر ۳۹۱ھ کی ہے، (معجم ۶ ج ۲) جس کو یاقوت نے دیکھا تھا مجمل کے ایک قدیم نسخہ کے آخر مین جو ۴۴۶ھ کا لکھا ہوا تھا ابن فارس کی تاریخ وفات ۳۹۵ھ درج تھی، (معجم ۱۲ ج ۲)، شاید اسی بنا پر ذہبی نے ۳۹۵ھ سال وفات قرار دیا ہے، چلپی (۲۸۷ ج ۲) نے ۳۹۸ھ کی تصریح کی ہے، لیکن سیوطی نے نحاۃ (۱۵۳) مین ذہبی کے قول کو راجح قرار دیا ہے، مجمل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مختصر کتاب ہے، لیکن بقول ابن خلکان (۳۵ ج ۱) اس مین بہت کچھ ہے، خود مصنف نے دیباچہ مین لکھا ہے کہ کتاب مین صرف مستعمل اور صحیح الفاظ لئے گئے ہین، نامانوس اور غیر مستعمل لفظون کو چھوڑ دیا گیا

---

[1] - معجم الادباء ۲۶۸ ج ۲،

ہے ، (مزہر ۱۶ ج ۱) یاقوت کی ایک عبارت سے جو جوہری (۲۶۸
ج ۲) کے حال مین ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ مجمل کی ترتیب ایسی ہے کہ
الفاظ آسانی سے نہین نکل سکتے ، چنانچہ اسی بنار پر صحاح کو اس پر
ترجیح دی ہے ، اس کتاب کی ترتیب وہی ہے جو مُغرب کی ہے ،
(چلپی ۳۸۷ ج ۲) ، اس کے نسخے برلن ، گوتھا ، لیڈن ، پیرس ،
برٹش میوزیم ، آکسفورڈ وغیرہ مین ہین ،

(۸) جامع :- ابوعبداللہ محمد بن جعفر قزاز قیروانی (سـ۴۱۲ـنہ) نے
اس کو تصنیف کیا تھا ، یہ امہات مطولہ مین تھی ، ابن خلکان (۱۴۱ ج ۱)
کے الفاظ یہ ہیں ، "بڑی اور منتخب اور مشہور کتابوں میں سے " چلپی (۳۸۷ ج ۱)
سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم دستیاب ہوتی ہے ، موجودہ کتبخانون کی
فہرستون مین اس کا پتہ نہین ہے ،

(۹) موعب :- یہ تمام بن غالب کی تصنیف تھی ، اس کا سال وفات معجم اور ابن خلکان
میں سـ۴۳۶ـنہ لکھا ہے ، لیکن سیوطی نے نحاۃ (۲۰۹) میں سـ۴۳۳ـنہ درج کیا ہے ، مصنف
حمیدی ، ضبی اور ابن خلکان کے نزدیک تیانی کے نام سے مشہور تھا ، معجم اور نحاۃ
مین ابن التیان ہے ، لیکن وجہ نہیں لکھی ہے ، موعب امہات مطولہ میں تھی ، سیوطی
کے بیان کے مطابق (مزہر ۵۵ ج ۱) حروف پر مرتب لغت کی کتابوں میں صحیح
ترین تھی ، جرجی زیدان نے بلا حوالہ لکھا ہے کہ کتاب العین اور جمہرہ سے صحیح
لغات جمع کئے تھے ، اور شواہد کا اختصار نہین کیا تھا ، یہ کتاب ضائع
ہوگئی ہے ، اکتفاء القنوع کے مصنف نے صرف اس کے نام سے

واقفیت ظاہر کی ہے، شاید یہ کتاب عرصہ سے ناپید ہے، یاقوت (سنہ ۶۲۶ھ)، ابن خلکان (سنہ ۶۸۱ھ)، اور سیوطی (سنہ ۹۱۱ھ) سب نے مصنف کے حالات مین اس کا نام نہین لیا ہے، یہ لوگ اس کی ایک کتاب تلقیح العین کا نام لیتے ہین، یاقوت نے حمیدی اور صلۂ ابن بشکوال کے حوالہ سے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن حمیدی نے جیسا کہ پروفیسر مارگولیث (D. S. Margoliouth) نے حاشیہ مین تصریح کی ہے، تلقیح کا نام نہین لیا ہے، اس سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید حمیدی نے موعب کی طرف اشارہ کیا ہو، لیکن یہ شبہ اس لئے صحیح نہین ہے کہ موعب مختصر کتاب نہ تھی، اور یہان مختصر کتاب کا تذکرہ ہے، دوسرے یہ کہ سیوطی اور چلپی نے بھی اس عبارت مین تلقیح ہی کو مراد لیا ہے، ابن خلکان مین البتہ بلا حوالہ ایک جگہ ایک "کتاب مشہور" کا اور دوسری جگہ ایک "کتاب جامع" کا تذکرہ آیا ہے، اور اس دوسری کتاب کا نام تلقیح بتایا ہے، لیکن کتاب مشہور کی صفت وہی اختصار بیان کی ہے، اور الفاظ بالکل یاقوت کی معجم سے ملتے جلتے ہین، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ شاید کتاب مشہور کا نام (تلقیح) معجم کی عبارت نقل کرتے وقت ابن خلکان سے چھوٹ گیا، لیکن اس پر زیادہ زور اس لئے نہین دیا جاسکتا کہ خود معجم کے مصنف نے جس حوالہ (حمیدی) سے یہ نام لکھا ہے، وہان یہ نام درج نہین ہے،

(۱۰) محکم :- اس کا مصنف ابوالحسن علی بن اسماعیل بن سیدہ

(۴۵۸ھ) ایک نابینا عالم لغت تھا، اس کے باپ کا نام اسمٰعیل تھا، ابن بشکوال نے یہی لکھا ہے، (معجم ۸۴ ج ۵) اور ابن سیدہ کی دوسری مطبوعہ تصنیف مخصّص مین بھی بقول پروفیسر مارگولیث یہی نام آیا ہے، لیکن یاقوت نے حمیدی کی کتاب کو شہرت کی بنا پر معتبر سمجھ کر ابن سیدہ کے باپ کا نام احمد لکھا ہے، اور سیوطی نے نحاۃ (۳۲۷) مین اسی کو اختیار کیا ہے، قاضی صاعد کی کتاب کے ایک نسخہ مین اسمٰعیل اور دوسرے مین احمد ہے، (معجم ۸۴ ج ۵) لسان العرب (مقدمہ ص ۳ ج ۱) مین وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے،

کتاب کا پورا نام "المحکم والمحیط الاعظم" ہے، (مزہر ۶۲ ج ۱) جو صحاح جوہری کے بعد کی کتب لغت مین سب سے بڑی کتاب ہے، یاقوت کے بیان کے مطابق ۱۲ جلدون مین (۸۵ ج ۵) اور زبیدی کے قول کے موافق (تاج العروس ۳ ج ۱، مقدمہ) ۸ جلدون مین تھی، ابن خلکان (۳۴۲ ج ۱) نے جلدون کی تعداد نہین لکھی ہے صرف "بڑی کتاب" کہا ہے، اور بتایا ہے کہ اس مین مختلف اقسام کے لغت ہین، کتاب کی ترتیب کے متعلق یاقوت نے ایک مغالطہ آمیز جملہ لکھا ہے کہ وہ حروف معجم پر مرتب ہے، (۸۵ ج ۵) مگر اس کا مطلب نہین بتایا ہے، ابن خلدون (۶۲۸ مقدمہ) نے اتنا کہا ہے، کہ کتاب العین کے طرز پر ہے، لسان العرب (۸ ج ۱، دیباچہ) مین نیلوہ دقیقہ سنجی سے بحث کی ہے، اور اس کو ترتیب خلیلی کے

مطابق کہنے کے باوجود اخیر مین کچھ اختلاف دکھایا ہے ۔ اس مین حرف م کے بعد الف ، ی اور و ہین ، جو ترتیب تعلیلی کے خلاف ہین ، اس کی ترتیب پر دو شاعرون نے مثالین دے کر اشعار لکھے ہین ، جن مین ابن مکرم کو ابن قرناص کے اشعار پسند آئے ہین ، (لسان العرب ۸ ج ۱) انھون نے شاعر کا نام نہین لیا ہے ، لیکن کشف الظنون (۳۹۴ ج ۲) مین نام آیا ہے ، ابن خلدون اور ابن مکرم دونون نے کتاب کو اصول و امہات لغت مین شمار کیا ہے ۔

گذشتہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب کتاب العین کی اور جامعیت صحاح جوہری کی تھی ، یہ ابن خلدون کی تصریح ہے اور بالکل صحیح ہے ، انہی خصوصیات کی بنا پر ابن مکرم نے اس کو لغت کی تمام کتابون مین سب سے زیادہ کامل تسلیم کیا ہے ، (لسان ۳ مقدمہ) اور اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ جمع کے نام ، جمع مرکب ، قلب ، بدل کا فرق ، شاذ نسبتین ، تصغیر ، مصادر ، افعال ، امالہ ، ابنیہ ، تصاریف ، ادغام ، سب پر مصنف کی نظر رہتی ہے ، (کشف الظنون ۳۹۴ ، ج ۲) یعنی بالفاظ ابن خلدون اس نے اشتقاقات و تصاریف کا اضافہ کیا ہے ، (مقدمہ ۶۲۸) مصنف نے ان چیزون کو اس قدر سامنے رکھا ہے کہ خود لکھتا ہے کہ جو شخص اعراب ، عروض اور قوافی کا ماہر نہ ہو کتاب سے مستفید نہین ہو سکتا ، (کشف الظنون ۳۹۴ ج ۲) اس کتاب کے متعدد نسخے ہین ، ایک نسخہ برٹش میوزیم مین بھی

ہے، بعض نسخے ۱۰ جلدون تک پائے جاتے ہین،

(۱۱) اساس البلاغۃ:- اس کے مصنف کا نام ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری، اور لقب جار اللہ ہے، ۵۳۸ھ مین وفات پائی، اس کی کتاب کا طبقات النحاۃ مین نام نہین ہے، یہ عربی زبان میں بے مثل کتاب ہے، مصنف کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لفظ کی اصل وضع اور اس کے استعمال کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے، عرب بسا اوقات کسی لفظ کو وضع کرتے وقت عام رکھتے ہین، لیکن ایک چیز کے مختلف خصوصیات کی بنا پر علیحدہ علیحدہ الفاظ استعمال کرتے ہین، جو چیز سفید ہو اس کو ابیض کہتے ہین، جو عام ہے، لیکن سفید گھوڑے کو اشہب، سفید آدمی کو ازہر، سفید بکری کو املح کہتے ہین، اب اگر ان الفاظ کے بجائے ابیض بولا جائے تو عربیت کے لحاظ سے غلط ہوگا، لیکن یہ چیز وضع اور استعمال کا فرق جانے ہوئے بغیر معلوم نہین ہوسکتی، اور بڑے بڑے عالمون سے ایسے مواقع پر غلطی ہوسکتی ہے، اسی بنا پر زمخشری اس کتاب مین لفظ کی تشریح نہین کرتا، بلکہ ادیبون کے فصیح و بلیغ جملے جن مین وہ لفظ ہوتا ہے، نقل کر دیتا ہے، اس سے یہ فائدہ ہے کہ قرینہ سے معنے سمجھ مین آجاتے ہین، اور لفظ کا طریقۂ استعمال بھی معلوم ہو جاتا ہے، اس طرح یہ کتاب شواہد و استعارات کا قاموس بن گئی ہے حروف تہجی پر باعتبار اوائل حروف مرتب ہے، ابن خلدون (۶۲۹ مقدمہ) نے اس کی مدح مین لکھا ہے کہ افادی حیثیت سے بلند رتبہ کتاب

ہے، چلپی (۸۹ ج ۱) نے اس کو علم ادب کا ستون بلکہ بنیاد قرار دیا ہے اور انسائیکلوپیڈیا (۱۹۷ ج ۸ طبع ۱۱) مین اس کو "منتخب الفاظ اور جملون کا بیش بہا خزانہ" کہا گیا ہے،

(۱۲) معرّب :- یہ ابومنصور موہوب جوالیقی کی تصنیف ہے، یاقوت اور ابن خلکان دونون نے اس کی ولادت کا سال ۴۶۶ھ اور وفات کا سنہ ۵۳۹ھ لکھا ہے، لیکن سیوطی نے غلطی سے طبقات النحاۃ (۴۰۱) مین اور ان کی پیروی مین چلپی نے کشف الظنون (۶۶۸ ج ۲) مین ۴۶۵ھ کو سالِ وفات کہا ہے، جو جوالیقی کے سالِ ولادت سے ایک برس قبل کا سنہ ہے، ممکن ہے کہ خود سیوطی سے نقل کرنے مین غلطی ہوگئی ہو، یا سیوطی کے کاتبون اور ناقلون کی فروگذاشت ہو،

اس کتاب کا نام "المُعَرَّب من الکلام الاعجمی" ہے، (معجم الادباء ۱۹۹ ج ۷) اس کو "معربات" بھی کہتے ہین، (چلپی ۴۶۶ ج ۲)، اس کی نسبت ابن خلکان (۱۴۲ ج ۲) کی یہ رائے ہے کہ اپنے موضوع پر سب سے مفصل کتاب ہے، کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی وہ ان اجنبی الفاظ کا مجموعہ ہے جو عربی مین داخل ہوگئے ہین، ترتیب حروفِ معجم پر ہے، سنہ ۱۸۶۷ء مین پروفیسر سخاؤ نے اس کو شائع کیا ہے،

(۱۳) نزہۃ الانفس :- اس کا پورا نام "نزھۃ الانفس وروضۃ المجلس" حسبِ قول چلپی (۵۹۳ ج ۲)، اور "فی روضۃ المجلس" بقول جرجی زیدان

ہے، محمد بن علی عراقی اس کا مصنف تھا، کشف الظنون مین اس کے سال وفات کی نسبت سکوت ہے، جرجی زیدان نے (شاید گوتھا لائبریری کی فہرست سے) ۵۶۱ھ نقل کیا ہے، مصنف کے حالات معجم الادباء، ابن خلکان اور نحاۃ وغیرہ مین نہین ملے، کتاب کا موضوع بڑا اہم ہے، چلپی کے بیان کے مطابق (۱) عرب کا کلام جس کو عوام بغیر سمجھے استعمال کرتے ہین (۲) ضرب المثل کہان استعمال کرنی چاہیئے؟ (۳) عوام نے اس کو کیون غلط استعمال کیا؟ (۴) اور مثل کس قصہ مین کہی گئی؟، یہ اس کے مضامین ہین، مثل کے مباحث کی وجہ سے زبیدی نے اس کو امثال کی کتاب کہا ہے (تاج العروس ۴، مقدمہ) گوتھا لائبریری مین اس کا ایک نسخہ ہے،

(۱۴) امالی :- ابو محمد عبداللہ بن بری مصری ان کے مصنف تھے ابن بری کا سال وفات ابن خلکان اور سیوطی مین ۵۸۲ھ ہے، جس کو چلپی (۵۷، ج ۲) یا اس کے کاتبون نے غلطی سے ۵۷۲ھ لکھ دیا ہے، امالی اور مجالسات وہ خطبے (لکچر) ہین جو کسی موضوع پر اساتذۂ فن مختلف نشستون اور صحبتون مین دیا کرتے تھے، یہ خطبے ابن بری نے صحاح جوہری پر دئے تھے، اور ۳۰ جلدون مین تھے، یاقوت نے ابن قطاع (۵۱۴ھ کے حال مین (معجم ۱۰۷ ج ۵)

لے۔ تاج العروس ج ۱، مقدمہ، ص ۱۳،

ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کو صحاح پر ابن قطاع کے نفیس حاشیون سے ماخوذ بتایا ہے، ابن خلکان (۲۶۹ ج ۱) نے لکھا ہے کہ یہ نادر حاشیے ہین متعدد مقامات مین صحاح پر اعتراض اور اضافہ کیا ہے، لسان العرب (۳ ج ۱، مقدمہ) مین معترفانہ انداز سے ان کا تذکرہ آیا ہے، اور لکھا ہے کہ ابن بری نے صحاح کی غلطیان پکڑی ہین، اور ان پر اپنے امالی لکھائے، سیوطی کی نحاۃ (۲۷۹) مین صفدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مصنف نے امالی کو پورا نہیں کیا تھا، وقش (اصلی لفظ وبش وب ش) تک پہنچا تھا، کہ موت آگئی) عبد اللہ بن محمد بسطی نے ان کو پورا کیا، حرف ش تک ابن بری کا املا پوری کتاب کا چوتھائی حصہ تھا، لیکن تاج العروس کا مصنف زبیدی جس نے اکثر مقامات مین ان امالی سے فائدہ اٹھایا ہے (تاج العروس ص ۱۳ مقدمہ ج ۱) صفدی کے خلاف لکھتا ہے، اس نے امالی کا ایک قدیم نسخہ دیکھا تھا، جس کی نسبت مشہور تھا کہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے پہلے حصہ کے شروع مین سیوطی نے مصنف کی ولادت اور وفات لکھی تھی، اگر پورا نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا تو صفدی کا بیان غلط ہو جاتا ہے، ان امالی کا چلپی مین ذکر نہین ملا، دو جگہ دو نام ملتے ہین، ایضاح (۵۷ ج ۲) اور التنبیہ والافصاح (۳۳۶ ج ۱) دوسری کتاب کو چلپی نے ابن بری کی سب سے بہتر تالیف قرار دیا ہے، ممکن ہے کہ وہ یہی امالی ہون،

(۱۵) عباب :- یہ رضی الدین حسن بن محمد صغانی (سنہ ۶۵۰ھ) کی تصنیف ہے، ساکنان لاہور! آپ جانتے ہین کہ یہ کون بزرگ ہین؟ یہ آج سے پونے آٹھ سو برس پہلے آپ ہی کے شہر لاہور مین ۵۷۷ھ مین پیدا ہوئے تھے، غزنہ مین پرورش پائی، سنہ ۶۱۰ھ مین عدن گئے، سنہ ۶۱۳ھ مین مکہ معظمہ آئے، جہان یاقوت حموی مصنف معجم سے ملاقات ہوئی، جو پھر نہ ہوسکی[۱]، اسی لئے سنہ ۶۱۳ھ کے بعد کے حالات معجم مین نہین ہین، اور نہ اس کتاب کا تذکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۶۱۳ھ تک نہین لکھی گئی تھی، عدن اور بغداد کی اقامت کے سبب سے بہت سے مورخین ان کو "ہندوستانی" نہین سمجھتے، خود یاقوت نے جو ان کا معاصر تھا، ان کو صغانی لکھا ہے اور صغانیان (چغانیان) کو ماوراءالنہر کا شہر بتایا ہے، لیکن جواہر مضیئہ کے مصنف ابن ابی الوفاء (سنہ ۷۷۵ھ) نے یہ عقدہ کھولا ہے، اس نے ان کو "لاہوری" کہا ہے، لاہور کو جاے پیدائش بتایا ہے، ہندوستان کے شیوخ سے حدیث سننے کا تذکرہ کیا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ لاہور، ہندوستان کا ایک بڑا شہر ہے، (۲۰۱، ۲۰۲ ج ۱) لاہور کی پیدائش اور غزنہ کی تربیت کا ذکر سیوطی نے بھی کیا ہے، اور امام ذہبی (سنہ ۷۴۶ھ) کا حوالہ دیا ہے، جو جواہر مضیئہ کے مصنف سے پیشتر گذرے ہین[۲]، اب رہی

---

[۱] معجم الادباء ۲۱۱ قسم ۱ ج ۳، [۲] طبقات النحاۃ ۲۲۷،

صغانی کی نسبت، تو جواہر مضیئہ مین یہ فقرہ ہے :۔ الصغانی المحتد محتد اصل کو کہتے ہین، اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا خاندان صغانیان کا تھا، جو ہندوستان چلا آیا تھا، اس طرح وہ صغانی بھی تھے اور ہندوستانی بھی،

عباب کا پورا نام "العباب الزاخر واللباب الفاخر" ہے، ۲۰ جلدون مین ہے، لیکن ناتمام ہے، صغانی کے حالات کا پہلا ماخذ معجم الادبار اس سے بالکل ساکت ہے، اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ سنہ ۶۱۳ھ کے بعد لکھی گئی ہے، ماخذ نمبر ۲ اور ۳ یعنی جواہر مضیئہ اور ابن قطلوبغا (سنہ ۸۷۹ھ) کی تاج التراجم (ص ۱۷) مین اس کا ذکر ہے، ماخذ نمبر ۵ یعنی چلپی (۱۰۵ ج ۲) مین مزید تفصیل یہ ہے کہ حرف م مین مادہ بکم (ب ک م) تک پہنچے تھے کہ وفات پا گئے، اس طرح جواہر مضیئہ کے مصنف نے شک کے لہجہ مین جو یہ لکھا تھا کہ ۳ حرف یا زیادہ باقی رہ گئے تھے، اس کی چلپی سے تعیین ہو جاتی ہے چلپی نے یہ بھی بتایا ہے کہ عباب، صحاح جوہری کے انداز پر مرتب ہے، اکتفار القنوع سے معلوم ہوتا ہے کہ چھپی نہین ہے، اور یہ کہ اس مین لغت کی مشہور کتابون اور معتبر تصانیف کا تمام متفرق مواد جمع کر دیا گیا ہے، سنین کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۶۱۳ھ اور سنہ ۶۵۰ھ کے درمیان تصنیف ہوئی ہے،

(۱۶) مجمع البحرین :۔ یہ بھی انہی امام صغانی کی تصنیف ہے، اس کا

ذکر جواہر مضیئہ، تاج التراجم، طبقات النحاۃ، چلپی، سب نے کیا ہے، صرف معجم مین ذکر نہین ہے، یہ بھی سنہ ۶۱۲ھ کے بعد کی تصنیف ثابت ہوتی ہے، یہ کتاب ۱۲ جلدون مین ہے، اور غالباً عباب سے پہلے لکھی گئی ہے، کیونکہ مکمل ہے، اور عباب ناتمام ہے، چلپی (۲۸۲ ج ۲) کے مطابق مصنف نے تاج اللغۃ، صحاح اور اپنی تصنیفات مین سے تکملہ، ذیل اور صلہ کو اس کتاب مین جمع کر دیا ہے، اور یہ بات خود مصنف نے بھی دیباچہ مین لکھی ہے،

(۱۷) لسان العرب:- یہ مفردات کی سب سے ضخیم کتاب ہے، مصنف کا نام جمال الدین محمد بن جلال الدین مکرم انصاری افریقی ہے، جو ابن منظور کے نام سے مشہور ہین، ان کی ولادت اور وفات کی تاریخون مین اختلاف ہے، سیوطی نے نحاۃ (۱۰۶) اور حسن المحاضرۃ (۲۲۹ ج ۱) مین ولادت کا سال سنہ ۶۳۰ھ اور وفات کا سنہ ۷۱۱ھ لکھا ہے، زبیدی نے تاج العروس مین ایک جگہ (۳ ج ۱، مقدمہ) اسی کو اختیار کیا ہے، اور انسائیکلو پیڈیا مین بھی یہی ہے، تاج العروس مین دوسری جگہ (۱۲ ج ۱ مقدمہ) سنہ ۶۹۰ھ ولادت کا اور سنہ ۷۱۱ھ وفات کا سنہ درج کیا گیا ہے، لیکن یہ بلا سند ہے، چلپی (۳۵۴ ج ۲) مین سنہ ۷۱۶ھ سال وفات لکھا ہے،

لسان العرب اواخر کلمات پر صحاح جوہری کی طرح مرتب ہے، اور اس کی خود مصنف نے دیباچہ مین تصریح کی ہے، (ص ۳ ج ۱)

اس مین ۶۰ ہزار مادے ہین[۱]، اور مصنّف کی تصریح کے مطابق آیات، احادیث، آثار، امثال، اشعار سے شواہد لکھے گئے ہین، قدیم کتبِ لغت مین سے تہذیب ازہری، محکم ابن سیدہ، نہایہ ابن اثیر، صحاحِ جوہری، امالی ابن بَرّی کا دیباچہ مین ذکر آیا ہے، اور بعض کی نسبت مدحیہ الفاظ لکھے ہین، تاج العروس (۳، مقدمہ) کے مطابق جمہرۂ ابن درید بھی مصنف کا ایک ماخذ تھا، لسان العرب کی یہ خصوصیت مصنّف نے بیان کی ہے کہ وہ تمام اگلی کتبِ لغت کا مجموعہ ہے، یہ بالکل صحیح ہے، لیکن مصنّف کا اس سلسلہ مین یہ فرمانا کہ قدما نے اپنی تصنیفات مین اگلی کتابون کو جمع نہین کیا تھا، مجھے اس سے اختلاف ہے، اور کئی کتابون کے تذکرون مین یہ دکھایا گیا ہے کہ اپنے قبل کی تصنیفات پر حاوی تھین،

لسان العرب ۲۰ جلدون مین مصر مین چھپی ہے اس کا وہ نسخہ جو مصنّف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، محمد بن ابی شریف نے مدرسۂ اشرفیہ (اشرف برسبای) قاہرہ کے کتب خانہ مین دیکھا تھا، اس پر ابو حیان، شہاب محمود اور چند علماء کے دستخط تھے، جو اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، (چلپی ۵ ۳۵ ج ۲)، زبیدی نے جو نسخہ دیکھا تھا، وہ مصنف کے مسودہ سے اس کی زندگی ہی مین نقل کیا گیا تھا، یہ ۲۸ جلدون مین تھا[۲]، لین (LANE) کا نسخہ بھی ۲۸ جلدون مین ہے[۳]، ممکن ہے

---

[۱] تاج العروس ۲۳ ج ۱، [۲] ایضاً ص ۲، مقدمہ،

[۳] انسائیکلوپیڈیا ۱۹۷ ج ۸ طبع ۱۱،

کہ یہ تاج العروس والا نسخہ یا اس کی نقل ہو ،

(۱۸) تہذیب التہذیب :- ابو الثنا محمود بن ابو بکر تنوخی (سنہ ۷۲۳ھ) نے صحاح ، تہذیب اور محکم کو اصل قرار دے کر لکھی ہے ، الفاظ کا اعراب اور تلفظ خاص طور سے مدنظر ہے ، ریو (RIEU) کی تحریر کے مطابق تہذیب اللغۃ کے انداز پر مرتب ہے[۱] ، لین (LANE) نے اپنی کتاب کے مقدمہ مین اس کتاب کو لسان العرب اور تاج العروس کے بعد عربی لغات مین سب سے بہتر اور جامع قرار دیا ہے[۲] ، پانچ جلدون مین مصنف کا مسودہ ، زبیدی نے دمشق مین دیکھا تھا جس کا تاج العروس (ص ۳ ، ج ۱ ، مقدمہ) مین ذکر کیا ہے ، کشف الظنون (۳۵۰ ج ۱) مین اس کا صرف نام آیا ہے ، اور باب الکاف کا حوالہ دیا ہے ، لیکن کاف اس نام کی کوئی کتاب نہین ہے ،

(۱۹) قاموس :- اس کو ابو طاہر مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے تصنیف کیا ، ان کی تاریخ وفات مین اختلاف ہے ، سیوطی نے بغیۃ (۱۱۸) مین سنہ ۸۱۶ھ لکھا ہے ، جس کو زبیدی نے شک کے ساتھ (تاج العروس ص ۱۴ ، مقدمہ ج ۱) ، اکتفاء القنوع کے مصنف

---

۱ - تتمہ فہرست برٹش میوزیم ۵۸۶ ،

۲ - ایضاً ،

نے ایک کمزور قول کی شکل میں، اور انسائیکلوپیڈیا (۱۹۷ ج ۸) میں قطعی طور پر اختیار کیا ہے، ۸۱۷ھ کی روایت زبیدی میں ہے، جرجی زیدان اور ریو[1] نے اس کو قطعی مانا ہے، اکتفاء القنوع میں ۸۲۰ھ بھی سال وفات لکھا ہے، اور مصنف اسی کو صحیح سمجھتا ہے،

لسان العرب کی طرح قاموس میں بھی ۶۰ ہزار مادے میں[2] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف قدماء کی تصنیفات پر اضافہ نہیں کر سکا ہے یہ او اخر کلمات کے لحاظ سے مرتب ہے۔ اس کا پورا نام بڑا لمبا ہے "القاموس المحیط والقابوس الوسیط الجامع لماذهب من کلام العرب شماطیط" قاموس دراصل اسی مصنف کی ایک دوسری کتاب لامع کا اختصار ہے، لامع کی پانچ جلدیں مکمل ہو سکی تھیں، (تاج العروس ۱۴، ج ۱، مقدمہ) بعد میں وہ ضائع ہو گئی،

قاموس میں مفتاح الالفاظ کا خاص اہتمام ہے، جس کی بعد کے مصنفین نے تقلید کی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حمزہ ابن عبداللہ نکساری کا، اور دوسرا عزالدین بن مخلطہ مالکی کا لکھا ہوا برٹش میوزیم میں ہے، ایک تیسرا نسخہ بھی ہے جو لین کو ملا تھا[3] اس کے کاتب کا

---

[1] تتمہ فہرست برٹش میوزیم ۵۸۸،

[2] تاج العروس ۲۳، مقدمہ، ج ۱،

[3] تتمہ فہرست برٹش میوزیم ۵۸۸، ۵۸۹،

نام معلوم نہین ، یہ کتاب آستانہ ، مصر، تبریز ، کلکتہ ، بمبئی ، لکھنؤ ، مین بارہا چھپی ہے ، اس کے بہت سے شروح و انتقادات ہین جن سے اس کی مقبولیت ظاہر ہوتی ہے ،

مصنف کے متعلق ایک دلچسپ بات سیوطی نے یہ لکھی ہے کہ وہ ہندوستان بھی آیا تھا [۱]،

(۲۰) تاج العروس :- اس کے مصنف کا نام سید محمد بن محمد حسینی واسطی ہے ، جو سید مرتضیٰ زبیدی کے نام سے مشہور تھے ، یو پی مین قصبۂ بلگرام (ضلع ہردوئی) بڑا مردم خیز خطہ ہے ، وہین سید مرتضیٰ کی ولادت ہوئی ، ہندوستان کے متعدد علماء سے تعلیم حاصل کی ، پھر زبید اور مصر چلے گئے ، اس تعلق سے مصر وشام کے علماء نے ان کا حال لکھا ہے ، لیکن ہندوستان کی پیدائش کا ذکر نہین کیا ہے ،

سید مرتضیٰ کا سال وفات مختلف فیہ ہے ، تاج العروس (۷۰ ہ ، ج ۱۰) کے آخر مین ان کے حالات شامل ہین ، ان مین سنہ ۱۲۰۵ھ لکھا ہے ، ریو (تتمہ فہرست ۵۹۲) ، اور جرجی زیدان نے اسی کو اختیار کیا ہے ، لیکن اکتفاء القنوع مین سنہ ۱۲۰۶ھ ہے ، اور انسائیکلوپیڈیا [۲] مین جو عیسوی سنہ (سنہ ۱۷۹۱ء) دیا ہے وہ سنہ ۱۲۰۶ھ کے مطابق

۱؎ - نحاۃ ۱۱۷ ،

۲؎ - انسائیکلوپیڈیا ۱۹۷ ج ۸ ، طبع ۱۱ ،

ہوتا ہے،

تاج العروس کہنے کو تو قاموس کی شرح ہے، لیکن دراصل مستقل کتاب ہے، اور مصنف نے بہت سے معلومات کتب لغت کا مطالعہ کرکے بڑھائے ہین، ان کتابون کی فہرست مقدمہ مین دی ہے، اس کتاب کی ترتیب قاموس کی طرح اواخرِ الفاظ پر ہے، مصنف نے حسبِ بیانِ جرجی زیدان ۱۴ جلدون مین لکھی تھی، لین کا نسخہ ۲۴ جلدون مین ہے[1] اور مطبوعہ نسخہ ۱۰ ضخیم جلدون مین، لین نے لسان العرب کی طرح اس کو بھی اپنی لغت کا ماخذ قرار دیا ہے،

معززین! ان ۲۰ مشہور، مستند اور ضخیم کتابون کے علاوہ صدہا مختصر کتابین بھی ہین، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ ان کے نام سنتے سنتے اکتا جائین گے، اس لئے ان کو قلم انداز کرتا ہون،

(۲) معاجم معنویہ

(Subject-books)

معززین! شاید آپ تنقید و تبصرہ کے "ادبی سب و شتم" سے گھبرا گئے ہون، اس لئے آئیے! اب لغت کے "جمالیاتی"

---

[1] انسائیکلوپیڈیا ۱۹۷ ج ۸، طبع ۱۱،

پہلو کا مشاہدہ کیا جائے، یہ وہ موقع ہے، جہاں میرا قلم انگلیوں کے درمیان ہنستا اور دوڑتا ہوا چلتا ہے، لیکن میرے لئے یہ بہت زیادہ فخر و مباہات کا موقع نہیں ہے، زمانہ نے (Economy of Nature.) کی ترکیبِ اضافی سے خود فطرت کے "غیر مرئی" پیرون مین "اقتصادیات" کی زنجیرین ڈال دی ہین، تو پھر بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ مین "محسوس و مجسم" انسان ہوکر ان قیود سے آزاد رہ سکون، اس مضمون مین میرا "اقتصادی رجحان" درحقیقت آپ صاحبوں کے دلوں کی گہرائیون کا ترجمان ہے؛ مضمون مختصر ہو، تاکہ آپ کے نازک" آلات سماعت "لغت کے الفاظ کا ناقابلِ برداشت "بار" زیادہ دیر تک نہ اٹھائین، جو چیز پیش کی جائے، "اپنی ملکیت" ہو، تاکہ میرا "دوش ناتوان" "واپسی عاریت" کی گران ذمہ داریون سے دب نہ جائے؛ پس اب میری پوزیشن بالکل صاف ہے، مین یورپ کا وہ کارخانہ دار (ہندوستانی فارسی!) ہوں، جو ایشیا کی خام پیداوار اپنے ملک کو لے جاتا ہے، اور پھر اس کو پختہ کر کے، شکل بدل کر، اور نیا آب و رنگ چڑھا کر پھر ایشیا میں واپس بھیج دیتا ہے، جو تاریخی جواہر میں آپ کی نگاہوں کے سامنے لا رہا ہوں، ان کا معدن آپ ہی کے اسلافِ کرام کی قلمی یادگار ر... بطون و اوراق ہیں!

معززین! معاجم کی اس دوسری قسم میں جو تنوع اور گوناگونی ہے، اس کو دیکھ کر مجھے حق ہے کہ خواجہ حافظ کی طرح آواز دوں کہ ع

گوہرے دارم و صاحب نظرے می جویم!

آیئے اور کچھ دیر کے لئے اپنی "صاحب نظری" کا ثبوت پیش کیجئے!

ان معاجم کی دو اصولی قسمین ہین ، (۱) عام معاجم ، اور (۲) دوائر معارف ، پہلی قسم پہلے ملاحظہ ہو ، اس سلسلہ مین صرف وہی کتابین پیش کی جاتی ہین جو حروفِ تہجی پر مرتب ہین ، معاجم

(۱) تاریخ (History) و تراجم (Biography) کے دو بڑے حصے ہین (۱) اشخاص ، اور (۲) مقامات ، اشخاص کے ۱۲ اقسام ہین :- ۱ صحابۂ کرام کے معاجم مین ابن عبدالبر (سنہ ۴۶۳ھ) کی استیعاب ، ابن حیان (سنہ ۴۶۹ھ) کی معرفۃ الصحابۂ عزالدین ابن اثیر (سنہ ۶۳۰ھ) کی اسد الغابہ ، ذہبی (سنہ ۷۴۸ھ) کی تجرید ، ابن حجر (سنہ ۸۵۲ھ) کی اصابہ ، یحیٰی عامری (سنہ ۸۹۳ھ) کی الریاض المستطابۃ ، وغیرہ لکھی گئین ،

۲ محدثین کے معاجم مین اکمال ابن ماکولا (سنہ ۴۸۶ھ) ، الجمع بین رجال الصحیحین ابن قیسرانی (سنہ ۵۰۷ھ) ، شیوخ بغداد ابو طاہر سلفی (سنہ ۵۷۶ھ) ، الکمال جماعیلی (سنہ ۶۰۰ھ) ، الکمال ابن النجار (سنہ ۶۴۳ھ) تہذیب الاسمار واللغات نووی (سنہ ۶۷۶ھ) ، الدقائق نووی ، تذہیب تہذیب الکمال ذہبی (سنہ ۷۴۸ھ) ، تذکرۃ الحفاظ ذہبی ، معجم اشیاخ ذہبی ، المجمع المؤسس ابن حجر (سنہ ۸۵۲ھ) ، المنجم سیوطی (سنہ ۹۱۱ھ) ، زیادہ مشہور ہین ،

۳ مشاہیر کے معاجم میں صلہ ابن بشکوال (۵۷۸ھ)، ذیل تاریخ بغداد ابن النجار (۶۴۳ھ)، معجم ابن آبار (۶۵۸ھ)، وفیات ابن خلکان (۶۸۱ھ)، مختصر تاریخ بغداد ذہبی (۷۴۸ھ) الطالع السعید اُدفوی (۷۰۸ھ)، وافی صلاح الدین صفدی (۷۶۴ھ) فوات الوفیات ابن شاکر کتبی (۷۶۴ھ)، احاطہ لسان الدین خطیب (۷۷۶ھ)، العطایا السنیہ ملک افضل عباس (۷۷۸ھ)، نزہۃ العیون عباس، طراز اعلام الزمن ابو الحسن خزرجی (۸۱۲ھ) درر العقود الفریدۃ مقریزی (۸۴۵ھ)، درر کامنہ ابن حجر (۸۵۲ھ) المنہل الصافی تغری بردی (۸۷۴ھ)، دستور الاعلام ابن عزم تونسی (۸۹۱ھ)، الضوء اللامع سخاوی (۹۰۲ھ)، تراجم الاعیان حسن بورینی (۱۰۲۴ھ)، سُلّم الوصول چلپی (۱۰۶۰ھ)، خلاصۃ الاثر محمد امین محبی (۱۱۱۱ھ) وغیرہ ہیں،

۴ علماء کے معاجم میں جذوۃ المقتبس ابن ابو نصر حمیدی (۴۸۸ھ)، عنوان الدرایہ احمد غُبرینی (۷۱۴ھ)، نوادر الاخبار طاش کبری زادہ (۹۶۸ھ)، بستان ابن مریم (تالیف ۱۰۱۹ھ)

۵ حنفیہ کے معاجم میں تاج التراجم ابن قطلوبغا (۸۷۹ھ)، طبقات حنفیہ ابن خضر (اوائل قرن دوازدہم)

۶ شافعیہ کے معاجم میں طبقات کبریٰ سبکی (۷۷۱ھ)، صغریٰ سبکی. طبقات اسنوی (۷۷۲ھ)، طبقات ابن قاضی شہبہ

سنہ ۵۵۱ھ ،

۷ مالکیہ کے معاجم مین الدیباج المذہب ابن فرحون (سنہ ۷۹۹ھ)

۸ حکمار کے معاجم مین اخبار العلمار قفطی (سنہ ۶۴۶ھ) ،

۹ ادبار کے معاجم مین معجم الادبار یاقوت (سنہ ۶۲۶ھ) ،

۱۰ اطبار کے معاجم مین عیون الانبار ابن ابی اصیبعہ (سنہ ۶۶۸ھ)

۱۱ شعرار کے معاجم مین اخبار الشعرار ابوبکر صولی (سنہ ۳۳۵ھ) ،
اخبار المحمدین من الشعرار قفطی (سنہ ۶۴۶ھ) ،

۱۲ سلاطین کے معاجم مین تذکرۃ النسیان (تالیف سنہ ۱۱۶۴ھ)
وغیرہ ہین ،

مقامات کے بھی دو حصے ہین ، دول اور بلاد ،

۱ دول ہیں دول الاسلام ذہبی (سنہ ۷۴۸ھ) سلطنتوں کا تاریخی معجم ہے ،

۲ بلاد کے تاریخی معاجم یہ ہین ، ذیل تاریخ دمشق ابن قلانسی (سنہ ۵۵۵ھ) ، تاریخ دمشق ابن عساکر (سنہ ۵۷۱ھ) ، الاشراف علی معرفۃ الاطراف ابن عساکر ، بغیۃ الطلب ابن العدیم (سنہ ۶۶۰ھ) العقد الثمین تقی الدین فاسی (سنہ ۸۳۲ھ) ،

(۲) آیات قرآنیہ :- میں مفردات راغب اصفہانی (سنہ ۵۰۲ھ)

(۳) حدیث :- کے چار اقسام ہین ، ۱ وہ جو احادیث و رواۃ پر مرتب ہین مثلاً فردوس الاخبار شیرویہ (سنہ ۵۰۹ھ)

جامع المسانید ابن جوزی (۵۹۷ھ)،

۲۔ وہ جن مین احادیث حروف معجم پر مرتب ہین، مثلاً جامع الاصول مجدالدین ابن اثیر (۶۰۶ھ)، المعجم المفہرس ابن حجر (۸۵۲ھ)، جمع الجوامع سیوطی (۹۱۱ھ)، کنوزالحقائق عبدالرؤف مناوی (۱۰۳۱ھ)،

۳۔ وہ جن مین صرف غریب حدیثین ہین مثلاً نہایۃ مجدالدین ابن اثیر (۶۰۶ھ)

۴۔ وہ جن مین صرف مشہور حدیثیں ہین مثلاً مقاصدِ حسنہ شمس الدین سخاوی (۹۰۲ھ)،

(۴) فقہ (LAW) :- میں المغرب فی ترتیب المعرب ناصر مطرزی (۶۱۰ھ) نے ان غریب الفاظ پر لکھی ہے جن کو فقہاء استعمال کرتے ہیں،

(۵) تاریخِ کتب (BIBLIOGRAPHY) حاجی خلیفہ (۱۰۶۸ھ) کی کشف الظنون حروف ابجد پر مرتب ہے، فلوگل کے بیان کے مطابق اس مین ۱۴۵۰۰ کتابون کے حالات ہین، جو تمام دنیا کے مصنّفین سے تعلق رکھتی ہیں،

(۶) جغرافیہ (GEOGRAPHY) وکتب وصف البلاد (GAZETTEER) مین ابو عبید بکری (۴۸۷ھ) کی معجم ما استعجم ان شہرون کے حالات مین ہے جن کا ذکر اشعار عرب مین آیا ہے،

یہ گویا جغرافیۂ خاص کا معجم ہے ، زمخشری (۵۳۸ھ) کی کتاب الأمکنہ والجبال والمیاہ بھی گویا جغرافی معجم ہے ، ابوعبداللہ یاقوت حموی کی معجم البلدان جغرافیہ عام کا معجم ہے اور ۱۰ جلدوں میں ہے ، یاقوت نے ۶۲۶ھ مین وفات پائی ، محمد بن علی سپاہی زادہ کی کتاب اوضح المسالک جغرافیۂ عام کا معجم ہے ، مصنف نے ۹۹۷ھ مین انتقال کیا ،

(۷) تصوف مین اصطلاحات صوفیہ جمال الدین کاشانی (۷۳۰ھ) نے لکھی ، یہ معجم عبدالرزاق بھی کہلاتی ہے ، مصنف کا نام عبدالرزاق تھا ،

(۸) ادویہ (MEDICINE) مین اسحاق بن حنین کی کتاب مفرد دواؤن پر تھی اور حروف پر مرتب تھی ، ابن طرخان (۷۲۰ھ) نے تذکرہ السویدی کے نام سے ۳ ضخیم جلدون مین ادویہ مفردہ پر ایک مفید کتاب لکھی تھی ، اس مین ترتیب اعضاء اور امراض کے لحاظ سے تھی ، حکماء قدیم و جدید کے اقوال اور مجربات بھی تھے ،

(۹) جراحت (SURGERY) مین ابو جزلہ بن یحیی بن عیسی (۴۹۳ھ) کی کتاب منہاج البیان کا کچھ حصہ ہے ، پوری کتاب مین دوائین ، شربت ، غذائین اور تمام مرکب اور بسیط چیزین زیادہ تر بیان کی گئی ہین ،

(۱۰) عروض :- میں برزخ کی معانی العروض ،

(۱۱) نبات (BOTANY) ، حجر (MINERALOGY) ، حشرات

(INSECTS) مین عبد الرحمان بن داؤد اندلسی نے نزہۃ النفوس والافکار کے نام سے ایک کتاب لکھی، یہ اصل مین نبات اور پتھرون کا معجم ہے، ایک باب حشرات الارض پر بھی ہے، ۷۴۴ صفحات کی کتاب ہے، کتابت کا سال ۸۴۸ھ ہے،

(۱۲) علم الحیوان (zoology) مین کمال الدین دمیری (۸۰۸ھ) کی حیوٰۃ الحیوان الکبریٰ ہے، معجم کے طرز پر حیوانات کے نامون پر مرتب ہے، جانورون کے خصائص طبعی، اوران کے متعلق اشعار اور امثال نقل کئے ہین، بہت سے انسانون کے حالات بھی آگئے ہین، دو بڑی جلدون مین چھپی ہے، ابن کنان دمشقی نے (۱۱۵۳ھ) المآم مین مختصر طور پر حیوانات پر لکھا ہے،

(۱۳) انساب (GENEALOGY) مین قلقشندی (۸۲۱ھ) کی دو کتابین ہین، نہایۃ الارب، قلائد الجمان،

(۱۴) شعر مین شمس الدین نوّاجی (۸۵۹ھ) کی تحفۃ الادیب ہے، اس مین وہ اشعار ہین جو ضرب المثل کے طور پر ہین، اسی مصنف کی دوسری تصنیف تاصیل الادیب ہے، اس مین غزلین ہین، قطب الدین (۹۸۸ھ) کی التمثیل والمحاضرہ نادر اشعار کا معجم ہے،

(۱۵) نحو:- مین سعید بن ابراہیم ابن تستری اور ابن ولّاد (۳۳۲ھ) کے رسالے مقصور و ممدود، مکتیبی کی فعلت وافعلت عبد الرحمان سلمی

کی کتاب النحو، قزاز (سنہ ۴۱۲ھ) کی معجم نحو،

(۱۶) حفاظِ قرآن :- مین شمس الدین ابوالخیر جرزی (سنہ ۸۳۳ھ) کی غایۃ النہایۃ ہے،

(۱۷) مفسرین :- مین سیوطی (سنہ ۹۱۱ھ) کی طبقات المفسرین

(۱۸) صوفیہ :- مین عبدالرؤف مناوی (سنہ ۱۰۳۱ھ) کی کواکب دریہ

(۱۹) نحاۃ ولغویین :- مین سیوطی (سنہ ۹۱۱ھ) کی طبقات النحاۃ

(۲۰) مشتبہین :- مین ذہبی (سنہ ۷۴۸ھ) کی المشتبہ فی الاسماء والانساب

(۲۱) کنی والقاب :- مین مجدالدین ابن اثیر (سنہ ۶۰۶ھ) کی المرصع اور ذہبی (سنہ ۷۴۸ھ) کی المقتنی کنیتون کے معاجم ہین، ابن فوطی (سنہ ۷۲۳ھ) کی مجمع الآداب اسماء و القاب کا معجم ہے، اور ابن حجر (سنہ ۸۵۲ھ) کی نزہۃ الالباب مین صرف القاب ہین،

(۲۲) انتسابات :- میں ابن قیسرانی (سنہ ۵۰۷ھ) اور سمعانی (سنہ ۵۶۲ھ) کی کتاب الانساب ہے، سمعانی کی کتاب ضخیم ہے، یہ دونوں کتابیں انساب میں نہیں ہیں بلکہ ان میں انساب یا القاب کی طرف انتساب ہے،

(۲۳) معانی شعر :- مین ابو ہلال عسکری (سنہ ۳۹۵ھ) کی کتاب دیوان المعانی، جو مضامین کے لحاظ سے مرتب ہے،

(۲۴) اغلاطِ لغویہ :- مین صفی الدین حلّی (سنہ ۷۵۰ھ) کی اغلاطی،

(۲۵) تلفظ (Pronunciation) مین ابن القطاع صقلی (سنہ ۵۱۵ھ) کی اصوات، اور حریری (سنہ ۵۱۶ھ) کا رسالہ سینیہ،

حریری نے اس رسالہ مین ضاد اور ظار کے درمیان فرق دکھایا ہے،
یہ رسالہ برلن مین ہے،

(۲۶) مفاسد (ADULTRATIONS) مین ابوالخطاب کلبی (سنہ ۶۳۴ھ) کی تنبیہ البصائر، اس مین شراب کے نام ہین،

(۲۷) امثال عربیہ :- مین میدانی (سنہ ۵۱۸ھ) کی مجمع الامثال اور زمخشری (سنہ ۵۳۸ھ) کی مستقصی،

(۲۸) تنقید مین ذہبی (سنہ ۷۴۸ھ) کی میزان الاعتدال، اس مین رواۃ حدیث پر نقد ہے،

(۲۹) الفاظ معرّبہ :- مین شہاب الدین خفاجی (سنہ ۱۰۶۹ھ) کی شفار العلیل،

(۳۰) الفاظ دخیلہ :- مین محمد امین محبی (سنہ ۱۱۱۱ھ) کی قصد السبیل

(۳۱) اصطلاحات :- مین ابوالبقار کفوی (سنہ ۱۰۹۴ھ) کی کلیات العلوم، اور محمد صابر تھانوی (سنہ ۱۱۵۸ھ) کی کشاف اصطلاحات الفنون،

(۳۲) افکار و امثال :- مین چلپی (سنہ ۱۰۶۸ھ) کی تحفۃ الاخیار،

(۳۳) قبائل مین ابن درید (سنہ ۳۲۱ھ) کا رسالہ اشتقاق، اس مین قبائل کی شاخون کے ساتھ سردارون، شاعرون شہسوارون کا بھی تذکرہ ہے، سنہ ۱۸۵۴ع مین یہ رسالہ چھپ گیا ہے،

(۳۴) مثلثات :- مین ابن مالک طائی (سنہ ۶۷۲ھ) کی کتاب

الاعلام بمثلث الکلام، اس مین وہ الفاظ حروف تہجی پر مرتب ہین جن مین ہر لفظ کے معنے تینون حرکتون (زبر، زیر، پیش) کے بدلنے سے ۳ ہو جاتے ہین،

(۳۵) تمدنیات:- مین مقریزی (۸۴۵ھ) کی المقفی ہے، اس مین مصر کے امراء و مشاہیر کا طرزِ زندگی دکھایا ہے،

(۳۶) موسیقی (MUSIC) مین ابن ابی منصور کی اغانی، اور ابن مکرم کی مختار الاغانی،

(۳۷) فقہ اللغۃ:- مین عبدالرحمان ہمدانی (۳۲۷ھ) کی الفاظ کتابیہ، ابو الحسین (۳۹۵ھ) کی صاحبی، ثعالبی (۴۳۰ھ) کی فقہ اللغۃ، ابن سیدہ (۴۵۸ھ) کی مخصص، انباری (۵۷۷ھ) کی الفاظ الاشباہ والنظائر ہین، ان کتابون کا مواد معانی کے لحاظ سے مرتب ہے،

معاجم معنویہ کے گذشتہ اقسام مین اگر وہ تصنیفات بھی شامل کر لی جائین، جو عباسیہ کے ابتدائی دور مین لکھی گئین، تو یہ عنوان بالکل مکمل ہو جاتا ہے، ان تصنیفات کے عنوانات یہ ہین:-

نوادر، امثال، ضرب المثل اشعار، اخبار، کنایات، فروق، منطق، غریب الحدیث، لغات، اعراب، شواہد، مصادر، امالی، معانی شعر، ازمنہ، اشتقاق، اضداد، اشباہ و نظائر، انواء، میاہ، زرع، نبات، ریاض، مطر، سلاح، جمع وتثنیہ،

ابل، غنم، خیل، النخل والکرم، الوحوش، خلق الانسان، خلق الفرس، رحل البیت، وغیرہ، لیکن ان عنوانات کی کتابین حروف معجم پر مرتب نہین تھین، اور نہ ان مین جیسا کہ نامون سے دھوکا ہوتا ہے، فنی حیثیت سے کچھ تھا، ان مین صرف لغات جمع تھے، اور لغوی حیثیت سے تشریح تھی،

(۲) دوائرِ معارف (ENCYCLOPAEDIAS)

معززین! اگر کارنیول (CARNIVAL) کا "نغمۂ برقی" آپ کی قوت سامعہ کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے، تو اس "تحائف خاکاغذی" کا ہر ورق، یقیناً آپ کی قوتِ باصرہ سے ایک نگاہِ غلط انداز، اور ایک "نظر طائری" کا خواستگار ہوگا، جیسا کہ آپ نے دیکھا معاجم معنویہ کی پہلی قسم مین علوم وفنون کی ایک ایک شاخ یا ایک ایک نسل تھی، لیکن اس دوسری قسم مین وہ نسل منظر عام پر لائی جاتی ہے جس مین تمام گذشتہ نسلین یکجا ہین، "یہ نسلِ جامع" (Comprehensive Offspring) دوائرِ معارف یا موسوعات کے نام موسوم ہے، اس مین علوم صنائع کے متعلق نہایت مکمل معلومات جمع ہوتے ہین، لوگون نے غلطی سے حکیم ابونصر فارابی (۳۳۹ھ) کو اس کا موجد قرار دیا ہے، حالانکہ انسائیکلوپیڈیا کے مضامین وضخامت کی تدریجی ترقی پر اگر صدی وار غور کیا جائے تو اس خیال کی تردید آسانی سے ہوسکتی ہے،

معززین! جیسا کہ آپ کو علم ہوگا، ابتداءً لغت کے الفاظ خاص خاص مضامین پر چھوٹے چھوٹے مجموعوں میں ترتیب دئے گئے، پھر چند مضامین کو ایک کتاب میں لکھا گیا، پھر ایسی کتابوں کے مضامین میں وسعت پیدا کی گئی، جس سے انسائیکلوپیڈیا کا مواد تیار ہوا، ہم ان میں سے چند ضخیم کتابوں کا یہاں ذکر کرتے ہیں، تاکہ اس "نسل جامع" کے تاریخی ارتقار کے ساتھ ساتھ فارابی کی ایجاد کا مسئلہ بھی روشنی میں آجائے،

سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا دوسری صدی ہجری کے اواخر میں تیار ہوئی، یہ فقہ حنفی کے دوسرے امام، قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ کے امالی (لکچر) تھے جو انہوں نے فقہ پر لکھائے تھے؛ ان کی جلدیں تین سو سے زائد تھیں، تیسری صدی کے اوائل میں ابو عمرو شیبانی (۲۰۶ھ) نے شاعری کی ایک ضخیم انسائیکلوپیڈیا اسی جلدوں میں لکھی، چوتھی صدی کے اواخر میں احمد بن ابان (۳۸۲ھ) نے العالم واللغۃ سو جلدوں میں تیار کی، چھٹی صدی کے آغاز میں کتاب الفنون تصنیف ہوئی، اس ضخامت کی کتاب اب تک سنی نہیں گئی، اس کی چار سو ستر جلدیں تھیں، ساتویں صدی کے اواخر تک مشرق و مغرب نام کی دو کتابیں ایک سو پچاس جلدوں میں مکمل ہوئیں،

معززین! بیان مذکور سے دو باتیں معلوم ہوئیں، چند ضخیم

کتابون کے نام اور فارابی سے پہلے دو ضخیم کتابون کی موجودگی، اور یہ مدعیون کی تردید کے لئے کافی ہے،

معززین! اسلام مین دوائرِ معارف دو قسم کے ہین، (۱) عام، اور (۲) خاص، اور ہم دونون کو اختصار کے ساتھ لکھتے ہین،

(۱) فقہ:- بلکہ اسلام کی سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا امام ابویوسف انصاری (۱۸۳ھ) نے لکھی، یہ فقہِ حنفی کے دوسرے بازو تھے، یہ کتاب امالی کہلاتی تھی، کیونکہ امامِ موصوف نے اس کو املاء کرایا تھا، یہ امالی ۳۰۰ سے زیادہ جلدون مین قلمبند ہوئے تھے[۱]، امالیِ ابویوسف اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلام مین "خاص" انسائیکلوپیڈیا پہلے لکھی گئی،

(۲) مضامین مختلفہ:- یہ عام انسائیکلوپیڈیا مین ہوتے ہین، سب سے پہلی اس قسم کی کتاب نضر بن شمیل (۲۰۴ھ) نے لکھی، اس کا نام کتاب الصفات تھا، اس کے سات حصے تھے[۲]، یہ اسلام مین دوسری انسائیکلوپیڈیا تھی، اس کے بعد ابن قتیبہ دینوری (۲۷۰ھ) کی عیون الاخبار ہے، جو دس کتابون (بابون) مین ہے[۳] اور چھپ گئی

---

[۱] - کشف الظنون ۱۴۸ ج ۱،

[۲] - فہرست ندیم ۷۷،

[۳] - ایضاً،

ہے، اس کے بعد احمد بن ابان اندلسی (سنہ ۳۸۲ھ) کی العالم واللغۃ تھی، یہ سو جلدون مین تھی، اور اجناس پر مرتب تھی، آسمان سے لے کر ذرہ تک ہر چیز کا بیان تھا،[1] اس کے بعد راغب اصفہانی (سنہ ۵۰۲ھ) کی محاضرات تھی، اس مین اخلاقی اور اجتماعی مباحث تھے، مفتاح السعادۃ اور کشف الظنون مین اجمالاً اس کا ذکر ہے، اس کے بعد میدانی (سنہ ۵۱۸ھ) کی السامی فی الاسامی تھی، جس مین شرعیات، حیوانات، علویات اور سفلیات کے تحت مین مذاہب عالم، آسمان، فضاء، زمین کا جغرافیۂ طبعی، اور جانورون کی غذاؤن پر مفید معلومات جمع تھے، اس کے بعد اس موضوع پر دو بڑی کتابین تصنیف ہوئین، یہ ڈیڑھ سو جلدون مین تمام ہوئی تھین، اور ایک سو پندرہ برس مین ان کو ایک جماعت نے مرتب کیا تھا، ان کے متعلق پہلے کشف الظنون کا بیان سن لینا چاہئے،

مشرقیات کا حصہ "المشرق فی محاسن اہل المشرق" کے نام سے موسوم تھا، ۶۰ جلدون مین تھا، مغربیات کا حصہ ۱۵ جلدون پر مشتمل تھا، جو ابو الحسن نور الدین علی غرناطی (سنہ ۶۷۳ھ) کی تصنیف تھین، اور محی الدین محمد بن محمد الصاحب بن ہذی جزری کے نام پر معنون تھین، ان کا نام "مغرب فی محاسن حلی اہل المغرب" تھا، پوری کتاب کا مقدمہ احمد بن علی بن سعید قیسی (یا عبسی) نے لکھا تھا، اور وہی اس سلسلہ کا

[1] کشف الظنون ص ۱۰۵ ج ۲

خاتم تھا، ملا علی قاری نے طبقات مین قیسی کو مشرقیات کے تمام حصون کا مصنف تسلیم کیا ہے جو غلط ہے ' (کیونکہ قیسی کے بیان سے صرف مقدمہ لکھنا ثابت ہوتا ہے)

چلپی کا یہ بیان دو جگہ (۳۹۴ ، ۱۱۷۴ ج ۲) ہے، ہم نے اس کو یکجا کر دیا ہے، لیکن مغرب کی چوتھی جلد کا مطبوعہ نسخہ ہمارے سامنے ہے، اس کی لوح پر جو عبارت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصۂ مغربیات (مغرب) ۱۱۵ سال مین تصنیف ہوا تھا حصۂ مشرقیات کا اس مین ذکر نہین ہے، مصنفین مین ۶ اشخاص کے نام ہین، جو یہ ہین، ابو محمد حجاری، عبدالملک بن سعید، احمد بن عبدالملک، محمد بن عبدالملک، موسیٰ بن محمد، علی بن موسیٰ، ان نامون سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی خاندان مین ۶ پشتون نے اس کو تصنیف کیا تھا، لوح مین "بالموارثہ" کا لفظ بھی اشارہ کرتا ہے' ان نامون مین آخری نام علی بن موسیٰ کا ہے، جس کا سلسلۂ نسب یون ہوگا، علی بن موسیٰ بن محمد بن عبدالملک بن سعید، یہ حضرت عمارؓ بن یاسر عنسی کی اولاد مین تھے جو مشہور صحابی گذرے ہین، اور ان کا پورا سلسلۂ نسب حضرت عمارؓ تک لوح مین منقول ہے، اس بنا پر کشف الظنون مین قیسی یا عبسی غلط ہے، عنسی ہونا چاہئے (نون ساکن)، پہلے نام (ابو محمد حجاری) کے متعلق کچھ پتہ نہ چل سکا، اور نہ وہ نسب نامہ مین ہے، اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ وہ عنسی نہ ہوگا'

اس کے بعد سے عنسی شروع ہوئے ہو گئے ، اس طرح پانچ پشتون مین عنسیون نے اور ایک پشت مین غیر عنسی نے اس کتاب کو تصنیف کیا ہوگا ،

کشف الظنون مین حصۂ مغربیات کا مصنف نور الدین علی بن موسیٰ بن سعید غرناطی کو بتایا گیا ہے ، ممکن ہے کہ مغرب کا آخری نام وہی علی ہو ، اور نور الدین اس کا لقب ہو ، اگر ایسا ہے تو اس کا سال وفات ۶۷۳ھ ہوگا ، اور کتاب کی ابتدا کم از کم ۵۵۸ھ مین ہوئی ہوگی ، البتہ چلپی کا یہ قول کہ کتاب بدری کے نام پر معنون تھی ، محتاج ثبوت ہے ، کیونکہ مغرب کی لوح پر سرپرست کا نام کمال الدین ابو القاسم عمر بن احمد عُقَیلی لکھا ہے ، اسی طرح چلپی اور مغرب مین ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ چلپی کے نزدیک آخری شخص احمد بن علی ہے اور مغرب مین خود علی !

مغرب کی یہ جلد ۱۸۹۸ء مین لیڈن مین چھپی ہے ، اس کا انداز یہ ہے کہ مختلف لوگون کے حالات مختلف کتابون سے لکھے ہین اور ان ماخذون کے نام عنوان کے طور پر دیدئے ہین ، اس جلد مین حسب ذیل ماخذون کے نام ہین :-

العیون الدعج ، مشارع الصفا ، تلقیح الآراء ، بلوغ الاعمال ، الاحکام ، الیاقوت ، الریحانۃ ، نجوم السماء ، عنبر الشعر ،

یہ کتابین علحدہ علحدہ مختلف پیشون کے اشخاص کے حالات مین ہین اور مغرب مین ان کے حالات پیشون کے مطابق ماخذون سے لئے گئے ہین،

مغرب کے بعد شہاب الدین احمد نویری (۷۳۲ھ) نے نہایۃ الارب فی فنون الادب ۳۰ جلدون مین لکھی، یہ پانچ فنون پر مرتب ہے، اور آسمان، زمین، انسان، حیوان، نباتات اور تاریخ پر مضامین ہین[1]، اس کے سات حصے چھپ چکے ہین، ابن فضل اللہ دمشقی (۷۴۹ھ) نے ۲۰ ضخیم جلدون مین ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی، اس کا نام مسالک الابصار ہے، اس کی دو تقسیمین ہین، پہلی قسم مین زمین کا اور دوسری مین ساکنان زمین کا حال لکھا ہے،[2]

(۳) شاعری :۔ سب سے پہلے شاعری کی انسائیکلوپیڈیا ابوعمرو شیبانی (۲۰۶ھ) نے مرتب کی، اس نے تمام قبائل کے دواوین اشعار جمع کئے، ان قبائل کی تعداد ۸۰ کے قریب بیان کی جاتی ہے[3]، اس لئے کتاب کی جلدین بھی اسی قدر تھین[4]، سنین کی ترتیب

---

[1] کشف الظنون ۶۱۹ ج ۲،

[2] ایضاً ۴۲۲ ج ۲،

[3] فہرست ندیم ۱۰۱،

[4] کشف الظنون ۱۰۹ ج ۱،

کے لحاظ سے یہ اسلام مین تیسری انسائیکلوپیڈیا تھی ،

(۴) انساب :- کی پہلی انسائیکلوپیڈیا محمد بن حبیب نے لکھی، جو ابن الاعرابی اور قطرب وغیرہ کا شاگرد تھا، اس کا سنہ وفات ۲۴۵ھ ہے، اس نے فتح بن خاقان کے لئے کتاب القبائل الکبیر والایام کے نام سے متعدد جلدون مین ایک کتاب تصنیف کی جو اسلام مین چوتھی انسائیکلوپیڈیا تھی، اس کا اب پتہ نہین ہے، ندیم مصنف فہرست نے اس کا ناقص نسخہ دیکھا تھا، جو تقریباً ۲۰ جلدون مین تھا، ہر جلد ۲۰۰ سے زیادہ صفحات کی تھی، اور ۲۰۰ صفحات مین فہرست تھی، ندیم نے لکھا ہے کہ پوری کتاب تقریباً ۴۰ جلدون مین ہوگی[1] احمد بن جابر بلاذری (۲۷۹ھ) نے استقصا فی الانساب والاخبار ۴۰ جلدون مین لکھی تھی، لیکن یہ ان کی وفات کی وجہ سے تمام نہ ہوسکی[2]

(۵) جغرافیہ :- کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ابن رستہ نے الاعلاق النفیسہ کے نام سے لکھی، یہ سنہ ۲۹۰ھ کی تالیف ہے، اور اسلام مین پانچوین انسائیکلوپیڈیا ہے، اس کی سات جلدین تقویم البلدان پر ہین، اور پوری کتاب برٹش میوزیم مین ہے، یہ جرجی زیدان کا بیان ہے، ہم کو ریو کی تتمہ فہرست مین پتہ نہین چلا، البتہ اس کتاب کی مطبوعہ جلد

---

[1] - فہرست ۱۵۵،

[2] - کشف الظنون ۹۳ ج ۱،

ہفتم کے دیباچہ مین دی غویہ (M. J. De Goeje.) نے اس کی برٹش میوزیم مین موجودگی، اور ریو (Rieu) کی فہرست جلد ۲ ص ۴۰۲ مین اس کے تذکرہ کا پتہ دیا ہے، مطبوعہ جلد مین آسمانون کے عجائبات، مقام زمین، اس کا حجم، پھر مکہ، مدینہ، اقالیم سبعہ خصوصاً ایران اور اس کے نواح، سمندر، دریا، قدیم موجدین وغیرہ کا بیان ہے، یہ جلد ۱۸۹۲ء مین لیڈن مین چھپی ہے، ۲۲۹ صفحہ کی کتاب ہے، لیکن ناتمام معلوم ہوتی ہے، اس کا جرمن ترجمہ ۱۹۰۵ء مین طبع ہوا ہے،

(۶) علوم و فنون :- کی سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا حکیم ابونصر فارابی (۳۳۹ھ) نے لکھی، جو اسلام مین چھٹی انسائیکلوپیڈیا تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارابی ایک خاص قسم کی انسائیکلوپیڈیا کا موجد تھا، فارابی کی اس کتاب کا نام فہرست ندیم (۲۶۸) مین مراتب العلوم لکھا ہے، اور یہ اس کے متعلق سب سے قدیم حوالہ ہے، کیونکہ فہرست ۳۷۷ھ مین تمام ہوئی ہے، اور اس سے صرف ۳۸ برس پیشتر فارابی کا انتقال ہوا ہے، اس لئے یہ معاصرانہ شہادت ہے، بیہقی (۵۶۵ھ) کی تاریخ الحکماء دستیاب نہین ہوتی، لیکن اس کا فارسی ترجمہ درۃ الاخبار موجود ہے اس مین فارابی کے حالات مین اس کتاب کا نام نہین ہے، صرف ان کتابون کے نام لکھے ہین جو ایران مین موجود ہین، شہرزوری

(بعد سنہ ۶۱۱ھ) کے تاریخ الحکماء میں بھی اس کا نام نہین ہے، اس
میں خراسان مین موجود تصنیفات کے نام گنائے ہین (نسخہ قلمی
دارالمصنفین) قفطی (سنہ ۶۴۶ھ) کی اخبار الحکماء (۱۸۳) مین احصاء العلوم
نام بتایا ہے، اور دوسری جگہ (۱۸۲) یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب علوم کے
شمار اور ان کی غرض بتلانے کے لئے لکھی ہے، ایسی کتاب پہلے کبھی
تصنیف نہین ہوئی، ابن ابی اصیبعہ (سنہ ۶۶۸ھ) نے عیون الانباء
(۱۳۸ ج ۲) مین احصاء العلوم و ترتیبھا اس کا نام لکھا ہے،
اکتفاء القنوع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہے
جو اسکوریال (اسپین) مین ہے، جرجی زیدان نے اس کے
عبرانی اور لاطینی ترجمون کا بھی ذکر کیا ہے،

فارابی کے بعد ابوعبد اللہ محمد بن احمد خوارزمی (سنہ ۳۸۷ھ) نے
مفاتیح العلوم لکھی، حاجی خلیفہ نے اس کا صرف نام لکھا ہے، اور فہرست
مین نام بھی نہین ہے، حالانکہ مصنف فہرست کی وفات حسب تصریح
ابن نجار (ذیل تاریخ بغداد) شعبان سنہ ۳۸۵ھ مین ہوئی ہے، اس بنا
پر خوارزمی اور ندیم دونون حقیقی معاصر ہین، اور ندیم کا ان کے حالات سے
سکوت تعجب انگیز ہے، اس کتاب مین دو مقالے ہین جن مین ۱۵ باب
اور ۹۳ فصلیں ہیں، پہلے مقالہ میں ۶ باب اور ۵۲ فصلیں ہین
ان مین فقہ، کلام، نحو، کتابت، شعر، اخبار کا تذکرہ ہے،
دوسرے مقالہ میں ۹ باب اور ۴۱ فصلین ہین، ان میں فلسفہ، منطق

طب، عدد، ہندسہ، نجوم، موسیقی، حیل (MECHANICS)، کیمیا، کا ذکر ہے، اس طرح بقول مصنف شرعی اور غیر شرعی یا بالفاظ دیگر مسلم اور غیر مسلم اقوام کے تمام علوم اس کتاب مین اجمالی طور پر آگئے ہین، یہ نادر کتاب ۱۸۹۵ء مین لیڈن مین چھپی ہے، ولاٹن (G. VON. VLOTEN) نے تہذیب کی خدمت انجام دی ہے،

خوارزمی کے بعد ایک بڑی ضخیم کتاب ترتیب دی گئی ہے، اس کے مصنفین مین دو شخصون کے نام معلوم ہیں، (۱) علی بن عقیل بغدادی (۲) ابوالوفا حنبلی (۵۱۳ھ) اس کتاب کا نام کتاب الفنون تھا، اور چار سو ستر ۴۷۰ جلدون مین تمام ہوئی تھی[1] جلدون کی ضخامت کچھ بھی ہو، تاہم تعداد تعجب انگیز ہے، اس کے بعد نجم الدین احمد بن حمدان بن شبیب حرانی (۶۹۵ھ) نے ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی، جس کا نام جامع الفنون ہے، کشف الظنون (۳۷۹ ج ۱) مین اس کا نام جامع العلوم لکھا ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم مین ہے، اور وہان کی فہرست وصفی (DESCRIPTIVE LIST) مین (ص ۳۷) جو ریو کے تتمہ کے بعد ایلیس (A.G. ELLIS) اور اڈورڈس (EDWARD EDWARDS) نے مرتب کی ہے، اس کا ذکر ہے، حرانی کے بعد جمال الدین وطواط نے "مباہج الفکر"

---

[1] - کشف الظنون ۲۹۳ ج ۲،

کے نام سے ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی ، مصنّف کا سالِ وفات سنہ ۸۱۷ھ ہے ، اس کے ۴ حصے ہیں ، پہلے میں علم ہیئت ، دوسرے میں جغرافیہ تیسرے میں حیوانات ، چوتھے میں نباتات کا ذکر ہے ، اس کے مختلف اجزا برلن ، مصر اور حلب میں ہیں ، وطواط کے بعد شرف الدین اسماعیل یمنی (سنہ ۸۳۷ھ) نے عنوان الشرف الوافی کے نام سے فقہ ، نحو ، تاریخ ، عروض ، اور قوافی کی ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی ، اس کے متعدد نسخے ہیں جو برٹش میوزیم ، وائنا ، لنڈن اور مصر میں موجود ہیں ، ریو کے تتمۂ فہرست (۴۸۸) میں اس کا ذکر آیا ہے ، اس کے بعد عبد الرحمان حروفی (سنہ ۸۵۸ھ) نے الفوائح المکیہ میں ۱۰۰ علوم پر لکھا ، لیکن کتاب ناتمام رہی ، اس کے نسخے وائنا ، لیڈن لیبسک ، اسکوریال ، اور مصر میں ہیں ، اس کے بعد عبد العزیز مکناسی نے ایک منظوم انسائیکلوپیڈیا لکھی ، مکناسی کی وفات سنہ ۹۶۴ھ میں ہوئی ہے اس کی کتاب میں ۱۳ رسالے ہیں ، قرآن ، حدیث ، اصول فقہ ، جدل ، صرف ، نحو ، منطق ، معانی و بیان ، بدیع و حساب وغیرہ پر اشعار کہے ہیں ، ریو کی تتمۂ فہرست (۴۸۹) میں اس کا تذکرہ ہے ، اس نے ہر رسالہ کے ابتدائی اشعار بھی نقل کئے ہیں ، اور خاتمہ کے حوالہ سے کتاب کی تصنیف کی تاریخ سنہ ۹۴۲ھ نقل کی ہے ، مکناسی کے ایک معاصر عبد الوہاب شعرانی (سنہ ۹۷۳ھ) نے الدرۃ المنثور کے نام سے قرآنی علوم و معارف ، قانون البیان ، صرف و نحو ،

خطابت اور زہد (تصوف) کی ایک انسائیکلو پیڈیا لکھی، یہ نام کشف الظنون میں نہیں ملا، کتاب کے نسخے برلن، گوتھا، مصر میں ہیں، اور ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے، اور ایکیس کی فہرست وصفی (ص ۳۶) میں اس کا ذکر آیا ہے، حبیب اللہ مرزا جان شیرازی (سنہ ۹۹۴ھ) کی ایک شرح بے نام "کتاب انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے، جو مصنف کے صرف ۶ برس بعد (سنہ ۱۰۰۰ھ) لکھی گئی ہے، اس میں ۹ علوم ہیں، تفسیر، معانی، بیان، اصول، کلام، منطق، طبیعی، الٰہی ہیئت، مصنف مسائل پر تنقید بھی کرتا ہے،

(۷) **فلسفہ**:- کی پہلی انسائیکلو پیڈیا چوتھی صدی کے وسط میں ایک جماعت نے مرتب کی، اس کا نام رسائل اخوان الصفا ہے، چار جلدوں میں بمبئی میں چھپی ہے، اور ہمارے دار المصنفین میں اس کا قلمی نسخہ خوشخط دو جلدوں میں موجود ہے، یہ رسائل تعداد میں ۵۱ ہیں، اور ان کی تفصیل ریو نے تتمہ فہرست میں دی ہے، ان میں ۵۰ حکمت کے ۵۰ اقسام پر ہیں، اور آخری رسالہ ان سب پر اجمالی تبصرہ ہے، یہ رسائل بصرہ[1] میں طبیعات، ریاضیات، الٰہیات اور عقلیات پر دقیق بحث اور طویل نظر کے بعد چند مصنفین نے لکھے تھے، جن میں بعض کے نام یہ ہیں:- ابو سلیمان محمد بن مخشر بستی مقدسی، ابو الحسن علی

---

[1] - جرجی زیدان نے بغداد لکھا ہے جو غلط ہے، دیکھو ابو حیان کا جواب (قفطی ص ۵۹)

بن ہارون زنجانی، ابو احمد مہرجانی، ابو الحسن عوفی، ابو حیان توحیدی کے جواب (۳۷۳ھ) مین چار نام ہین، پھر وغیرہم لکھ دیا ہے[1] ایک نام زید بن رفاعہ کا چلپی (۵۷۰ ج ۱) مین ہے، اخوان الصفا کے بعد فلسفہ کی دوسری انسائیکلوپیڈیا بو علی سینا (۴۲۸ھ) نے ۱۸ جلدون مین لکھی، جس کا دوسرا[2] حصہ طبیعات کتاب الشفا کے نام سے موسوم ہے اور عام طور پر متداول ہے، یہ پوری کتاب مصر کے کتبخانۂ خدیوی مین موجود ہے،

(۱۸) **ادب:-** کی پہلی انسائیکلوپیڈیا اسحاق بن ابراہیم فارابی (تقریباً ۳۵۰ھ) نے دیوان الادب کے نام سے ۶ جلدون مین لکھی' یہ لیڈن اور اکسفورڈ وغیرہ مین موجود ہے، ہر جلد کے دو حصے ہین، پہلے اسماء ہیں پھر افعال' اور سب کا اشعار سے ثبوت دیا ہے' ابوسعید محمد بن جعفر نے اسی نام سے ۱۰ جلدون مین اس پر اضافہ کیا ہے[3] اس کے بعد نشوان بن سعید حمیری (۵۷۳ھ) نے ۱۸ جلدون میں شمس العلوم تصنیف کی' یہ حروف معجم پر مرتب ہے، چلپی نے اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس مین چند ابواب ہین

[1] کشف الظنون ۴۶ ج ۲،

[2] تتمہ فہرست برٹش میوزیم ریو ۴۸۴،

[3] کشف الظنون ۵۰۳ ج ۱،

ہر حرف تہجی ایک باب مین ہے، ہر باب کے دو حصے ہین، ایک مین اسماء اور دوسرے مین افعال ہین، اسماء و افعال کے ہر کلمہ کی ایک ایک باب مین تشریح ہے، تشریح میں علمی اور طبیعی حیثیت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے، مثلاً حیوان، نبات یا معدن کے خصوصیات بھی لکھتا ہے، قدیم اشخاص کے حالات فراہم کرتا ہے، اور تاریخی حیثیت سے ان پر بحث کرتا ہے، ملکہ زبار کی تاریخی شخصیت پر اسی سلسلہ مین اس نے بحث کی ہے، احکام شرعیہ کا ذکر بھی جا بجا آتا ہے، شمس العلوم کے نسخے یورپ کے متعدد کتب خانون مین ہین، مصر مین بڑی تقطیع کے ۱۵۰۰ صفحہ کا نسخہ ۲ جلدون مین موجود ہے، نشوان کے بعد صلاح الدین صفدی (۷۶۴ھ) نے "تذکرہ صلاحیہ" ۳۰ جلدون مین لکھی، جو مضامین کے لحاظ سے مرتب ہے، بڑا حصہ ادب و شاعری پر ہے، تاریخی اور اجتماعی معلومات بھی ملتے ہین، سوانح عمریان بھی ہین، اس کا پورا نسخہ کہین نہین ہے، گو تھا، اکسفورڈ، برٹش میوزیم اور مصر مین متفرق اجزا ہین، صفدی کے بعد محمد بن احمد ابشیہی نے مستطرف لکھی جو چھپ گئی ہے، مصنف نوین صدی کے نصف اول مین تھا، اس کے بعد شہاب الدین قلقشندی (۸۲۱ھ) کی صبح الاعشیٰ ہے، اس کی قلمی سات ضخیم جلدین ہین، انشاء کے ساتھ ساتھ تقویم البلدان پر بھی کئی حصے لکھے ہین، یہ کتاب چھپ گئی ہے، ۱۴ جلدون میں آئی ہے،

(۹) موسیقی :- کی پہلی انسائکلوپیڈیا ابو الفرج علی بن حسین اصفہانی نے کتاب الاغانی کے نام سے لکھی ، مصنف کا سال وفات فہرست ندیم (۱۶۷) مین سنہ ۳۶۰ھ کے قریب لکھا ہے ، لیکن ابن خلکان (۳۴۵ ج ۱) مین سنہ ۳۵۶ھ کی تصریح ہے ، یہ کتاب تقریباً ۵۰ برس مین مکمل ہوئی[۵۱] ندیم کے بیان کے مطابق ۱۰ ہزار صفحات مین تھی[۵۲] اس وقت تک اس کے ۲۱ حصے تقریباً ۴ ہزار صفحات مین شائع ہو چکے ہین ،

اس کتاب مین سینکڑون خلفاء ، شاعرون ، مغنیون ، عاشقون ، سپہ سالارون ، اور اکثر عرب کی لڑائیون ، قبیلون ، تالابون کا تذکرہ ہے ، جاہلیت اور اسلام کے بہترین اشعار درج ہین ، عرب کے کھانے پینے ، رہنے سہنے ، نکاح ، طلاق اور جنگ کے طریقے اور ہر قسم کے حالات فراہم کئے ہین ، مصنف صرف مؤرخ ہی نہین بلکہ ناقد بھی ہے ،

(۱۰) تجارت (COMMERCE) :- کی پہلی انسائکلوپیڈیا ابو الفضل جعفر بن علی دمشقی نے الاشارۃ الی محاسن التجارۃ کے نام سے لکھی ، مصنف خلافت عباسیہ کے تیسرے دور (سنہ ۳۳۴ھ سے سنہ ۴۴۷ھ) کا معلوم ہوتا ہے ، اس مین اس نے اچھے اور برے سامان ، اقسام

---

۵۱ - ابن خلکان ۳۴۴ ج ۱ ،

۵۲ - فہرست ۱۶۷ ،

متاع ، منافع ، قیمتی پتھر ، کپڑے ، فرش ، موسمی پیداوار ، زیتون، آلما ، گھوڑے ، خچر ، سواریان ، چرب زبانی یا ترکیب سے روپیہ لینا ، مختلف قسم کے تاجرون کو مختلف نصیحتین ، یہ اور اسی قسم کے عنوانات پر مضامین لکھے ہین ، کتاب ۱۳۱۸ھ مین مصر مین چھپی ہے ،

(۱۱) اعراب :- یعنی قرآن مجید کے اعراب کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ابوطاہر صقلی (۴۵۵ھ) نے ۹ جلدون مین لکھی ، اس کے بعد ابوالحسن علی بن ابراہیم عوفی (۵۶۲ھ) نے ۱۰ جلدون مین ایک کتاب تصنیف کی ، پھر شہاب الدین احمد بن یوسف جلبی (۷۵۶ھ) نے ایک جامع کتاب تیار کی ، اس مین پانچ علوم اعراب ، صرف ، نعت، معانی ، بیان[۱] جمع تھے ،

(۱۲) اسلام :- کی انسائیکلوپیڈیا مفید العلوم کے نام سے چھٹی صدی کے نصف اول مین لکھی گئی ، یہ ایک جلد مین ہے اور ۳۲ کتابون (بابون) پر منقسم ہے ، قوانین ممالک، عقاید ، حقوق ، اخلاق ، تاریخ ، سیاست ، عجائب فطرت ، خواص بلاد ، مناظرے لڑائیان ، جہاد سب کو لیا ہے ، چلپی نے اس کے مصنف کا نام نہین لیا ہے ، صرف یہ لکھا ہے کہ کسی مغربی کی تصنیف ہے[۲]، لیکن

---

[۱] - کشف الظنون ۱۲۱ ج ۱ ،

[۲] - ایضاً ۴۹۰ ج ۲ ،

بروکلمین اور ریو نے مصنف کا نام جمال الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد قزوینی بتایا ہے ، اور کتاب کی تالیف کا زمانہ ۵۲۷ھ کے بعد قرار دیا ہے ، یہ کتاب برٹش میوزیم مین ہے ، اور گوتھا وغیرہ مین بھی ،

(۱۳) تفسیر :- کی انسائیکلوپیڈیا امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) نے مفاتیح الغیب کے نام سے لکھی ، یہ تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے ، ابن خلکان کی تحریر کے مطابق یہ کتاب ناتمام ہے ، (۴۷۴ ج ۱) تاہم اس میں اکثر علوم کے مسائل آگئے ہین ، اس کی ترتیب خاص امام صاحب کا اختراع ہے ، یہ طرز پہلے نہ تھا ، ۸ ضخیم جلدون میں یہ کتاب چھپی ہے ،

(۱۴) سیاسیات و آداب :- کی مخلوط انسائیکلوپیڈیا ابن فضل اللہ دمشقی (۷۴۹ھ) نے لکھی ، اس کا نام " التعریف بالمصطلح الشریف " ہے ، کائنات کے مراتب ، عہد نامون فرمانون وغیرہ کا دستور ، ہر سلطنت کے حدود اور آبادیان ، ڈاک خانے نامہ بر کبوتر ، جہاز ، مینارے ، اور اسی قسم کے تمام معلومات ۴۷۴ صفحات مین جمع کئے ہین ، مصر مین اس کا ایک نسخہ ہے ، ۱۳۱۲ھ مین چھپ گئی ہے ، قاضی حسین بن حسن سمرقندی نے ۹۳۶ھ مین اسی طرح کی ایک انسائیکلوپیڈیا ترتیب دی ، اس کا نام " لطائف الافکار " ہے ، اس کے ۵ باب ہین ، پہلے مین سیاسیات ، دوسرے مین تاریخ اکابر رجال ، تیسرے مین ادبیات ، چوتھے مین اخلاق حسنہ ، پانچوین

مین عجائب المخلوقات کا بیان ہے ، اس کا ایک نسخہ وائنا مین ہے ،

(۱۵) یورپ کی انسائیکلوپیڈیا :- آج یورپ مین اسلام کی انسائیکلوپیڈیا لکھی جاتی ہے ، لیکن اب سے ۶۰۰ برس پیشتر ابن فضل اللہ دمشقی نے یورپ کی انسائیکلوپیڈیا لکھی تھی ، جس کا نام "ممالک عباد الصلیب" تھا ، اٹلی کے ایک "بندۂ صلیب" لاماری نے اس کا اٹالین زبان مین ترجمہ کر کے ۱۸۸۳ء مین مع اصل کے چھپوایا ہے ، اس کتاب مین تہاور مغری کے ایک مملوک بلبان جنوی کے ذریعہ سے حالات فراہم کئے گئے ہین ، اس زمانہ کے متمدن یورپ یعنی فرانس ، جرمنی ، بندقیہ ، اٹلی ، جنیوا کے سیاسی اور اجتماعی حالات اور مسلمانون کے تعلقات کو بیان کیا ہے ،

(۱۶) تعریفات و مصطلحات :- (TECHNICAL TERMS) کی انسائیکلوپیڈیا یا مقالید العلوم فی الحدود والرسوم کے نام سے غالباً سید شریف علی جرجانی (سنہ ۸۱۶ھ) نے ابو الفوارس شاہ شجاع کے لئے لکھی ، یہ جیسا کہ بعضون کا خیال ہے ، سیوطی کی تصنیف نہین ہے ، سیوطی اس مصنف سے ایک صدی بعد تھے اس کتاب کا زمانۂ تصنیف سنہ ۷۷۹ھ سے سنہ ۷۸۹ھ تک سمجھنا چاہئے ، کیونکہ سید شریف اسی زمانہ مین شیراز کے دار الشفا مین معلم

کی خدمت انجام دینا تھا ، اس کتاب میں ۱۲ علوم کے اصطلاحات ۲۱ بابون مین لکھے ہین[۱]، حروفِ معجم پر مرتب ہے ، چلپی اس کے ذکر سے خاموش ہے ،

(۱۷) تصوف :- کی انسائیکلو پیڈیا " الناموس الاعظم " کے نام سے قطب الدین عبدالکریم گیلانی نے لکھی ، ان کا سال وفات ۸۲۶ھ ہے ، اس کی ۴۰ جلدین ہین ، متفرق حصے یورپ کے کتبخانون مین اور چند مصر مین ہین ،

(۱۸) علوم اسلامیہ :- کی انسائیکلو پیڈیا شیخ الاسلام احمد بن یحییٰ تفتازانی حفید نے ۸۹۴ھ مین لکھی ، اس کا نام مجموعہ نفیسہ ہے ، مصنف کے پردادا علامہ سعدالدین تفتازانی تھے ، اسی لئے وہ حفید کہلاتا تھا ، اس کتاب کا چلپی نے موضوعات العلوم مین ضمناً تذکرہ کیا ہے ، ریو نے تتمۂ فہرست (۴۸۹) مین اس کے بابون کا ذکر کیا ہے ، جو یہ ہین :- جمع و تلاوتِ قرآن ، جواھر علمِ حدیث ، اصولِ حدیث ، تفسیر ، کلام ، فقہ و اصولِ فقہ ، لغت ، صرف و اشتقاق نحو ، معانی و بیان ، بدیع و عروض ، آخری باب مین علم الخط پر ایک مختصر مضمون ہے ، ایک ضمیمۂ علومِ فلسفیہ پر بھی شامل کیا ہے ، مصنف چونکہ ناقد تھا ، جابجا ابن سینا ، غزالی ، مصنف مفتاح ، سید شریف اور

---

[۱] - تتمۂ فہرست برٹش ص ۴۸۷ ،

سعدالدین تفتازانی کی رائین نقل کرتا ہے ، اور کہین کہین اپنی مجتہدانہ رائین بھی لکھتا ہے ،

(۱۹) طب :- کی انسائیکلوپیڈیا داؤد بن عمر انطاکی نے لکھی ، یہ نابینا تھا ، ۱۰۰۸ھ مین وفات پائی ، کتاب کو "تذکرہ انطاکی" بھی کہتے ہین ، اس مین ایک مقدمہ اور ۴ باب ہین ، مقدمہ مین علوم طب کی تعداد ، پہلے باب مین کلیات ، دوسرے مین دواسازی کے قوانین ، تیسرے مین جڑی بوٹیون کے خواص ، چوتھے مین امراض کا بیان ہے ، تیسرا اور چوتھا باب حروف معجم پر مرتب ہے ، یہ کتاب مصر مین بارہا چھپی ہے ، ۳ جلدین ہین ، کشف الظنون (۲۷۲ ج ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری باب حرف طا سے تی تک ایک تاجر سے ہندوستان مین ضائع ہوگیا ، اور اب کتاب ناتمام ہے ،

کتب لغت کی کثرت

معززین ! یہ میرے مضمون کا آخری حصہ ہے جس کے بعد میری اور آپ کی "سبکدوشی" کا وقت آجائے گا ، اس۔ براہِ کرم صبر وتحمل اور خندہ جبینی کے ساتھ چند منٹ ... گوارا فرمائیے ، ایک زمانہ وہ تھا جب عبد الملک بن ...

دربار مین سوید بن غفلہ نے جسم انسانی کے لغات کی ایک "کتاب" حروفِ معجم پر مرتب کرکے "ساڑھے تین سطرون" مین "نقد" پیش کی تھی، اور پھر جب اس کے تتمہ (SUPPLEMENT) کا مطالبہ ہوا تو بڑی ہمت کرکے "۸ سطرون" کا مجموعہ تیار کرسکا تھا، اور یا آگے چل کر وہ وقت آیا جب بڑی بڑی ضخیم جلدون مین ایک ایک کتاب برسون کی محنت و کاوش کے بعد مرتب ہوئی، اور ان کتابون کی یہ کثرت ہوئی کہ وزیر صاحب ابن عباد (۳۸۵ھ) کو جب ایک بادشاہ نے اپنے یہان بلانا چاہا تو اس نے معذرت مین یہ لکھا کہ مجھ کو صرف لغت کی کتابین اٹھانے کے لئے ۶۰ اونٹون کی ضرورت لاحق ہوگی (مزہر ۵۹ ج ۱)، میدانی (۵۱۸ھ) نے جب مجمع الامثال لکھی تو ۵۰ سے زیادہ کتب امثال سامنے تھین[1]، جن مین ان کو اتنا کافی ذخیرہ ملا کہ زمخشری کے سوا کوئی شخص ان کو "ہمیدانی" کہنے والا نہ مل سکا؛ امام رضی الدین صنعانی (۶۵۰ھ) نے صحاح کا تکملہ لکھنا چاہا تو اقسام لغت کی ہزار کتابین پیش نظر تھین، اور المصباح المنیر کی تصنیف کے وقت احمد بن محمد فیومی (۷۷۰ھ) نے ۷۰ تالیفات کو اپنا ماخذ

---

[1] کشف الظنون ۳۸۲ ج ۲۔

بنایا تھا[۱]،

اگر معاجمِ لفظیہ سے آگے بڑھ کر معاجمِ معنویہ کی کثرت ضخامت کا جائزہ لیا جائے تو حیرت و استعجاب کا بڑا عجیب و غریب منظر سامنے آئیگا، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، ایک کتاب ۷۰۰ جلدون مین تصنیف کی گئی! ایک دوسری کتاب کی تالیف مین ۴ پشتون نے ایک سو پندرہ سال صرف کئے!

خاتمہ

معززین! سلسلۂ سخن دراز ہوگیا ہے، اور اب مین اسی جگہ اس کو ختم کرتا ہون، "عشق و محبت" کی "نبردگاہ" مین دلدادگانِ حسن کو "قاتل" کی "سستیٔ بازو" کی شکایت پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ نبردگاہِ عشق نہین، "گلستانِ تاریخ" ہے، یہان "بازو" کے بجائے "آنکھ" کام کرتی ہے، اس لئے مین "نگاہ" کی "تنگیِ دامن" کا شکوہ کرتا ہون،

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گلچین بہارِ تو، ز داماں گلہ دارد

آخر مین اسی شکوہ کی "معذرت" پر یہ مضمون ختم ہوتا ہے، والسلام،

سعید انصاری

شبلی منزل، دارالمصنفین، اعظم گڈھ

۱؎ ۔ کشف الظنون ۰۰۵۸ ج ۲،

قراقوینلو ترکمان

صاحب جامع التواریخ کے قول کے مطابق ترک ایک صحرانشین قوم تھے، جن کا مسکن ایک طرف ابتدائے جیحون وسیحون سے لے کر انتہائے حدود بلاد مشرق تک تھا، اور دوسری طرف دشتِ قبچاق سے لے کر غایت ولایت جورجہ وختا تک تھا، اس علاقہ کے دشت وجبل اور وادیاں ان کا گہوارہ تھیں، جب انھوں نے اس سرزمین سے نکل کر بلادِ ماوراالنہر اور ایران میں توطن اختیار کیا، اور یہاں ان کی نسل پھیلی، تو آب و ہوا کے اثر اور تقاضے سے ان کی شکل وصورت نے تاجیک خط وخال اختیار کئے، چونکہ یہ تاجیک مطلق تھے، نہ خالص ترک، اس لئے ان دونوں رعایتوں کو مدنظر رکھ کر جدت پسندوں نے انصاف کا حق ادا کیا، اور وہ اس طرح کہ ان کو ترکمان کے نئے نام سے موسوم کیا،

قراقوینلو انہی ترکمانوں کی اولاد تھے، مؤرخین نے صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا کہ یہ کون سے قبیلہ کی شاخ تھے، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہ اور ان کے حریف آق قوینلو ایک ہی جد کی اولاد

ہین ، اس کی تصدیق ایک توان کے نامون کی ترکیب اور مشابہت سے
ہوتی ہے ، اس کے علاوہ یورپ کے بعض مؤرخین کے اقوال
بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہین ، چنانچہ پروفیسر براؤن نے تاریخ
ادبیات ایران کی تیسری جلد مین قراقویونلو ترکمان کے احوال مین
ایک شخص کا قول نقل کیا ہے ، لیکن اس کی بہترین سند صاحب
جامع التواریخ کا شجرۂ اتراک ہے ، جس مین ترکون کے آبائے اولین
مین سے ایک فرد یعنی کوک خان کا لقب بایندری درج ہے ،
اس سے اتنی بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ کم از کم آق قویونلو
کوک خان بایندری کی اولاد سے ہین ، کیونکہ اکثر مورخین آق قویونلو
خاندان کے بعض افراد کے نامون کے ساتھ ان کا خاندانی لقب یا نام
بایندری لکھتے ، قراقویونلو کی مشابہت رسمی اس بات کی متقاضی ہے
کہ ان دونون قبیلون کو ایک قبیلہ کی شاخ اور ایک جد کی اولاد قرار
دیا جائے ، اب رہا یہ امر کہ قراقویونلو افراد کے نام کے ساتھ کتب
تواریخ مین لفظ بایندری کیون استعمال نہین ہوا ، اس کی اغلب
وجہ ان کی باہمی رقابت اور عداوت تھی ، نیز ابتداءً قراقویونلو
زیادہ طاقتور تھے ، اور آق قویونلو نسبتاً کمزور اور گمنام تھے ، اس
لئے ممکن ہے کہ قراقویونلو قبیلہ یا اس کے سردارون نے اپنے آپ
کو آق قویونلو سے نسبت دینا موجب عار سمجھا ہو ، اور اسی بنا پر اپنے لئے
قرا (سیاہ) نام ان کی ضد پر اختیار کیا ہو ، اس سلسلے میں یہ بات

قابل ذکر ہے کہ آق قویتلو کے جھنڈے پر سفید بھیڑ کا نشان تھا، اور قراقویتلو کے جھنڈے پر سیاہ بھیڑ کا، نیز یہ دونوں قبیلے دیار بکر کی سرزمین مین ایک دوسرے کے قریب ہی رہتے تھے ہمیری رائے مین یہ دونون باتین پھر مذکورہ بالا خیال کی تائید مزید کرتی ہین،

اس سلسلے مین یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قراقویتلو ترکمانون کے سردارون کو بعض اہل قلم نے جن مین بابر بھی شامل ہے آب بارانی لکھا ہے، ہم اہل ہند کے لئے ان ترکمانون کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس حکمران خاندان کے دو افراد یعنی سلطان قلی اور بیرم خان نے تقریباً چالیس سال کے فاصلے سے اس ملک مین دو سلطنتین قائم کین، اول الذکر دکن مین بہمنی سلطنت کا چراغ گل ہونے پر قطب شاہی کا بانی ہوا، اور ثانی الذکر یعنی بیرم خان ہمایون کی از دست رفتہ سلطنت کے حصول کا ذریعہ بنا، اور اکبر کے اوائل سلطنت مین اس کا رکن رکین رہا، بنا برین ان اولوالعزم نفوس کے اجداد کی تاریخ کا مطالعہ ہمارے لئے انتباہ اور دلچسپی کا باعث ہے،

قراقویتلو ترکمانون مین ایک قبیلہ بہارلو تھا، جس کے سردار تمام گروہ کے حاکم تھے، ان لوگون کا نمایان وصف ان کا جذبۂ آزادی ہے، جس کے باعث انھون نے بعض جبار اور باسطوت بادشاہون کے ہاتھون طرح طرح کی مصیبتین اٹھانی قبول کین، لیکن ان کے آگے کبھی سر اطاعت خم نہیں کیا، چنانچہ اس جذبہ سے مجبور ہو کر ان کا

ایک سردار امیر تورہ بیگ ۵۹۹ھ مین چنگیز خان کے خروج کے زمانے مین تقریباً تیس ہزار خانوادے کے ساتھ ترک وطن کر کے ماوراءالنہر اور جبل فرغانہ مین وارد ہوا، قراقوینلو ترکمانون مین پہلا شخص ہے جس سے تاریخ ہمین روشناس کرتی ہے، جب چنگیز خان نے اسے یہان بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، تو کوچ کر کے ایران سے ہوتا ہوا ارض روم اور دیار بکر کی دور دست وادیون مین آکر مقیم ہوا، یہ اور اس کے اخلاف مدت تک اسی سرزمین مین خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے رہے ان کا گذارہ زیادہ تر بھیڑ بکریون کے گلون پر تھا، جیسا کہ خانہ بدوشون کا قاعدہ ہے، یہ موسم گرما مین دریائے فرات کے کنارے کے میدانون کو چھوڑ کر شمالی پہاڑون مین چلے جاتے تھے اور سردی کے موسم مین پھر انہی میدانون مین آجاتے تھے، یہ بات یقین کے ساتھ نہین بتائی جا سکتی کہ یہ لوگ مشرف باسلام کب ہوئے، تاریخ ترکمانیہ، تاریخ سلطان محمد قطب شاہی، اور مآثر رحیمی کے مصنفین کی رائے تو یہی ہے، کہ جب چنگیز خان نے خروج کیا ہے تو یہ لوگ دائرۂ اسلام مین داخل ہو چکے تھے،

چونکہ قراقوینلو ترکمان کم از کم پچاس سال تک بغداد کے خاندان جلائر یا ایلکانی کے دامن دولت سے وابستہ رہے اور ان کے ساتھ آخر مین ان کی قرابت بھی تھی، اور وقتاً فوقتاً یہ ان سے ہنگامہ آرا بھی رہے اور بالآخر ان کی جگہ بغداد اور آذربائجان مین حکمران بھی ہوئے

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر الفاظ مین اس خاندان کا ذکر کیا جائے ، شیخ حسن بزرگ اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہے ، یہ آق بوقا جلائر کا پوتا اور ایلکان تویان ہلاکو کے ایک معزز امیر کے اخلاف مین سے تھا ، یہی وجہ ہے کہ تاریخون مین اس کے خاندان کا ذکر جلائر اور ایلکانی نامون سے ملتا ہے ، شیخ حسن بزرگ نے ۷۵۷ھ مین وفات پائی ، اور اس کے بعد اس کا ایک بیٹا اور دو پوتے یکے بعد دیگرے مسند نشین حکومت ہوئے ۔ اور ۸۱۳ھ مین قراقوینلو ترکمانون کے پہلے خود مختار بادشاہ قرا یوسف نے ان کا خاتمہ کر کے بغداد کو اپنی آذربائجان کی سلطنت کا ضمیمہ بنا لیا ، خاندان جلائر کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلمان ساؤجی اسی خاندان کے بادشاہ اویس کے دربار سے تعلق رکھتا تھا ،

قراقوینلو ترکمانون کی مسلسل تاریخ بیرم خواجہ سے شروع ہوتی ہے ، یہ خاندان جلائر یا ایلکانی کا ملازم تھا ، اور ان کی جانب سے موصل اور ارجیش کا حاکم تھا ، اس کا نبیرہ قرا محمد، سلطان اویس ابن شیخ حسن بزرگ کی طرف سے شہر واسط مین حکمران تھا ، ۷۶۵ھ مین جب خواجہ مرجان حاکم بغداد باغی ہوا ، اور سلطان نے اس کی تنبیہ کے لئے فوج کشی کی تو اس مہم کے دوران مین ایک موقع پر سلطان کو کشتیون کی ضرورت پڑی ، اور اس کے امرا مین سے کوئی فراہم نہ کر سکا ، آخر کار یہ خدمت قرا محمد نے انجام دی ، چاہیئے تھا

کہ اس خدمت کی بدولت سلطان اویس اور بیرم خواجہ اور قرا محمد کے باہمی تعلقات خوشگوار اور دوستانہ ہوتے، مگر ایک ہی سال کے اندر سلطان اویس کو ان پر فوج کشی کرنی پڑی، ممکن ہے کہ اپنے آبائی جذبۂ آزادی سے متاثر ہوکر انھون نے سرکشی کی ہو، گو سلطان اویس نے ان کو پھر محکوم کرلیا، مگر قرار واقعی تنبیہ نہ کرسکا، کیونکہ بیرم خواجہ اور قرا محمد موصل، سنجار، میافارقین، ارجیس اور واسط کے علاقون پر بھی متصرف رہے، اس سے دو باتین ظاہر ہوتی ہیں، اوّل یہ کہ یا تو ان کی اہمیت اور خدمتگذاری کی بنا پر اویس نے ان کا قلع قمع کرنا خلاف مصلحت سمجھا یا وہ حقیقتاً اس کے بس کے نہ تھے،

سنہ ۷۷۶ھ مین سلطان اویس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سلطان حسین تخت نشین ہوا، گذشتہ گیارہ سال مین بیرم خواجہ اور قرا محمد نے اتنا زور پکڑ لیا تھا کہ ترکمانون مین کوئی دوسرا قبیلہ ان کا مدمقابل نہ رہا اور یہ خودمختاری کا دم بھی بھرنے لگے تھے، اس لئے تخت نشینی کے بعد ہی سلطان حسین نے ان کو دائرۂ اطاعت مین لانے کے لئے ان کی سرکوبی کرنا لازم سمجھی، اس نے فوج کے دو حصے کئے، ایک نے ترکمانون کے قلعہ بند کماہلی کو تسخیر کیا اور دوسرے حصے کو سلطان خود لے کر الطاق پہنچا، اس وقت تک بیرم خواجہ اور سلطان محمد کی فوجین متحد نہین ہوئی تھین، سلطان حسین نے یہ

دانشمندی کی کہ قرا محمد کو جو ارجیس مین تھا جا کر محصور کر لیا ، اس نے صلح کی درخواست کی اور مہلت چاہی ، مہلت مانگنے سے قرا محمد کی اصلی غرض یہ تھی کہ سلطان حسین کو اس حیلہ سے جنگ کرنے سے باز رکھے ، اور بیرم خواجہ اس کی کمک کے لئے آجائے، چنانچہ جب بیرم خواجہ کی افواج کی آمد کا پتہ چلا تو سلطان حسین نے اسے بھی شکست دی ، اور قرا محمد کو مطیع کر لیا ، اور بیس ہزار گوسفند کا سالانہ خراج ان سے منوا کر چھوڑا ، نیز قرا محمد نے وعدہ کیا کہ سلطان حسین کی واپسی کے بعد تبریز مین حاضر دربار ہوگا ، وہان جاکر اس نے سلطان کو ایسا خوش کیا کہ اس نے خراج قطعی معاف کر دیا ،

سنہ ۷۸۲ھ مین بیرم خواجہ کی وفات کے بعد قرا محمد اس کا جانشین ہوا ، اس کے روز افزون اقتدار اور طاقت کو دیکھ کر بہت سے قبائل بتقاضائے مصلحت اس کی ماتحتی میں آگئے ، اور اس طرح اس کے خیل و حشم مین بیحد اضافہ ہوا ، ادھر تو قرا محمد روز بروز طاقت پکڑ رہا تھا ، ادھر سلطان حسین اپنی عیش پسندی اور آرام طلبی سے سلطنت مین ضعف پیدا کر رہا تھا ، سنہ ۷۸۴ھ مین سلطان احمد نے جو سلطان حسین کا بھائی تھا ، موقعہ پاکر اس کو ہلاک کر ڈالا ، اور اس کی جگہ خود سلطنت کا مالک بن بیٹھا ، سلطان احمد کی اس حرکت نے اکثر امراء کو اس سے برگشتہ

کردیا، اس سے جو فتنہ و فساد پیدا ہوئے وہ آخر کار جلائر خاندان کو تباہ کر کے رہے، سلطان احمد حافظ علیہ الرحمہ کا ہم عصر ہے، خواجہ صاحب اپنے ایک مطلع میں بایں الفاظ اس کا ذکر کرتے ہیں :-

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان احمد شیخ اویس حسن ایلکانی

سارق عادل اور پیر علی باوک دو امیر سلطان احمد کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوئے، کیونکہ اول الذکر نے شہزادہ بایزید کو، ثانی الذکر نے شیخ علی سلطان کے خلاف تخت کا دعوے دار بنایا، یہ دونوں شہزادے سلطان احمد کے چھوٹے بھائی تھے، سلطان علی نے پیر علی باوک اور شیخ علی کا ہفت رود کے مقام پر مقابلہ کیا اور وہاں سے بھاگ کر قرا محمد سے امداد کا طالب ہوا، قرا محمد نے ایک خون ریز جنگ کے بعد پیر علی باوک اور شیخ علی کو ہلاک کر کے سلطان احمد کے متزلزل اقتدار کو دوبارہ استقامت بخشی، مگر سارق عادل اور سلطان بایزید کا معاملہ ابھی یکسو نہ ہوا، اس لئے اپنی ذات اور سلطنت کی حفاظت کے لئے سلطان احمد نے قرا محمد سے دہرا رشتۂ یگانگت پیدا کیا، یعنی اس کی بیٹی سے خود نکاح کیا، اور اپنی خالہ قتلغ وفا کو اس کی زوجیت میں دیا، قرا محمد کی فتح اور اس کے اس رشتہ سے یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ چاہتا تو تخت سلطنت پر قدم رکھنا اس

کے لئے چندان دشوار نہ تھا ،

مگر امیر تیمور اور اس کی ایرانی مہمین قرا یسنلیہ ترکمانون کے لئے سد راہ بنین ، لیکن دوسرے معنی مین وہ ان کی معاون بھی ثابت ہوئین ، کیونکہ امیر تیمور نے ۷۹۵ھ مین بغداد کو فتح کرلیا اور اس سے قبل اور مابعد کی یورشون مین سلطان احمد کو ملک سے فرار ہونے پر مجبور کرکے اس کی سلطنت کے ضعف کو بدرجہا ترقی دی، جیسا کہ عنقریب بیان کیا جائیگا ،

۷۸۸ھ مین تیمور نے ایران اور عراق عرب پر پہلی یورش کی، اس کی آمد ایک زبردست طوفان کے مانند تھی ، جس کے سامنے تخت اور تخت نشین یا تو خمیدہ ہوجاتے تھے ، یا تباہ ، اس سے مفر کی صرف دو صورتین تھین ، یعنی اطاعت اور گریز، قرا محمد امیر تیمورہ بیگ کا سچا خلف تھا ، اس نے نہ اس کے بیٹے قرا یوسف نے کبھی تیمور کی اطاعت قبول نہین کی ، ان کے برخلاف ان کے مخالف ہمسایوں یعنی آق قویونلو ترکمانون نے تیمور اور اس کے بیٹے شاہرخ کی ماتحتی اختیار کرکے ان کو کافی نقصان پہنچایا ، اور خود عزت حاصل کی ، قرا محمد کی کیا بساط تھی جو تیمور کے مقابلہ میں آتا ، تیمور نے اس کے ایک والیس کو غارت کیا ، اور اس کے امیر تعاقب کرتے ہوئے اس کے پیچھے دشوار گذار پہاڑون مین پہنچے ، اس جنگ گریز مین تیمور کے تین نامی سردار کام آئے ، اور باقی جنگ

کو بے سود سمجھ کر واپس لوٹ گئے ،

دو سال بعد قرا محمد نے تیمور کی اس تعدّی کا یہ جواب دیا کہ تبریز پر ۷۹۲ھ مین قبضہ کر لیا ، واضح رہے کہ ۷۹۰ھ مین تیمور نے آذربائیجان کو اپنے ممالک محروسہ مین داخل کرکے میرزا میران شاہ کی ایالت مین دے دیا تھا ، شہزادہ ایک معتبر امیر کو اپنا نائب مقرر کرکے تیمور کے ہمراہ چلا گیا ، قرا محمد نے اہل تبریز کی استدعا پر شہر پر قبضہ کر لیا ، لیکن وہان قیام کی ہمت نہ پڑی ، اس لئے شہر کو جالق اور ترا بسطام کے حوالہ کرکے میران شاہ کے نائب کو ہمراہ لے کر جلد لوٹ گیا ، قرا محمد ۷۹۲ھ مین ایک جنگ کے اندر ملکِ شام مین مارا گیا ، اس کے تین بیٹے تھے ، یار علی والئے موصل ، قرامصر حاکم ادنیک ، اور قرا یوسف جو ان سب مین سے زیادہ لائق تھا ، باپ کا جانشین بنا ،

قرا یوسف نے بھی تیمور کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنایا ، اور باپ کی طرح اس نے بھی ۷۹۴ھ مین تبریز پر قبضہ کیا لیکن اس کے عمال نے باشندگان شہر پر انواع واقسام کے ستم کئے ، جب ۷۹۵ھ مین تیمور نے بغداد کی جانب یورش کی ، تو قرا یوسف تبریز کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا ، تبریز پر قبضہ کرنے کی گستاخی کے علاوہ امیر تیمور کو قرا یوسف سے ایک یہ شکایت بھی تھی کہ وہ حاجیون کے قافلون کو لوٹتا اور تنگ کرتا تھا ، اس

لئے تیمور نے اس کو سزا دینا واجب سمجھ کر قلعہ النجق مین اسے اور قلعہ اونیک مین اس کے بھائی قرا حصر کو محصور کرلیا، یار علی چند روز کے لئے تیمور کی اطاعت قبول کر کے چند روز اس کے ہمراہ رہا مگر بعد مین قرا یوسف سے آملا، قرا یوسف النجق سے بچ نکلا، لیکن قرا حصر ۱۶ رشعبان سے لے کر ۲ رشوال تک محصور رہا اس اثنا مین اپنے خورد سال بیٹے کو معافی کی خواستگاری کے واسطے تیمور کی خدمت مین بھیجا، تیمور اس کی فراست اور تمیز سے بیحد خوش ہوا اور اس کو ایک زرین حمائل بھی عنایت کی، اس کے بعد قرا حصر کی مان نے حرم مین جا کر بیٹے کی جان بخشی کے لئے کوشش کی مگر تیمور کا شروع سے یہ اصرار تھا کہ قرا حصر خود ہمارے حضور مین آئے، آخر کار شہزادہ سلطان محمد کی وساطت سے قرا حصر کی خطا بخشی ہوئی، تیمور کا قاعدہ تھا کہ جب موقع ملتا تھا، تو علماء اور مشاہیر کو سمرقند لے جاتا تھا، اسی قاعدہ کے مطابق قرا حصر بھی سمرقند کو جلاوطن ہوا، نہ معلوم وہان اس پر کیا گذری اور اس کا کیا انجام ہوا،

جب تیمور نے ۷۹۵ھ مین بغداد کو فتح کرلیا تو سلطان احمد اور اس کے ساتھ قرا یوسف دونون سرحد روم مین بھاگ گئے لیکن اس کی واپسی کے بعد پھر چلے آئے، قرا یوسف نے اونیک کے قلعہ کو دوبارہ فتح کرلیا، اور وہان جو تیمور کا حاکم تھا اسے گرفتار کر کے

برقوق حاکم مصر کے پاس بھیج دیا، تیمور تقریباً چھ سال تک گرجستان اور ہندوستان کی مہم مین مصروف ہونے کی وجہ سے قرا یوسف کی طرف توجہ نہ کر سکا، مگر ہندوستان سے لوٹ کر ۸۰۲ھ مین پھر قرا یوسف کے استیصال کی طرف متوجہ ہوا، وہ اور سلطان احمد بھاگ کر سلطان بایزید یلدرم کے پاس چلے گئے، جہان ان کے ساتھ شاہانہ سلوک ہوا، روم کے قیام کے دوران مین قرا یوسف نے ایک یہ زیادتی کی کہ سلطان بایزید سے طہرتن والیٔ آذربائجان پر فوج کشی کرائی، طہرتن تو بچ نکلا مگر سلطان کے اہل وعیال کو اسیر کر کے لے آیا، سلطان بایزید نے قرا یوسف کو آذربائجان کا حاکم بنا دیا لیکن رعایا کے ساتھ جب نباہ دشوار دیکھا، تو وہ اس خدمت سے خود سبکدوش ہوگیا، طہرتن تیمور کے اطاعت گزارون مین تھا، اس لئے اس نے تحریراً تیمور سے فریاد کی، تیمور نے بایزید کو لکھا کہ طہرتن کے اہل وعیال کو اس کے پاس واپس بھیجے اور قرا یوسف کو یا ہمارے حوالہ کرے یا قید کرے یا اسے اپنے ملک سے نکال دے، بایزید نے ان مین سے ایک بات بھی قبول نہ کی، تیمور نے اس کو شکست دے کر گرفتار کر لیا مگر بعد مین آزاد کر دیا، قرا یوسف کی خوش قسمتی دیکھو کہ وہ پھر بھی تیمور سے بچ نکلا اور عراق عرب مین آن موجود ہوا، اس پر تیمور کے حکم کے مطابق مرزا ابابکر نے حملہ کر کے قریب ۸۰۶ھ مین اس کو شکست دی، جس مین اس

کا بھائی یار علی کام آیا اور اس کی بیوی مرزا ابوبکر کے ہاتھوں مین اسیر ہوئی ،

اس شکست کے بعد قرا یوسف اور سلطان احمد سلطان فرخ والئ مصر کے پاس پناہ گزین ہوئے ، وہ تیمور سے خائف تھا ، اس لئے دونون مفرورون کی آمد کی اطلاع تیمور کو دی ، یہان سے حکم پہنچا کہ سلطان احمد کو ہمارے پاس مقید کر کے بھیج دو ، اور قرا یوسف کا بند بند جدا جدا کر کے ہلاک کرو ، اس نے اس حکم کی تعمیل تو نہین کی ، البتہ دونون کو مقیّد کر لیا ،

اس اسیری کے دوران مین قرا یوسف نے ایک شب خواب مین دیکھا کہ امیر تیمور نے اپنی انگلی سے انگشتری اتار کر اس کے حوالہ کی صبح ہونے پر قرا یوسف نے سلطان احمد کے روبرو یہ خواب بیان کیا ، اس نے کہا کہ اس کی تعبیر تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ امیر تیمور کی مملکت کا کچھ حصّہ تمہارے تصرّف مین آئیگا ، قضائے الٰہی سے اسی زمانے مین امیر تیمور نے وسط شعبان ۸۰۷ھ مین جہان فانی سے رحلت کی ، اور قرا یوسف کا ستارہ نحوست کے چکر سے نکلا ، تقریباً ایک ہزار ترکمان جو مصر مین تھے ان کو ہمراہ لے کر یہ با ہمت سردار آذربائجان کے ارادے سے مصر سے روانہ ہوا ، راستے مین مخالفین سے جنگ کرتا ہوا قلعہ ادنیک پر متصرف ہوا ، تیمور کی وفات کے بعد ملک مین بدامنی رونما ہو گئی

تھی ، قرا یوسف نے آذربائیجان کے شمال مغربی علاقوں مین لوٹ کا بازار گرم کرکے اس مین اور اضافہ کیا اور اس کی روک تھام کے لئے مرزا ابابکر اس کا سابق حریف دوبارہ اس سے معرکہ آرا ہوا ، ایک دفعہ ۸۰۹ھ مین اور دوسری مرتبہ ۸۱۰ھ مین ، دونون معرکون مین فتح قرا یوسف کی رہی ، بلکہ دوسری جنگ مین تو مرزا ابابکر کا باپ میرزا میران شاہ ابن تیمور ایک ترکمان سپاہی کے ہاتھ سے مقتول ہوا ،

اس فتح نے قرا یوسف کے لئے راستہ صاف کر دیا ، اور اس نے اپنے دل مین استقلال کی ٹھانی ، لیکن خاندان جلائر کی عظمت ابھی اس کے دل مین باقی تھی ، اس لئے خود تخت سلطنت پر نہین بیٹھا بلکہ اپنے خورد سال بیٹے پیر بداق کو بادشاہ بنا کر آپ وزیر بنا اور اس کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا ، مصر مین سلطان احمد پیر بداق کو اپنا بیٹا کہ چکا تھا ، اس بنا پر چتر اور دیگر لوازم شاہی کی اس سے فرمائش کی ، اس طرح سلطان احمد اور گرد و نواح کے چھوٹے بڑے حکمرانوں سے پیر بداق کو بادشاہ تسلیم کرایا ، قضائے الٰہی سے پیر بداق نے تھوڑے ہی عرصہ مین دنیا سے رحلت کی ، اب قرا یوسف خود مختار بادشاہ بن سکتا تھا ، لیکن پھر بھی وہ ایسا کرنے سے باز رہا ،

۸۱۳ھ مین سلطان احمد نے از راہ عاقبت اندیشی قرا یوسف

کی غیبت مین جبکہ وہ آذربائجان کی مہم مین مصروف تھا تبریز پر حملہ کیا، حالانکہ مصر کی اسیری کے زمانے مین دونون مین عہد وپیمان ہوچکا تھا کہ ایک دوسرے کے علاقے سے سروکار نہ رکھین گے، قرا یوسف کا بیٹا شاہ محمد تبریز کو سلطان احمد کے حوالہ کرکے خود مع فوج کے باہر نکل گیا، قرا یوسف آذربائجان سے بعجلت تمام لوٹا اور اس نے سلطان احمد کو شکست دے کر گرفتار کرلیا، اور امرار کے مجبور کرنے پر اس کا اور خاندان جلائر کے دیگر افراد کا خاتمہ کر دیا، سلطان احمد کے قتل پر رضامند نہ ہونے سے قرا یوسف کی عالی ہمتی اور مروت بیشک ظاہر ہوتی ہے تاہم یہ خون کا داغ اس کے نام سے دور نہین ہوسکتا، یہ واقعہ بالتفصیل تاریخ شاہرخی مین مذکور ہے، یہان صرف اس کا ماحصل بیان کیا گیا ہے،

سلطان احمد کے قتل کے بعد قرا یوسف نے اپنے بیٹے شاہ محمد کو عراق عرب اور بغداد کا حاکم بنا دیا، گرد و نواح کے سردارون نے اس کی اطاعت قبول کی اور ۸۱۵ھ مین اس نے سلطانیہ، طارم اور قزوین کو جو تیمور کے بیٹے اور جانشین شاہرخ کے علاقے تھے اپنی سلطنت مین شامل کرلیا،

قرا یوسف کی قابلیت اور قوت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ خود تیمور اس سے خائف تھا، اور اس نے اپنے عمال کو متنبہ کر رکھا تھا کہ اس کی طرف سے ہمیشہ چوکنے رہین، نیز جب

شاہرخ نے اپنے بھائی میرزا میران شاہ کے قتل کا انتقام اور سلطانیہ طارم اور قزوین کے واپس لینے کی نیت کی تو اپنے بھتیجے مرزا اسکندر کو ۸۱۶ھ مین شرکت عمل کی دعوت دی تاکہ پوری فوجی استعداد سے قرایوسف پر حملہ کرے، مگر اسکندر نے الٹی بغاوت کی، اس لئے یہ مہم سات سال تک ملتوی رہی، پھر جب ۸۲۳ھ مین ایک لشکر عظیم فراہم کرچکا تو پہلے صلح صفائی سے کام نکالنا چاہا، اس غرض سے ایک معتبر ملازم کو قرایوسف کے پاس بطور ایلچی کے بھیجا، چونکہ قرایوسف عملی طور پر بادشاہ استقلال تھا، اور گرد و نواح کے امرا اس کے مطیع تھے اور اس کے حکم سے سرتابی نہین کرسکتے تھے، نیز اس نے سنگین قلعے تعمیر کرکے ملک کے استحکام اور حفاظت کا سامان بہم پہنچالیا تھا، اس لئے سفارت سے شاہرخ کا مطلب پورا نہ ہوا، شاہ رخ کے ایک امیر غیاث الدین شاہ ملک نے بھی اپنا ملازم قرایوسف کے پاس بھیجا تھا، مگر قرایوسف نے اسے قید کرلیا، اور آذربائیجان بغداد، ایران وغیرہ مقامات سے لشکر فراہم کرکے خزانے تقسیم کئے، اس کے بیٹے جہانشاہ حاکم سلطانیہ نے بھی سامان جنگ بہم پہنچایا، شاہرخ بھی اپنی فوج کی استعداد اور قوت کی طرف سے مطمئن ہوکر روانہ ہوا، اور ساتھ کے ساتھ روحانی امداد کا بھی انتظام کیا، یعنی کئی ہزار حافظون سے انا فتحنا لک کا ختم کرایا، قرایوسف اگرچہ بیمار تھا، مگر فوج لے کر وہ بھی آیا، ابھی دونون لشکر فاصلہ پر ہی تھے

کہ پنجشنبہ ۷ ر ذی قعدہ کو قرا یوسف اوجان کے مقام پر درد قولنج سے مرگیا، شاہرخ اور اس کے لشکر نے اس مرگ ناگہانی کو فتح غیبی سمجھ کر خوشی کے شادیانے بجائے، ادھر قرا یوسف کا لشکر بے سردار ہونے کی وجہ سے پراگندہ ہوگیا ۔

قدرت نے قرا یوسف کو اولوالعزمی، عالی ہمتی اور دیگر مردانہ اوصاف غیر معمولی درجہ مین کرامت فرمائے تھے، اگرچہ وہ معمولی سپاہی تھا اور تمام عمر کشمکش اور کوشش ہی مین گذری، پھر بھی اس مین انسانیت اور پاس ادب کا مادہ تھا، اور میرزا میران شاہ کے قتل کو اس نے معیوب سمجھ کر اس کے قاتل کو سزا دی، مرزا ابابکر کی شکست کے بعد جب اس کے حرم دربار مین آئے، تو ان سے احترام سے پیش آیا اور جب اس کی بیٹی جوان ہوئی تو کسی دوسرے امیر کی زوجیت مین دینے کی بجائے خود اس سے نکاح کیا، گو سلطان احمد کے قتل کی ذمہ داری تمامتر اسی پر عائد ہوتی ہے، پھر بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس نے محض امرا کے اصرار سے ایسا کیا، مرزا ابابکر کو شکست دے کر جب یہ تبریز پر متصرف ہوا تو اعلان کر دیا کہ اب کسی پر جبر وستم نہ ہوگا، بلکہ رعایا کے ساتھ انصاف کا سلوک کیا جائیگا۔ اس نے لوٹ مین سے خود کوئی حصہ نہین لیا، اس کی عظمت اور طاقت کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ تیموری خاندان کے چند شہزادے جن مین

سعد وقاص ابن شاہرخ بھی شامل ہے، مختلف اوقات مین اس کے پاس پناہ گزین ہوئے اور سب کے ساتھ ان کی حیثیت کے مطابق سلوک ہوا، صاحب روضۃ الصفا کا قول ہے، کہ اس کے زمانے مین سپاہ اور رعایا دونون خوش حال تھے، اور سلاطین اور ملوک اس سے خائف رہتے تھے، وہ وضیع و شریف کی رعایت کرتا تھا، اور مشائخ سے مؤدبانہ پیش آتا تھا، اور بعض اوقات اسیران جنگ کو آزاد کرکے زاد راہ بھی دیتا تھا، اس کی شہرت ایران اور خراسان سے گذر کر ختا تک پہنچ گئی تھی، اس کے ملک مین غلہ ارزان تھا، اور ضروریات کی دوسری اشیا ارزاں تھین، الغرض وہ بہمہ صفت موصوف سردار تھا، اور اس کے پیرو اس پر جان فدا کرنے کو آمادہ تھے، اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ اس کی ذاتی زندگی مین پابندئ شرع کم نظر آتی تھی، چونکہ یہ تیموری مؤرخین کا قول ہے، ممکن ہے کہ اس مین کسی قدر مبالغہ بھی ہو،

قرا یوسف کی وفات کے وقت اس کے بیٹون مین سے شاہ محمد بغداد مین متمکن تھا، اسکندر کوزکول مین، اسپند عبد الجوز مین، جہان شاہ سلطانیہ مین اور ابوسعید ارزنجان مین حاکم تھے، اس کی وفات سے بہت ابتری پھیلی، چنانچہ قرا یوسف کی ... اس کے خزانے سمیٹ کر اذنیک کو روانہ ہوگیا، اس ...

دیگر امیر جس طرف جس کا منہ اٹھا چلے گئے، تاریخ وفات کسی نے منظوم کی ہے

وفات میر یوسف شاہ تبریز — کتابت شد بتاریخ کتابت

امرائے تبریز نے قرا یوسف کی نعش کو ارجیس لے جا کر اس کے آبائی مدفن میں سپرد خاک کیا، ادھر شاہرخ نے آذربائجان میں اپنا نظم قائم کیا، چنانچہ ۱۵ ذی قعدہ کو موسی تاکی امیر کو سلطانیہ کا حاکم مقرر کیا، مرزا بایسنقر کو تبریز اور وہاں کے کارخانوں کے ضبط کا حکم ملا، سکہ و خطبہ شاہرخ کے نام کا جاری کیا، اور بدلیس، اخلاط، ارجیس، عادل جوز، موش وغیرہ مقامات پر جو قراقوینلو ترکمانوں کے آبائی موطن تھے تسلط قائم کیا، ان انتظامات کے بعد شاہ رخ کی یہ رائے ہوئی کہ سرداروں اور کلانتروں کو انعام اکرام اور وعدے وعید کے ساتھ ان کے گھروں کو بھیج دیا جائے، اور خود بھی تبریز کو مراجعت کرے، لیکن ان کے انتظامات کے باوجود اسکندر، اسپند اور قرا یوسف کے دوسرے بیٹے لشکر جمع کر کے اخلاط اور عادل جوز تک بڑھے چلے آگئے، قرا عثمان بایندری اور دیگر امراء نے شاہرخ پر زور دیا کہ جب تک قرا یوسف کے اتباع کا قرار واقعی استیصال نہ ہوگا، اس سرزمین میں امن و امان ناممکن ہے، مگر شاہرخ نے اس مسئلہ پر چنداں توجہ نہ کی، نتیجہ وہ اسکندر کو جو قرا یوسف کی جگہ قبیلہ کا سردار بنا تھا موضع بخشی میں

شعبان ۸۲۴ھ مین سخت جنگ کے بعد شکست دے کر وسط شعبان مین تبریز پہنچا، البتہ اتنا ضرور کیا کہ سلطانیہ، قزوین، رے اور قم وغیرہ ضروری مقامات پر چھاؤنیان قائم کر دین، اور ۱۹ر شوال ۸۲۴ھ کو وہ ہرات واپس آگیا،

شاہرخ کے پیٹھ پھیرتے ہی اسکندر نے آذربائجان میں دوبارہ تسلط قائم کرلیا، وہ قراقوینلو بادشاہون مین سب سے زیادہ بہادر بادشاہ ہؤا ہے، حتیٰ کہ اس کی بہادری کی داد دشمنون نے بھی دی ہے، لیکن قسمت سے مجبور تھا، مذکورہ بالا جنگ کے علاوہ شاہرخ اور اس کے درمیان دو لڑائیان اور ہوئین، جن میں فتح شاہرخ کی رہی، ۸۳۲ھ مین جب دوسری مرتبہ اسکندر کو شکست دی تو شاہرخ نے سمجھ لیا کہ اس کا زیر کرنا آسان کام نہین، کیونکہ ہر شکست کے بعد وہ سلطان روم کے علاقہ میں چلا جاتا ہے، اور جب میدان خالی پاتا ہے تو واپس آن کر از سر نو ملک پر متصرف ہوجاتا ہے، علاوہ اس کے جو سردار اور والیان ملک وابستۂ دولتِ شاہرخی ہین ان کو یا تو حملے کر کے تنگ کر دیتا ہے یا ہلاک کر دیتا ہے، اس لئے اس نے یہ تدبیر نکالی کہ اسکندر کے چھوٹے بھائی ابوسعید کو آذربائجان کا حاکم بنا دیا، لیکن اسکندر نے شاہرخ کی واپسی کے بعد ایک سال کے اندر ہی ابوسعید کو لقمۂ اجل بنا دیا اور خود آذربائجان کا حاکم بن بیٹھا، ۸۳۸ھ مین امیر خلیل شروانی

نے جو شاہرخ کی اطاعت کا دم بھرتا تھا، شاہرخ کو لکھا کہ اسکندر آذربائجان کا فرمانروا بنا ہوا ہے، اور اب شروان کے درپے ہے، مجبوراً شاہرخ لشکر لے کر روانہ ہوا، ۱۵ر ذی الحجہ ۸۳۸ھ کو جہانشاہ اور شاہ علی ابن شاہ محمد ابن قرا یوسف اسکندر سے جدا ہو کر رے کے مقام پر شاہرخ کے لشکر مین حاضر ہوئے، ادھر قطب الدین مرزا محمد جوکی نے اسکندر کا تعاقب کر کے اسے سرحد روم پر بھگا دیا، اس قربہ شاہرخ نے ۸۳۹ھ مین جہانشاہ کو آذربائجان کی ریاست کا فرمان عطا کیا، کچھ عرصہ کے بعد اسکندر پھر لوٹ آیا اور صوفیان تبریز مین جہانشاہ سے معرکہ آرا ہوا، لیکن شکست کھائی، متواتر شکستوں اور اپنوں کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر اسکندر قلعہ النجق مین چلا گیا، وہان اس کے ناخلف بیٹے قباد نے باپ کی حرم لیلےٰ سے سازش کر کے اوائل شوال ۸۴۱ھ مین اس کو قتل کر دیا،

مرزا جہانشاہ ابن قرا یوسف نے اولاً تقریباً گیارہ سال تک شاہرخ کا باجگذار بن کر آذربائجان پر حکومت کی، لیکن جب ذی الحجہ ۸۵۰ھ مین شاہرخ نے دنیا سے رحلت کی اور تیمور کی سلطنت اس کے اخلاف مین منقسم ہوگئی تو جہانشاہ خودمختار ہوگیا، مرزا سلطان محمد بن بایسنقر مرزا ابن شاہرخ کے حصہ مین عراق اور فارس کے علاقے آئے تھے، اور وہ اپنے آپ کو شاہرخ کا قائم مقام تصور کیے بیٹھا

تھا جہان شاہ نے اس کی اطاعت سے انکار کیا اور سلطانیہ اور قزوین کے اضلاع پر اپنا قبضہ کرلیا، جب نامہ و پیام اس عقدہ کو حل نہ کرسکے تو لشکر کشی تک نوبت پہنچی، آخر کار مصلحت اندیشون کی وساطت سے صلح اس طرح ہوئی کہ جہان شاہ کی بیٹی مرزا سلطان محمد کے نکاح مین آئی اور قزوین و سلطانیہ شیر بہا کے عوض جہانشاہ کو ملے، مگر مرزا سلطان محمد کو سلطنت زیادہ راس نہ آئی، کیونکہ ۸۵۵ھ مین مرزا ابوالقاسم بابر اس کے سگے بھائی نے چناران کے مقام پر شکست دے کر اس کو قتل کرڈالا، اور ساتھ ہی اس امر کی اطلاع جہان شاہ کو بھی بھیجی،

شاہرخ کی وفات کے بعد ہی تیموریون مین طوائف الملوکی رونما ہوگئی تھی، اور تیمور کی سلطنت کے حصے بخرے ہوکر رو بانحطاط تھی، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہان شاہ نے اپنے داماد سلطان محمد کے قتل کے بعد ہی ۸۵۶ھ مین ساوہ پر جو ملک عراق کی کنجی تھی قبضہ کرلیا، اور قم کا محاصرہ کرکے ۸۵۷ھ میں اس پر تسلط جمالیا، اور آذربائجان سے اپنے بیٹے پیر بداق کو طلب کیا، اس نے آن کر شیراز کو فتح کرکے وہان اپنی حکومت قائم کرلی، امرائے چغتائی وہان سے پسپا ہوکر شبانکاوہ چلے گئے، مرزا الغ بیگ ابن شاہرخ اور مرزا عبداللطیف کے فوت ہونے پر ابوسعید نبیرہ مرزا میرانشاہ ابن تیمور نے ماوراءالنہر کے علاقے پر قبضہ کرلیا تھا اس کے خوف سے مرزا ابوالقاسم بابر جو اس وقت خراسان پر متمکن تھا قراقوینلو ترکمانون کے خلاف لشکرکشی

نہ کرسکا، تاہم ابو سعید کے خرخشے کو رفع کرنے کے لئے اس نے ۸۵۵ھ مین تین چار ماہ تک سمرقند کا بے سود محاصرہ بھی کیا، اس خانہ جنگی کی بدولت جہانشاہ ایران مین اپنی سلطنت کو وسعت دیتا چلا گیا، اور عراق عرب کو بھی اپنے تصرف میں لے آیا، مرزا ابوالقاسم بابر کی وفات کے بعد ۸۶۱ھ مین اس کے بیٹے مرزا شاہ محمود اور مرزا ابراہیم ابن علاؤالدولہ ابن مرزا بایسنقر ابن شاہرخ نے ایک دوسرے پر فوج کشی کی، مرزا ابراھیم استرآباد کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک جہانشاہ کے لشکر سے دوچار ہوا اس جنگ مین تقریباً پانچ سو نامی امرائے چغتائی تلف ہو گئے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا ابراھیم اور شاہ محمود کو سلطنت کرنی نصیب نہ ہوئی،

جہانشاہ نے ایران کو فتح کرکے اپنے بیٹون مین تقسیم کر دیا، چنانچہ گازرون اور اس کے اضلاع کا محمدی مرزا کو فرمانروا بنایا، کرمان ابوالقاسم مرزا کے حصّہ مین آیا، اور شیراز کا علاقہ پیر براق کے سپرد ہوا،

ایران کے نظم ونسق سے فارغ ہو کر جہان شاہ نے خراسان کا رُخ کیا، اور ہرات پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا، اہل شہر قلعہ کی سنگینی اور ذخیرون کی فراوانی پر مغرور تھے، جب ترکمانون نے قلعہ کی دیوار کا ایک حصّہ گرا دیا تو احمد یساول گلے مین تلوار اور کفن پہن

کرجہان شاہ سے اہل شہر کی جان بخشی کا طالب ہوا، الغصہ شاہرخ ابن تیمور گورگان کے دارالحکومت پر جہان شاہ ابن قرا یوسف ۸۶۲ھ مین قابض ہوگیا۔ لیکن رعایا کی تالیف قلب کے لئے اس نے ملکی و مالی امور کو بدستور سابق بحال رکھا، جو لوگ جہان شاہ کے خوف سے ترک وطن کر چکے تھے، وہ اس کے عدل و انصاف کے آوازہ سے واپس آگئے، جہان شاہ نے عید رمضان اور عید قربان ہرات ہی مین منائین، لیکن وہ اپنے ملک سے اتنے فاصلہ پر غیر ملک مین گھس آیا تھا کہ اس کے لئے خطرے کی صورت پیدا ہوگئی تھی، چنانچہ اس کی اس غلطی کو محسوس کرکے سلطان حسین ابن منصور بن مرزا بائقرا ابن عمر شیخ ابن تیمور نے جو بعد مین خراسان کا زبردست بادشاہ ہوا استرآباد کو فتح کرکے جہانشاہ کے لئے مزید خطرے کی صورت پیدا کردی، نیز سلطان ابوسعید نے جو بابر کا دادا تھا، فوجی نقل و حرکت شروع کردی، جہان شاہ نے ہراسان ہوکر شیراز سے پیر بداق کو طلب کیا، وہ اس طویل مسافت کو سولہ روز مین طے کرکے آپہنچا، لیکن ابوسعید کے لشکر کے مقابلہ مین اس کو کامیابی حاصل نہ ہوئی، ادھر تو جہان شاہ سلطان ابوسعید کے ساتھ مصالحت مین مصروف تھا، ادھر اس کا بڑا بیٹا حسن علی آذربائجان مین قید خانے سے نکل کر باپ کے خزانے لٹا لٹا کر لشکر جمع کر رہا تھا، اور اس فکر مین تھا کہ خود مختار بن بیٹھے، سلطان

ابوسعید کا جہان شاہ سے یہ مطالبہ تھا کہ جس طرح شاہرخ کے زمانے مین محکوم تھا اب بھی محکوم اور باجگذار ہوکر رہے، اور ایران اور خراسان کے تمام صوبے جو فتح کر لئے ہین وہ واپس کرے، آخر جہان شاہ کے وزیر سید عاشور نے اس معاملہ کو طے کیا، اور یہ قرار پایا کہ خراسان سلطان ابوسعید کے حوالہ کیا جائے، اور جہان شاہ اپنے ملک کو واپس جائے،

جہان شاہ نے اس قصہ کو طے کر کے بعجلت تمام آذربائجان کو مراجعت کی، اور حسن علی کو شکست دے کر دوبارہ قید کر دیا، ابھی حسن علی کا معاملہ یکسو ہؤا ہی تھا، کہ پیر براق نے شیراز مین استقلال پیدا کر لیا۔ اس کی اور شکایتین بھی جہان شاہ کو پہنچین، مثلاً یہ کہ علماء اور شعراء کی صحبت کا اس درجہ شیفتہ تھا کہ سفر اور حضر مین ان کو ساتھ رکھتا تھا، اور چونکہ خود سفر کی مشقتون کو خاطر مین نہین لاتا تھا اس لئے ان کی تکلیفون سے غافل تھا۔ اس کی سطوت اور جباری کی ایک دوسری مثال یہ بھی ہے، اس نے دہقانیون کو حکم دے رکھا تھا کہ تختون پر مٹی ڈال کر سبزی کی کاشت کرین، غرض یہ تھی کہ سفر مین تازہ سبزیان دسترخوان پر آئین، ۸۶۴ھ مین جہان شاہ نے پیر براق کو ایک عتاب آمیز خط لکھا، لیکن اس کا بیٹے پر کچھ اثر نہ ہؤا، آخر کار خود شیراز پہنچا، وہان اکابر و اہالی شیراز نے اس کا خیر مقدم کیا اور قاضی نظام الدین عبداللہ شروانی نے

جو منصب صدارت پر فائز تھا، بادشاہ کی خدمت مین حاضر ہوکر پیر براق کی شکایت کی کہ علماء اور شعراء اس سے تنگ ہین، اور اکابر و افاضل شیراز سے جبراً شعرائے متقدمین کے دیوانون کے جواب لکھواتا ہے، جہان شاہ نے بیٹے کے اس رویہ کی عذر خواہی کی اور پچاس ہزار شاہرخی کے صرف سے چند قطعے زمینون کے خرید کر علماء اور سادات کی کفالت کے لئے وقف کر دئیے، جب جہانشاہ خود پیر براق کو راہ راست پر نہ لاسکا تو اس نے پیر براق کی والدہ کو درمیان مین ڈال کر بیٹے کو پرچایا، شیراز کی بجاے بغداد کی حکومت اس کو دی، القصہ اس طرح بیٹے کو پھسلا کر بغداد لایا، پیر براق شیراز سے چلتے چلتے بھی بعض علماء کو اپنے ہمراہ بغداد لے گیا، جن مین سے ایک خواجہ جلال الدین صاعدی تو راستے مین سے بھاگ کر لوٹ آئے، یہ اغلباً فضل الدین روزبہان صاحب تاریخ عالم آرائے امینی کے ایک بزرگ تھے، اور شاہ صدر الدین کرمانی ان سے کسی بات پر ناراض ہوا تو ان کو غرق کرکے ہلاک کرا دیا،

جہان شاہ پیر براق کو بغداد لے تو آیا، لیکن کدورت دونون کے دلون مین باقی تھی، بیٹے نے بغداد پہنچ کر پھر پاؤن نکالے اور خود مختاری کا جذبہ پھر رنگ لایا، ظالم باپ نے اس مرتبہ بیٹے کا خاتمہ کرنے پر کمر باندھی اور ۸۷۰ھ لشکر عظیم لے کر بغداد کو

آگھیرا ، سات مہینے تک محاصرہ رہا ، اس اثنا مین دو مرتبہ جنگ ہوئی ، جس مین جہان شاہ کو شکست ہوئی ، محاصرے کے دوران مین پیر بداق نے بعض موقعون پر کمال مستعدی کا اظہار کیا ، چنانچہ ایک مرتبہ اپنے سامنے فصیل کے رخنے کی مرمت کرائی ، خود کھڑے ہو کر برج کی مرمت کرائی ، اور پھر اس کو پتھر اور لوہے کی سلاخون سے مستحکم کر دیا ، شہر مین غلہ کی کمی سے لوگ نالان تھے ، اور شہر پناہ پر سے اپنے آپ کو گرا دیتے تھے ، آخرکار جب باپ بیٹے مین صلح ہوئی ، اور پیر بداق مطمئن ہو کر بیٹھا تو باپ کے اشارے سے محمدی مرزا نے پیر بداق کا ایک روز کام تمام کر دیا ، اس طرح جہان شاہ نے اس ہونہار فرزند کو جسے مورخین اس کی اولاد مین بالاتفاق اشجع اور ارشد بتاتے ہین ، ۸۷۱ھ مین ہلاک کر دیا ،

اس مضمون کے ابتدائی حصہ مین قراقونیلو اور آق قراقو نیلو قبیلون کی باہمی رقابت اور عداوت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ، اس کی اغلب وجہ اختلافِ مذہب تھی ، یعنی قراقونیلو شیعی تھے ، اور آق قونیلو سنّی ، فضل الدین روز بہان الاصفہانی قراقونیلو مذہب کے بارے مین لکھتا ہے :-

"چنانچہ در بسے از ملوک قاراقونیلو این شیوۂ ذمیمہ (یعنی تشیع) موجود بود ، کہ بواسطۂ اتفاقات و مصاحبان

ملحد طبیعت از جادۂ حق وصواب انحراف یافتہ بودند"
قاضی نور اللہ شستری مصنف مجالس المومنین بھی ان کے تشیع کے قائل تھے ، بہرکیف اس مذہبی تفرقہ نے جو نقصان عالم اسلام کو پہنچایا ہے اس سے قراقوینلو اور آق قوینلو بھی نہین بچے ، اس کی بنا پر ان مین گہری عداوت تھی ، اور اتحاد اور اشتراک عمل مفقود چونکہ قراقوینلو ابتدار مین زیادہ طاقتور تھے ، اس لئے وہ آق قوینلو کے ساتھ بسا اوقات زیادتیان بھی کر جاتے تھے ، چنانچہ قرا یوسف نے ۸۱۲ھ مین قراعثمان بایندری کو شکست دی اور اس کے بیٹے امیر علی بیگ کو مدت تک ایسا محبوس رکھا کہ شاہرخ کے عمل نے قرا یوسف کی وفات کے بعد اسے آزاد کرایا ، ۸۳۲ھ مین جب اسکندر ابن قرا یوسف شاہرخ کی افواج سے شکست کھا کر بھاگا تو راستہ مین قراعثمان جو شاہرخ کی اطاعت کا دم بھرتا تھا اس کا مزاحم ہوا ، اسکندر نے اس کو قتل کر دیا ، دیار بکر کو قراقوینلو اپنا آبائی علاقہ سمجھتے تھے ، اور قرا یوسف نے اسے ۸۱۲ھ مین قراعثمان کو شکست دے کر فتح کیا تھا ، ۸۷۲ھ مین ساٹھ سال بعد اسی پر جہانشاہ اور حسن بیگ اوزون بایندری ابن امیر علی بیگ ابن قراعثمان کے درمیان جنگ ہوئی ، کیونکہ اس پر آق قوینلو قابض ہو گئے تھے ، اس مہم کے دوران مین جہان شاہ نے بعض قصورون پر اہل لشکر کو ایسی سخت سزائین دین کہ قاضی

زین الدین علی حسن بیگ کے صدر جو سفیر ہو کر جہان شاہ کے پاس آ رہے تھے ، ان سزاؤن کا حال سن کر راستے ہی سے لوٹ گئے ، بعد مین دوسرے سفیر آئے لیکن جہان شاہ کی آنکھیں غرور اور جہل نے بند کر دی تھین ، صلح منظور نہ کی ، حسن بیگ پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گیا جہانشاہ کا لشکر آگے بڑھا ، مگر حسن بیگ کے لشکر کے سامنے کچھ نہ کر سکا ، دو تین مہینے اسی طرح گذر گئے ، امرا ر جنگ کی طوالت اور جہانشاہ کی رعونت اور بد دماغی سے تنگ آگئے تھے ، اور فرض کی ادائگی مین کوتاہی کرتے تھے ، چنانچہ ایک روز قاسم بیگ سردار اور ایک اور امیر جس کا نام ابراہیم شاہ تھا ، دربار مین آئے تو جہانشاہ نے طنزاً کہا کہ "جب آپ جیسے امیر ہون اور ہر ایک اپنے آپ کو شاہ رخ کے امرا سے کم نہ سمجھتا ہو تو یہی حال ہوتا ہے ، آج پیر براق زندہ ہوتا تو دیکھتے کہ کیا کارہائے نمایان انجام دیتا ، " غرضیکہ جہانشاہ وہان سے ناکام لوٹا اس نے معدودے چند امرا ر اور سوار اپنے ہمراہ رکھ کر باقی فوج کو آگے روانہ کر دیا ، حسن بیگ نے موقع پا کر ایک روز صبح کو جبکہ وہ بستر راحت پر دراز تھا حملہ کر دیا ، جہانشاہ بھاگ کر جان بچانی چاہتا تھا ، مگر ایک مجہول الاسم سپاہی نے اس کے قیمتی لباس کے لالچ مین اس کو قتل کر دیا ، حسن بیگ نے اس کے امرا ر مین کسی کو باقی نہ چھوڑا ، اس کے ایک بیٹے محمدی مرزا کو پیر براق کے قتل کے جرم مین ہلاک کیا اور دوسرے بیٹے یوسف مرزا کو نابینا کیا

کسی نے یہ شعران کی حالت پر خوب برجستہ کہا ہے :-

چو دولت ازان خاندان درگذشت　　یکے کشتہ شد دیگرے کور گشت

جہانشاہ کے قتل کی تاریخ کسی موزون طبع نے اس طرح نظم کی :-

اردوئے جہان شاہ بہادر نویان　　باآن ہمہ اسباب زبردستی وپشت

ثانی عشر شہر ربیع الثانی　　ویران شد و تاریخ حسن بیگ بکشت

قراقوینلو ترکمانون مین جہانشاہ کے مرتبہ کو کوئی بادشاہ نہین پہنچا، آذربائیجان، عراقین، ایران، آرمینیہ، گرجستان اور بحر عمان کا تمام ساحل اس کی قلمرو مین تھے، وہ با مذاق اور موزون طبع بادشاہ تھا اور حقیقی تخلص کرتا تھا، اس کا ایک منظوم خط پیر براق کے نام بعض تذکرون مین موجود ہے، ذیل کے دو شعر بعض نسخون مین دیکھے گئے، اس لئے یہان درج کئے جاتے ہین :-

از لطف دوست یافت حقیقی مراد دل　　بیجد وجہد وطاعت وبے منت عمل

جہانشاہ نے ایک مرتبہ شاہرخ کو اپنے بھائی اسپند والی بغداد کے بارے مین ایک مراسلہ بھیجا تھا، اس مین ذیل کا شعر بھی درج تھا :-

کوس رحلت راسوئے بغداد باید کوفتن　　بہر دفع درد سر اسپند باید سوختن

جہانشاہ کو عمارات کا خاص شوق تھا، اس نے تبریز مین شاندار مساجد، مقبرے اور حمام تعمیر کر کے شہر کو معقول ترقی اور زینت بخشی، اس کی مسجد اور باغ اپنی شان کے اعتبار سے

قابل ذکر ہین ، علی الخصوص باغ جس مین شاہ عباس ثانی نے بھی ایک موقع پر جلوس کیا تھا ، آذربائیجان کے علاقہ کو اس نے بہت رونق دی ، اور رعایا کی بہبودی اور رفاہیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ، مگر اس کی بددماغی ، ظلم پسندی اور مذہب کی تحقیر ان تمام خوبیون کو نسیاً منسیا کر دیتی ہین ، جہان شاہ نے شاہ اسمعیل صفوی کے جد سلطان جنید کو اس وہم کی بنا پر اپنے علاقہ سے بدر کر دیا کہ کہین وہ قوت پکڑ کر اس کے لئے کوئی خطرہ نہ پیدا کر دین ، اس کے برخلاف حسن بیگ اوزون نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنی بیٹی بھی ان کی زوجیت مین دی ،

جہانشاہ کے عہد کی کامیابی زیادہ تر امیر علی شکر بیگ کی فراست اور دانشمندی کا نتیجہ تھی ، یہ شخص ادنیک کے ہیرو قرا حصر کے اخلاف مین سے تھا ، اور جہانشاہ نے اس کو اپنا وزیر بنا رکھا تھا ، اس کی صلح پسندی اور سلامت روی نے جہانشاہ کو اکثر موقعون پر ظلم سے باز رکھا ، علی شکر بیگ خود بھی ایک وسیع علاقے کا مالک تھا ، جس مین ہمدان ، دینورہ ، شوستر و کردستان وغیرہ شامل تھے ، یہ علاقہ شاہان صفوی کے زمانے مین بھی قلمرو علی شکر کے نام سے موسوم تھا ، اسکندر ابن قرا یوسف نے اپنی بیٹی اس کی زوجیت مین دی ، جہان شاہ نے اپنے دو بیٹون محمدی مرزا اور یوسف مرزا کی شادی اس کی دو بیٹیوں سے کی ، ظاہر ہے

کہ یہ رشتے اس کے عالی مرتبہ ہونے کی وجہ سے تھے، جب ۸۶۴ھ
مین اس کا انتقال ہوگیا تو جہان شاہ نے اس کے سب سے بڑے
بیٹے پیر علی کو اس کا منصب تفویض کیا، اور دوسرے بیٹے یار علی کو
اصفہان کا حاکم مقرر کیا،

جہانشاہ کے قتل کے بعد قراقوینلو ترکمانون کا وہی حال ہوا جو
قرایوسف کے قتل کے بعد ہوا تھا، لیکن فرق اتنا تھا کہ اسکندر
اور جہان شاہ جیسے باہمت اور اہل جانشین موجود تھے، نیز مخالفین
بہت طاقتور بھی نہین تھے، جہان شاہ کے بیٹون مین سے پیر براق
اور محمدی مرزا یعنی مقتول اور قاتل دونون تلوار کے گھاٹ اتر چکے
تھے، یوسف مرزا کی آنکھون مین سلائی پھر چکی تھی، اب رہے
ابوالقاسم مرزا اور حسن علی، ان مین سے ثانی الذکر ۸۷۲ھ مین
تخت نشین ہوا، اور چونکہ تمام عمر قید مین گذاری تھی، اور افیون کا
عادی تھا، اس لئے مخبوط الحواس بھی تھا اور ظالم بھی، چنانچہ ابوالقاسم
مرزا کو اس نے قتل کیا، یہ اراذل نواز تھا، اور امرائے پدر کو خوار
رکھتا تھا، اس وجہ سے بعض بااثر امرا حسن بیگ کے پاس چلے
گئے، کبھی دیوانون کی سی حرکتین کرتا تھا، مثلاً جب بخشش کرتا تھا
تو بوریان بھر کر روپیہ دیتا تھا، ایسا کرنے سے اس کی غرض یہ تھی،
کہ افلاس اور تمول دور کرکے مالی یکرنگی پیدا کردے، گویا کہ ایک
معنی مین زمانۂ حال کا سوشلسٹ تھا،

حسن بیگ اوزون نے اپنے بیٹے اغرلو محمد کو حسن علی کے استیصال کے لئے مقرر کیا، اس سے شکست کھا کر حسن علی معہ پسران علی شکر کے سلطانیہ مین سلطان ابوسعید سے جا ملا، اور سلطنت اور خزانے اس کے قدمون پر رکھ دئے، سلطان ابوسعید اس لالچ مین آیا تھا کہ جس طرح جہان شاہ سے خراسان کا ملک مفت مین لے لیا تھا، اسی طرح حسن بیگ سے فارس اور عراق لے لے، قراقوینلو سردار اور حسن بیگ کے نمایندے اس سے امداد لینے کے لئے آئے تو ان کو محض وعدون سے خوش کر کے اپنا کام لینا چاہا، لیکن حسن بیگ نے ایک خط مین یہ شعر لکھ کر

گرت ہواست کہ معشوق نگسلد پیمان نگاہ دار سر رشتہ تا نگہ دارد

متنبہ کر دیا تھا، آخر کاران لطائف الحیل کے پیچھے سلطان ابوسعید حسن بیگ کے ہاتھون ۸۷۳ھ مین قتل ہوا اور اس کے بعد حسن علی بھی آغرلو محمد سے جنگ کر کے ہمدان مین مارا گیا، قراقوینلو ترکمانون کی سلطنت کا چراغ ۵۹ سال کے بعد گل ہوگیا یوسف مرزا ابن جہان شاہ، سلطان علی ولد حسن علی مختلف اوقات مین دشمنون کی نذر ہوئے، پیر علی، یار علی اور بہرام بیگ پسران علی شکر سلطان محمود ابن سلطان ابوسعید کے پاس حصار شادمان گئے اور وہین اپنی بہن بادشاہ بیگم بیوۂ محمدی مرزا کا عقد سلطان محمود بابر کے چچا سے کر دیا، جب اس کے ساتھ زیادہ

عرصہ تک نہ بنی تو سلطان حسین والئی ہرات کے پاس چلے گئے، پھر اس سے علحدہ ہو کر بابر کے ایک دوسرے چچا مرزا ابو بکر کے ساتھ شامل ہو گئے، یہ شہزادہ سلطان حسین سے مصروف پیکار تھا، چونکہ اقبال یاور نہ تھا، اس لئے پیر علی اور بہرام بیگ اور دیگر رفقا سمیت قتل ہوا، پیر علی کا بیٹا بیرک بیگ اپنے بیٹے سیف علی کو لے کر بدخشان آگیا، کچھ عرصہ بعد سیف علی بابر کے امراء مین داخل ہو گیا اور وفات کے وقت غزنی کا حاکم تھا، مشیت الہٰی نے قرایوسف اور قرا حصر کے اخلاف کو تیمور کے اخلاف کی خدمت پر مامور کیا جیسا کہ سیف علی کے بیٹے بیرم خان اور اس کے بیٹے عبدالرحیم کی کارگذاریون سے ظاہر ہے،

اب سلطنت قطب شاہی کے بانی کا قراقوینلو ترکمانون سے جو تعلق ہے اس کا عرض کرنا باقی ہے، اس کی اصلیت یہ ہے کہ اسکندر بن قرایوسف کے چار بیٹے تھے، ان مین سے قباد کا ذکر ہو چکا ہے، باقی تین یار علی، قاسم بیگ اور الوند تھے، ان مین سے کوئی آبائی تخت پر نہین بیٹھا، یار علی خراسان مین آکر گمنام ہو گیا، قاسم بیگ کا صرف اتنا ذکر ملتا ہے، کہ ۸۶۹ھ مین وہ سیستان کا خود مختار حاکم تھا، الوند کے بیٹے پیر قلی بیگ کی شادی خدیجہ بیگم بنت جہان شاہ سے ہوئی اس سے دو بیٹے اویس قلی اور آلہ قلی پیدا ہوئے، اویس قلی کا بیٹا سلطان قلی

تھا جو ہندوستان میں دو مرتبہ آیا، آخری مرتبہ وہ سلطان محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں آیا، اور ترقی کر کے اس کے وزیروں میں داخل ہو گیا گو نظام الدین احمد مؤلف طبقات اکبری اس کو سلطان محمود شاہ بہمنی کا مملوک بتلاتا ہے بہر کیف وہ خداداد قابلیت اور ذاتی صفات کی بدولت سلطنت قطب شاہی کا بانی تھا،

قراقوینلو ترکمانوں کا تمدن ابتدائی حالت میں بہت سیدھا سادہ ہوگا، اس کی دلیل ہمیں بیس ہزار گوسفند کے اس خراج سے ملتی ہے جو سلطان حسین نے قرا محمد سے طلب کیا تھا، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ خاندان جلائر کے ارتباط اور وسیع دائرہ عمل میں داخل ہونے کی وجہ سے اس میں نمایاں ترقی بھی ہوئی مثلاً قرا محمد کے بعد قرا یوسف نے اپنے بیٹوں کے نام اسکندر، اسپند، جہانشاہ وغیرہ رکھے، قراتورمش وغیرہ سادہ ترکی نام نہ رکھے ان ناموں سے ایک طرف تو اولوالعزمی ظاہر ہے اور دوسری طرف ان میں شاہانہ شان بھی آشکارا ہے، جس طرح ان ناموں میں تغیر ہوا اسی طرح یہ لوگ ترکی کے علاوہ فارسی سے بھی آشنا ہو گئے، چنانچہ قرا یوسف نے اپنے بیٹے پیر بداق کے نام جو پہلا فرمان جاری کیا، اس کی عبارت ترکی زبان میں تھی، مگر قرا یوسف کے بعد ہم اسکندر اور جہانشاہ کو دیکھتے ہیں کہ ان کی اولاد کے نام کے فارسی سجعے موجود ہیں، اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ سجعے غیروں نے منظوم کئے تھے تب بھی اتنی بات ضرور ظاہر ہے کہ جن ناموں کے یہ سجعے ہیں وہ فارسی سے بخوبی آشنا ہو گئے تھے، اور ان میں

فارسی نے شاعری کا ذوق بھی پیدا کر دیا تھا، ان سجعوں میں دو سجعے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کیونکہ یہ اسکندر کی دو بیٹیوں کے ناموں کے ہیں، علاوہ ازیں سجعوں سے ان کے شیعی اعتقاد کا اظہار بھی ہوتا ہے:-

در مشغلۂ دنیا در معرکۂ محشر　　از آل علی گوید آرائش اسکندر
بود از جان مرید آلِ حیدر　　اورق سلطان بنت شہِ اسکندر

پیر بداق کے نام کا سجع :-

نامم بداغ و بندۂ با داغ حیدرم　　ہر جا شہیست در ہمہ عالم غلام ماست

اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے اکثر افراد کا رویہ خلاف شرع رہا ہے، چنانچہ قاضی نور اللہ شستری صاحبِ مجالس المومنین کو بھی اس کا اعتراف ہے، جیسا کہ وہ اسپند ابن قرا یوسف کے حال میں بیان فرماتے ہیں کہ "او بخلاف سلاطین خاندان خود عفیف بود"

اسی طرح کاتبی نیشاپوری کی ایک رباعی سکندر کے بارے میں ہے، لیکن اس قابل نہیں کہ اسے حوالۂ قلم کیا جائے۔

اظہر علی ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی (کنٹب)
سنٹ سٹیفنز کالج۔ دہلی

کمالُ الدّینؔ بہزاد مُصوّرُ

تاریخ مین بیشمار ہستیاں ایسی ہوگذری ہیں جنھوں نے اپنے کمالاتِ فن سے اپنے زمانہ اور مابعد کو بہت فیضان بخشا ہے' چنانچہ کمال الدین بہزاد مصور بھی انہیں میں سے ایک ہے' تاریخ ایران قدیم کے صفحات مین بھی بہزاد کے نام کو دخل ہے' چنانچہ فردوسی کے شاہنامہ مین لفظ بہزاد سیاوش اور کیخسرو ثانی کے گھوڑے کے نام کی حیثیت سے بیان ہوا ہے' جیساکہ "گرفتن کیخسرو بہزاد را" مگر آج بھی عوام میں مانی اور بہزاد بطور ضرب المثل مصورین کی حیثیت سے مشہور ہین' اور ایسے مانی نامی مصور بہزاد کا ہمعصر بھی تھا جس کو مصوری میں بہزاد کا سا مرتبہ حاصل نہ تھا ؎۔ بہزاد یگانۂ زمانہ + مانی بزبان او افسانہ

کمال الدین بہزاد ہرات مین ۸۴۴ھ میں پیدا ہوا اور وہین طویل عمر مین ۹۴۲ھ مین فوت ہوا' اور وہین دفن ہوا' غرضیکہ بہزاد کی شخصیت ایرانی مصوری کے عین شباب کے زمانہ کی ایک صدی کی ذمہ دار ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ایرانی مصوری دیگر اثرات سے آزاد ہوکر خالص ایرانی مصوری شمار ہوئی' اور سلطان حسین بائقرا (۸۷۳ھ - ۹۱۲ھ) والی ہرات کی علمی وفنی فیاضیون سے تمام علوم وفنونِ ایران کو چار چاند لگ گئے' جس کے دربار مین دور دراز سے تمام قسم کے ماہرینِ علوم وفنون وصاحب کمال جمع ہو

گئے تھے، نظام الدین میر علیشیر نوائی متوفی ۹۰۶ھ جیسا علم دوست اور مدبر سلطان حسین بائقرا کا وزیر کل تھا، جو سلطان کا ہم سبق بھی رہ چکا تھا، اور یہ خود اعلیٰ پایہ کا شاعر فارسی و ترکی زبان کا تھا، غالباً یہ اعلیٰ مصور بھی تھا، جس کا ثبوت بوسٹن موزیم امریکہ کے مجموعہ کی ایک تصویر سے ملتا ہے، جس پر "عمل میر علی شیر" لکھا ہے، اور یہ تصویر زنجیرون میں جکڑے ہوئے ایک شیر کی ہے، غالباً علی شیر نے یہ فن بہزاد سے سیکھا تھا، ہم نے اس کا نام تلامذۂ بہزاد کے زمرہ مین درج نہین کیا، کیونکہ اس کا ثبوت کہین نہیں ملتا، سلطان حسین بائقرا کے زمانہ کے علوم و فنون کا چرچا زیادہ تر میر علی شیر کا مرہون منت ہے، جس نے ان ماہرین کی پرورش اور حوصلہ افزائی کی، جس کی وجہ سے تمام ماہرین مطمئن رہے، اور سلطان حسین خود بھی اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا، اور ایسے باکمالون کی صحبت سے متمتع ہوتا تھا، سلطان علی جیسا خطاط بھی اسی جماعت کا ایک فرد تھا، غرضکہ بہزاد نے ان معاصرین کے کلام کو مصور کیا، اور اپنی مصوری کے شاہکارون مین وہ جذبات بھرے جو اُن مجالس اور محافل کے مذاکرات علمی اور ادبی سے منتج ہوتے، اگرچہ ان اصحاب علم کا کلام انکے جذبات انکے قلم کی گلکاریوں اور زور بیان کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں مگر وہ تاثرات جو مصوری ہی سے تعلق رکھتے ہین ان کو خصوصیت سے بہزاد نے ہی اپنے موے قلم سے نوازا اور ان کو مصور کیا جن کے نسخے آج بھی کتبخانوں کی زینت ہیں،

افسوس کہ بہزاد کی ابتدائی زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، سوا اس کے کہ تاریخ رشیدی اور دوست محمد کے رسالۂ خطاطان و نقاشان سے معلوم

ہوتا ہے کہ اول بہزاد نے مصوری سید روح اللہ میرک سے سیکھی، مگر ترکی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد کا استاد سید پیر احمد تبریزی تھا، جو چارٹ مین دکھایا گیا ہے، غرضکہ بہزاد میں ایرانی، عراقی اور وسط ایشیائی دبستان مصوری کی آمیزش تھی، مگر اس نے خالص ایرانی مصوری کی داغ بیل ڈالی، ظہیر الدین بابر بادشاہ نے اپنے معاصر مصورین مین سے اپنی توزک مین بہزاد اور شاہ مظفر کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، جن کے کام کو وہ بہت پسند کرتا تھا، مگر شاہ مظفر کے کام کو ترجیح دیتا تھا۔ افسوس کہ شاہ مظفر کا چوبیس سال کی قلیل عمر مین انتقال ہوا، ورنہ قیاس غالب تھا کہ شاہ مظفر اپنی اعلیٰ قابلیت سے بہزاد کی شہرت کو مات کر دیتا،

بہزاد کو زمانہ کے نشیب و فراز سے ہمیشہ دوچار ہونا پڑا، سلطان حسین بائقرا شاہ اسمٰعیل صفوی، محمد خان شیبانی، شاہ طہماسپ وغیرہم سلاطین کے دامن دولت سے وابستہ رہا اور اپنے کمال فن کے اعتبار سے ہر دربار مین باعزت و احترام رہا، سلطان حسین بائقرا کے انتقال کے بعد تبریز میں آگیا تھا، صفویون کے غلبہ سے بھی اس پر کوئی اثر نہین ہوا، بلکہ ان کے دربار مین مہتمم کتبخانہ ہونے کی حیثیت سے زیادہ معزز رہا، بہزاد کے ورود سے تبریز مین فن مصوری کو بہت عروج ہوا، یہان بیشمار تلامذہ دور و نزدیک سے جمع ہوکر اس کے کمال فن سے مستفیض ہونے لگے، اور اکتساب فن سے فارغ ہوکر جہات شرق غرب مین پھیل گئے، اور مختلف مقامات میں پہنچ کر اپنے ماحول کے مطابق مختلف دبستان مصوری قائم کئے، جو اُن کے نامون سے امتیازی

شان اور حیثیت رکھتے ہین اور اس لحاظ سے بہزاد کی عظیم المرتبت شخصیت اور اثر کا اندازہ کرنا چاہئے، نیز بہزاد کے تلامذہ اور روایاتِ فن کا ایک غیر مختتم سلسلہ انھی سے وابستہ ہے،

بہزاد نے کافی طویل عمر پائی، اس کا پتہ شیراز کے عجائب خانہ کی اس تصویر سے چلتا ہے جو لنڈن کی نمائش ایرانی فن سنہ ۱۹۳۱ء مین آئی تھی، اس تصویر پر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ذیل کی تحریر ثبت ہے :-

"این رقمیت بدیع مشعر از مضمون، اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ، کہ ہم شکستہ نہاد فقیر نامراد بہزاد بعد از وصولِ عمر بدرجۂ ہفتاد و تجربہ قوی درین امر افتاد، وَالْمَسْئُوْلُ مِنَ اللّٰہِ الْعَفْوُ فِی الْمَعَاد"

اس تصویر مین ایک اونٹ ہے اور ایک معمر شخص اس کی نکیل تھامے ہوئے ہے، غالباً بٹھانے کی کوشش کر رہا ہے، جہانگیر نے اس تصویر کی ایک عمدہ نقل اپنے عہد کے ہندو مصور نانہای سے سنہ ۱۰۱۷ھ مین کرائی تھی، یہ بھی لنڈن کی نمائش مین موجود تھی، جس پر حسب ذیل عبارت ہے یعنی جہان بہزاد نے محولۂ بالا عبارت لکھی ہے، وہان جہانگیر نے اس تصویر پر ان الفاظ کو خود لکھا ہے :-

اللّٰہ اکبر

"این کار استاد بہزاد را دیدہ نانہای مصور کردہ حسب الحکم من حررہٗ جہانگیر بن اکبر بادشاہ غازی سنہ ۱۰۱۷ھ"

منقولہ صدر تحریر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کس طرح ہندوستان مین ایرانی مصوری نے اثر و نفوذ کیا اور جہانگیر نے مصوری کے فن کو مزید ترقی دینے کی غرض سے اپنے عہد کے مصور بشنداس کو ایران بھیجا تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر بہزاد کے شاہکار بہزاد کی زندگی مین ہی، ہندوستان مین پہنچ چکے تھے، جس کا پتہ ظفر الوالہ تاریخ گجرات کے حالات ۹۴۱ھ مین یون ملتا ہے:-

"هجموا على المخيم ولم يجدوا إلا الأثقال فانتهبوا ما وجدوا حتى الكتب وكان من حملتها تمرنامه (تیمور نامه) لمولنا هاتفي بخط الأستاذ سلطان على وتصوير الأستاذ بهزاد..... " (صفحہ ۲۴۴ جلد اول)

غرضکہ یہ چیزین یہان موجود تھین، اور غالباً احمد آباد مین یہ تیمور نامہ عبدالرحیم خانخانان کے کتبخانہ مین محفوظ تھا، جس کی عمارت سابرمتی کے کنارے فتح واڑی کے نام سے اب بھی موجود ہے، اسی لنڈن نمائش مین مصر کے کتبخانہ ملیہ سے ایک مخطوطہ گلستان شیخ سعدی آیا تھا، جس مین تمام تصویرین بہزاد کی دستخط شدہ تھین، اور بہترین نمونۂ فن تھیں، ان پر ۸۹۲ھ و ۸۹۴ھ تاریخیں ثبت تھین، مگر برٹش میوزیم کے مخطوطہ خمسہ نظامی Add 25.900 مورخہ ۸۴۶ھ مین بہزاد کی دستخط شدہ تصاویر ہین، جو غالباً بہزاد نے اس نسخہ کے تیار ہونے کے ایک عرصہ بعد اپنے زمانۂ شباب مین بنائی تھین، دوست محمد نے اپنے رسالہ مین تاریخ وفات بہزاد

سنہ ۹۴۲ھ یون درج کی ہے :-

"خاک قبر بہزاد سنہ ۹۴۲ھ"

بہزاد کی تصاویر کا مطالعہ ظاہر کریگا کہ اس نے اس فن لطیف مین بیشمار اختراعات اور ایجادین کین، جو قبل اس سے نہ تھین، اگر بہزاد کے شاہکارون کی تفصیل دی جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی، یورپین محققین نے کافی جد وجہد کے بعد ایرانی مصوری پر کتب شائع کی ہیں، جو اس ضمن مین بہت مدد دے سکتی ہیں، ان مین سے قابل ذکر کتاب حال ہی کی مطبوعہ "ایرانی مصوری" مصنفہ ڈاکٹر لارنس بنین وغیرہ اکسفورڈ پریس کی شائع کردہ ایک مفید تصنیف ہے، اس میں ایرانی مصوری پر کافی مواد فراہم کیا گیا ہے، بالفاظ دیگر یہ کتاب لنڈن کی نمائش ایرانی فن سنہ ۱۹۳۱ع کی ایک مبسوط فہرست ہے، مین اس فکر مین ہون کہ بہزاد کے متعلق ایک مفصل کتاب مع تصاویر شائع کرون تاکہ تاریخ مصوری کا یہ گم شدہ باب عوام کے سامنے آسکے، امید ہے کہ عنقریب اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤنگا، وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہِ

محمد عبداللہ چغتائی

رضا عباسی (ق)

معین (ق) | محمد شفیع عباسی (ق)

حوالہ جات

ع ۔ مناقب ہنروران	د ۔ رسالہ خطاطان و نقاشان قسطنطنیہ
د ۔ تاریخ رشیدی	ق ۔ قدیم تصاویر
ب ۔ عالم آرائے عباسی	ٹ ۔ تذکرہ خطاطان و نقاشان فرانسیسی
ا ۔ نفائس المآثر	

اورنٹیل کالج میگزین فروری سنہ ۱۹۳۲ء و اگست سنہ ۱۹۳۲ء میں اقتباسات تحفہ سامی ''تاریخ رشیدی اور بابرنامہ متعلقہ نقاشان و خطاطان از پروفیسر محمد شفیع صاحب بھی اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہیں'

مؤلفہ
محمد عبداللہ چغتائی

(گیلانی پریس لاہور)

مقالة فى رسائل اخوان الصفا

هذه المقالة قدمتها في ادارة معارف اسلامية بلاهور
بنجاب الهند يوم الاحد السادس عشر ابريل ١٩٣٣ م.

الكاتب حسين الهمداني.

مقالة في رسائل اخوان الصفا

للدكتور حسين الهمداني اليعبري

(١)

نشرت المكتبة التجارية الكبرى في سنة ١٩٢٨ م مطبوعة رسائل اخوان الصفا التي عني بتصحيحها السيد خير الدين الزركلي واطلعت على ما فيها من مقدمتين قيمتين نفيستين- مقدمة تحليلية للاستاذ الدكتور طه حسين والاخرى تاريخية للاستاذ أحمد زكي باشا. ونشرت " مجلة المجمع العلمي العربي " (بدمشق الشام سنة ١٩٢٨) مقالة علمية للأستاذ محمد كرد علي في شأن رسائل اخوان الصفا - وأرسل الي مؤخراً الاستاذ السيد عبد اللطيف الطيباوي من القدس هدية رسالته النفيسة المسماة " جماعة اخوان الصفا" (طبعت مرة ثانية عن مجلة " الكلية " التي تصدر عن الجامعة الامريكية في بيروت ١٩٣٠-٣١ م). واستفدت كثيرا من هذه المباحث العلمية. فاليوم اريد أن اذكر طرفا مما تعين و تحقق عند هولاء الأساتذة المحققين في أمر الرسائل لكيما نعرف النتائج التي استنبطوها بعد درس الرسائل - واذكر شيئا قليلا مما وجدته في كتب الدعوة الاسمعيلية المصونة في خزائن الدعوة باليمن والهند. ثم شواهد خارجية وداخلية بأن الرسائل لا بد لها من صلة بينها وبين الحركة الاسمعيلية.

فاقول انّ العلماء المتقدّمين والمتاخّرين اختلفوا في أمر تأليف رسائل اخوان الصّفا اختلافات عديدة - فمنها في من الّف الرّسائل ومنها أين ومتى الّفت الرّسائل. ولم يأتوا فيها بقول فصل بل ذهبوا فيها كلّ مذهب. وأظهروا آراء متباينة متضادّة متناقضة في مباحثهم اشدّ تناقض. واذكر بوجيز الكلام شيئا من هذه الآراء المختلفة :—

(٢)

هل صنّف الرسائل جماعة من علماء بصرة؟

قيل انّ جماعة من علماء بصرة الّفوا رسائل اخوان الصّفا في أواسط القرن الرّابع بعد الهجرة النّبويّة - وأوّل من قال بهذا الرّأى هو أبوحيّان التّوحيدى في كتابه "الأمتاع والمؤانسة" (راجع مقدّمة أحمد زكي باشا ' ص ٣٠). ثمّ أورد جمال الدّين أبو الحسن القفطي المصرى المتوفى سنة ٦٤٦ ﻫ في "كتاب تراجم الحكماء" كلامًا طويلاً ضمّنه ذكر الحديث الّذى جرى في سنة ٣٧٣ ﻫ = ٩٨٣ م بين أبي حيّان وبين وزير لصمصام الدّولة، فاستخلص منه أن زيد بن رفاعة أقام بالبصرة وصادف بها جماعة منهم أبو سليمان محمد بن معشر البستي المعروف بالمقدسي وأبو الحسن علي بن هارون الزّنجاني وأبو أحمد المهرجاني والعوفي وغيرهم، واجتمعوا على تأليف الرّسائل.
وقال القفطي :— "انّ هؤلاء جماعة اجتمعوا على تصنيف كتاب في انواع الحكمة الأولى". ثمّ قال :—

" ولما كتم مصنّفوها أسماءها، اختلف النّاس في الّذي وضعها. فكل قوم قالوا قولاً بطريق الحدس والتّخمين. فقوم قالوا: هي من كلام بعض الأئمّة من نسل علي بن أبي طالب كرّم اللّه وجهه. واختلفوا في اسم الامام الواضع لها اختلافاً لا يثبت له حقيقة. وقال آخرون: - هي تصنيف بعض متكلّمي المعتزلة في العصر الأوّل ".

والغريب أنّ القفطي اعترف بوجود النّاس الّذين قالوا انّ الرّسائل من كلام بعض الأئمّة العلويّين واعترف بوجود مذاهب أخرى في أمر الرّسائل مع هذا أنّه يستند ويعتمد على كلام أبي حيّان.

وقال الأستاذ أحمد زكي باشا (ص٣٤) في شأن الجماعة:—
" وعلى ذلك يكون مؤلّفوها ممّن نحوا نحو الاسمعيلية، وذهبوا مذاهبهم، وقالوا بمقالاتهم......وقد أعملت الجهد الجهيد في تطلّب ترجمتهم، ومعرفة أخبارهم وشؤونهم......فلم يسعفه القدر ببلوغ الوطر الخ". ولكن الأستاذ لا يرى في اطناب أبي حيان في مدح زيد بن رفاعة الّا " دلالة ضمنية على فائق فضلهم وواسع علمهم".

وهكذا استنبط الأستاذ السيّد عبد اللّطيف الطيباوي نتيجة توافق ما توصل اليه الأساتذة قبله حيث يقول:—واذا فتاريخ نشوا لجماعة وتاليف رسائلها يتراوح ما بين سنتي ٣٣٤ هـ و ٣٧٣هـ. هذا ما توصلنا اليه في تحقيق زمان الجماعة

"... فالبصرة اذا مركز الجماعة وفيها قامت مؤسستهم على رأي القفطي (من حديث أبي حيّان) . ولسنا على حقّ في الاعتراف بصحّة هذه القضية بحقيّقة تامّة . فلا شاهد آخر ازاء القفطي مستقلاً عنه يذكر هذا الأمر . وقد تحاشى الأخوان ذكر اسم البلدة التّي كتبوا فيها رسائلهم كما هي العادة كما تحاشوا ذكر التّاريخ " .

الا يصحّ لنا ان نقول "على طريق الحدس والتخمين" ، لا بعين العلم واليقين أنّ هذه الجماعة - ان صحّ لنا وجودها - كان مذهبهم ومسلكهم مصطبغاً بصبغة المذهب الاسمعيلي ؟ ولكنّنا لا نعرف أخبار هذه الجمعيّة السرية حقّ معرفة .

(٣)

هل صنّفها المجريطى ؟

وقيل انّ مسلمة المجريطي المتوفّى سنة ٣٩٨ هـ الّف رسائل اخوان الصفا . عزيت الرّسائل اليه اعتماداً على ما جاء في كتاب " رتبة الحكيم " وليس كتاب " رتبة الحكيم " بتأليف الحكيم المجريطي ، بل هو منسوب اليه قد أثبت العلماء مؤخراً أنّ هذا الكتاب الفه أحد غير المجريطي لا نعرف اسمه في قرن بعد وفاة المجريطي ولكن لا يهمنا الاختلاف في أمر تاليف كتاب " رتبة الحكيم " ، بل نرى ماذا يقول صاحب الكتاب في أمر الرسائل :—

" وقد قدّمنا من التآليف في العلوم الرياضيّة والأسرار الفلسفيّة رسائل استوعبناها فيها استيعابا لم يتقدّمنا فيها أحد من عصرنا ألبتّة . وقد شاعت هذه الرّسائل فيهم وظهرت اليهم فتنافسوا في " التنطّر اليها ، وحضّوا أهل زمانهم عليها . ولا يعلم من ألّف ولا اين ألّف غير الحذّاق منهم لما دأبوا على مطالعتها لاستحسانهم اياّها واستعذابهم لألفاظها . انّها من تاليف زمانهم وعصرهم الذى هم فيه ولا يعلمون من الفها الخ " .

فاقول أن لم توجد في العبارة المتقدمة ذكرها أن المجريطي او غير المجريطي الّف الرسائل بل يذكر صاحب الكتاب أن أبناء زمانه لا يعلمون " من الّف ولا اين الّف غير الحذّاق منهم ". ثم يصرح أنّ الرسائل تأليف زمانهم وعصرهم الذى هم فيه ". وأمّا قوله :—" وقد قدّمنا من التّاليف . . . . رسائل " فلعلّه يشير ألى امر نقل الرسائل من المشرق الى المغرب لأن المجريطي أو تلميذه الكرماني أو صاحب كتاب " رتبة الحكيم " كان أول من أدخل الرسائل الى الاندلس (راجع P. de Gayangos. The (History of the Muhammadan Dynasties in Spain, I, 427-29.

وقال المحبّي المتوفي سنة ٤٥٦ ﻫ = ١٠٦٤ م في ترجمة البهائي : انّ هذا سئل عن مؤلّف رسائل اخوان الصفا فكتب :— " انا الفقير رأيتها منسوبة للمجريطي وما تحقّقت من هو وما أخباره " . ثمّ قال :—

" رأيت ابن الحجر المكّي ذكر في فتاويه وقد سئل عن صاحب رسائل اخوان الصفا وترجمته وما حال كتابه . فأجاب بقوله :- نسبها كثير الى جعفر الصادق وهو باطل وانما الصواب أن مؤلّفها مسلمة بن احمد بن قاسم بن عبد اللّه المجريطي . . . . وممّن ذكره ابن بشكوال وغيره - وكتابه فيه أشياء حكمية وفلسفية وشرعية وممن شدّد عليه ابن تيميّة لكنّه يفرط في كلامه فلا تغترّ بجميع ما يقول " . (راجع خلاصة الأثر، ج ۴، ص ۲۰۹)

فاقول انّ العلماء الذين ذكرهم المحبي فما أوردوا دليلا واضحاً على انتساب الرّسائل الى المجريطي بل تناقضوا في مقالاتهم أشدّ تناقض . وقد قال الأستاذ أحمد زكي باشا - " فالظاهر أنهم لما اطلعوا عليه (اى على كتاب رتبة الحكيم) قالوا أن الرسائل التي يذكرها انما هي المعروفة برسائل اخوان الصفا وهو وَهم " .

وأمّا ما ذكر صاحب كشف الظّنون " انّ المجريطي ألّف كتابا يسمّى " رسائل أخوان الصّفا "، أوّله - " الحمد للّه الّذى خلق فسوّى الخ " فمفيد لنا لأنّه أشار الى كتاب غير الرّسائل المتداولة بين النّاس حيث قال :-" وهو نسخة مغايرة على اخوان الصّفا " . فالّذى أشار اليه صاحب "كشف الظّنون " هو الرّسالة الجامعة .

(٤)

الرسالة الجامعة

وكان ظنّ العلماء ألى اواخر القرن الأخير أنّ رسالة الجامعة المذكورة في الرّسائل الاحدى والخمسين المتداولة بين النّاس مفقودة غيرموجودة عندنا. ولكنّ المستشرق الفرنسيسي كزانوفا وجد نسخة منها المفقودة الصّفحات الأولى في المكتبة الأهليّة بباريس ، ثمّ نشر مقالة في هذه الرّسالة . وأخذت العلماء يدرسون الرّسائل من وجهة أخرى . و "اتّجه الفكر مؤخّراً الى الاعتقاد بوجود صلة بين فلسفة اخوان الصّفا من جهة وعقائد الاسمعيلية من جهة أخرى " (الطيباوى ، ص ٧١) .

هذا ماتوصل اليه كزانوفا *Notice sur un manuscrit de la* (*secte des Assassins J.A.*, 1898, p. 151 seq. بعددرس الرّسالة :—

"لااراني الاّ مصيبافي القول انّ فلسفة الاسمعيلية جميعها مبثوثة فى رسائل اخوان الصّفا ......فالقول بالامام المستور الّذى سوف يظهر ليعيد السّلام الى العالم - هذا القول عندهم يمثل امتزاج النّظريّات الأفلاطونية بالاعتقاد بالمجيء الثّانى للمسيح ......وعليه فمن الجور في الحكم ان يرمى القرامطة والحشاشون بالكفر والانحطاط الأخلاقي كما جاء في فتوى ابن تيميّة الّذى يزعم القسم الأخير من (البلاغ الأكبر) انكار لوجود الخالق . اذلم نجد في الرّسالة الجامعة الّتي هي لبّ الرّسائل و روحها مايدئم

هذا الزّعم ، بل على الضّدّ من ذالك نجد في تعاليمهم الطّهارة والمثلية المتقمصة بنزعات الشّمول ، الدّائنة بالجمال ، البعيدة كل البعد عن نزعات الشّكّ و المادّية الخ " (هذا ترجمة السّيّد عبد اللطيف الطيباوى) .

توجد مخطوطات هذه الرّسالة في مكتبة ميونيخ المانيا (Aumer No. 653) وفي المكتبة الكبرى المصريّة ومكتبة الأستاذ العلّام أحمد تيمورباشا (١) في مصر وكلها منسوبة الى المجريطي . وأمّا النّسخ المصونة في خزائن الدّعوة اليمنيّة فتسمى باسم " الجامعة " ، أوّلها:- " الحمد للّه الّذي خلق فسوّى ، والّذي قدّر فهدى ، والذى أخرج المرعى ، فجعله غثاء أحوى الخ " بما جاء به صاحب "كشف الظّنون " .

وكانت الدعوة الاسمعيلية اليمنيّة تهتمّ برسالة الجامعة منذ أواخر الدّولة الصّليحيّة في اليمن اهتماما بليغا . وكانت هذه الرّسالة معروفة باسم " الجامعة " عند أولي الدّعوة من القرن السّادس بعد الهجرة . ولا ينسبونها الى الحكيم المجريطي او الى غيره ، بل يحسبون أنّها من أجزاء الرّسائل . وذكر الدّاعي ابرهيم ابن الحسين الحامدي المتوفّى سنة ٥٥٧ ﻫ اسم الجامعة غيرمرّة في كتابه المسمّى "كنز الولد" وهو يقول:- " قال الشّخص الفاضل الكامل صاحب الرّسائل " ، ثمّ ينقل

---

(١) تفضل عليّ حضرة الباحثا الأستاذ العلّامة المخلّد الأثرأحمد تيمور مخطوطة هذه الرسالة للمطالعة والدّرس أيام اقامتي في مصر .

عبارات كثيرة من الرسالة الجامعة . وهذه الشواهد تدلّ على أنّ الرسالة موجودة غير مفقودة في العالم .

(٥)

تحقيقات العلماء المستشرقين

واقول أيضًا أن يجب لنا ان نعترف فضل علماء اوروبا لأنّهم أثبتوا صلة بين تعاليم الرسائل وعقائد الاسمعيلية وكان الأستاذ كزانوفا زعيم القائلين بهذا الرأي وأوّل من اعتنى بدرس الرسالة الجامعة . ولكن جماعة من المستشرقين المحقّقين تقدّموا الى القول بأن الرسائل مصطبغة بالصبغة الاسمعيلية . ووصلني مؤخّرا مكتوب الأستاذ الجليل دبور (De Boer) صاحب كتاب "تاريخ الفلسفة في الاسلام" (Wijsbegeerte in den Islam, 1921) وهو يكتب فيه :—

"كان اغسطس ميولر (Aug. Mueller) أوّل من قال بأنّ الرسائل الّفت قبل تاليف رسائل الكندى والفارابيّ كنّا (اعني غولتصر وأنا) نعرف صلة الرسائل بالحركة الاسمعيلية . فلذلك تكلمت في كتابي المؤلّف في سنة ١٩٠٦ عن الرازي والاخوان قبل الكندي والفارابي اللذين يجمعان في تأليفهما الفلاطونية الحديثة والارسطاليسية . وكانت العلماء يزعمون قبل سنة ١٩٠٠م أنّ زمان تاليف الرسائل بين الفارابي وابن سينا . والآن أنتم ابدّتمونا وأغنيتمونا في آرائنا ومقائسنا بالشواهد الأدبيّة" (من مكتوبه المؤرخ : ٢١ يناير ١٩٣٣م) .

وأمّا ما ذكر الأستاذ العلّام ماسينيون (Massignon, *Der Islam*, 1913, vol. IV, p. 324) من الأبيات الواردة في الرسائل فيفيدنا لتقرير تاريخ الرسائل ولكنّنا لا نعرف أسماء ناظمي جميع الأبيات، ولا محيص لمن يريد أن يدرّس الرسائل وتاريخها عن مباحث علميّة لفلوغل (Flugel, *Ueber die Inhalt u. Verfasser der arabischen Encyclopaedie R. Ikhwan as Safa* (*ZDMG*, XIII, 1839) وديتريصي (Dieterici, *Die Philosophie der Araber in X Jahrhundert*, Leipzig, 1876) وغولتصير (Goldziher, *Ueber die Benennung der* اخوان الصفا) (*Der Islam*, vol. 1, 1919) ونيكولسون (Nicholoson, *A Literary His. of the Arabs*, London, 1923) وغيرهم من العلماء المحقّقين المستشرقين .

(٦)

اهتمام الدعوة الاسمعيلية اليمنية بالرسائل

فاريد الآن ان الفت انظاركم الى آداب الدعوة الاسمعيلية (ستنشر في المستقبل القريب في مجلّة الجمعية الآسوية الملكية البريطانوية (*JRAS*) مقالتي في تاريخ آداب الدعوة الاسمعيلية القديمة) وهي محفوظة في خزائن كتب الدعوة باليمن والهند . وهذه الآداب كانت مستورة الى هذا الأوان ولكنّ القضايا الاتّفاقيّة قد ساعدت محقّقي أوروبا بحصول بعض كتب الدعوة (راجع جريفيني Griffini, *ZDMG*,

Esquisse d'une bibiliographie Qarmate,) وماسينيون (LXIX Tritton,) وتريتون (vol. of Oriental studies (Gibb series) *Notes on some Ismaili MSS*, *BSOS*, vol. VII, part I,) 1933) وهي مهمّة جدّا لانها تحتوي على أمور تاريخية ومفيدة للذين يريدون أن يدرسوا تاريخ العقائد والفلسفة في الاسلام. وهي تتضمّن على كتب للمؤلّفين المتقدّمين الكبار ما كنا نعرف الا أسماء بعضهم مثل كتب الفيلسوف أبي يعقوب السجزي والشيخ أبي حاتم الرازي والقاضي النعمن والحكيم أحمد حميد الدين الكرماني والداعي المؤيّد في الدين الشيرازي وغيرهم. ولو استقصينا ذكر هولاء المؤلّفين وتآليفهم ليخرج الكلام عن حيّز هذه الرسالة. ولكنّ المهمّ لنا ان نذكر فوائد درس هذه الآداب مع ذكر الرسائل لأنّ هذه الآداب قد نشأت في الزمن التي ظهرت فيها الرسائل، وبلغت الحركة الاسمعيلية الى أوجها العلمي الأدبي -

وانتقلت كتب الدعوة الاسمعيلية الفاطمية المصرية في ايام خلافة المستنصر بالله والمستعلي لدين الله والآمر بأحكام الله ثم بعد انقراض الدولة الفاطمية من مصر الى اليمن لأنّ الصلات كانت موجودة بين الأئمّة الفاطميين في مصر والسلاطين الصليحيين في اليمن. ثمّ اتّخذت الدعوة اليمنية تدرس الرسائل ومن حيث بلغ علمي أنّ أوّل من ذكر الرسائل والرسالة الجامعة في تاريخ آداب الدعوة الاسمعيلية هو الداعي ابرهيم بن الحسين

الحامدي المتوفى سنة ٥٥٧هـ . لم يقع نظري الى اليوم في تآليف الدعاة الذين كانوا في أيّام الخلفاء الفاطميين على ذكر الرسائل. ولكن الدعاة اليمنيين أكثروا مباحثهم في الرسائل وأمعنوا في مطالعتهم ايّاها وتآليف الدعاة المتقدمين . فصارت الرسائل عندهم "قرآن الأئمّة" كما قال الشيخ ابراهيم السيفي المتوفّى سنة ١٢٣٦هـ في كتابه المسمّى "تحفة رسائل اخوان الصفا" ويحترمونها كما يحترمون "قرآن الأمّة" .

وهم يعتقدون بأنّ الرسائل الّفها " الامام الهمام قطب الأقطاب مولانا أحمد المستور بن عبد الله بن محمد بن اسمعيل بن جعفر الصادق " في أيّام الخليفة المأمون العبّاسي كما صرّح به ونصّ عليه ادريس عماد الدين المتوفّى سنة ٨٧٢هـ - ١٤٦٧م صاحب كتاب " عيون الأخبار " (راجع تقريظ المولوي الشيخ محمد علي الرامفوري المدراسي في مطبوعة بومبائي ١٣٠٦ ص ٤٠٦ . وأيضاً اتى صاحب الرسالة المسمّاة "العسل المصفّى" بومبائي ١٩٢٩ ببيان ادريس وكتابه "عيون الأخبار" . وكان الداعي علي بن محمد بن الوليد المتوفّى سنة ٦١٣هـ - ١٢١٦م جدّ ادريس و " والد الجميع " أوّل من قال بهذا الرأي في كتابه المسمّى "دامغ الباطل" - ثمّ اخذه ادريس و صرّح به في كتابيه " عيون الأخبار" و " زهر المعاني " .

قال الداعي ادريس عماد الدين في كتابه "عيون الأخبار" الجلد الرابع ص٣٦٦:—

"وقام الامام التقى احمد بن عبد الله بن محمد بن اسمعيل بعد ابيه بامر الامامة وبث دعاته في الآفاق من سلمية واتصل به الدعاة ودعوا اليه وهم مختفون لمقامه كاتمون لاسمه ......وكان المامون حين احتال على علي بن موسى الرضى ابن جعفر ظن ان امر الله قد انقطع وحجته عن الارض قد ارتفع ......فحين ظن المامون العباسي......ذلك الظن ووهم ذلك الوهم سعى في تبديل شريعة محمد صلعم وتغييرها وان يرد الناس الى الفلسفة وعلم اليونانيين......وخشى الامام عم ان يميل الناس الى ما زخرف المامون عن شريعة جده......فألّف رسائل اخوان الصفاء.

(ثم ذكر مؤلف كتاب عيون الاخبار بعد هذا فهرست الرسائل على التمام).

فهذه فهرسة الرسائل التي الفها الامام عم فجمع فيها انواع العلوم الفلسفية والهندسية والشرعية..........وجعل الجامعة هي منها الغاية التي يتبين فيها المراد، ويتضح المعنى لامرتاد، وقصرها على خلصاء شيعته وخيرة خاصته، ......وانما الف الامام احمد......تلك الرسائل......لتقوم الحجة على المامون واتباعه......حين انحرفوا عن علم اهل النبوة، واثروا الفلسفة، ثم ان الامام امر ان تبث تلك الرسائل في المساجد......فحين وقع الناس عليها رفعت الى المامون......فعلم انه لم يصنع شيئاً، وان ما رامه من

قطع حبل الامامة لايكون ،

ثم انه اتصل به احد دعاة الامام......وسأله عن شيء من غامض العلم ليدله عليه فانبأه بذلك بما امكن ان يبينه...... فباء بذنبه معلنا وللاصرار مبطنا وقال: ليتني اجد خَلَف الرسول، فابوء اليه باثمي......وادفع اليه ملكي......فاغتر ذلك الداعي بقوله ووعده الى موعد ليدله على الامام بعد ان اخذ عليه في ذلك اكيد المواثيق......

وهاجر ذلك الداعي الى حضرة امامه ع م، وعرّفه بما دار بينه وبين العباسي من الكلام،......فعرّفه الامام ع م ان ذلك الجبار لايوفى بحلفه......فابى ذلك الداعي الا التمادى في مطالبة الامام.........وكرّر على الامام ذلك المقال، قال له "اذهب وعرفه انك الامام......وانك انما سترت عنه ذلك تقية وامتحانا...........واعلم انه في كل ذلك يمكر بك وانه سوف يبين راسك عن جسدك" فودعه الداعي، ورجع الى الماموم......فاظهر المامون البشر لقدومه.........ثم خلالهما المجلس، قال......فهات الىّ عنوان الخبر، وعرفني بالامام من ابناء اسمعيل بن جعفر، فاعاد عليه الداعي مؤكدات الأيمان......فحين اعطاء من المواثيق ما طلب......قال له ذلك الداعي "اني انا الامام ....وانما كتمت عنك لخوف سطوتك"......وقد كان سمع من علمه ما دلّه ان ذلك لايوجد الا في معدن النبوة والامامة فحين ظن المامون ان المخاطب

له هو الامام، دعا سيافه، وامره ان يضرب عنقه بالحسام، فقال "صدق صلى الله عليه لقد نبأني انك من الظالمين" فعلم المامون عند ذلك انه لم يقع على مراده،......فقتل ذلك الداعي......وكان الداعى يكنى الترمذى قس، -

وقد قال بعض المتاخرين......ان الرسائل ليس لاحد الائمة المستورين، واحتج ببيت سطر في الرسائل هو من قول......... المتنبي وهو قوله:

"وفي الجسم نفس لاتشيب بشيبه
ولكن ما في الجسم منه خراب"

وهذه الرسائل الفها الامام المذكور احمد بن عبدالله بن محمد بن اسمعيل بن جعفر صلعم بغير شك.........ولا ان هذا البيت اورده بعض الناسخين من المتأخرين"

وقال الداعى شرف الدين جعفر بن محمد بن حمزة في الرسالة الموقظة :-

"......حتى همّ المتسمى بالمامون ان يردّ الامة الى دين الفلسفة والقول بالنجوم وقال ما جاء محمد الا بناموس ملك به الناس ولاحقيقة لمابه ولااساس حتى اظهر ولى الله وابن رسول الله رسائل اخوان الصفاء فيها ما تحير فيه جميع العالم من العلوم في كل فن والاستشهاد على شريعة الرسول...... وهو صلعم اذ ذاك في كهف التقية مستتر، ودعاته الباقون

مفرقون لتلك الرسائل فى كل مشهد وقطر، فرجع اللعين عمّا همّ به من ذلك......".

وقال الداعي علي بن محمد بن الوليد الانف الجلد الثاني في كتاب دامغ الباطل :—

"ليس بجحد الجاحدين للحق يبطل ويستحيل . ولاباجماع اهل الباطل عليه يعلو على الحق ويستطيل وعلوم هذا الامام وآباءه الكرام عليه افضل التحية والسلام في جميع الفنون الدينية.........جايلة في الافاق بين اهل الدعوة الهادية، كاشف نورها لظلم الاختلاف الحادث بين الفرق الاسلامية وغير الاسلامية، وليس اذا ضعف بصر الخفاش عن نور الشمس ببطل، ولا اذا جحد جاحد المشاهد يجوز جحده انه عند اهل العقول ويقبل،........وقد كان من احد ائمة الهدى سلام الله عليهم من اظهار رجل العلوم، المحتوية على كلّ فن جامع الفوايد في باديها والمكتوم، في الرسايل التي مزقها فى الجهات، وعمر بها سائر المدارس والاجتماعات، حين رام المأمون العباسى نسخ الشريعة باحياء علم النجوم والتطريف والتعطيل لاملة الاسلامية فلم يمكنه ان يبلغ من ذلك ما يروم، بل جعلوا تلك الرسائل جامعة من كل فن من العلم لجملة وتفاصيله.....فحين لمع برهان تلك التاليفات لكافة اهل العراق وسطع شعاع حقها في سائر الافاق، انكفى المسمى بالمامون عمّا رامه راجعاً واعمل

فكره وصرف همه الى منشىء ذلك ظانا ان يظفر به فيكون بقتله اياه سبب الحق منقطعاً، ويستتب له اغتصاب اهل بيت النبوة الذي فيه كدح واسلافه وسعاً، فاظهر التشيع متظاهراً به، وتسارب اليه من الفاطميين من اغتر بتمذهبه فافنى منهم نفرا، ولم يظفو بالشخص الاشرف الامامي ولاادرک منه وطراً.......

وقال القاضي النعمن في كتاب شرح الاخبار:-

"وقيل انه وقع الى المامون رجل من الشيعة، فناسره، فقامت حجة عليه وانقطع المامون واراه القبول لما جاء به وجعل يستبحثه عن امام الزمان عندهم، فاوصى له الى على بن موسى بن جعفر بن محمد، فراى انه قد ظفر ببغيته، ودبر امراً، واراد الحيلة فيه ان يطهر ويدعو اليه، ثم يعمل في قتله، ولم يطلع احداً من الناس على باطن مراده في ذلک ان لايفشو ذلک عنه"

وقال الداعي جعفر بن منصور اليمن في سرائر النطقاء:-

,.ثم وجدنا الفرق التى بعد هولاء اجتمعت على ولده احمد بن موسى وهو المسمى بعلي الرضى، الذى نصبه المامون وجعله ولى عهده، والامام بعده،......ولم يشک احد من العلويين والشيعة ان الامر منصرف اليه بعد المامون،........ وذلک ان المامون جمع الفقهاء والعلماء من سائر البلدان، وناظرهم في الفدک والعوالي، حتى ردّها على ولد فاطمة عم

بعد اقامة الحجة عليه، كل ذلك حبئة على صاحب الامر فلم يجد الى ذلك سبيلا لستره نفسه عن الظهور قبل اوانه واختفائه عن اعدائه وانتظار الفرج في حينه واوانه.....

واتصل خبره برجل كان منصرف في الشام من قبل ولي الزمان وكان دار هجرته بيت المقدس، وكاتب صاحب الجزيرة بالتوجه اليه فسار نحوه باذلاً نفسه ابتغاء مرضاة الله.....

وسار الرجل حتى دخل اليه وبذل نفسه وجاهد في الله حق جهاده، فكان من خطاب المامون له في وقت دخوله اليه فلما افلح بالحجة عليه قال ارجو ان تكون الحجة الخفية المطلوبة، والنعمة الواسعة الموهوبة، وباب الرحمة الموجودة فتحك الله لي، فقال له اما الحجة المطلوبة، فلا يجاب رحمة فتحت لك فيهم، فاسمع استماع من يخشى الصمم، وتثبت تثبت من يخاف الزلل، ولقد جرى بينهما مايطول شرحه ان نقصيناه ويخرج عن حد الكتاب، حتى إنّه بسط اليه يدا كانت عن الحق مقبوضة، وفي الجور مبسوطة، وانعم عليه، وعرّفه بمولاه، وافاض عليه من نوره وهداه، فساواه في مجلسه، فشرح له ما جرت به السنة الماضية، وتركه على حاله الي اوان الظهور، وتمام المقدور، بالوقت المعلوم، والاجل المحتوم، واقام معه مدة طويلة، بذل له في خلواته، ويبذل نفسه في مرضاته، ولم يزل يطا رحه شيئًا بعد شيء، حتى استكمل رضاعه، واكتفى بما اخذه منه، ورآه الرجل قد قوي امره، وحسن مذهبه. وانصرف عماكان عليه،

فعند ذلك عرّفه بحال المنصوب، وما يكون منه، وودّعه وسار .... فلما لم يجد عند علي بن موسى شيأً من الحق المطلوب، ...... وعلم انّ حكمة الله مستورة عن اعداء الدين، والجالسين مجالس الائمة المهديين، ومذخورة في اوليائه الي اوان الظهور، فعند ذلك قلّب الرأي في امره، وانه رآه خاليا مما طلبه فيه، وغير مستحق لما اهّله له، .... فعند ذلك قتله.

ومخطوطات هذه الكتب موجودة محفوظة في خزائن الدعوة غير معروفة الا عند أرباب الدعوة. وكان ناشر مطبوعة بومبئي يتدّين بدين الاسمعيلية وكان عالما بكتب الدعوة و حاويا لعلومها وتاريخها وورد راى ادريس - لا لنيل الاحتكار اختلقه كما زعم الأستاذ أحمد زكي باشا - لأنه وجد هذا البيان في كتاب "عيون الأخبار". وأمّا ما قال علي بن محمد بن الوليد و ادريس عماد الدين في أمر الرسائل فيجب علينا أن ندرس قولهما الجديد كما درسنا آراء مختلفة و نظريات متباينة عديدة. ولا غرو أنّ هذا الرأى يفيدنا في درس مسئلة الصلة بين الرسائل والحركة الاسمعيلية في الاسلام. واذا درسنا مذاهب شتّى في أمر تاليف الرسائل فأىّ شيء يمنعنا أن ندرس هذه النظريّة؟ وما اثبت رأى ادريس ههنا وفي مقالتي *Rasail Ikhwan as-Safa in the literature of Ismaili Taiyibi Da'wat, der Islam*, Bd. XX, Heft 4 الا ليعرف العالم العلمي ما ذا تعتقد الاسمعيلية في أمر الرسائل -

(٧)

وتدل هذه الشواهد الخارجيّة على أنّ الرسائل لا بدّ لها من علة بين فلسفتها وعقايد الاسمعيلية . وهذه نتيجة توصلنا اليها بعد درس هذه الرسائل . فالآن اذكر طرفا من مذهب الرسائل وفلسفتها التي تؤيّد رأينا هذا . فمنها دعوى اخوان الصفا أن الرسائل تتضمّن على علوم أهل بيت النبي كما جاء في الرّسائل :-

" واعلم يا أخي بأنّا قد عملنا احدى وخمسين رسالة (١) في فنون الآداب وغرائب العلوم وظرائف الحكم كل واحدة منها شبه المدخل والمقدمات والأنموذج لكيما اذا نظر فيها اخواننا وسمع قرائتها أهل شيعتنا وفهموا بعض معانيها وعرفوا حقيقة ما هم مقرّون به من تفضيل أهل بيت النّبي صلعم لأنّهم خزّان علم الله ووارثو علم النبوّات تبين لهم تصديق

---

(١) ذكر السيد الطيباوى أمر الاختلاف في عدد الرسائل في كتاب " جماعة اخوان الصفا " (ص ٣٦-٣٧) . والطريف ما جاء به ادريس عماد الدين في " زهرالمعاني " حيث قال : " فقام الامام أحمد بن عبد الله التّقى صلوات الله عليه بأمر الله ووجبه وهو الثاني من الخلفاء وحجّته عبد الله بن ميمون وأحمد بن عبد الله ممثول النطقة في دورهم مقابل لنوح ثانى النطقاء ولجده الحسين بن على ثاني الأئماء . فنشر العلوم ظاهرا وباطنه وصنف الرسائل وجعلها على العلوم الأربعة......ثمّ جعلها ثلثة وخمسين رسالة شاهدة له ودالّة عليه لأن اسمه بحساب الجمل ثلثة وخمسون الخ "

ما يعتقدون فيهم من العلم والمعرفة الخ" (ج ٤، ص ٢٢٢).

فمن أراد ان يدخل مدينة العلم وجنّة الدين فليأت الباب كما قال النّبي أنا مدينة العلم وعلي بابها. ومن أراد ان يستفيد من هذه العلوم فيجب عليه أولا معرفة الباب وهي معرفة الحدود ومن عرف حدود الدين فدخل الجنة - جنة الدعوة والدين الاختيارى اذ لا اكراه فيه (ج ٤، ص ٤٠٦).

وتقيم الرسائل دعوة الى محبّة النّبي وأهل بيته وولاية على بن أبي طالب وهذه المحبة والولاية هي "العماد" الذى تشير الرسائل اليه و"يجمع الاخوان حرمة الأدب والخروج من جملة العوام" (ج ٤، ص ٢٢٩).

وأمّا القول بالنطقاء والاختلاف في شرائعهم ووضائعهم والدين دين واحد ففلسفة هذا الاختلاف والائتلاف مشبعة في كتب الدعوة الاسمعيلية. ودليل ذلك في الرسائل قولها هذا:- "انّ الأنبياء عليهم السلام لا يختلفون فيما يعتقدون من الدين سرّا وعلانية ولا في شي منه البتّة كما قال تعالى: اقيموا الدين ولا تتفرّقوا فيه ولكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا". وأما النواميس والسنن والشرائع فهم فيها مختلفون كما جاء في الرسائل: -

"......فهكذا شرائع الانبياء واختلاف سننهم بحسب كل زمان وما يليق بهم أمة أمة وقرنا قرنا مثل شريعة نوح عليه السلام في زمانه، وشريعة ابراهيم عليه السلام بعده في زمان آخر وقوم آخرين، وشريعة موسى عليه السلام في زمان آخر

وقوم آخرين . وشريعة المسيح عليه السلام بعده في زمان آخر وقوم آخرين ، وشريعة سيد الأنبياء محمد عليه الصلوة والسلام والتحية والرضوان في زمان آخر وقوم آخرين ، كما قال تعالى شرع لكم من الدين ما وصّى به نوحا والذى أوحينا اليك . فهٰؤلاء "كلهم دينهم واحد وان كانت شرائعهم مختلفة" (ج ٤ ، ص ٦١-٦٢) . وأما دين الاسلام فلم يتغيّر منذ خلقت السموات والأرض ولن يتغيّر الى يوم القيمة كما جاء في القرآن : انّ الدين عند الله الاسلام" . ولكن الشرائع الأولة قد نسخت وبدّلت بالأخرى الجديدة لأنّ معنى نسخ الشريعة تبديلها بالشريعة الجديدة . ما ينسخ ناطق من شريعة الاّ يأت بخير منها . وليس النسخ بابطال ما يأتي به الامام الأول بل هو تجديد شريعة السابق .

وانّ "الامام" هو مركز دعوة الرسائل وهو الذى تدعو اليه الرسائل من أولها الى آخرها . واذا اجتمعت خصال النبوة "في واحد من البشر في دور من أدوار القرانات في وقت من الزمان ، فان ذلك الشخص هو المبعوث وصاحب الزّمان والامام للناس ما دام حيّا" (ج ٤ ، ص ١٧١) . والأمام هو صاحب الامر (ج ٤ ، ص ٢٢٥) وصاحب الناموس الأكبر (ج ٤ ، ص ١٨١) والشخص (ج ٤ ، ص ١٨١) . وما بقيت رسالة من الرسائل الا وفي خطبتها " الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى ءالله خير أمّا يشركون" . والمعنى في قول القرآن "العباد" عند

الاسمعيلية الأئمّة من ذرية النبي. والامام هو" خليفة الله وبه صلاح العالم وربما كان ظاهرا بالعيان موجودا في دور الكشف وربما كان مستورا في دور السّتر من تصاريف الزمان ونوائب الحدثان ". وأمّا القول بأنّ الامام المنتظر لا يظهر من خوف المخالفين فمن الآراء الفاسدة والاعتقادات المولمة (ج ٤، ص ٨٧). لا يكون مفقود الوجود بل يعرفه أولياءه. لا يخلو زمان من الامام لأنه " حجّة الله على خلقه وهو تعالى لا يرفع حجّة ولا يقطع الحبل الممدود بينه وبين عباده ". (ج ٤، ص

أنّ الأئمّة هم اوتاد الأرض وهم الخلفاء بالحقيقة في الدورين جميعا. ففي دور الكشف يظهر ملكهم في الأجسام والأرواح. وفي دور الستر يجرى أمرهم في الأنفس والعقول (ج ٤، ص ٣٥٤) ويكون الامام مستترا في " كهف التقيّة " وهو " كهف أبينا آدم " مدّة من الأزمان ولا يكون ظاهرا للعيان موجودا للمكان حتّى جاء وقت الميعاد (ج ٤، ص ١٠٧).

وفي دور الستر يكون فعل إبليس ازاء القوة الامامية أقوى ما يكون لانّ الأمام يكون مختفيا مستورا " وان كانت أنواره يضيء في نفوس العارفين به ". قد صرّحت الرسالة الجامعة ما كانت مرموزا في الرسائل حيث جاء في الرسالة :- انّ الابليس كان بالحقيقة شخص من بقايا أشخاص آخر دور الكشف الأوّل ممّن كان قد لحق بعد شرائطه ووقف على شيئ من معلوماته فلذلك قيل انه كان من الجنّ وانه فسق عن أمر

ربّه......... فلمّا جهل أهل دور الستر الى أن يسجد للذي هو أول خليفة قام به بأمر الله تع وأراد ابليس أن يكون هو القائم بذلك الأمر فأخلف الله ظنّه وجعله تابعا لا متبوعا. فلمّا استكبر ابى وفسق...... وخدع آدم وغرّه وعارضه بمذاكرة علم دور الكشف وما فيه من الفوائد العقلية الباقية الخالدة الخ". فاذا بهذا البرهان أنّ الابليس كان شخصا من دور الكشف تكبّر عن قبول رياسة آدم دور السّتر. وكذلك الأبالسة والشياطين أجمع هم أشخاص موجودون في كلّ دور من الأدوار ازاء الأئمّة وهم الملائكة المعصومون يخالفونهم ويضادّونهم بقدر قوّة صاحب الزمان حتّى يكون زوال دور السّتر فعند ذلك يذبح ابليس ولا يبقى من ذريته أحد ويكون العالم سعادة كلّه لله. وكذلك رموز الدين وأسرار العلوم ومعرفة قائم القيمة محجوبة عن أضداد الأئمّة الذين هم الأبالسة في كلّ عصر من العصور ودور من الأدوار الاّ عند اخوان الصفا وخلاّن الوفا لانّهم ذرّية آدم بالحقيقة كما جاء في الرسائل :- "اعلم يا أخي ايّدك الله وايّانا بروح منه بأن علم البعث وحقيقة القيمة محجوب عن ابليس وذريته وأتباعه وجنوده من شياطين الانس والجن وهو سرّ الله الأعظم لا يطلع عليه احد من خلقه الاّ من ارتضى من أوليائه وأصفيائه وأهل مودّته من ذرّيّة آدم ومن ذرية نوح ومن ذرية ابراهيم واسرائيل وممن هدى واجتبى اذا تتلى عليهم آيات الرحمن خروا سجدا وبكيا الخ". (ج ٣، ص ٨٤).

وأمّا القول بفلسفة العقول وفلسفة الأعداد فمن أهمّ عقائد الاسمعيلية . وهذه الفلسفة التي اتخذوها من الفلاطونيّة الحديثة والفيثاغورية الحديثة مبثوثة في جميع الرسائل . ومنها أن "العقل" هو اسم مشترك يقال على معنيين : أحدهما ما تشير به الفلاسفة الى أنه اول مبدع أبدعه ألباري المبدع . والمعنى الأخير ما يشير به جمهور الناس الى أنه قوة من قوى النفس الانسانية . والنفس الانسانية هي قوة من قوى النفس الكلية . والنفس الكلية هي فيض فاض من العقل الكلي الذي هو أول فيض فاض من الباري (ج ٣ ، ص ٣٧) . فلا توجد في الرسائل والرسالة الجامعة بيان العقول العشرة التي أوردها الفارابي وبصورة أخرى معاصره أحمد حميد الدين الكرماني . ولكن الرسالة الجامعة تذكر أمر الخطيئة الأولى وتقاطر الرتب في العالم الروحاني اللطيف كما جاء في الرسالة :— "فقد بان بالبرهان وصح أن الشرّ لا أصل له في الابداع . وسمّي عجز الأشياء بحدوث بعضها عن بعض شرا بمعنى التخلف عن اللحوق بدرجة الفاضل المتقدّم عليه . ومتى غفل المفضول عن اللحوق بدرجة الأفضل ورضي لنفسه بانحطام الأخسّ الأرذل فهو الشر المحض البعيد عن الخير الخ" .

لا تقدم الرسائل دعوة لامام مستور في كهف التقية في كل موضع بصراحة القول ، بل تذكر أمر الامام والامامة بعبارة غامضة فلسفية علمية . قد أوردت الرسائل ذكر الايّام

الأربعة التي اتخذها الفلاسفة أعيادا، ثمّ قابلتها بأعياد الشريعة الاسلامية لانها وجدتها موافقة لها. " وذلك أن النبيّ سنّ لامّته في شريعته أعياد. فالأوّل منها عيد الفطر، وهو أعظم فرح يكون بخروج الناس من شدّة الصّوم الى الفطر كفرح أهل الأرض بقدوم الربيع. والثاني منها عيد الأضحى، وهو يوم تعب ونصب يوافق للعيد الثاني الفلسفي. ثمّ اليوم الثالث من الأعياد الشرعية هو يوم انصرافه من الحجة الوداع بغدير خم " وفرحه ممزوج لأنّه خالط ذلك بنكث وغدر موافقا للعيد الثالث الفلسفي المتقلّب فيه الزمان من الصيف الى الخريف ". والعيد الرابع من السنة الشرعية هو يوم الحزن والكآبة فهو "يوم وفاة النبيّ وعيد له غير انّه مشوب بمصاب أمّته........كما حزنوا أهل بيت النبوّة لما فقدوا سيّدهم وغاب عنهم واحدهم وتخطفوا من بعده وتفرّق شملهم وطمع عدوّهم واغتصبوا حقهم وتبدّدوا. ثم ختم ذلك بيوم كربلاء وقتل من قتل من الشّهداء ما انتفع الاسلام به ومن قبله ما أنال أحقّ الناس بما قاسى أولاهم بالأمر من بعده. ثم من بعد غيبة صاحب الشريعة صلى الله عليه وسلم قتل من بعده من أجلّة أصحابه المساعدين له في اقامة الناموس معه مثل صدّيقه وفاروقه وذى النورين وما تواتر على أهله وأقاربه من المصائب. فصار ذلك سببا لاختفاء اخوان الصفا وانقطاع دولة خلّان الوفا الى أن يأذن الله بقيام أوّلهم وثانيهم وثالثهم في الأوقات التي ينبغي

لهم القيام فيها اذ برزوا من كهفهم واستيقظوا من طول نومهم " . وكانت الاخوان "احقّ النّاس بالعبادة الشّرعية ....وأحقّ الناس أيضا بالعبادة الفلسفية والقيام بها والتجديد لما دثر منها " . فاذا أكمل الاخوان ذلك كانت لهم "سنة ثالثة" يتميّزون بها . ولهم في هذه السنة الثالثة أعياد وهي لا تشابه أعياد الشريعة ولا أعياد الفلسفة بالحقيقة ولكن بالمثل لأنّ أعيادهم ذاتية قائمة بذواتها تظهر أفعال عنها وبها وفيها . " فأعيادنا أيّها الاخ هي اشخاص ناطقة و أنفس فعّالة تفعل باذن ربها " . فاليوم الأوّل من هذه السنة يظهر فيه أوّل القائمين منهم وهو يوم فرح واستبشار لجميع الاخوان وفي اليوم الثاني يقوم ثانيهم اذ كان فيه "تصرّم دولة أهل الجور" . واليوم الثالث هو يوم قيام ثالثهم وهو يوم "مقاومة الباطل الحقّ وكون الأمر على خلاف ما كان عليه" . وفي اليوم الرابع يرجع الاخوان الى كهفهم - كهف التقيّة والاستتار ويكون ألامر كما قال النبيّ "انّ الاسلام ظهر غريبا وسيعود غريبا فيا طوبى للغرباء " .

وامّا ما اوردناه من ذكر الأعياد فهو مهمّ لكونه فى فصل يسمّى " الفصل الجامع " من خاتمة الرسالة الثامنة من المجلد الرابع (ص ٢٧٦ - ٧٧) وهذا الفصل من الرسائل "بمنزلة القلب من الجسد والرأس من البدن وهو نهاية الغرض بعد الوقوف على ما فيها والارتسام بجميع ما رسمناه والاعتماد

على ما وصفناه " (١) -

وفي هذا الفصل الجامع نكات فلسفيّة ومسائل علميّة تتميّز الاسمعيلية بها وفيه أيضا احدى مساعيهم لتوفيق الدين بالفلسفة والعلم لأن الاسمعيلية أكثر الناس في الاسلام ممّن أدخل الفلسفة والعلم في الدين ولأجل ذلك سمّوهم مخالفوهم " الملاحدة " " الزنادقة " - وهكذا نسبوا الالحاد والزندقة الى الرسائل لمزجها المسائل العلمية والنكات الفلسفية بالعقايد الدينية - وفي هذا الفصل دليل واضح على الصلات بين فلسفة الاسمعيلية ومذهب الرسائل - فهذه الشواهد أوردتها لكي نرى أن فلسفة الرّسائل هي عين المذهب الاسمعيلي وهي تؤيّد رأى العلماء الذين قالوا بأنّ الرسائل لابدلها من صلة بين فلسفتها وبين مذهب الاسمعيلية -

(٨)

وكانت الاخوان يريدون قلب النّظام السياسي المسيطر على العالم الاسلامي - وكانوا يعملون في الخلوات لهذا الغرض السياسي كما استنبط الأستاذ الدكتور طه حسين - وما أحسن استنباطه - حيث يقول :- "كان هؤلاء الناس اذن يعملون من وراء ستار ويؤلّفون جماعة سرية - وكان قوام جماعتهم هذه فيما يظهر، سياسي وعقلي - وكانوا يتوسّلون الى قلب هذا النظام السياسي "بتغيير النظام العقلي وانشاء فلسفة جديدة تكوّن

---

(١) ولعلّ الاشتباه في الاسم حمل الأستاذ السيّد عبد اللطيف الطيباوى على القول بأنّ الجماعة "قد أطلقوا (الفصل الجامع) على الرسالة الجامعة نفسها " (ص ٧٦) .

الحياة العقلية والعملية للفرد والجماعة تكوينا جديدا" (مطبوعة مصرص ٨) - وكانوا يجتمعون لهذا الغرض ويبحثون في مجالسهم السرّية عن خفيّات الأمور - "فتذاكروا يوما من حوادث الايّام .... ومن تغيرات شرائع الدّين والملك وتنقّل الملك والدول من أمّة الى أمّة ومن بلد الى بلد ومن أهل بيت الى أهل بيت - فاجتمع رأيهم واتفقت كلمتهم على أنه لا بد من كائن في العالم قريب وحادث عجيب فيه صلاح الدين والدنيا وهو تجديد ملك في المملكة وانتقال دولة من أمّة الى أمّة" (ج ٤؛ ص ٢٢٥) . وكانوا يعقدون بينهم عهدا وميثاقا يتناصرون ويتعاونون ويكونون "كرجل واحد في جميع أمورهم وكنفس واحدة في جميع تدابيرهم" (ج ٤؛ ص ٢٢٣) - وكانوا يريدون هدم بناء الدين القديم والمملكة القديمة وتأسيس "دولة أهل الخير يبتدى أوّلها من قوم علماء حكماء أخيار" (ج ٤؛ ص ١٤٤) - وكانت دعوتهم الى طلب العلوم والمعارف كلّها ولا يعادون علما من العلوم ولا يهجرون كتابا من الكتب ولا يتعصبون على مذهب من مذاهب لأنّ رأيهم ومذهبهم يستغرق المذاهب كلّها ويجمع العلوم جميعها" (ج ٤؛ ص ١٢٤) - وكانت دعوتهم الى طلب "معلم ذكى جيد الطبع حسن الخلق صافي الذهن محب للعلم طالب للحق غير متعصب لرأى من المذاهب" (ج ٤؛ ص ١٣٠) وترك الاشتغال "باصلاح المشائخ الهرمة الذين اعتقدوا من الصبى آراء فاسدة وعادات رديئة واخلاقا وحشية - فانّهم يتعبونك ثمّ لاينصلحون - وان صلحوا قليلا قليلا فلا

يفلحون "(ج ٤ ص ١٣١) - ثم يحثون الى طلب "الشباب السّالمى الصّدور، الرّاغبين في الآداب المبتدين بالنظر فى العلوم... المستعملين شرائع الأنبياء عليهم السلام، الباحثين عن اسرار كتبهم، التاركين الهوى والجدل " غير متعصّبين على المذاهب بأنّ الله ما بعث نبيّا الّا وهو شابّ، ولا أعطى لعبد حكمة الا وهو شاب، كما ذكرهم ومدحهم فقال عزّ اسمه :- انّهم فتية آمنوا بربّهم وزدناهم هدى.......واعلم بأن كل نبي بعثه الله فأول من كذبه مشائخ قومه... كما وصفهم تعالى فقال :- ولمّا ضرب ابن مريم مثلاً اذا قومك منه يصدّون وقالوا ءآلهتنا خيُرٌام هوما ضربوه لك الّا جدلاً بل هم قوم خصمون " - (ج ٤ ؛ ص ١٣١) - وكل هذه الشواهد تدل على أنّ الاخوان كانوا يريدون تغيير النظام السياسي المسيطر على العالم الاسلامي - واستخدموا الدين الاسلامي والعلوم والفلسفة المتداولة بين النّاس في هذا العصر - وكان هذا العصر " من أنضر العصور الفلسفية الاسلامية " لهذا الغرض السياسي - واقاموا دعوتهم الى حرية الفكر وحرية القول وحرية النفس -

وما أتيت بهذا البحث الا لكيما يرى الطالب اعتقاد الاسمعيلية ونقطة نظرهم في أمر الرسائل لعلّ هذه النقطة تفيدنا في درس الرسائل وفي حلّ معضلاتها اذا درسناها من الوجهة العلمية التاريخية -

پنجاب ايجوكيشنل پريس لاهور

اجابت کرد پسر خورد تر او سلطان محمد از جوزجان در رسید و به سلطنت نشست و وزارت بر قرار بحسنک تفویض کرد، در هواداري سلطان محمد جانب سلطان مسعود را که درین وقت در عراق بود فرو گذاشت چنانچه روزي بر ملا بر زبان راند که هر گاه مسعود پادشاه شود حسنک را بر دار باید کردن، چون سلطان مسعود ملک را از برادر خورد بگرفت و بر سریر سلطنت نشست حسنک را ببهانهٔ آنکه خلعتی از مصریان پوشیده و قرمطي است در نیشابور بقتل آورد،

و عافیت اما من بالا و عامهٔ[1] او را دوست ندارم، و ظاهر مستوفی است
مردی امین و معتمد، اما ستمکار است و من ستمب زده ام و کاری رود
خواهم، و ابو الحسن عقیلی مردی نیک لخت و روستائی طبع است و احوال
و عادات ما را دانسته است و من خوی فرا وی کرده ام پیغامها که برد و آورد
درست[2] گرفته ام و بهیچ حال روا ندارم که از مجلس ما دور باشد،[3] اما[4] حسنک
جوانست و هر چند عادات ما را نیک دریافته است ولی در هیچ دیوان شاگردی
نکرده چگونه باشد اگر این شغل بدو داده آید، تا آنکه نائبان او ما را از
شغل نیشابور بی درد سر میدارند اما مردمان چگویند که محمود را از چندین
خدمتگاران پیری شایسته نبود تا کار بجوانی بایست داد، و[5] کدخدای التون تاش
میگویند مردی جلد و شایسته است و روا باشد که او را کار فرموده آید اما
دل التون تاش نگاه میدارم که[6] جزوی کسی ندارد و دران[7] سرحد متحیر بماند،
پیغامها بطارم بردم بشنیدند،[8] دیگر روز حسنک را بخواندند و آنچه کردنی
بود بکردند | و او را خلعتی پوشانیدند که هیچ وزیری را در هیچ روزگاری (f. 82a)
نپوشانیده بودند[9] و وزارت بدو دادند، وهم دران نزدیکی سلطان[10] پشیمان شد
و این وزارت دادن از جمله خطاهائی که سلطان را افتاد شمردند در آخر عمر،
خاتمت عمر آن پادشاه بر وزارت او بود و چون سلطان محمود دعوت حق را

(1) The Ms. has عامه but see Mas'údí l.c. (2) cf. Mas'údí l.c., who states the opposite. (3) Baihaqí adds here some remarks about Bu Sahl Hamdúní. (4) Mas'údí, و حسنک حشمت گرفته است شمار و دبیری ندانند هر چند نائبان او شغل نشاپور راست می دارند و این بموت او می نواند کرد، (5) i.e., Aḥmad son of 'Abd al-Ṣamad. (6) Mas'údí. چنونی دیگر (instead of جز وی کسی) (7) i.e., in Khwárizm. (8) The Ms. has یکرو (instead of دیگر روز) (9) The Ms. has در instead of و (10) Mas'údí 454: سلطان آخر بحسنک داد و پشیمان شد اکنون همه بر جایند مگر حسنک

بی آن میسر نشود و از رسم دور توان شد خداوند درین باب چه اندیشیده است؟
گفت: در اول که احمد عزل شد دلم بر عارض ابو القاسم کثیر قرار میگرفت
که مردیست از خاندان وزارت و رونقی و منظری دارد و در خدمت ما حشمت
گرفته، دو سال او را بیازمودم این شغل ازو نیامد و شغل عارضی که بعهدهٔ[1] او بود (f. 82a)
تباه کرد، گفتم: خداوند بحال دیگر بندگان واقف است چه اندیشیده[2]؟ گفت:
تو باز نمای که از خدمتگاران ما کدام این شغل را شاید، گفتم زندگانی خداوند
دراز باد این کار خورد نیست و در یک مجلس راست نشود اگر رای عالی صلاح
بیند جماعتی از محتشمان حشم را بطارم دیوان بنشانده آید تا درین باب رای
زنند و نام کسانیکه این شغل را شایند بنویسند و بعرض رسانند تا بر چیزی
قرار گیرد، گفت: صواب همین است، و در حال ارسلان جاذب و علی خویشاوند
و بلکاتکین[3] و بکتغدی را طلب فرمود و بطارم بنشاند، سلطان مرا درین باب
سوی ایشان پیغام داد که بی وزیر کار راست نیاید و من هیچ حال این شغل
باحمد نخواهم داد و عارض شغلی گران دارد و ازوی این کار نیاید شما چه
صواب بینید، از هر گونه سخن در انداختند و در باب هر کس سخنی گفتند
تا دوات و قلم آوردند اول نام ابو الحسن سیاری را نوشتند آنگاه طاهر مستوفی
و ابو الحسین عقیلی و بعد ازان حسنک و احمد عبد الصمد وزیر[4] التونتاش
را، و گفتند: ما اینها را می شناسیم حالت بیشتر حسنک دارد، چون این نسخه
پیش سلطان بردم زمانی تامل کرد پس گفت: ابو الحسن سیّاری یکست

(1) بعدهٔ in the original. (2) ایشیده in the original. (3) بلکانکین in the original. (4) و وزیر in the original cf. Gardízí. p. 99.

خشم میگرفته اند و باز بر یشان رحمت کرده اند و عفو ارزانی داشته و اگر خواسته اند شغل باز داده اند که درین هیچ عیب نیست و نباشد، و خلفای بنی عباس این کرده اند، در روزگار مقتدر سه کرت علی عیسی را از وزارت معزول کردند و باز بدو دادند و چندین دیگر از وزراء بوده اند که یکبار و دو بار معزول و مشغول بوده اند، و در روزگار سامانیان هم بوده است که بو جعفر عتبی و بلعمی را یک نوبت و دو نوبت معزول کردند و بسمرقند و بست و فرغانه فرستادند و دیگر باز آوردند و عفو کردند و شغل باز دادند و از ایشان جز مناصحت و راستی نیامد، اکنون خداوند بدل خویش نگرد آنچه او را خوشتر است کند و فرماید، گفت: احمد مردست کافی و شغل بزرگ از خاطر من دور میداشت و تا وی را معزول کرده شده است رنج بر خاطر من بیشتر است، اما این اولیای حشم من بیشتر دشمن وبند و درین روزگار چون رای مرا در باب او بد دیدند از بدی و دشمنی آنچه ممکن بود بکردند و هیچ محابا ننمودند می ترسم و می اندیشم که اگر شغل وزارت بدو باز دهم و هر چند او را زهرهٔ آن نباشد که بانتقامی ظاهر مشغول شود اما بر باطن او واقف نتوانم بود و اولیای حشم من از وی بترسند و بدین سبب دل همگنان بر من ریش بود، یکتن را آزرده و دلریش داشتن اولیترکه عالمی ترسان و بدگمان گردانیدن، گفتم: هم چنین است که خداوند اندیشیده است و الحمد لله که خداوند را هیچ وزیری و معینی[1] حاجت نیست نه تنها شغل وزارت بلکه همه شغلها خداوند میفرماید امّا آخر وزیری و واسطهٔ بباید که

---

(1) معنی in the original.

حکایت

خواجه ابو نصر مشکانی حکایت کند که در تاریخ سنه تسع عشر و اربعمائه سلطان محمود مرا روزی بخواند و بر جای کرد و از هر گونه غم و شادی میگفت در اثنای آن گفت: رسم بوده است که چون وزیری را معزول کنند و بیازارند و نعمت پاک بستانند دیگر باره وزارت بدو دهند و آنکس پس از آزردگی و جفا و خواری که دیده باشد براستی و امانت آید گفتم: زندگانی خداوند دراز باد اگر غرض حالی درانچه از بنده می پرسد سر ست (sic) تا بگوی سمر فرو شود و آنچه دیده و خوانده گفته آید و اگر غرض چیزی دیگر است بهمه حال تا سر حدیث بدست بنده داده نشود سخن نتواند گفتن، گفت: سمر می خواهم که باز مانی چندانکه خوانده و یاد داری و دیگر حدیث احمد بن حسن است که [هر؟] چند او زنده است اعتقاد من آنست که او روی من نه بیند و در هیچ خدمت من شروع نکند، وهم در دلم میگردد که مگر ایزد تعالی کرده باشد که رضای ما او را دریابد آنگاه اگر شغل وزارت (f. 81b)
بدو داده آید مردم ما را بضعف رای منسوب کنند و ازوی پس ازانکه دُم کنده شده است و درویش گشته و جفای بسیار دیده نصیحت و راستی آید یا نه، گفتم: زندگانی خداوند دراز باد بنده نکتهٔ چند ازانکه بما نزدیک تر ست درین باب باز نماید، بباید دانست که تا جهانست این بوده است که خداوندان بر بندگان

(1) Apparently some copies have 416 instead of 419, particularly the India Office Ms No 1569 (see Názim's Mahmúd) See also p. 127 note 1. When Ahmad Maimandi died in 424, and Mas'úd held a Council for appointing his successor, he asked Abú Nasr to repeat his father's remarks about the various persons who were considered at the time of Hasanak's appoinment. These remarks which are given in T. Mas'údí, p. 453, offer variations to the text of the Athár.

خلعت مصریان متنفر شده بود بجهت سوختن خلعت با سر رضا آمد، فی الجمله صورت و سیرت حسنک در حضرت سلطان رواج و قبول تمام یافت،

حکایت[1]

آورده اند که سلطان محمود دایم الاوقات در باب مذهب کرّامیان بامیر حسنک مناظره میکرد و گفتی ایشان مردم پارسا و صاحب کرامتند و حسنک گفتی جمله مزوّر و طرّارند تا چنان واقع شد که سلطان عازم حرب بو علی سیمجور شد و بو علی را المؤید من السماء لقب بود، چون سلطان ببوزجان جام رسید گفتند اینجا زاهدیست از کرامیان، سلطان عزم زیارت او کرد و حسنک را همراه برد چون نزدیک زاهد رسیدند بنشستند، بعد از ساعتی سلطان فرمود که ترا از مال دنیا چیزی می باید گفت مرا بدنیا حاجت نیست و دست در هوا کرد و یک مشت زر از هوا بگرفت و بامیر و حسنک داد چون حسنک دران نظر کرد همه بسکّهٔ بو علی سیمجور بود، چون سلطان از پیش آن زاهد برخاست حسنک را گفت که این کرامت را چگونه منکر توان شد گفت ای خداوند من این کرامت را منکر نیستم اما خداوند را بجنگ کسی نباید رفت که در آسمان زر بنام او میزنند و زرها را بسلطان نمود سلطان بسیار بخندید و دانست که آنهمه زرقست و کرّامیان را بعد ازان منکر شد،

(1) This anecdote seems to be improbable. The incident could not have happened after 387 (the year in which Abú 'Alí Símjúr died; Gardízí p. 57) but in 387 Ḥasanak would be only a small boy.

APPENDIX IV.

Extract from the *Āthár al-Wuzará'* relating to Hasanak.

(f. 80b) الوزیر حسنک ابو علی الحسن بن محمد بن العباس

از آل میکال و خانه‌واده احتشام نیشابور بود، در طفولیت بخدمت سلطان محمود پیوست و لطافت و [1]لیاقت (sic) بیحد داشت و صورت و طلعتی مرغوب و محبوب و از مقربان درگاه سلطان شد، و سلطان او را حسنک خواندی و بدین نام تا وزارت یافت و معزول و مقتول گشت مشهور بود، مال وافر [2]بیندوخت و تصرف و حکومت نیشابور از [3]خواجه احمد فرو کشوده تقلد کرده و نوّاب را قایم مقام خود بنیشابور فرستاد و خود بدرگاه سلطان بود و بدان مهم بواجبی قیام نمود و نواب او فارغ دل کار میراندند و مزید اعتقاد سلطان می شد، و عزیمت زیارت بیت الله نمود و از راه [شام—ظ] مراجعت [4]کرد و با پادشاه مصر که از خلفاء اسمعیلیه بود ملاقات نمود و او را خلعت داد و رسالت و اخلاص بر زبان حسنک ابلاغ نمود سلطان بسمع قبول اصغا [5]نفرمود و از غایت تعصب فرمود تا آن خلعت را بسوختند در سر چهار سوی بازار | [6]غزنین، و خلیفه عباسی القادر بالله از رفتن حسنک بمصر و گرفتن (f. 81a)

---

(1) لیاقت is preferable cf Yamíní (on the margins of al-Fath al-Wahbi II. 321. (2) نیندوخت in the original but cf. Ta'ríkh Mas'údí (Calcutta edition) p. 219 (3) *i e.* Khwája Ahmad b. al-Hasan al-Maimandí, but cf. *Turkestan* p. 290. According to Barthold Hasanak replaced the Karrámí leader Abú Bekr Muhammad b. Isháq, who was dismissed from the Ra'ís-ship of Níshápúr, on account of his unpopularity. (4) *i.e.*, after the pilgrimage he took the Syrian route, cf. Mas'údi, p. 212. (5) بفرد in the original. (6) This is incorrect; see Mas'údí, p. 213.

APPENDIX III.

Extract from the *Ta'ríkh-i-Baihaq* by 'Alí b. Zaid al-Baihaqí relating to the Míkálís.

[Br. Mus. Copy No Or. 3587.]

[f.68a] میکالیان خاندانی قدیم است در نیشابور و بیهق و جد ایشان میکال بن عبد الواحد بن جبرئل بن القسم بن بکر بن دیواستی و هو سور بن سور ن سور بن سور اربعة من الملوک بن فیروز بن یزدجرد بن بهرام جور و العقب من میکال شاه بن میکال، و من هذا البیت الامیر ابو العباس اسمعیل بن عبدالله بن محمد بن میکال و قال ابن درید مقصورته فیه و فی ابیه، و العقب من الامیر ابی العباس اسمعیل الامیر ابو محمد عبد الله، توفی الامیر ابو العباس سنة اثنتی و تسعین[1] و ثلثمایة و رئیس نیشابور و وقف کننده اسباب خویش بود [و] الامیر احمد بن علی بن اسمعیل المیکالی، و عقب او بود امیر عالم ابو الفضل عبید الله بن احمد مصنف کتاب المنخل (sic) و کتاب مخزون البلاغة و غیر آن و صاحب نظم و نثر بود، او را دیوان و رسائل است، و العقب من الامیر العالم ابی الفضل عبید الله بن احمد الامیر الحسین و الامیر علی و الامیر اسمعیل، و للامیر علیّ بن الامیر ابی الفضل دیوان شعر، و امیر و رئیس جمال الامرا علی بن الامیر ابی عبد الله الحسین بن شیخ الملک ابی محمد زید بن الحسین از فرزندان میکالیان است من قبل جدته،

---

(1) See Appendix I Table B, note a. تسعین is probably a scribal error for ستین see p. 115.

f. 586 b الامير ابو القاسم على بن عبدالله الميكالى

اكبر ابناء الامير السيد ابى الفضل ادام الله عزّه و آدبهم و اعلمهم و هو فى الكرم همام و فى الطب امام وله شعر لم يخرج بعد لانه لا يظهره ترفعا عنه و سوء الظنّ به فمّا اختلسه حفظى منه قوله فى شدة الحرّ

كانّ و الهجير يطبخنا ... و البق تقتات كل ما نضجا
طبخ صيام يراقبون به ... ادراكه و الظلام ان يلجا

و سالحق ما اجده من غيره بهذا الكتاب ان شاء الله تعالى

f. 587 a الامير ابو العباس اسمعيل بن عبد الله

كثير المحاسن غزير الفضائل كريم النفس شريف الطبع كتب الى الامير ابيه ايدهما الله و كان خرج الى [1]ناحيته ابياتا منها

و لو انى غداة البين اغدوا ... امام الخيل فى خدم الامير
للاحت لى تباشير الامالى ... و هشّت لى أسارير السرور
و لكنّى [2]لقيد الاذن منه ... اقت وجدّ قلبى فى المسير

(1) ناحية ? (2) لفقد ?

فقلتُ لهم و القلبُ مِنّيَ خافقٌ   أناشدكم لاتجعلوهُ ابنَ طاهرِ

وقوله وله قصّة

عجبا الزمان حين بلانى   بأناسٍ لهم عقول سخيفهْ
حسدونى على نزولى خصّا   بعد سكناى فى قصور منيفهْ
حسد الكلب و الغراب اذا ما   رأيا الباز واقعا فوق جيفهْ

و قوله فى تراجع الشرب

شربت الراح شربَ الهيم دهرًا   فصرت الآن اشرب بالتّكلف
ويكفينى غُميرٌ[1] دون صحنٍ   و ما ضرّ التخلف فى التخلف

و قوله لبعض اصحابه

حسبتك لبَّ الجود بذلا و همّةً   فادخلت فيها كنت احسبه وهنا
و كنت كما قدّرت لبّ سماحة   و لكن كلب الجوز اذ فارق الدهنا

و قوله فى قينة تسمّى دَهزاره

تبدّى النورُ و القمريُّ اضحى   يجاوب[2] فى ترنّمه هزارهْ
*فطاب الوقتُ[3] و الدنيا و لكن   أمرَّ العيشَ فرقةُ دَهزارهْ

و قوله

اذا محنةٌ ضاقت بذرعك فاصطبرْ   و ثِقْ بتقضّيها اذا ساعدَ العمرُ
فرأسك غصن الصبر و الصبرُ دوحة   و ما دام غصنُ الدوحِ ينتظر الثمرُ

(1) Kháṣṣ al-Kháṣṣ (Cairo, 1326, p. 178): عُمَيرٌ دونَ عَمرو   (2) *ibid.* يحاكي
(3) *ibid.* و غضّ العيش

APPENDIX II.

Text of the articles in the *Tatimma al-Yatima* (Bibl. Nation. Paris Ms. Arabe 3308) on the Míkális, which supplement those in the *Yatima* (Vol. 4).

(f. 549a) الامير ابو ابراهيم نصر بن احمد الميكالى ادام الله عزّه فردُ خُراسان و بدْرُها و صدْرُها و فخرُها و من لم يرَ مثلهُ فى الجمع بين شرف الاصل وكمال المجد و كرم الطبع و بين الآداب العربيّة و الفارسيّة و الاداة الملوكية وله شعر بارع قلّ ما يظهر و لكن دُررَه تلتقط من مجلسه و غرره تختلس من فمه كقوله

تق اللهَ لا الاعداء و اعلم [1]تيقّنًا   بان الذى لم يقضه لن يصيبكا
وحظّك لا يعدوك ان كنت قاعدا   و لا انت تعدُوا حين تعدو نصيبكا

و قوله

ما قبيح كالبخل قبحًا و لا كالجود   كل الخصال حسنًا يفوت
ثمّ بخل مع التواضع خيرٌ   من سخآءٍ يشوبهُ جبرُوْت
و لعمرى انّ [2]المزنّد ذا البخل   لئيم مذمّم ممقوت

و قوله

لعمرك مَن ولّاك وجهَ اعتذارِه   من الفعل يأتى و هو فى الحال فاعلهْ
كمعتذرٍ من اكله ذاتَ بطنه   الى آكليه و هو فى الحال آكِلهْ

و قوله فى مرثية ابى العبّاس بن طاهر بن زينب

(f. 549b) نعوْا لى ابا العبّاس شمسَ المفاخر   و بدرَ المعالى كلها و المآثر

---

(1) The original has تقينا which is impossible. (2) The original has المرند

روّح الله روحهما باملاء جناب مكرمت شعار رفعت دثار صاحب الشرف و الکرامات المتصف بالفضائل و المقامات ذی الحسب الفاخرة و النسب الباهرة امیر جلال الدین منصور بن امیر فخر الدین حسن علی میکال زاد الله تعالی تعظیمه و تکریمه فی الدنیا و الآخرة و هو بخصائص نفسه الشریفة مستغنی عن الاطناب فی الاوصاف٠

و لیس یزید الشمس نورًا و بهجة　　اطالة ذی مدح و اکثار مادح

و انا (sic) الکاتب الفقیر المحتاج الی رحمة ربه الغنی [1]....... العلوی القاینی غفر الله له و لوالدیه فی سلخ جمادی الا[ولی] سنة ست و تسعین و ثمانمائه من الهجرة النبویه علیه السلام٠

(1) The name of the scribe has been obliterated from the original.

لولا مرارته و الماء لولا اسراعه الى الكدر و الرّوض لولا حاجته الى المطر،

لهفى على (f. 178b) دهر الحداثة اذ غصن شبابى غضّ وريق و تقلّ

شرابى عض وريق، النعمة عروس مهرها الشكر و [1]ثوب صوانه النشر،

[2]و من قول اخيه ابى ابراهيم اسمعيل رحمه الله تعالى:

ضاق ذرعى فى هوى قمر قمرَ القلب و ما شعرا

و من قوله رحمه الله:

لا تصبحن بالحيوة ذا ثقة فكل نفس للمنون ذائقة،

انّ لى فى الهوى اسانا كتوما و فؤادا يخفى حريق جواه [اجواه]

غير انّى اخاف دمعى عليه ستراه يفشى الذى ستراه

*و من منثور الفاظه الغريبة[3]

[4]و هو واحد البشر و ثانى المطر، و ثالث الشمس و القمر، و رابع العود و المسك و العنبر،

و هذا القدر كاف للاستدلال على فضائلهم و حسن اخلاقهم و شمائلهم فروّح الله ارواحهم و عظّم فتوحاتهم،

(f. 179a) كتب [5]هذه السطور من خط مولانا فصيح الدين محمّد بعد ما سطر من حالات النسب من خط خواجه نصير الحق و الدين محمّد الطوسى

---

(1) 'Utbi-Man.: نور (2) What is ascribed here to Ismá'il is in 'Utbi-Man. II. 45 seq ascribed to Obaidallàh.

(3) In the original this sentence occurs before ان لى فى الهوى الخ which is written like prose. The verses are ascribed in the Yatima, (IV. 258) to Abu'l-Fadl. (4) In Yatíma, IV. 253, 1-10 where the passage is ascribed to Abu'l-Fadl, we have: هو واحد العصر و ثانى القطار و ثالث الشمس و البدر

(5) In the original: هذا

يعى ابو الفضل و [1]اسماعيل فقال: كلّ منهما بدر فى ضيائه و علائه و بحرٌ فى تيّاره و نمائه غير انّ ابا الفضل ابرع فى لطائف الادب و انظم لقلائد [2]العرب و لكلّ منهم فضل موفور و ادب مشهور و عزّ معقود و مال ممدود و شعر نقى السنخ و الجوهر، الذكى [ذكى] المسك و العنبر الرضى [رضى] المورد و المصدر، فمن قول [1]ابيهما ابى النصر:

[2]بانى العلى و المجد و الاحسان ... و الفضل و المعروف اكرم بان

ليس البناء مشيّدا لكن [3]شيده (sic) ... مثل الثناء يشد بالاحسان

البرّ اكرم ما [4]حوته حقيبة ... و الشكر اكرم ما حوته يدان

(178 a) و اذا الكريم مضى و ولى عمره ... كفل الثناء له بعمر ثان

و من قول ابى الفضل رحمه الله تعالى:

[5]لقد راعنى بدر الدجى بصدوده ... و وكّل اجفانى برعى كواكبه

فيا جزعى مهلا عساه يعود لى ... و يا كبدى صبرًا على ما كواك به

و من منثور الفاظه البديعة: اخلاقك اخذت من الورد عرقه [و فى اليمينى: عرفه] و من الندّ عبقه، اخلاق هى المسك لولا فارته و الورد

---

(1) Qá'ini calls him Abú Ibráhím Ismá'íl on the next page, after 'Utbi. The *Dumya* (p 181), which has an article on him, gives the name of the brother of Abu'l-Faḍl as "al-Amír Abú Ibráhím Naṣr b-Aḥmad", which is probably correct. He is noticed in the Tatimma al-Yatíma (Bib. Nat. copy, f. 549) as well.
(2) 'Utbí-Man : شعر العرب

(1) In the original : ابيها (2) See *Dumya al-Qaṣr* p. 181. (3) Thus defectively quoted in the original. 'Utbí-Manini II. 34 correctly has لك. In the *Dumya* the verse vakes this form : ليس البناء مشيدا آجرّه ... ان البناء مشيد الاحسان
(4) *Dumya*: وعته instead of حوته (5) Cf. Yatíma al-Dahr IV. 258.

انّ اکرمکم عند الله اتقیکم هذا و انّ قبیلة المیکال ذوو انساب شریفة و احساب منیفة و نسب نامهٔ ایشانرا خواجه نصیر الملة و الدین محمد الطوسی شکر الله سعیه ببیان تقریر و بنان تحریر فرموده اند از امیر عز الدین محمد بن امیر تاج الدین الی حضرت ابی البشر صفیّ الله آدم صلوات الرحمن علیه[1] آنچه از کتب تواریخ چون یمینی وغیره معلوم می شود، امروز از اولاد میکالیه تا امیر عز الدین المذکور هذا پنج واسطه هست و الله اعلم، (f. 177a) چنانکه: امیر علی ابن امیر فخر الدین بن امیر علی بن امیر فخر الدین بن امیر علی بن امیر حسن ابن تاج الدین المذکور هذا،

و این امیر حسن المذکور برادر امیر عز الدین المذکور بوده است و پدر ایشان امیر تاج الدین بن امیر ابی القاسم بن امیر عز الدین محمد ابن امیر قوام الدین علی بن امیر جمال الدین مؤید بن ابی سعد بن ابی الفضل عبید الله بن ابی النصر و قیل ابی المحامد احمد بن اسمعیل است بهفت واسطه، و این ابو النصر مذکور و دو پسر وی ابو الفضل و اسماعیل هر سه از علماء کبار بوده اند در زمان سلطان ابی الفتح محمود بن سبکتکین و در شهر نیسابور ساکن بوده اند لیکن ابو النصر باین مشتهر بود که صنیعهٔ سلطان است یعنی از حال صغر پروردهٔ نعمت سلطان و منظور نظر عنایت ایشان بود و در[2] کتاب عتبی گفته که از مفاخر ابو النصر شمرده اند (f. 177b) وجود دو نجیب وی را

(1) The original has و آنچه but 'Utbi could throw no light on persons included in the Table D see above, p. 151 who came centuries after him.
(2) See 'Utbi-Manini II. 42 seq.; the Lahore edition p, 198 seq.

ناطق و شاهد است، و از طرف والده انتساب او بعترت طاهرهٔ مصطفویه و دوحهٔ علیّهٔ علویهٔ زاهره صحیح و صریح و ظاهر است، چون حال برین منوال بود در حیّز تحریر آورده شد تا بر رای اولوالالباب واضح باشد،

﴿ ۲ ﴾

(f. 176a) نسب نامه جناب وزارت مآب دولت اناب صاحب المقامات العلیّة حسبا و نسبا خواجه تاج الدین علی بن خواجه فخر الدین میکال منقول از خط شریف مولانا الاعظم الاکرم قدوة المتاخرین بین الامم مولانا فصیح الدین محمّد بن محمّد بن علی القاینی الفارسی روّح الله روحه شده بفضل الله العزیز العلام و هو حسبی،

بسم الله الرحمن الرحیم و به نستعین

الحمد لله [1] الذی خلق من الماء بشرًا فجعله نسبا و صهرًا و کان ربك قدیرا و الصلوة و السلام علی نبیّهِ و رسولهِ الذی ارسله بالحق بشیرًا و نذیرًا محمّد و آله و صحبه الذین هم للحق ظهیرا، و بعد بر رای عالم آرای اولی الالباب روشن و مبرهن است که شرف انساب خصیصهٔ اولاد آدم است علیه السلام، (f. 176b) کما قال صاحب [2] الکشّاف: قسّم البشر قسمین ذو[ی] نسب [ای] ذکور ینسب الیهم فیقال فلان بن فلان و فلانة بنت فلان و ذوات صهر ای اناثا یصاهر بهنّ، و فایدهٔ این نسب تعارف است فیما بین القبائل کقوله تعالی [3] یا ایها الناس انّا خلقناکم من ذکرٍ و انثی و جعلناکم شعوبا و قبآئل لتعارفوا

(1) Qur. 25 (Súra al-Furqán): 56. (2) Kashsháf (Búláq, 1318) II 331. (3) Qur., 49:13

و ایدهم بالنصر و التمکین و اقام بهم قوائم الدین محقّق و معیّن و مبرهن است که شرف اولاد آدم و امتیاز اهل عالم بفضایل حسب و شرایف نسب است و تفوق بعضی بر بعضی و ترفّع جمعی بر جمعی بواسطهٔ کمال اصالت انساب و جلالت احساب، و مصداق این مقال قول شاعر است

(f.175a) هر کرا [ا]صل [است] قول او درست آمد ازانک
اصل لا یخطئ کلام حضرت پیغمبر است
در چمن باشد درخت نیک و بد بسیار لیک
هر درختی را که اصلش پاک باشد سرور است

مقصود از تمهید این مقدمات و تحریر این کلمات آنک صاحب و صاحب زادهٔ اعظم نتیجة الاکابر فی العجم امیر عز الدین محمّد بن الامیر المرحوم السعید المغفور امیر تاج الدین ابو القاسم بن المرحوم السعید امیر عز الدین محمّد بن الامیر المرحوم المغفور امیر قوام الدین علی بن المرحوم امیر جمال الدین مؤید بن تاج الدین علی بن جمال الدین موید بن ابی سعد بن ابی الفضل عبد الله بن ابی المحامد احمد بن اسمعیل بن عبد الله بن الحسین ابی العباس بن شاه بن میکال بن عبدالواحد بن جبرئیل بن بکر بن دیوای بن سور الملك بن سور الملك (f.175b) بن سور ملك (sic) بن سور ملك (sic) و هم اربعة من ملوك ایران بن فیروز بن یزد جرد بن بهرام جور متصلا الی ساسان بن بهمن بن اسفندیار الی اسحق النبی علیه السلام بن ابراهیم خلیل الله صلوات الله و سلامه علیه برین موجب است که مسطور شد، کتب تواریخ عجم و دفاتر انساب ملوک بدین انتساب صحیح و انتهای صریح بر نهج مسطور و وجه مزبور و مشروح

Table D

Táj al-Dín to Amír 'Alí

Authority : Muhammad Qa'iní

Táj al-Dín 25

Amír 'Izz al-Dín — Amír Hasan

Amír 'Alí

Amír Fakhr al-Dín

Amír 'Alí

Amír Fakhr al-Dín 30

Amír 'Alí 31

Table E

'Alí Míkál to Amír Jalál al-Dín .

Authority: The Scribe Qa'iní

'Alí Míkál 31(?)

Amír Fakhr al-Dín Hasan

Amír Jalál al-Dín Mansúr 33

(circa 896)

We now proced to give text of the two *Nasab Námehs* (by Túsi and Muhammad al-Qá'iní) referred to above.

﴿ ۱ ﴾

(f. 174b) این نسب نامهٔ میکالیه از خطّ قدوة الحکماء زبدة العلماء
خواجه نصیرالحق و الدین طوسی روّح الله روحه نقل کرده شد،

بسم الله الرحمن الرحیم و هو حسبی و نعم الوکیل

الحمد لولیّه و الصلوة و السلام علی نبیّه محمّد و آله اجمعین الطیّبین الطاهرین
اما بعد بر رای صایبهٔ اولوالالباب از سادات عظام و قضاة اسلام و مشایخ
کرام و علماء انام و اهالی ایّام زاد الله دولتهم بالخلود و الدوام الی یوم القیام

TABLE C.

Abu'l-Fadl to Táj al-Dín and his son.

Authorities:	Túsí	Muhammad al-Qá'iní	
18	Abu'l-Fadl 'Abdalláh	Amír Abu'l-Fadl 'Obaidalláh	13
	Abú Sa'd	Abú Sa'd	
	Jamál al-Dín Mu'ayyid	Amír Jamál al-Dín Mu'ayyid	
	Táj al-Dín 'Alí	Amír Qiwám al-Dín 'Alí	
22	Amír Jamál al-Dín Mu'ayyid	Amír 'Izz al-Dín Muhammad	22
	Amír Qiwám al-Dín 'Alí	Amír Abu'l-Qásim	
	Amír 'Izz al-Dín Muhammad	Amír Táj al-Dín	
	Táj al-Dín Abu'l-Qásim	Amír 'Izz al-Dín	
26	Amír 'Izz al-Dín Muhammad (7th century.)		26

Note 1. It will be noticed that Qá'iní, has missed out Túsí's ll. 20 and 21 (J. D Mu'ayyid and T. D. 'Alí) and treated T. D. Abu'l-Qásim (Túsí's l. 25) as two persons.

Note 2. Túsí has told us that the mother of the Amír 'Izz al-Dín Muhammad (l. 24) was an 'Alid lady.

Notes relating to Table B.

Note 1. Additions in square brackets are from the *Dunya* p. 181 and in double square brackets from al-Tha'álibí and 'Alí Baihaqí.

Note 2. According to Baihaqí (see Appendix III) Ismá'íl (l. 15 above) died in 392 but this is a scribal error. Yaqút, who places his death, like other authorities, in 362, tells us that he was 92 in that year.

Note 3. Yáqút and Ibn Shákir agree, as far as they go, with Sam'ání and Baihaqí, except that Ibn Shákir alone calls Abu'l-Fadl 'Obaidalláh (or 'Abdalláh) by the name of 'Abd al-Rahmán.

Note 4. Túsí differs in several important respects from the first four authorities, particularly in omitting the name of Muhammad b Míkál altogether, and describing his descendents as those of Sháh b. Míkál. It is possible that this confusion arose from a remark in Mas'údí's *Murúj el-Dhahab* (see B. Khallikán I. 498 l. 4), which remark, it may be noted, occurs in a briefer form in the Paris edition of the *Murúj* (VIII. 305, l. 1), and in a still more abridged form in the Egyptian edition of the work printed on the margins of the *Nafha al-Tíb* (III. 411).

Note 5. In the *Mu'jam al-Udabá'* VI. 493 l. 11 we have:

الامير ابو نصر بن احمد بن الحسين بن احمد بن عبيدالله بن احمد بن الميكالي

He is said to be a contemporary of Ibn Duraid (*d.* 321). This is impossible for even 'Obaidalláh (*d.* 426) could not have been his contemporary, not to speak of Abú Nasr, four generations lower down.

Table B.

Míkál to Abu 'l-Fadl

Authorities—*Sam'ání* and *'Alí Baihaqí*; also in part, *Tabarí*, *Yáqút* and *Ibn Shákir*. The names in crotchets are from *al-'Utbí* and the *Átháru'l-Wuzará'*, but their place in the table is hypothetical.

Túsí — *Md. al-Qá'iní*

12 Míkál. — Míkál. 12

Muhammad — Sháh — Sháh

'Abdalláh — Ghánim — al-Husain — Abu'l-'Abbás

15 Abu'l-'Abbás Ismá'íl (*d.* 362) — Muhammad — 'Abdalláh 15

16 al-'Abbás — Abu'l-Qásim 'Alí (*d.* 376) — Abú Muhammad 'Abdalláh (*d.* 379) — Ismá'íl — Ismá'íl 16

Muhammad — [Abú Nasr] Ahmad — Abú Ja'far Muhammad (*d.* 388) — Abu'l-Mahámid Ahmad — Abu'l Nasr or Abu'l-Mahámid Ahmad

al-Hasan. — [Abú Ibráhím Nasr] — Abu'l-Fadl 'Obaidalláh (*d.* 436) — A. F. 'Abdalláh — A. F. 'Obaidalláh — Ismá'íl

19 [[Amír 'Alí — Amír al-Husain — Amír Ismá'íl]] 19

It will be noted that the portions of the tables which Túsí has in common with Sam'ání and others, are comparatively less authoritative, and show signs of a confused tradition.

The Genealogical Tables of the Míkálís.

Table A

Bahrám Gúr (and his ancestors) to Míkál

Authorities:	Sam'ání (supported by Baihaqí, Yáqút and Ibn Shákır)		
1	Bahrám Gúr[1].		1
	Yezdajird		
	Fírúz		
	Shúr[2]	Four Princes	
5	Shúr[2]	Four Princes	5
	Shúr[2]	Four Princes	
	Divásí[3] or Shúr[2] al-Malik	Four Princes	
	Bekr		
	al-Qásim		
10	Jibríl		10
	'Abd al-Wáhid		
12	Míkál		12

Note. Túsí agrees with the above but omits al-Qásim and prefixes to the above the following genealogy of Bahrám:

Ibrahím Khalílalláh
Isháq
⋮
Isfandyár
Bahrám
Sásán[4]
!
Bahrám Gúr

---

(1) Sam'ání wrongly has بهرام بن جور. (2) Baihaqí, Yáqút, al-Kutubí: سور; Túsí: بن سور الملک. Apparently سور الملک is the correct form cf. Justi, *Iranian Namenbuch*, p. 316. We learn from Ṭabarí, I. 873 that Fírúz had gone to fight against the Epithalites, who had taken Ṭokháristán, but he was killed in a battle with them, along with his four sons and four brothers, each of whom had the title of 'Prince' (كلهم كان يتسمى بالملک) (3) Baihaqí, Yáqút: ديواستى; Ṭúsí: ديواسى . ديواى and ديواستى may be corrupt forms of ديواشنى; see Ṭabarí, II. 1446, where a dihqán of Samarqand is called by this name and we are told: و يقال ان ديواشنى دهقان سمرقند و اسمه ديواشنج فاعربوه ديواشنى
(4) For the eight names which intervene between Bahrám and Sásàn see Nöldeke, Geschichte der Perser, p. 436*a*.

Túsí's contemporary "**Sáhibzádeh-i-'A'zam Amír 'Izz al-Dín Muhammad" through Míkál and Bahrám Gúr to Abraham.**

(ii) The *Nasab Námeh*[1] of Khwája Táj al-Dín 'Alí b. Khwája Fakhr al-Dín Míkál (see Table C. 31) by Fasíh al-Dín Muhammad b. Muhammad b. 'Alí al-Qá'iní al-Fárisí copied from his autograph by another Qa'iní. He brings down the genealogy to his own times *i.e*, five generations below Túsí's 'Izz al-Dín. Both of those documents were copied, as the scribe tells us in his colophon, at the dictation of the Amír Jalál al-Dín Mansúr b. Amír Fakhr al-Dín[2] Hasan [-i-?] 'Alí Míkál.

Before giving the text of the *Nasab Námehs* from the B. M. copy of the *Ta'ríkh-i-Baihaq*, referred to above, the data from all the above named sources is set forth in a tabular form in the following five sections:

		Sources
A.	From Bahrám Gúr (and his ancestors) down to Míkál.	Sam'ání Baihaqí Yáqút, al-Kutubí, and Túsí
B.	From Míkál down to Abu 'l-Fadl and his sons.	The above sources; also, in part, Tabarí Tha'álibí, and Muhammad Qa'iní. Additions from 'Utbí and Saif al-Dín Hájí
C	From Abu 'l-Fadl down to Táj al-Dín and his son, the Amír 'Izz al-Dín Muhammad.	Túsí and Muhammad Qá'iní.
D.	From Táj al-Dín down to the Amír 'Alí	Muhammad Qa'iní
E.	From 'Alí Míkál (?) down to the Amír Jalál al-Dín Mansúr.	The scribe Qá'iní.

(1) He is apparently the individual noted in the Table D. 30.

(2) I have not been able to identify the author of this Nasab Námeh, unless he is Mawláná Fasíh al-Dín Muhammad al-Nizámí, who was a learned man of the time of Sultán Husain Báyqará, wrote several works on theology, Arabic Grammar, and Rhetorics, and died in Balkh in 919 (see Habíb al-Siyar, III. 3. 345 and Kashf al-Zunún, I. 322, VI. 475).

APPENDIX I.

The Genealogy of the Míkálís.

Their *Nasab Námehs* by Nasír al-Dín al-Túsí
and
Fasíh al-Dín Muhammad al-Qá'iní

The genealogy of the Mikalís has been given by several authors, the most important of them being Sam'ání (d. 562), 'Alí b. Zaid al-Baihaqí (d. 565), Yáqút (d. 626), Nasír al-Dín al-Túsí (d. 672), Ibn Shákir al-Kutubí (d. 764) and Fasíh al-Dín Muhammad al-Qá'iní (9th cent. ?).

The earliest of these authors, Sam'ání, traces the genealogy of the Míkálís to Bahrám Gúr, on the authority of al-Ra'is Abú Muhammad b. Abi 'l-'Abbás al-Míkálí. (see B. 16 in the Tables below). In noticing five important members of the family he gives us further material for constructing their genealogical table.

Sam'ání's contemporary 'Alí b. Zaid al-Baihaqí notices the Míkálís in his *Ta'ríkh-i-Baihaq*[1] (completed in 563). This notice, which is given in Appendix III. corroborates the statements of Sam'ání, and adds the names of the sons of Abu 'l-Fadl.

Yáqút in his *Mu'jam al-Udabá'* (VI. 490) traces the genealogy of Ismá'íl b. 'Abdalláh (see Tables, B. 15) to Bahrám Gúr, and to Míkál only on II 343[2], and agrees entirely with Sam'ání.

The same may be said also of Ibn Shákir[3] who has only two variants from the fairly well authenticated genealogy of the family as given by Sam'ání. He traces the genealogy of Abu'l-Fadl al-Míkálí to Bahrám Gúr.

For further information beyond the point where Sam'ání left it, we are indebted mainly to Túsí and Qá'iní, who bring it down from the 5th to the 7th and the 9th centuries respectively. Appended to the British Museum copy of the *Ta'ríkh-i-Baihaq* are a few leaves giving the following materials about the Míkálís, signed in A. H. 896 by a scribe whose name has been obliterated, though his *Nisbahs* (العلوى القاينى) are still legible :

(i) The *Nasab Námeh-i-Míkalíya* by Khwája Nasír al-Dín al-Túsí, copied from his autograph. This traces the genealogy of

(1) Rotographs of the British Museum copy of this work have been obtained by the Panjab University Library. (2) Note Yáqút's remark on this occasion : و قد ذكر هذا النسب فى عدة مواضع (3) See Fawát al-Wafayát II. 25; (the article on Abu'l-Fadl al-Míkálí).

Every one of 'Izz al-Din's four immediate ancestors is designated by him as "al-Amír."

This *Nasab Námeh* was made up-to-date by Mauláná Fasíh al-Dín Muhammad b. Muhammad b. 'Alí al-Qá'iní al-Fárisí, who brought it down to Khwája Táj al-Dín 'Alí, described by him as 'Wazír.' This 'Ali Míkál is probably the individual who is mentioned among the viziers of the Tímúrid Sultán Abu'l-Ghází Husain as Khwája 'Alá' al-Dín 'Alí Míkál. (see *Habíb al-Siyar,* III. 3 333). Al Qá'ini designates all the intervening generations between the Amírs 'Izz al-Dín and 'Alí as Amírs; also two of the following (?) generations.

and turning his defeat into a victory. Bektughdí fled away but Husain refused to budge from his post and continued to fight, until, being deserted by his men, he was surrounded by the Turkomans and brought down from his elephant. Dá'úd spared his life, but kept him as a prisoner[1]. He was still alive in 451 (*T. Mas'udi*, p. 353).

The Míkális in the Post-Ghaznavid period

After the Ghaznavid period our sources of information about the Míkális are few, but there is evidence enough that the family had not yet ceased to produce remarkable men. Abu 'l-Hasan Baihaqí d. 565 (see Appendix III) describes thus an individual whose grandmother was of this family:

امیر و رئیس جمال الامراء علی بن الامیر ابی عبد الله الحسین بن شیخ الملک ابی محمد زید بن الحسین

The Imám Fakhr al-Dín al-Rázi (d. 606) wrote his *al-Kamállya fi 'l-Haqá'iqi 'l-Iláhiya*, in Persian, for a certain Kamál al-Dín Muhammad b. Míkál, who apparently belonged to this family (see *'Uyún al-Anbá'*, II. 30).

Nasír al-Dín al-Túsí (d. 672) refers in the *Nasab Námeh* (for which see Appendix I) to the eighth descendants of Abu'l-Fadl al-Míkálí as follows:

صاحب و صاحب زادهٔ اعظم نتیجهٔ الاکابر فی العجم امیر عز الدین محمد

(1) Gardízí (pp. 100 sqq.) to whom we owe these facts adds (circa 440): و تا بدین غایت اندر میان ایشان مانده است. T. Mas'údí gives a somewhat different account of these events, see pp. 597 sqq. A. F. Baihaqí mentions him on p. 547 also. Apparently it is he who is referred to as follows in the Maqámát Abú Nasr Mushkání, quoted in the Áthár al-Wuzará', under Ahmad b. Hasan Maimandi. The vizier in examining the attitude of his enemies at the Court of Mahmúd remarks about him:

و حسن (sic) علی میکائیل بسبب تصرف که کرد بر عمل مراعی و تسعیر گوسفندان و بخیانت منسوب شد و خطر جان داشت او را و فرزندان او را خلاص دادم بد نکردم که بچهار هزار هزار درم جملهٔ ایشان را ازان بلاها برهانیدم از چه واجب بود که ایشان بمنازعت من مشغول شوند

Gurgán, the capital of the Hurra's husband Falak al-Ma'álí Mínúchihr. After Mahmúd's death in 421, he was one of those nobles of his court who wrote to Mas'úd explaining their conduct in inviting the Amír Muhammad to occupy the throne temporarily, and urged him to hasten to Khurásán, as he was the rightful heir to his father's dominions (*T. Mas'údí* p. 18). Towards the end of 422 he was in charge of the arrangements made in Balkh in honour of the visit of the Faqíh Abú Bekr Muhammad b. Muhammad al-Sulaimání al-Tusi, who had been sent by the Caliph al-Qá'im, at his accession, to receive Mas'úd's *bai'a*, and was present when the necessary document was signed (*Mas'údí*, pp. 352, 356 sqq., 360). A year later, he was sent by Mas'úd with a party of pilgrims as their leader (*Ra'is al-Hájj*). He was still living in 450, but the times had changed, and he had lost favour at the Ghaznawid court (*ibid.* p. 442). He had a garden, close to Balkh, in which Mas'úd halted on the 13th Jumáda I, 422, when going from Balkh to Khulm, on his way to Ghazní, (*ibid.* 296). Khwája 'Alí's son Bu'l Muzaffar, was Ra'ís of Ghazní and the deputy of his father. When on the above occasion Mas'úd was reaching near Ghazní he waited on him at Barwán with a large stock of provisions. His death was reported from Ghaznín to Mas'úd in Balkh on the 25th Rabí' II, 427. According to Baihaqí he was a clever, efficient, and capable man (*ibid* p. 617).

His brother Khwája Husain is praised by Nizámí 'Arudí[1] (circa 550) as "one of the most accomplished and remarkable men of his time." It was he whom Mahmúd sent to the court of Abu'l-'Abbás Ma'mún Khwárizmsháh (killed in 407) to bring Bú 'Alí b. Siná, Bírúní, and other philosophers and learned men gathered about that court. He succeeded in bringing some of them to Mahmúd in Balkh. We hear of him again in the next reign. He was ordered by Mas'úd to accompany Bektughdí as his *Katkhudá* (or lieutenant), when he was sent against the Seljúqs in 426. A battle was fought at Sipandánqán beyond Nasá, and won by the general, but his army became so busily engaged in looting the enemy camp, that the Seljúq Commander Dá'úd b. Chaghar Beg succeeded in making a counter-attack,

(1) See Chahár Maqála (Revised Translation) p. 86.

There is also a brief notice in the *Tatimma* of Abu 'l-Abbás Ismá'íl, which refers in general terms to his many good qualities and virtues, to his generous soul and noble nature. In the same notice are quoted three lines which Ismá'íl had addressed to his father (see Appendix II.)

In Túsí's *Nasab Námeh* Abu'l-Fadl has a son Abú Sa'd. If the Amír had only three sons, as appears from the *Ta'ríkh-i-Baihaq*, then this Abú Sa'd is al-Husain the ancestor of several illustrious men (see Appendix I, Table C).

We may point out here that the *T. Mas'údí* [1] and other works of the Ghaznawid period mention some men who appear to belong to the family, on account of the familiar "son of Míkál" at the end of their name, but whose genealogy is not fully known to enable us to fit them into the genealogical tables of the family. Among these are 'Alí[2] Míkál and his two sons (Bu'l-Muzaffar Míkál and Abú 'Abdalláh al-Husain), and another individual called by Abu'l-Fadl Baihaqí as Míkál. This last almost certainly was related to Hasanak, and very infamously heaped vile abuse on him, while Hasanak was being taken to the Musallá of Balkh[3] for execution. He had married a sister of Ayáz, the favourite of Mahmúd, and suffered terribly after the execution of the said minister. He was still alive when the *T. Mas'údí*[4] was written, given up to retirement and devotional exercises.

We shall now briefly notice the more important but more doubtful group of 'Alí Míkál and his sons.

Khwája 'Alí Míkál enjoyed a position of distinction at the court of Mahmúd and his son Mas'úd. He is described by A. F. Baihaqí (p. 352) as Ra'ís of Ra'ises who had great experience and skill in managing festive and ceremonial occasions. In 402 he escorted the daughter of Mahmúd to Gurgán and the party was given a grand reception both at Níshápúr[5] and

(1) I am indebted to Dr. Siddiq M.A. Ph. D. for his kindly placing the relevant portion of his Analytical Index of the T. Mas'údí at my disposal. (2) Called Bú 'Alí (apparently wrongly) in certain places in Mas'údí, *e.g.*, on p. 245. (3) See T. Mas'údí, p. 217. (4) *Ibid.* Baihaqí calls him a friend. (5) See Mas'údí, p. 245 seq. Abu'l-Fadl Baihaqí was then a boy of sixteen. At Níshápúr they had erected triumphal arches and decorated them so gorgeously that he never again saw the like of that decoration in the city.

Under each letter the proverbial sayings from the Qur'án and Hadíth precede others. In the Imperial Library, Berlin (Ahlwardt, VII. 593) there are about nine pages of quotations from this work, which was being used as a text in the schools of Nishápúr in the beginning of the sixth century (see *Mu'jam al-Udabá'*, V. 209).

6. *Fadá'il al-Mulúk* (*Kashf*, IV. 452, on the authority of the Rawda al-Safá).

7. *Kitáb Mulah al-Khawátir wa Subah*[1] *al-Jawáhir*. Ibn Shákir and Háji Khalifa mention it without any details but quotations from it are given in the *Yatima* III 77 sq. (also on p. 12?), though, mixed up with those of al-Tha'álibí himself. From these it appears to be a selection of remarkable passages of prose (and poetry?).

8 *Mu'ajjam fi Áthár Mulúk al-'Ajam.* According to the *Kashf*, IV. 629, Abu'l-Fadl is said to have compiled a work of this name.

9. A *Sharh* of the *Hamása* of Abú Tammám (see *Kashf* III. 114).

(*c*) *The grandsons of the Amír Abu 'l-Nasr Ahmad.*

The Amír Abu 'l-Fadl had at least[2] three sons viz. 'Alí, Ismá'íl, and al-Husain (see Appendix III). The eldest, al-Amír Abu'l Qásim 'Alí, has been noticed in the *Tatimma al-Yatíma* (see Appendix II). According to al-Tha'álibí, he was the most accomplished and learned of the sons of Abu'l-Fadl, particularly in the medical science. He wrote poetry also, but did not publish it, looking upon the art of versification as below his dignity. Abu'l-Hasan Baihaqí, however, tells us that 'Alí's poetry had been collected in a *díwán*.

---

(1) *Kashf* has سنح, Ibn Shákir, منح instead of سبح, which is the form given by al-Tha'álibí.

(2) In al-I'jáz wa 'l-Íjáz of al-Tha'álibí (Cairo edn. of 1897, p.275) two verses of ابو على الحسن are quoted, and he is referred to as the son of "Abu'l-Fadl 'Obaidalláh b. Ahmad al-Míkálí." This edition is full of misprints, so it is difficult to say whether he is the fourth son of the Amír, or is identical with one of the above three.

Háji Khalífa (IV. 452) refers in the following words:

مخزن البلاغة فى التاريخ لابى الفضل عبيد الله بن ابى النصر احمد بن على

بن ميكال ذكره صاحب روضة الصفا[1]

But the work certainly was not on history and the confusion may have arisen from some corrupt form of the following remarks of al-Tha'álibí:

كتاب له وسمه بالمخزون ما يؤرخ به محاسن الكلام (*Yatíma*, IV. 249). It may be added that the printed edition of the *Rawda* (Bombay, 1271) does not appear to contain the above remark—at least I cannot trace it. Over eight pages of this work are quoted in the *Yatíma* (IV. 249—258). See also the *Kháss al-Kháss* (Cairo, 1326), pp. 10 seq., and 34' and *Sihr al-Balágha*, p. 195, for selected passages in prose from Abu 'l-Fadl, which may be from the *Makhzún*.

2. *Díwánu Rasá'il* (Baihaqí', Ibn Shákir etc). Quotations from it are given by Husrí see I. 113—14, 116—18, II. 189—92, III. 108—10, and IV. 92—94, 199 sqq.

3. *Díwánu Shi'r*. The *Yatíma* has quotations from it covering over ten pages, and a few occur in al-Tha'álibí's other works e.g., in the *Kháss al-Kháss*, pp. 56 and 177, in *al-I'jáz wa 'l-Íjáz* (Cairo, 1897), pp. 270, 119 (?) and in the *Ahsanu má Sami'tu*, pp. 43 and 122. See also *Husrí* II 73—76, 182, 192 seq., 214 seq., III. 110—13, 124, 187, IV. 95, *Dumya*, 123, and *Ibn Shákir*, II. 25.

4. *Kitáb al-Muntakhal*. This is an anthology of Arabic poetry in fifteen chapters. There is a MS. copy of it in the Cambridge University Library (see Browne's Handlist p. 221). The work has been printed in Cairo in 1391 but wrongly ascribed to al-Tha'álibí, and called المنتحل[2]. It is probably this book which Abu 'l-Hasan al-Baihaqí studied, in his younger days (about A. H. 516), with al-Maidání (see *Mu'jam al-Udabá'*, V. 208,) In the *Ta'ríkh Baihaq* (see Appendix III) and *Fawát* (II. 25) it is wrongly called *al-Munakhkhal*.

5. *Al-Amthál*. Arabic proverbs arranged alphabetically.

(1) See Appendix III. (2) So also in B. Khallikán II. 59 and M. al-Udab. V. 208.

Darj al-Ghurar wa Durj al-Durar, which he devoted to the beauties of the prose and poetry of the Amír. A fragment of this work was published in Leipzig in 1908 (see *Mu'jam al-Matbú'át*, col. 1303), and quotations from it are given in the *Zahr al-Ádáb*, (I 120 seq., III. 113 seq.) and in the *Majání alAdab* VI. 206.

(*b*) *Abú Muhammad Ismá'íl al-Dahhán*. He was a pupil of the lexicographer al-Jawharí (*d*. between 393 and 400). He attached himself to Abu'l-Fadl and wrote eulogies for him and his father. For a specimen of these see *Yatíma*, IV. 310.

(*c*) *Abú Sa'd 'Alí b. Muhammad b. Khalaf al-Hamadhání*. He joined the service of Abu'l-Fadl in 390, the year in which the Amír visited Baghdád, and not only rendered personal service to him but praised him in prose and verse. For specimens of his eulogistic verse see *Yatíma* III. 225.

(*d*) *Hárún b. Ahmad al-Saimarí*. See *Yatíma* II. 4.

In spite of the copious eulogies bestowed by his contemporaries on his compositions, one must agree with the saner judgment of Abú 'Alí al-Hasan al-Bákharzí on his poetry, which is to the effect that in his smaller pieces he shows a great tendency towards artificiality, on account of his fondness for *Tajnís al-Qawáfí*, and play upon words. His longer poems are certainly better. The words of *Bákharzí* are: [1]اذا قطع الشعر قطع الشعر و لكنه اذا قصد اقتصد ("*When he writes occasional poems he splits hairs but when he writes Qasídas he is all right*). The Amír was, in this matter, following the fashion which had been set by Abu'l-Fath al-Bustí, who in his turn had imitated an older contemporary Abú Muhammad al-Bustí (see *Yatíma*, IV. 204 and 233).

Abu 'l-Fadl left several works, which, according to Sam'ání, had a world-wide circulation. A list of these, with some account of each work, is given below:

1. *al-Kitáb al-Makhzún*,[2] or *al-Makhzún*.[3] It contained passages from Abu'l-Fadl's letters. Abu'l-Hasan al-Baihaqí[4] calls it *Kitáb Makhzún al-Balágha*. Apparently it is this work to which

(1) *Dumya*, p. 122. (2) Yatíma, IV, 249. (3) Yatíma IV. 249, *Dumya* 122. (4) See Appendix III.

poet and stylist, and his calligraphy. In another (IV. 249), the words of the Amír are compared to almost every good thing in the world:

كم لك من مقالِ اصفى من الزلالِ

احلى من السلسالِ ابهى من اللآلى

ازكى من الغوالى امضى من الموالى

اقضى من النّصالِ اضوا من الهلالِ

اسرى من الخيال ابقى من الجبالِ

(Cf. the same author's *Aḥsanu má Sami'tu*, Maḥmúdíya Press, Cairo, 2nd edition p. 43).

We pass on to Abu'l-Ḥasan 'Alí al-Bákharzí (d. 467), who wrote an article on the Amír in the *Dumya* (p. 122), a little later than al-Tha'álibí. He had personally associated with Abu 'l-Faḍl, then an old man of over eighty, and was overwhelmed by him with favours. Even at that age the Amír had a prose style[1] which "lowered the spring blossoms in one's estimation," and his letters had the flow of milk and the beauty of a pearl string". The poets flew to him to benefit by his advice and described themselves as belonging to his school. In the beginning of the article he tersely says:—

"If I were asked to name the Prince of Learning (*Amír al-Faḍl*), I would say: the Amír Abu'l-Faḍl".

We mention below four of the most important literary men who were in the service of the Amír:

(*a*) *Abú Ḥafṣ 'Omar b. 'Alí al-Muṭṭawwi'í.*[2] He compiled the

---

(1) Cf. also his remark: من تأمل منثوره فى المخزون علم انه فرحة المحزون و شفاء القلب السليم و عقلة المستوفز و انس المقيم (*Ibid.*)

(2) For him see Yatíma, IV. 311, *Dumya*, 188. For his eulogies of the amír in verse see *Ḥuṣri*, I. 122, and *Dumya*, 189. See also *Dumya* p. 191 for two verses of al-Adíb Abú Yúsuf Ya'qúb b. Aḥmad in praise of Abu 'l-Faḍl, and Ḥuṣrí III. 115 for four verses of Abú Sa'íd Aḥmad b. Shabíb, already referred to as "Shaikh al-Dawlatain on p. 108, addressed to him or to his father.

The high social position of Abu'l-Fadl and his literary attainments won him the admiration and services of many a man of letters. Numerous eulogistic passages relating to him, in prose and verse, can be collected from *adab* books. The most important of these men of letters, as we have already said, was al-Tha'álibí. He dedicated his *Thimár al-Qulúb*[1] and his *Fiqh al-Lugha*[2] to him and apparently also his *Sihr al-Balágha*[3]. In the introduction of the *Fiqh al-Lugha*, which owed its plan and title to the Amír, who lent materials for it from his Library,[4] al-Tha'álibí bestows high praise[5] on him. The Amír owned several villages in the district of Juvain, one of which was called Fírúzábád. On one occasion al-Tha'álibí lived for four months with the Amír in this village[6], and was deeply impressed with his admirable personal qualities. He never found him backbiting any one absent, or swearing at any one present. Never was a beggar turned away from his door, nor a candidate disappointed. Never did he lose his temper when halting, or betray annoyance when travelling. Never did he play the tyrant towards his subordinates. Ever was he eager to do what was good, always did he shun what was not (*Fiqh al-Lugha*, Cairo, 1318, p. 6).

Reference may also be made to the passage from al-Tha'álibí's own Qasídas in praise of Abu'l-Fadl [7] which he has quoted in the *Yatíma*. In one of these[8] (IV. 248 cf Husri I. 123 seq.) he praises him for his handsome appearance,[9] his fine memory, his skill as a

(d. 453) and not his cousin Abu'l-Hasan (d. 488), as "most people believe", according to its editor Dr. Zakí Mubárak (see his contradiction p ح. A similar remark is made in Husri I 114[14] about al-Tha'álibí (d. 429): و ابو منصور هذا يعيش الى وقتنا هذا، which could have been written in or before 429.

(1) see p. 3 of the work, Cairo edition of A.H. 1326. (2) see pp.3 12 of the Cairo edition of A.H. 1318. (3) see p.4 of the Damascus edition of 1350; also the *Ghurar* (ed. Zotenberg) p. xi note 2. (4) see the work, pp. 9 and 11. (5) al-Tha'álibí praises him for

الفكر السبق و الرأى الزنيق، بعد الهمة، حسن الخلق، حسن الصورة، كرم المنصب و شرف المنتسب، فنون الآداب also for سائر ادوات الفضل و آلات الخير و خصال المجد and التواضع سرّ النظم و سحر النثر and ميراث الترسل (*Fiqh*, pp. 3–5). (6) 'Omar al-Muttawwi'i also celebrates his visit to Juwain on a similar occasion, with Abu'l-Fadl, in a eulogistic poem. See Yatima, IV. 314. (7) One of these is quoted in *Dumya*, p. 189. See also Husri, I. 124, and II 23 (where he celebrates a call from the Amír on him). (8) Quoted also in B. Khallikán I. 291. (9) Cf. also Yatíma, IV. 314:

لدى قرم خلائقه نجوم و لكن وجهه للبدر ثانى (al-Muttawwi'i).

al-Tha'álibí (I 174, III 225) incidentally tells us that the Amír had performed the Haj,[1] visited Baghdád in 390 on the return journey, and interviewed several of its literary men, including Abu'l-Faraj 'Abd al-Wáhid b. Nasr, nicknamed al-Babbaghá' (*d.* 398, *Majáni* VII. 608), Abú 'Alí al-Salámí, and Abú Sa'd 'Alí b. Muhammad b. Khalaf al-Hamadhání.

Abu 'l-Fadl's Library[2] was sold by his heirs, according to the *Dumya* (p. 242) and scholars vied with one another in offering high prices for its valuable contents. Al-Qádí Abú Ja'far al-Bahháthí (noticed in *Dumya*, p. 274) particularly, paid large sums for selected books and succeeded in acquiring them. A copy of the *Mu'jam al-Shu'ará'*[3] was bought in this sale for ten dínárs (*Dumya* p. 242).

It may be noted here that out of his contemporaries only two refer to his non-literary activities. One of these is Abú 'Alí al-Hasan al-Bákharzí (the father of the author of the *Dumya*), who refers in a Qasída, to his holding a ministerial office thus :—

حوى دست مولانا الوزير اخى العلا　　ابى الفضل طلقا بالعشيّات بسامـا
قد امتلأ الدنيا قنـا و قرى به　　فنخشاه مطعانا و نغشاه مطعامـا
و ابدع بالرمحين طعنا و كتبةً　　فصار لحبّ القلب و الدرّ نظّامـا
و لو طفت عرض الارض لم أرمثله　　حكيما شجاعا يقطع الحكم و الهامـا

(*Dumya*, p. 249)

The other is Abú Isháq al-Husrí (d. 453), who calls him "the Ra'ís of Níshápúr and its dependencies in this our time"[4] (*Zahr al-Ádáb*, I. 113).

---

(1) Possibly there is a reference to this incident also in the *Khass al-Khass* (Cairo, 1326) p. 64, l. 4, where ابو الفضل المعمى is possibly a misprint for ابو الفضل الميكالى

(2) al-Tha'álibí had borrowed from this library the autograph copy of the voluminous díwán of Abu 'l-Husain al-Ghuwairí (Yatíma III 161.), also the reference books which he utilized when composing his *Fiqh al-Lugha* (see next page).

(3) See Mu'jam al-Udabá' VII. 52.

(4) This passage proves incidentally that this part of the Zahr al-Ádáb was written before 436 (the date of Abu'l-Fadl's death), even before 422 (the date of the fall of Hasanak), and makes it more likely that the author of the book is Abú Isháq

Qur'án, and his liberality. He had studied *Hadíth* with many teachers[1] and in the last years of his life, from Rajab 422 onwards, he held regular meetings (*Majlis al-Imlá'*) for dictating it. Among those who handed down *Hadíth* on his authority, were Abu'l-Fadl Muhammad b. Ahmad al-Tabasí al-Háfiz[2] and Abu'l-Qásim 'Abdalláh b. 'Alí al-Faqíh al-Ajalí[3]. He died on the 10th Dhu'l-Hijja, 436 (*Kitáb al-Ansáb* s. v. *al-Míkálí*).

The date 422 is significant. We have already referred to the fact that Hasanak was executed in Safar 422. The calamity involved the whole family in ruin, and Abu'l-Fadl may well have sought solace in activities of a religious nature, immediately after the catastrophe. He has mourned the losses[4] suffered by him and his family probably on this occasion, in a poem quoted by al-Tha'álibí (IV. 266) under caption:

و له فی النکبة کفانا ها الله تعالی

جفون قد تملکها السهاد — و جنب لا یلائمها مهاد
و احداث اصابتنی و قوی — یذل من الحلیم لها انقیاد
فقد شطت بنا وبهم دیار — و فرق جامع الشمل البعاد
اقول و فی فوادی نار وجد — لها ما بین احشای اتقاد ....
الا هل بالأحبة من لمام — و هل شمس السرور بهم معاد
و لا والله ما اجتمعت ثلاث — فراقهم و جفنی و الرقاد

(1) Ibn Shákir names, out of these, al-Hákim Abú Ahmad al-Háfiz and Abú 'Amr b. Hamdán. (2) See Brocklemann I. 496. He died in 482. (3) Nizám al-Mulk Túsi's brother. He died in A. H. 499.

(4) The property and the endowments of the family confiscated by Government, or wrongfully misappropriated by individuals in 421, were restored to them, according to Abu 'l-Fadl al-Baihaqí, through the intercession of Qádí Sá'id (see Ta'ríkh Mas'údí p. 41), but this restoration may have been only partial, for we are told by the same authority (p. 462) that in A. H. 423, when Ahmad b 'Abd al-Samad was appointed vizier, he was lodged in the Mansion of Abu 'l-Fadl

بسرای ابو الفضل میکایل که از بهر وی پرداخته بودند راست کرده فرود آمد

"The Amír Abu'l-Fadl 'Obaidalláh b. Ahmad overshines the preceding and the following generations of the Míkális as the sun overshines the full moon. His place among them is the place of the central pearl in a necklace, for while he shares with them all their good qualities, accomplishments, virtues and peculiarities, he stands out from among them on account of his attainment in *adab*, of which he is an expert discerner, and in which he possesses great originality, together with a masterly knowledge of all its branches. There is on the face of the earth to-day nothing more beautiful than a letter of his composition, or more perfect than his exposition. He is, as it were, inspired with them by Divine adaptation and guidance, and apt phrases and choice words are captured by his genius and his thinking power.[1] He is thus a substitute for Ibn al-'Amíd, a successor of al-Sáhib, a locum tenens of al-Sábi'. Then, when he turns to write poetry, it is as if 'Abdalláh b. al-Mu'tazz, 'Obaidalláh b. 'Abdalláh b. Táhir, and Abú Firás al-Hamdání have been raised from the dead, and brought a second time to the world—and these men were princes of stylists and kings of poets" [*Yatíma* IV 247].

The other passage is as follows:

"The Eloquence of this period was able to hold together, after al-Sáhib and al-Sábi', on account of Abu'l-'Abbás [Ahmad b. Ibráhím al-Dabbí][2], but, at his death, it reached the verge of destruction. The locks of pens would have turned grey and the ponds of fair composition would have dried up, if the Almighty had not repaired the breaches of *Adab* and the Secretarial Art by the preservation of al-Amír Abu'l-Fadl 'Obaidalláh b. Ahmad, and healed the wounds of eloquence and perfect composition by the protection which He afforded him. He made him the peerless one of his time, the tongue of Khurásán, the warden of the orphan of learning, and the provider of a market for prose and poetry" [*Yatíma* III 119].

In a somewhat more sober style writes Sam'ání, more than a century later, though he also describes the amír as "the peerless one of Khurásán in his time, in letters, accomplishments, sagacity and nobility of lineage". Sam'ání praises him for his urbanity of manners, amiable disposition, devoutness, his daily reading of the

(1) These seem to be favourite expressions of al-Tha'álibi cf. Yatíma III 224, last line. (2) For him see Mu'jam al-Udabá' I. 68—74. He died in 399.

distinction between the two brothers as men of letters. Abú Ibráhím had a wider acquaintance with the Adab literature but Abu 'l-Fadl could apply his knowledge better, in the shape of works which he produced.[1] Al-Tha'álibi has quoted a score of his verses[2], and Bákharzí a dozen more. Muhammad al-Qá'iní, who is calling him Ismá'il instead of Nasr, after 'Utbí, has added to these thirty-two verses four doubtful[3] ones, along with one prose passage, which probably, he has ascribed to him wrongly.

We have already referred[4] to the exertions which Abú Nasr and his brother Abu'l-Fadl, successfully made to regain their confiscated properties, after the fall of their relative Hasanak.

(b) *Al-Amír Abu 'l-Fadl 'Obaidalláh b. Ahmad al-Míkálí.*

He was decidely one of the most brilliant and famous members of the Míkálí family, who played an important part in Khurásán as a poet and man of letters.[6] Unfortunately, we have to depend for his biography almost entirely on the eulogies pronounced on him by his contemporaries, who wrote in verse, or, as was the fashion of the day, in rhymed prose, which is a very difficult medium for the exact expression of historical fact. The most remarkable of these men is al-Tha'álibi, a personal friend of the Amír, who has devoted a long article to him in the *Yatíma* (IV. 247—268), beside numerous casual references scattered all over the work, wherein, generally, he cites various poets and prose-writers on the authority of the Amír (see for example op. cit. I 64, III 36, 38, 85, 105, 147 and 226), or his comments on their verses, as on III 108.[7] The following two passages give an idea of this learned man's admiration for Abu'l-Fadl :

---

(1) *Dumya*, p. 181 : و كان (الامير ابو ابراهيم) اعلم باصول الادب الجزل من اخيه ابى الفضل و ابو الفضل اجمع منه لثمار الفضل، cf. 'Utbi (Lahore edition), p. 198. (2) See Appendix II. (3) In both the printed editions of the Yamini, all the four verses are ascribed to Abu 'l-Fadl. (4) See p. 128.

(5) or 'Abdalláh. (6) Brocklemann I. 286. (7) See also his reference to his meeting with Abú Muhammad al-'Abdalkání at the house of Abú 'l-Fadl and to the Amír's citing the verses of the same Abú Muhammad to him (see Yatíma, IV. 324 seq). The printed edition of the Yatíma has an addendum (IV. 326), which the Amír had added to his copy of the Yatíma, on the authority of its author.

he had tried to pay the armies their dues, fill the Sultán's treasury, and make his subjects happy and contented (*id.* ll. 2 and 3). The poet's personal relations with the Vizier were so good that he was admitted to his presence immediately, whenever he called on him and he was granted his reward, even though the Vizier had no time to read his eulogies (*ibid.* p. 195 [11-12]). His just administration had brought prosperity to the kingdom. The poet could vouch for this fact from his personal experience of his own home-land viz., Sístán After Khalaf's removal from there, for years the country suffered a terrible devastation and the Sultán was not informed. Hasanak attended to its affairs, induced people to return to their homes, listened to their grievances, and restored to the land its original prosperity[1] (*ibid.* p. 196 [12]sq.). He released a hundred prisoners at the 'Íd festival and hosts of men who had been driven away from their hearth and home were allowed to return to their homes:

در روزگار او وطن خویش باز یافت پانصد هزار مردم گم گشته از وطن...

کس بود کو ز کوه یمن برگذشته بود امروز روی باز نهاد از که یمن

(iii) Leaving Hasanak, who had been brought up by the Amír Abú Nasr Ahmad, we now pass on to the two sons of the Amír *viz.* (*a*) Nasr b. Ahmad and (*b*) 'Obaidalláh b. Ahmad, and (*c*) to his grandsons.

(*a*) *al-Amír Abú Ibráhím Nasr b. Ahmad al-Míkálí*.

Al-Tha'álibí, who calls him "the unique one of Khurásán, its full moon, its chief, its pride," tells us in the same strain that " no one had been seen to combine in himself with a noble origin, perfect glory, and a generous nature, that knowledge of Arabic and Persian letters which he had, and those princely appurtenances which he possessed." He had written excellent poetry but rarely made it public (see Appendix II).

Bákharzí who likens him to his brother Abu'l-Fadl, draws a

---

(1) Hasanak held charge of the Baríd of Sistan see p. 125, note 5. No wonder, therefore, that he showed special consideration to the province and its people.

This criticism seems to be based on the remarks of **Mahmúd** quoted by A.F. Baihaqi (see appendix IV).

A similar unfavourable view about him, though **coming from** an inimical contemporary, is presented in the *Athár al-Wuzará'*, where Ahmad b. Hasan al-Maimandi, for whose downfall Hasanak had been plotting and whom he ultimately replaced as Vizier, remarks about him:

حسنک ابلهست و بجاه و مال خویش مغرور و غایلهٔ کارها نداند و

باد وزارت در سر وی نهاده اند'

It may be added here that Farrukhí has six Qasidas in his Diwán addressed to Hasanak. One of these celebrates his appointment as minister (Díwán, Tehrán edition, p. 191); two were presented to him at the Mihragán festival (*ibid* pp. 193, 196) and two at the 'Íd (*ibid.* pp. 194 and 333). He is praised for justice in almost all of these, for sound judgment, political sagacity, accomplishments and virtue (*Mardumí i. e., Muruwwa, ibid.* pp. 193[1] sq.), for his hereditary capacity to wield the pen and the sword with equal skill,[2] for honesty (*ibid.* pp. 196 ll. 4 and 7 and 197), and for modesty[3], and courtesy (*ibid.* p. 48^{13}). Two or three interesting historical facts which Farrukhí specially mentions may also be noted here. He assures us that the appointment of Hasanak had been long wished for by the people but some criticised it on the score of his being too young (*ibid.* $192^{9.21}$). Here is the poet's attempt to meet this criticism.

طعنی دگر باو نتواند زدن عدو   جز آنکه ژاژ خاید و گوید که نیست پیر

ابلیس پیر بود بیندیش تا چه کرد   بگزید بر بهشت برین آتش سعیر

رای درست باید و تدبیر مملکت   خواجه بهر دو سخت مصیب آمد و بصیر

Hasanak's appointment was made two months before the Mihragán festival (*ibid.* $194^{6.10}$). Even within that short period,

---

(1) رای درست، تدبیر مملکت، فضل، و مردی

(2) تیغ را میر جلیل و خامه را میر بزرگ   یافته میراث میری و بزرگی از پدر

(3) But see p. 129 note 1.

The next day (the 28th Safar, 422) he was hanged publicly at the *Musallá* of Balkh, in the midst of a sobbing multitude, and stoned by hired ruffians. His body was left on the gibbet for about seven years, then taken down by order, and buried at an unknown place[1]. He could hardly have been much more than forty at the time of his execution, as in 384 when Mahmúd went to Níshápúr, he must have been a mere baby.

Hasanak had amassed much wealth (*T. Mas'údí*, p. 219; cf. *Áthár al-Wuzará'*, see Appendix IV). The following observation of Abu'l-Fadl (p. 218 seq) relating to his execution is significant:

این بود که گفتی مرا دعای نشاپوریان بسازد و نساخت و اگر زمین و آب مسلمانان بغصب بستدند نه زمین ماند و نه آب و چندان غلام و ضیاع و اسباب و زر و سیم و نعمت هیچ سودش نداشت'

According to the same authority (p. 246 seq) Hasanak had a mind to build a College in Níshápúr, with Bú Sádiq as its Principal, but he does not tell us whether Hasanak was able to carry out this resolve. Muhammad Kháwand Sháh has criticized him as minister thus (in the *Rawda al-Safá*, Bumbay, A. H. 1271 IV. 39):

اما در فیصل و تمشیت امور وزارت عجز و ضعف داشت

(1) T. Mas'údí, p. 220. According to Gardízí the head was sent to the Caliph in Baghdád, but Abu'l-Fadl states that nobody knew where his body was and where his head. Some time after the execution, according to the same authority, Bú Sahl presented Hasanak's head to his friends, at an entertainment, with fiendish delight (T. Mas'údí, p. 220). An elegiac quatrain is quoted by Baihaqí, p. 221, relating to the incident. The official view seems to be presented by Farrukhí, who in a qasida beginning غم نادیدن آن ماه دیدار refers to the happenings related by Gardízí on pp. 93-95 and ends the poem with the following verse:

جهان از بد سگالانش تهی باد چنان کز شیخک بیشرم و طرّار

شیخک here has probably been substituted deliberately for Hasanak, apparently because Hasanak did not fit in ['Alí 'Abd al-Rasúlí, the editor of the Díwan Farrukhí has also added the following note to this verse on p. 165:

شاید اشاره بحسنک وزیر و بردار کردن او باشد]

But even some days before the date given above, the Mikális had begun to suffer heavily. Their properties had been confiscated[1], and even the pious bequests[2] (*Awqáf*) of their ancestors taken possession of, unlawfully, by men now coming to power. The wealthy individuals of the family, their agents, and tenants, had been indiscriminately arrested, fined and subjected to all sorts of indignities. In the Durbár referred to above, the Qádí Sá'id, Sultán Mas'úd's teacher, made a powerful appeal on their behalf, as they were his benefactors. Mas'úd, in response to this appeal, appointed a trustee for the *Awqáf* of the Mikális, who was to administer them through a trustworthy agent. As to their estates Mas'úd, professing ignorance of his father's orders on the subject, ordered that Bu'l-Fadl, Bú Ibráhím (see p. 131 sqq.), and others should appear before Bú Sahl Zawzaní' who was to submit his report to him after due investigation, for final orders. This report was duly made and the properties in question were restored to the Mikális. (T. Mas'údi p. 40 seq.)

This happened soon after the 10th of Sha'bán, 421. Hasanak was at the time in Ghazní with the Amír Muhammad who decided about the end of Sha'bán[4] to move from there in the direction of Bust.

At Takínábád the army deserted him and went over to Mas'úd, who had reached Herát on the 28th of Ramadán[5]. About the middle of Shawwál, three horse-soldiers brought a *firmán* from Herát, to Takínábád, and took Hasanak with them. He was placed under arrest and treated with great harshness. The old charge of his being a Carmathian was revived against him, particulaly by his enemy Bú Sahl Zawzaní, on account of an old grudge that he bore Hasanak,[6] and he constantly urged Mas'úd to execute him. After five or six months' imprisonment, Hasanak was forced to transfer formally all his properties to Mas'úd, in Balkh, and the price was paid to him[7].

(1) Even the carpets, mattresses, etc., of the houses of Shádiyákh in which Mas'úd and his entourage stayed on the occasion referred to on p. 127, belonged to Hasanak. He had got them specially made for those houses. (T. Mas'údí, p. 39).
(2) These existed not only in Khurásán but in 'Iráq as well, see Mu'jam al-Udabá, II. 346. (3) But see p. 134 note 6. (4) cf. Gardízí, p. 94. (5) See Gardízí, p. 94 and T. Mas'údí, pp. 50 and 54. (6) See T. Mas'údí, p. 211. (7) So in Mas'údí, p. 215, but cf. Gardízí, p. 96, l. 20. Abu'l-Fadl Baihaqi gives a detailed account of the execution of Hasanak, and is very sympathetic towards him, see T. Mas'údí pp. 207—221.

Hasanak's pilgrimage led to most serious complications. The Caliph al-Qádir Billáh (r. 381—422) suspected that all the acts of Hasanak had been authorized by Mahmúd and promptly declared that Hasanak was a Carmathian and consequently his life was forfeit. Ultimately, after lengthy negotiations during which he vigorously defended Hasanak, Mahmúd agreed to surrender the robe of honour and the presents to the Caliph for being publicly burnt in Baghdád, but the relations between the Caliph and Mahmúd still remained strained, though not openly.

In 416[1] Hasanak, was appointed Minister in place of Ahmad b. Hasan al-Maimandi, who was dismissed. Mahmúd had at first hesitated to appoint Hasanak, because he was young and inexperienced in statecraft, and had not been trained in any Díwán. Even after making the appointment he is said to have repented it. All the same, Hasanak held office till the death of Mahmúd (Rabí' II, 421), and after that he was retained in office by Muhammad b. Mahmúd, whose partisan he was in the struggle for the throne between the two brothers Muhammad and Mas'úd The struggle, unfortunately for him, ended in favour of Mas'úd, whom he had estranged, even during the reign of Mahmúd by his tactless deeds, and indiscreet remarks[2]. As soon as Mas'úd came into power, he took steps to avenge himself on the offending minister. Even before his accession to the throne, he made a speech in a durbar held in the Garden of Shádiyákh[3], a suburb of Níshápúr, in Sha'bán[4] 421, in which he condemned the administrative innovations introduced by Hasanak, ordered their abrogation, and a reversion to the old order of things:

اکنون می فرمائیم بعاجل الحال تا رسمهای حسنکی نو را باطل کنند و کارهای نشاپور در مرافقت و جز آن همه برسم قدیم باز برند که آنچه حسنک و قوم او می کردند بما می رسید بدان وقت که بهرات بودیم آن را ناپسند می نمودیم اما روی گفتار نبود و آنچه کردند خود رسد باداش آن بریشان'

(1) The copy of the Áthár al-Wuzará' which I have used (see Appendix IV) has 419 but see Názim (p. 137). cf. Farrukhí (Tehrán 1311), pp. 158, 305. (2) T. Mas'údi, p. 208 (3) See *Lands of the Eastern Caliphate*, p. 385. (4) T. Mas'údi p. 40 seq.

wanted to take steps even against their leader, but sensing danger Abú Bekr resumed his ascetic life and thereby disarmed all position. The 'Alid dignitaries (*al-Ashráf al-'Alawíya*) were simultaneously persuaded by Hasanak into submission. and law and order was restored in the place.

A good illustration of the administrative methods of Hasanak is furnished by the following incident. Unlike other towns of Khurásán, streets leading to the markets[1] of Níshápúr had no roofs, which caused great inconvenience to the people on account of the inclemencies of weather and dust. Hasanak persuaded the citizens to roof in the streets. and they vied with one another in putting up beautiful roofs, painted with various pretty designs, and provided with ventilators at suitable intervals. The total cost. *borne by the people themselves*, was ten thousand dínárs, and the whole thing was completed in two months.

After some time Hasanak proceeded to the court of his sovereign, leaving a deputy in Nishápúr who carried on the administration on his behalf quite satisfactorily. Under him justice was done and *Ihtisáb*[2] was rigorously enforced[3] (*'Utbí* II 327).

In 414 Hasanak obtained Mahmúd's permission to perform the *Haj*.[4] On the return journey, as the desert route was unsafe, he went from Medina to Syria, and from there visited Egypt[5]. The Fátimid Caliph presented him a robe of honour and sent presents for Mahmúd. Avoiding Baghdád. Hasanak returned to Khurásán, through Mawsil, and made for Balkh, where Mahmúd was staying in 415, preparing for his impending visit to Qadir Khán, in Transoxiana With numerous loads of presents,[6] Hasanak waited on his sovereign, who received him well, granted him a robe of honour, and ordered him to return to Níshápúr[7].

---

(1) Shawári' aswáq al-balad. (2) Ihtisáb was thus included among the duties of the Ra'ís, contrary to what Barthold states in the *Turkestan* p. 234. (3) It appears from the Átháral Wuzará' that his deputies were still managing the affairs of Nishápúr at the time when his name was proposed for a ministership (see Appendix iv), (4) See Gardízí p. 96 seq., T. Mas'údí pp. 211-12, Názim's *Mahmud*, p. 130. (5) So in Gardízí p. 96. T. Mas'údí, p. 212, refers only to his going from Medina to Wadi 'l-Qura "on the road to Syria," and his receiving the Egyptian robes. (6) Abu 'l-Fadl Baihaqi's remark on p. 509 may be taken to mean that Hasan brought five hundred loads of presents for Mahmúd. (7) Mahmúd returned from Transoxiana in Summer to Ghazni, then led an expedition to Somnat and on his return from India received Hasanak, and the divines and notables who came with him to congratulate Mahmúd on his victory (T. Mas'údí p. 247).

cut off in the prime of youth and his son[1] al-Hasan was brought up by his relation the Amír Abú Nasr Ahmad b. 'Ali (noticed on p. 120), who also died a little later[2]. When Mahmúd heard of al-Hasan's intelligence, elegance[3], and cleverness, he sent for him. Henceforth al-Hasan became his favourite and gradually rose in rank and influence. So many favours were showered upon him that he soon rivalled the chief Civil and Military leaders of his time in position and dignity[4].

Hasanak, for this was the nickname which Mahmúd gave him and which stuck to him to the last, was now appointed Ra'is of Níshápúr. The office was held before him by several members of his family.[5] This appointment he received sometime About A. H. 403, the year in which Mahmúd started his persecution of the *Karrámiya* (*'Utbi* II. 217; *Encycl of Islam*, II. 774; *Turkestan*, 290), replacing thereby the Karrámí leader Abú Bekr Muhammad b. Isháq b. Mahamshád. He acquitted himself very creditably of this responsibility and performed his duties with great energy and skill. In appointing him as Ra'ís of Níshápúr, Mahmúd aimed at the suppression of the Karrámís, who numbered over twenty thousand in that city alone, and who had grasped at the worldly power under the cloak of religion. Hasanak ruled the town with an iron hand, made the chief followers of Abú Bekr disgorge their ill-gotten gains, and imprisoned them in various fortresses. In fact he

---

(1) For Hasan's mother, who was an extraordinarily stout-hearted woman see Ta'ríkh Mas'údi, p. 220. (2) We have seen that Mahmúd came to Níshápúr in 384, and ascended the throne in 388. Hasanak was appointed Ra'is of that town about 403. Thus Abú Nasr's death falls approximately within the last decade or so of the fourth century. (3) Even when in captivity, immediately before his death, he is described as neatly dressed, and well-groomed (T. Mas'údi, p. 213). Note particularly the 'Mawza-i-Mikah' in this passage. See also p. 218 l. 2, where [illegible] described standing at the foot of the gallows, without a shirt:

تی چون سیم سپید، روی حو صد هزار نگار

(4) Against what appears to be the insinuation of al-'Utbi (II. 322) as to the [illegible] of Mahmud and al-Hasan, we have Mahmúd's own statement in the

وی را من پرورده ام و با فرزندان و برادران من برابر است . 212 T. Mas'údi, p.

(5) For example by Abu 'l 'Abbas Isma'il and his son Abú Muhammad 'Abdalláh (pp. 115 and 117). At his installation Mahmúd presented him with a costly robe of honour, a tailasan, and a woollen cloak (durrá'a). T. Mas'údi, p. 765, l. 4. He also held charge of the Barid of Siestan (*ibid.* p. 166) but we do not know during which period.

It seems likely that the Qádi Sá'id, who told Sultán Mas'úd that he had been brought up by the Mikális[1], was referring to Abú Nasr. We must now notice the most important protége of the Amír, viz., Hasanak.

ii. *Abú 'Alí al-Hasan b. Muhammad b. al-'Abbás,* commonly known as *Hasanak*

His grandfather Al-'Abbás, whom al-Maníní[2] calls Abu'l-'Abbás, was, according to al-'Utbí,[3] fortunate in winning the favour of the Sámanids, and was counted among the important personages and landed aristocrats[4] (*dihqáns*) of that period. That this al-'Abbás was a son of the Amír Ismá'íl b. Abdallah (noticed on p. 111), may be guessed from the fact that the Amír's *Kunya* was Abu'l-'Abbás, and that after the death of his father, al-Hassan b. Muhammad was brought up as we learn from al-'Utbí, by his relative Abú Nasr, the grandson of the said Amír Ismá'íl. It is possible that our authorities have been silent on the subject of al-Hasan's relationship with Abu'l-'Abbás, on account of the terrible fate from which that alleged Carmathian had suffered. When Mahmúd came to Níshápúr in A.H. 384[5] as *Sáhib al-Jaish* or Commander-in-Chief of Khurásán for the Sámánís, he made friends with Muhammad b. al-'Abbás. Both of them were young men, with like tastes. Mahmúd appreciated his company as well as his services. But Muhammad was

(1) His words are: که صاعده پس از فضل و خواست ایزد عز ذکره و پس از علم از خاندان میکالیان بر آمده و حق ایشان در گردن من لازم است (Ta'rikh Mas'údí, p. 35). (2) [illegible] al-Wahbí, II, 321. (3) For [illegible] what follows see Ta'rikh al-[illegible] Fath al-Wahbí, II, [illegible]

(4) [illegible] في جملة الأعيان والـ[illegible] [illegible] by al-Man[illegible] the Qámús; see also [illegible] 318. [illegible] in al-Istakhri p. [illegible] in Yatíma, [illegible] ([illegible]), and [illegible] correctly in the [illegible] Dumya 245. [illegible] Níshápúr in the [illegible] divided into five classes — [illegible], faqíhs, [illegible], poets, dihqans, and the [illegible], as we learn from the Ta'rikh al-Yamíní (Paris copy, f. 550 [illegible]) al-Kanjarúdí: في [illegible] من أهلها و هم الفقهاء و الأدباء و الشعراء و الدهاقين و العراة (5) Mahmúd ascended the throne in 388. In Ramadan he was about 23½ years old.

(*Rasá'il*, p. 147, *Majání* VI. 285). It recommended to him a certain Abú Nasr b. Dúsnám. The other is a complaint against the deputy of Abú Nasr in Herát, who had stated that he had attended to fifty different requisitions of al Hamadhání in four months, and yet he (al-Hamadhání) remained dissatisfied. Apparently, al-Badí' was the guest in Herát, of Abú Nasr who had to leave that city for some business. He instructed his deputy to look after the guest. Al-Badí's letter requests the Sheikh to reprimand his deputy for his reprehensible conduct in making those rude remarks. Husrí (II. 250) alone quotes a third letter to him which begins very obsequiously (قد عرف الشيخ الجليل اتسامى بعبوديته ولو عرفت وراء العبودية مكانا لبلغته معه), but which ends with a complaint that the Sheikh had given precedence over him to someone who did not deserve it.

From Abú Nasr's son Abu'l-Fadl we learn that in A. H. 390 Abu'l-Faraj al-Babbaghá' eulogized both him and his father (*Yatíma*, I. 174). Abu'l-Fadl himself also had written verses in praise of his father for which see Husrí, II. 192. See also his letters to his father, *ibid.* I 116, II 190. Apparently, al-Muttawwi'í, whose book relating to the Amír Abu'l-Fadl we shall notice shortly, wrote another one relating to his father the Amír Ahmad (Abú Nasr) (see *Yatíma*, IV 311).

In the circle of Abú Nasr Ahmad one must also include Abú Muhammad al-Hasan b. Ahmad al-Burújirdí, his Chief Secretary. Abú Muhammad had earlier in his life served under al-Sáhib b. 'Abbád. His skill in the secretarial art and his poetry are praised in the *Yatima* (IV. 278).

We have specimens of Abú Nasr's own prose and poetry in Utbí (Lahore, 1300) p. 194 seq. (=*Dumya* p. 181). See also al-Qá'iní's remarks about him in Appendix I, which are taken almost verbatim from 'Utbí, who bestows high praise on the Amír, and tells us that Abú Nasr was a favourite of Mahmúd of Ghazna.

The exact date of his death is not known but there is reason to believe that he died in or near the last decade of the fourth century, as we shall see under Hasanak (see p. 125, note 2).

It may be mentioned here that Bú Sahl 'Abd al-Melik who was appointed Secretary to the Amír 'Abd al-Razzáq b. Mas'úd, the Governor of Peshawar, in 429, was the son of a servant of this Abú Nasr Ahmad (see Ta'ríkh-i-Mas'údí p.666).

Abú Nasr had very friendly relations with Abú Bekr al-Khwárizmí[1]. When on his first visit to Níshápúr, al-Khwárizmí attached himself to the Amír for a time, and wrote many poems in his praise. Later, he went to, Sístán, and having incurred the displeasure of its ruler, was put in prison. From there he addressed a pathetic letter to Abú Nasr in verse, full of regrets for leaving his company :

و ما كنت فى تركيك الاكثارك   يقينا و راض بعده بالتوهم....

و ماء زلال قد تركنا وروده   زلالا و بعناه بشربة علقم....

و انشد فى ذكرى ادارك باكيا   الا انعم صباحا ايها الربع و اسلم....

و قد عاش بعد الخلد فى الارض آدم   فان شئت فاعذرنى فانى ابن آدم....

و انت الذى صورت لى صورة المنى   و اركبتنى ظهر الزمن المذمم

و صيرت عندى النحس الدهر اسعدا   و كذبت عندى قول كل منجم....

(*Yatíma*, iv. 124)

For quotations from two other Qasídas of al-Khwárizmí eulogizing the Míkális in general and Abú Nasr in particular, see *Yatíma* iv. 136 and 141, and 'Utbí, (Lahore, 1300) 196 seq.

We have already referred (p. 119) to Abú Nasr's relations with al-Khwárizmí's formidable rival al-Badí' al-Hamadhání. The *Rasá'il* (pp. 146 and 155 = Husrí I. 235. II. 249, have two letters in the name of Abú Nasr. The first shows that al-Badí' had not met him but knew him only by fame :

و اذا لم القه فهل اجهل خلقه و ماوراء ذلك من تالد اصل و نشب

و طارف فضل و ادب و بعد همة وصيت فعلوم تشهد بذلك الدفاتر

و الخبر المتواتر،

---

(1) For him see p. 107 Note 5.

unequalled in the nobility of the soul, the loftiness of ambition, and the perfection of his equipment for leadership." (*Yatima*, IV. 247).

Abú Sa'íd[1] al-Shabíbí al-Khwárizmí (flourished in the fourth century), who claims to be a sincere friend of the Míkálís, wrote a poem which is quoted in the *Yatima* (iv. 155), referring to some family trouble among them, relating to the chiefship of Abú Nasr. He urges them to accept him as their leader, for he was the best of them in generosity, accomplishments, learning, and noble ambition:

يا آل ميكال انتم غرّة العجم　　لكن احمدَ فيكم درّةُ الكرم....

لا تحسدوا رجلا ما ان له شبهٌ　　فى من برى الله من عرب و من عجم

فمن يحاكيه فى الأفضال و الكرم؟　　أم من يناويه فى الآداب و القلم؟

أم من يساجلهُ فى كلّ مكرمة؟　　أم من يعادله فى الجود و الهمم؟

Similarly he is praised by Abu'l-Fath al-Bustí (d. 430) for plentiful ease, large-heartedness, sagacity, his excellent style and beautiful writing:

جمع الله فى الامير ابى نصر　　خصالاً تعلو بها الأقدارُ

راحةً [2]ثرّةً و صدرًا فضاءً　　و ذكاءً تبدو له الاسرارُ

خطهُ روضةٌ و الفاظه الأزْ* هارُ يضحكن　　و المعانى ثمارُ

(*Yatima*, IV. 218, Husrí, I. 122).

When he built a structure for funerals (*al-Mashhad*) outside the Ma'mar Gate of Nísábúr[3], al-Hákim Abú Sa'íd[4] 'Abd al-Rahmán b. Muhammad b. Dúst wrote the following verses:

حسدوه اذلم يدركوا مسعاتهُ　　لمّا ابتنى دهليزَ باب الآخرَة

و تيقّنوا علما بانّ وراءه　　من جنّة الفردوس دارٌ فاخرَة

(*Dumya*, p. 186).

(1) See p 108 Note 2. (2) Husrí : برّة (3) There was a cemetery in Nísábúr known as Maqbaratu Bábi Ma'mar, see Mu'jam al-Udabá' II. 343. (4) Noticed in the Yatima iv. 304, as well as in the *Dumya* l. c.

form in another letter also (*Rasá'il* p. 64). Most of these letters, however, complain indignantly that their writer was shown coldness after being accorded a warm welcome. Apparently the savant lived with the Amir as a guest for some time, then an estrangement took place (cf. *Rasá'il* p.64) and Al Hamadhání left Abú Ja'far's company. Still he continued writing to the amír, though without being able to elicit a reply from him (*id.*) and finally threatened to stop writing to him just as he had stopped visiting him (*Ibid.* p. 65.) In the letter (*Ibid.* p. 113) which is not quoted by Husrí, he still professes an affectionate regard for the Ra'is, and recommends someone to him for a favour.

We shall presently see that al-Hamadhání, addressed some letters to Abú Nasr al-Míkálí also, so it becomes somewhat difficult to say which of the two amír's is meant in the letter addressed to "the Son of Míkál, the Ra'is of Nísábúr" (*Rasá'il* p. 303). This letter is full of foul satire upon the Míkálís, and the author asserts that they had greatly deteriorated and the generation he had met lagged far behind their noble ancestors.

We now take the following group of the Míkálís, who flourished in the Ghaznavid period:

(*i*) Abú Nasr Ahmad b. Abi'l-Qásim 'Alí.

(*ii*) Hasanak

(*iii*) Abú Ibráhím Nasr b. Ahmad, his brother Abu'l-Fadl, and the sons of Abu'l-Fádl. (see Appendix I, Table B 17-19).

(*i*) *al-Amír Abú Nasr Ahmad al-Míkálí*

We know very little about the facts of the life of Abú Nasr excepting those which pertain to his high social and literary position and his relation with the contemporary literati.

Al-Tha'álibí, after praising his father 'Ali and his uncle 'Abdalláh, speaks of him thus:

"In our times he represents his illustrious forefathers, is the most eminent of nobles, the most distinguished of savants. He is the peerless one of Khurásán, its pride and ornament, who is

In all that Destiny brings—
He makes him love folly, afflicts his heart with blindness,
And pulls him out of his judgment, as one pulls out an hair.
Then, when what He has decreed has happened,
He restores to him his wits, that he may take a warning.

Muhammad died in Ṣafar, 388, and was buried in the house of his father Abú Muhammad (Sam'ání f. 549a; *Yatima*, IV, 298 seq.)

We shall now east a glance at the relations of Abú Ja'far Muhammad with the famous 'Badí' al-Zamán al-Hamadhání[1]. There are at least four letters in the *Rasá'il* (Cairo, 1315) pp. 60—65 and 113, which throw light on the subject. They are quoted in the *Zahr-al-Adáb* also (see pp. I, 236 and 239), with the exception only of the one which occurs in the *Ras'a'il* on p. 113, but Ḥuṣrí asserts that they were addressed to Abú Naṣr (noticed on p. 120), not to Abú Ja'far. At any rate the poem, from which we quote below, is both in the *Rasa'il* (p. 61.) and the *Yatima* (IV. 198) said to have been addressed to Abú Ja'far

Only one of these four letters is dated (in Ḥusrí only), the date being A. H. 383. It is probably the first of the series. This letter forwards a brilliant poem in praise of the Míkálís in which occurs the following passage:

يا بنى ميكال و الجو*د لِعلاّنى مزيج
شرفاً ان مجال النّفضل فيكم لفسيح
و على قدر سنا الممدو*ح يأتيك المديح
فهناک الشرف الار*فع و الطرف الطموح
و النّدى و الخُلق النّطاهر و الخَلق الصبيح

Al-Hamadhání, states in the covering letter that since he had left Jurjan and entered Khurásán, he had addressed a eulogium to none except Abú Ja'far, a remark which he repeats in a different

(1) al-Badí' al-Hamadhání left his native town in 380, went to Jurján, then to Níshápúr in 382, and after travelling through Khurásán and Sístán, finally settled down in Herát, where he died in 398, at the age of over forty. Yatima IV. 167 cf. Brocklemann I. 93.

in Mecca (Sam'ání, s. v. al-Míkálí; *Yatíma*[1]. IV. 297 seq.)

He wrote some poetry. 'Al-Tha'álibí[2] (IV. 297), who did not think very much of it, quotes two of his facetious poems. Bákharzí (p. 180) quotes a more dignified one[3].

Abú Ja'far Muhammad b. 'Abdalláh al-Adíb

He was a distinguished stylist, an expert prosodist, and philologist. Out of religious sciences, he studied the *fiqh* with the same teacher as his father *viz.* the Qádí al-Haramain Abu'l-Husain. (see p. 116 note 2) He also studied Hadith, which he later handed down to others. In 383, he delivered a course of lectures on Hadith (عقد له مجلس الاملاء) which was attended, among others, by *al-Hákim Abú 'Abdalláh, al-Baiyyi'*, already mentioned.[4] Abú Ja'far was the author of several works. He had composed over ten thousand verses[5] out of which al-Tha'álibí declares the following as the best:

اذا اراد الله امرا بامرئٍ   و كان ذا عقلٍ و رأيٍ و بصرْ
و حيلةٍ يعملها فى كلّ ما   يأتى به جميع اسباب القدرْ
اغراه بالجهل و اعمى قلبه   و سلّه من رأيه سلّ الشعرْ
حتى اذا نفّذ فيه امره   ردّ عليه عقله ليعتبرْ

"When God wills that a calamity should befall
A man of intelligence, judgment, insight,
And resourcefulness—qualities which he utilizes

---

(1) al-Tha'álibí quotes verses of certain poets on his authority in the Yatima IV. 56 and 7. (2) His exact words are: واله شعر كتابى يشير لشرف *sic* قائله لا لكثرة طائله The remark is quoted in the *Dumya* p. 235 in another connection thus: و هذا من الكلام الذى يكتب لشرف قائله لا لكثرة طائله و اللفظ لسواى (3) The remark quoted in T. Mas'údi, p. 66 is apparently his. (4) see p. 111 note 1. He died in 405 (Brocklemann, I. 166.)

(5) He had written a Maqsura poem in which occured the following:

اذا ركبتَ كنتَ خير راكبٍ   و ان نزلتَ كنت خير من مشى

His father advised him to omit the line as being applicable only to the Prophet. The son, however, did not accept the advice. (Yatima l. c.)

Sháfi'ís and Hanafís (*al-Madhhabain*) *viz.*, Abu'l-Welíd al-Faradí (al-Qorashí ?)[1] and Abu'l-Husain al-Qádí[2].

In 356 he was raised to the dignity of the Ra'ís of Níshápúr, which position he held for twenty years, solely and independently, undisturbed by any rival claimant, and unencumbered with any deputy or assistant.

In 364 he was proposed as Chief of the Board of Correspondence (*Díwán al-Rasá'il*), the post held, at one time, by his father, who had died in 362 Later, he was proposed as minister to the Sámánid ruler, more than once. On every occasion he declined to accept the unsought for honour. In fact, so humbly and persistently did he entreat the authorities to excuse him from office that they had to excuse him[3].

He was, all the same, diligent in the discharge of his duties. From early morning till late at night, he was engaged in deciding legal cases, and no litigant was refused admission to his court.

In private life, he was a man of devotions and charity. In two *rak'ats* he would finish the whole *Qur'án* and his charity sought out the poor for unostentatious secret assistance. He performed the pilgrimage to Mecca twice, in 347 and 379. On the latter occasion he was requested to take with him his collection of *Hadíth*, which he handed down from teachers of high authority. He did so, and lectured on *Hadíth*, on his way, to eager students, in Níshápúr, Dámaghán, Ray, Hamadhán, Baghdád, Kúfa, and Mecca. Soon after the *Haj* of 379 he died at the age of seventy-two. His funeral was attended by over a lakh of men and he was buried

---

(1) He is apparently Abu'l-Walíd Hassán b. Muhammad al-Qurashí (d. 349), for whom see Sam'ání f. 446 b, l. 10, and Subkí II. 191 sqq. For Nazr al-Mazálim see the *Orient under the Caliphs* (Calcutta, 1920) p. 287 seq., and J. R. A. S. for July, 1911, p. 635 seq. (2) For him see p. 116 note 2. He had attended also the Court of Appeal of the vizier 'Alí b. 'Ísá, as qádí, see Fawá'id al-Bahiyya, p. 36., J. R. A. S. *l. c.* p. 659. (3) This aversion for ministership may be due in his case, as well as his father's, to a dislike for despotism, and an instinctive fear of the dangers to which a high official position exposed its incumbent. A poet of the period thus describes the common fate of the big men of his time :

فكم راينا من كبير ... كبرة قد قصة
غدت على ابوابه ... مواكب مزدحمة
فراح قد صب الردى ... على الثرى جهرا دمه

(Yatima IV. 57.)

to Tarsús in Asia Minor, at the barrier between Islám and Christendom, to defend his faith against the Byzantines; hence his *nisbah* of al-*Muttawwi'í* or volunteer. He loved to associate with the pious and studied *Hadíth* in Níshápúr, and recorded it in Baghdad, Basra, and probably in Syria, but never taught it. He died in Jumádá I, 376, in غزاوة[1] (?), the place where he resided as a holy warrior, and where he had acquired landed property. He was buried in a mausoleum which he had built for himself. (Sam'ání, s. v. al-Míkálí).

Abú Muhammad 'Abdalláh b. Ismá'íl, the Ra'ís of Níshápúr

Just as 'Ali had inherited the knightly qualities of their father, his brother 'Abdalláh had inherited his literary talents. Al-Tha'álibí (*Yatíma*, iv. 297) states that his fame had travelled far and wide, and his varied accomplishments were too numerous to be enumerated.

He had studied Jurisprudence (*fiqh*) with the Qádí al-Haramain Abu'l-Husain,[2] and was regarded as the best expert of his day in the knowledge of *Shurút* see for this term Háji Khalífa II 58). Apart from the *fiqh*, he had studied Hadith with teachers of high authority. In secular learning, too, he had acquired proficiency. He was admired for his skill in the secretarial art and for his eloquence. He had a prodigious memory, and if we could believe al-Tha'álibí. knew by heart a hundred thousand verses of the poets, old and new[3], which he could aptly quote, with facility and grace, in his conversation and correspondence.

In 347, he presided over a Mazálim[4] Court (*Majlis al-Nazar*) which was attended by the two acknowledged leaders of the

---

(1) Is it Ghazáwa (lit. raiding) applied to a colony of Gházis in Tarsús? or is it نزاوة in the district of Nasá? (see Mu'jam al-Buldán III 866)

(2) He is Ahmad b. Muhammad, b. 'Abdálláh of Nisábúr, for whom see al Fawá'id al-Bahíyya, Cairo, 1324, p, 36. He died in 351.

(3) al-Tha'álibí quotes from an autograph commonplace book (Safína) of his (Yatíma III 231). (4) That is appar. the sense cf. Dozy's Suppl.

after Dec. 956=A.H. Ramaḍ. 345; see *Turkistán*, pp. 110, 250), he could find no one in Khurásán who could attend the court of the king along with him, except Ismá'íl. So his name was suggested to the king and he was sent for, but, as usual, he refused to accept office. Ultimately at al-'Utbí's persuasion, he consented to hold the Chiefship of the Board of Correspondence (ديوان الرسائل), a function, which as the minister argued, could be performed only by the learned. All the same, he refused to wear the official dress, when attending the Sámánid Court, in place of his own *ṭailasán* and cloak, and to change his style of wearing the turban which, he fastened, like the *'ulama'*, under the chin[1]. He obtained special permission of the king to dress in his own style. We do not know how long he held this office but we hear praises of his epistolary style from the Qáḍí al-Quḍát Abu'l-Ḥasan al-Háshimí of al-'Iráq (see *Mu'j. Udab. l. c.*)

Abu'l-'Abbás Ismá'íl died on the 15th[2] Safar 362, in Níshápúr, at the age of ninety-two, and was buried in the Cemetery of the Ma'mar Gate. Before his death he made *waqf* to the Muslims all his effects. This information we have from Abu'l-Ḥasan al-Baihaqí, who also calls him "the Ra'is of Níshápúr" (see Appendix III). According to Sam'ání, he was "the Sheikh of Khurásán, its leading man, its chief, in his time."[3]

We now pass on to the two sons of Abu'l-'Abbás Ismá'íl (*viz.* Abu'l-Qásim 'Alí and Abú Muḥammad 'Abdalláh,) and his grandson Abú Ja'far Muḥammad b. 'Abdalláh, (see Appendix I, Table B 16-17) all of whom flourished under the Sámánids. Apparently, he had a third son al-'Abbás, from whom he derived, his *Kunya*, but this fact is not mentioned by our authorities.

Abu'l-Qásim 'Alí al-Muṭṭawwi'i b. Ismá'íl of Níshápúr.

He was counted among the famous knights of Khurásán, who combined military skill with religious zeal. After showing his prowess on many a battle-field in his home-land, he proceeded

(1) For تعمم تحت الحنكة see Bahár 'Ajam 1334, I. 233, and Steingass s. v. تحت الحنک. See also Tatimma Siwán al-Hikma (Lahore, 1351) p. 45 where Ibn Síná is described as similarly ḍressed. (2) But compare al-Jawáhir al-Muḍí'a I. 109, which is prob. incorrect. (3) كان شيخ خراسان و وجهها و عينها فى عصره

خيلاء الملك و لم تستفزه شرّة الشباب فبذلت له مصون ما اكننت... اذ رأيت

لسوق العلم عنده نفاقا ولاهله لديه مزية'

At the death of the Amír 'Abdalláh, the Caliph ordered the appointment of his son Ismá'íl to the Governorship that had fallen vacant[1], but, to the great surprise of his friends, he declined to accept the post, saying that he had decided to go back to his estates in Khurásán.

On his return to Níshápúr, a friend[2] advised him to pay the customary call on the local Ra'ís, on a Friday morning. This he did in company with his friend, but to his great mortification, the Ra'is did not make even the slightest motion from his place in order to receive him. And this cruel insult the *Ra'ís* had offered to a man who had rejected the Governorship of Fárs and Khúzistán! The same friend now counselled him to visit in Herát Ahmad b. Ismá'íl[3] al-Sámání, the ruler of Khurásán. Ahmad was pleased to invite him to play polo with him. The Míkáli gave such a good account of himself on the polo-ground that the Governor wanted to keep him near himself, and offered him several high offices, which, however, Ismá'íl declined to accept. He was then presented robes of honour, and equipped for his journey back to his home. The reception accorded to him in Herát must have considerably added to his prestige.

In his old age Ismá'íl was once again pressed to accept a Government Office. When 'Abd al-Malik b. Núh (r. 343—350) appointed Abú Ja'far Ahmad b. al-Husain al-'Utbí[4] as his minister,

---

(1) The following incidents of the life of Ismá'íl are quoted by al-Hákim Abú 'Abdalláh al-Baiyi' on the authority of Ismá'íl's son Abú Muhammad, who had heard them from his father (see Mu'j. Udabá' II. 345.)

(2) This friend was Abú Nasr b. Abí Habba (not Hayya, as twice in Mu'j Udabá' VI 345). See Yatíma IV pp. 14 (where it rhymes with *al-Hatba* and *dabba*), and 5.

(3) He ruled Khurásán from 295 to 301. (Hamza Isfahání p. 50) Ismá'íl al-Míkálí's father, therefore, must have died within this period, probably between 297 and 301, as Ibn Duraid dictated the *Jamhara* to Ismá'íl in 297.

(4) According to the Áthár al-Wuzará (and *Turkistan*) he was the minister not only of 'Abd al-Malik but of Mansúr b. Núh (r. 350—365) as well. The Áthár says about him:

و بحلیه فضل و ادب و علو اصل و نسب مزین و محلی بود و خزانه پادشاه خود را باموال وافر ممتلی گرداند چنانچه پیش او وزراء آل سامان در جمع اموال و اذخار خزائن عدیل نبودند'

As a reward for this eulogy the Amír Ismá'íl presented the Poet with three hundred dínárs, in a paper tray, for, as he modestly put it, he could not lay his hands on more, at that time. The modest nature of the Amír is brought out also in another anecdote which his pupil al-Ḥákim has related about the *Maqṣúra*. As the Amír Ismá'íl had studied it with the author several times, his pupils wanted him in 346, to recite it to them. He did so, but when he reached the passage summarized above he said, "We have been mentioned in the following verses; would one of you read them?" Abú Manṣúr al-Faqíh then read out the passage and the Amír corrected it." This same Abú Manṣúr happened to be in Aden in 337, and there met a teacher, who had been teaching the *Maqṣúra* as a text-book for years. This shows the wide popularity which the *Maqṣúra* enjoyed in relatively so short a time.

In 297 Ibn Duraid dictated, in Fárs,[1] from memory,[2] to the Amír Ismá'íl, his famous *Jamhara*, without consulting any book, except for two sections of the work (Báb al-Hamza wa'l-Lafíf). In its introduction he tells us that his contemporaries were so apathetic towards *Adab*, and so slow in seeking it, that he had decided to desist from communicating it to them, but having met Ismá'íl and being impressed with his keen intelligence, his learning, his enthusiasm for the acquisition of knowledge, and his regard for the learned, in spite of his high position and his youthfulness, he laid before him what he had been withholding from others. The passage in question is quoted below from the *Jamhara* (Hyderabad, 1344), p. 2:

لمّا رأيت زهد اهل هذا العصر فى الادب و تثاقلهم عن الطلب...

(حبوت) العلم خزنا على معرفتى بفضل اذاعته و جللته سترا مع فرط بصيرتى

بما فى اظهاره من حسن الاحدوثة الباقيه على الدهر... حتى تناهت بى الحال

الى ابى العباس اسمعيل بن عبد الله بن محمّد بن ميكال... فعاشرت منه شهابا

ذاكيا و سابقا مبرّزا و حكيما متناهيا و عالما متقنا يستنبط الحكمة بتعظيم اهلها

و يرتبط العلم بتقريب حملته و يستجرّ الادب بالبحث عن مظانّه و لم تطمح به

(1) See *Mu'j. Udab*. II. 343 seq. I read و اقرنها in l. 2 (instead of و اقربها)
(2) *Ibid*. VI. 490. (3) Ibn Duraid had a prodigious memory; see *M. Udab*. VI 485.

with him, and among them was included al-Hákim Abú Abdalláh *al-Baiyyi'*, the author of the *Ta'rikh Nisábúr*, to whom we have already referred.

His *Adab* studies with Ibn Duraid led to that *savant's* composing two works for him viz. his famous *Maqsúra*, in which he eulogized both the Amír and the Amír's father, and his lexicographical work, the *Jamhara*. In the passage of the *Maqsúra*, devoted to their eulogy, Ibn Duraid states that he did not leave 'Iráq, his homeland, on account of abhorrence or hatred for its people. In fact, since he parted company with them nothing had attracted his eye, which had not met the like of them, with the exception of the two Amírs, 'Abdallah and his son Ismá'íl, who had overwhelmed him with abundant favours :

[1] حاشا الاميرين اللذين أوفدا   عليّ ظلا من نعيم قد ضفا

They revived hope in him and restored the stream of life, which had become turbid, to its original limpid state. They had surrounded him with benefits, for which the whole world could not adequately thank them on his behalf. The Amír 'Abdalláh had reclaimed him after he had been cast aside like refuse. The Amír's son Abu'l-'Abbás great in liberality, high in rank, had come to his rescue, when he needed his assistance most:

[2] ان ابن ميكال الامير انتاشنى   من بعد ما قد كنت كالشئ اللقى

و مدّ ضبعىّ ابو العبّاس من   بعد انقباض الذّرع و الباع الوزى

لو كان يرقى احدٌ بجوده   و مجده الى السماء لارتقى

ما ان اتى بحرَ نداهُ معتفٍ   يشكو اوارى عيّمٍ الّا ارتوى

نفسى الفداء لاميرىّ و من   تحت السماء لاميرىّ الفدا

لا زال شكرى لهما مواصلا   لفظى او يعتاقنى صرف المنى

(1) Sharh Maqsúra Ibn Duraid (Cairo 1328, p. 35); see also الجواهر المضية I 109.

(2) The Maqsúra p. 37; Sam'ání p. 549 b.

'Abdalláh b. Muhammad b. Mikál,
and his son
Abu'l-'Abbas Ismá'il (see Appendix I Table B. 14-15).

For the lives of these eminent men our main source of information is the *Ta'ríkh Nísábúr* by al-Hákim Abú 'Abdalláh Muhammad b. 'Abdalláh al-Háfiz[1], who was a pupil of the above Abu'l-'Abbás Ismá'il. To that work we have no direct access, but several quotations from it relating to Abu'l-'Abbás, and his father, occur in the *Kitáb al-Ansáb* (s. v. al-Mikálí) and the *Mu'jam al-Udabá'*, II 343 sqq. These, along with such information as Sam'ání and Yáqút have collected from other sources than the *Ta'ríkh*, form the basis of what follows.

'Abdalláh b. Muhammad b. Míkál was appointed Governor of the districts of al-Ahwáz and Fárs by the Caliph al-Muqtadir (r. 295-320).

It was during this period that his son Ismá'il was brought to him from Nísábúr, where the family had settled. Ismá'il was born there about 270, and reached man's estate in that city. Before coming to his father he had made a name for himself for his proficiency in *Adab* and skill in horsemanship[2]. His father invited the most distinguished *savant* of the day, Muhammad b. al-Hasan b. Duraid,[3] and some other scholars and divines, and entrusted them with the education of his son. The exact date of the Amír 'Abdalláh's death is not given by the authorities named above, but it must have occured between 295 and 301, as we shall presently show (see p. 114 n. 3).

Abu'l-'Abbás, had studied Adab and Hadíth in Nísábúr. Now that he came to his father and stayed in Fárs he made further studies in these subjects. He studied the *Mu'attá* of the Imám Málik, and the traditions which 'Abdán al-Ahwází (d. 306) and his other teachers, handed down to him. The subject had such a fascination for him that he took it up again in Nísábúr[4], when he returned there after the death of his father, and acquired such specialized knowledge of it that, later in life, when he taught and dictated it, for about ten years, some of the most distinguished *Huffáz* studied it

(1) b. in 324; d. in 405 (Sam'ání s. v. البيع). (2) Mu'jam al-Udabá', II. 346.
(3) b. in 223; d. in 321; see p. 107 n. 4. (4) The list of his teachers and pupils is given in the Mu'jam al-Udabá', l. c.

on poets and writers of rhymed prose, but even thus it is ample to convince us of the extraordinary vitality of the family and of the wonderful achievements of its members.

Muhammad b. Míkál

and

al-Sháh b. Míkál

The first members of the family to acquire prominence in Islám were the Táhirid generals Muhammad b. Míkál and his brother al Sháh, who flourished about the middle of the third century. Muhammad lost his life about A. H. 250 in a campaign against the Tálibid al-Hasan b. Zaid, who had wrested Tabaristán from the Táhirids (see Tabari III. 1532).

Al-Sháh b. Míkál, who is referred to by Tabari (III. 1674, 1730) as the "Mawlá" or the "client" of Táhir, also operated against the 'Alids, when 'Ali b. Zaid al-Talibí revolted in Kúfa, in 256, but with no better success than his brother. There are several references to him in Tabari in connection with the events of the years 251, 252, 255, 256, and 267. In 251 he was serving in Baghdád under Muhammad b. 'Abdalláh b Táhir (d. 253), the Military Commandant (Sáhib al-Shurta) and the Deputy of the Caliph in that city (Tabari, III. 1616). We hear even of his Mansion there (*Ibid.* p. 1732 and 2122[15]). In 267 he took part in the operations against the Zingis, under Abu'l-'Abbás b. al-Muwaffaq (Tabari, III 1950) The date of his death is not known. The poet al-Buhturí eulogized him in several Qasídas, for which see his *Díwán* II. pp. 63, 65, 72—75, and 158. He is called there Abú Ghánim al-Sháh b. Míkál, as we have already seen. Muhammad b. Gháním b. al-Sháh held charge of East Baghdád in 278 (Tabari, III 2122[10]). After this we hear no more of the descendants of al-Sháh, but only of the descendants of Muhammad b. Míkál[1].

(1) This according to the best early authorities. It will be seen, however, from Appendix I, that al-Túsi regards the men in question as the descendants of al-Shah, not of Muhammad.

بالغَرْش او بالغُور مِنْ رَهْطِهِ   أَرُوْمٌ مَجْدٍ سَانَدَتْهَا الفُرُوْعْ

(Díwán II. 74[a])

أَمَا قَائل للشاه و الشاهُ بذةٌ   مُخَبِّرَةٌ عن مُلْك غَرْشٍ و كابلِ

(Díwán, II. 158[16]).

The name Gharsh, or Gharshistán, or Gharjistán, which according to Yáqút (*Mu'jam al-Buldán*, III. 785), was given to the country between Merw al-Rúdh, Ghazní, Ghúr, and Herát, is not used now, but Gharsh is obviously the country situated on the upper Murgháb in Afghán Turkestán, just as Ghúr is the country of the Upper Harí Rúd [1].

Their Genealogy.

The Míkális claimed descent from Behrám Gúr, through his grandson Fíruz, who fell in a battle with the White Huns, whom he wanted to drive out of Tokháristán. Míkál, was the twelfth descendant of Behrám, according to the genealogy of the family given by Sam'ání, (see Appendix I, where all the facts relating to the genealogy of the Míkális have been set forth in a tabular form). The fourth ancestor of Míkál, is the first to bear a Muslim name. About Míkál, himself our source-books are silent. It is really surprising that we know so little about the man each one of whose descendants, during six centuries, proudly called himself, after him, "Son of Míkál ".

Biographies of famous Míkális

In the following pages I propose to notice such members of the family as I can trace.

The information obtainable about them is generally scanty and scattered, for which we have, in several cases, to depend

(1) The periodical Kábul, issue No 4 of the 2nd year, p. 419, tells us that the vilayet of «غرج (و) غرو (غور ؟)» is now called «غوروهزار جات». We learn from Yáqút (M. Buldán III. 786) that in his day the name Ghúr was equally applied to Gharshistán but the Ṭabaqát Náṣiri pp. 360, 371, in describing the invasion of Chingiz Khán, speaks of the region as Gharjistán, so the name had not yet gone out of use entirely, in Yáqút's time.

patronized. Al-Sáhib b. 'Abbád[1], the famous minister of the Búyids, writes in a letter to the *Shaikh[2] al-Dawlatain* Abú Sa'íd al-Shabíbí about them thus :

When I mention them (the Míkális), a joy comes to my heart; when I hear of their accomplishments, a gladness fills my breast. A fine lot they are, whose brilliance is dazzling, whose self-acquired glory overshines that to which they are heir—a blessed tree of which the root is firm, and the branches are high as sky (*Zahr al-Ádáb*, ed. Dr. Zakí Mubárak. Cairo, 1925, I. 112).

We can thus see that their protégé Qádi Sá'id, the teacher of the Sultán Mas'úd, the Ghaznawid, was not exaggerating when he spoke of them thus in A.H. 421 :

"The house of Míkál, is an ancient one. In this city (of Nishápúr) they enjoy special distinction, and in it their works are visible everywhere." (*Ta'ríkh Mas'údí*, d. 40).

Writing even more than a century later Sam'ání (d. 562) said about them :

"The house of Míkál, is a famous house of Khurásán. They are of Níshápúr and their family has produced a host of men of learning and experts in various sciences[3]." (*Kitáb al-Ansáb* s. v. al Míkálí)

The Original Home of the Míkális.

They had settled not only in Níshápúr but in Baihaq (see Appendix II) but their original home was "al-Gharsh wa'l-Ghúr" or "Gharsh wa Kábul" as we learn from the following verses of al-Buhturí (d. 284) taken from the Qasídas which he addressed to Abú Ghánim al-Sháh b. Míkál.

ذاهب فى عمار الغرش و الغور   الى منكب زكت أعياصه

(Díwán, Constantinople, A. H. 1300, II. 73[6])

(1) b. 326 d. 385 (Mu'jam al-Udabá' II. 274). (2) So called because he had enjoyed the patronage both of the Sámánids and the Buyids. A biographical notice of him is given in the Yatíma, IV. 154 seq., see also pp.156seq, 159seq, 164 and 166. He belonged to Khwárizm. Abú Bekr al-Khwárizmi (d. 383) wrote an elegy upon him ; see Yatima, IV. 143. (3) See also 'Utbi (Lahore, 1300), p. 197, and al-Muttawwi'i's remarks in the Zahr al-Ádáb III. 113.

THE SONS OF MÍKÁL

The Míkális were a noble family of Persian origin, in Khurásán, which produced for six centuries (from the third to the ninth of the Hijra) several distinguished warriors, ministers, *Ra'ises*[1], landed aristocrats, and in particular men of letters[2]. Not only did some of them make valuable contributions, in the Sámánid and Ghaznavid periods, to the Arabic Literature—their literary language was Arabic—they were the means of enriching that literature indirectly, in no small degree, by their extensive patronage of letters. In the list of scholars who received favours at their hands were such masters of Arabic as al-Buhtúri[3] Ibn Duraid,[4] Abú Bekr al-Khwárizmí[5] Badí' al-Zamán al-Hamadhání,[6] al-Tha'álibí, and 'Umar al-Muttawwi'i. On their side these *savants* have helped to immortalize the names of their patrons by numerous eulogies in prose and verse. Here is an example from al-Tha'álibí[7] (*Yatíma* IV. 247):

"A discourse about the sons of Míkál—about the antiquity of their house, the nobility of their origin, the superiority of their rank, the generosity of their ancestors and of their kins, their combination of the first glory with the last, of the accomplishments of their forefathers with their own, and of the literary skill of their earlier generations with that of our contemporaries from among them—a discourse about these matters would cover volumes, fill endless scrolls of paper, and wear out pens. And what do you think of a people who were eulogized by al-Buhturi, and served by al-Duraidí[4], —for whom he compiled his *Jamhara*, and about whom he published his immortal *Maqsúra*,—and in whose circle were included Abú Bekr al-Khwárizmí and a host of other eminent men of letters, who had no compeer in their times."

It should not be imagined that the Míkális received such mead of praise only from those of their contemporaries whom they

---

(1) For this functionary see *Turkestan* p. 234. (2) This impression may partly be due to the fact that our sources of information are mostly literary. (3) b. 205, d. 284 (Brocklemann I. 80) (4) b. 223. d. 321 (Mu'jam al-Udabá', VI 483 seq., Brocklemann I. 111. (5) b. 323 d. 383 (Yatíma, IV. 127) (6) d. 389. (7) d. 429 or 430.

PAGE

APPENDIX II.

Text of the articles in the *Tatimma al-Yatima*. (Bibl. Nation., Paris, Ms. Arabe 3308) relating to the Mikalis. — 158

APPENDIX III.

Extract from the *Ta'rikh-i-Baihaq* by 'Alí b. Zaid al-Baihaqi, [Br. Mus. Ms. No. Or. 3587] relating to the Míkális. — 161

APPENDIX IV.

Extract from the Áthár al-Wuzará' relating to Hasanak — 162

LIST OF CONTENTS.

PAGE

1. The Mikálí family — 107
2. The Original Home of the Mikálís — 108
3. Their Genealogy — 109
4. Biographical notices of some famous Mikálís — 109
   (a) Muhammad b. Mikál and al-Sháh b. Míkál — 110
   (b) 'Abdalláh b. Muhammad b. Míkál and his son Abu'l-'Abbás Ismá'íl — 111
   (c) Abu'l-Qásim 'Alí al-Muttawwi'i b. Ismá'íl — 115
   (d) Abú Muhammad 'Abdalláh b. Ismá'íl — 116
   (e) Abú Ja'far Muhammad b. 'Abdalláh al-Adíb — 118
   (f) al-Amír Abú Nasr Ahmad al-Míkálí — 120
   (g) Abú 'Alí al-Hasan b. Muhammad b. al-'Abbas (*i. e.*, Hasanak) — 124
   (h) al-Amír Abú Ibráhím Nasr b. Ahmad al-Míkálí — 131
   (i) al-Amír Abu'l-Fadl 'Obaidalláh b Ahmad al-Míkálí — 132
   (j) The Grandsons of the Amír Abu'l-'Nasr Ahmad — 140
   (k) Some doubtful cases — 141
5. The Míkálís in the post-Ghaznavid period — 143

APPENDIX I.

i The Genealogy of the Míkálís — 145
ii The Genealogical Tables of the Míkálís — 147
iii The Text of Túsís *Nasab-Námeh-i-Míkáliya* [from the Br. Mus. Ms. No. Or. 3587] — 151
iv The Text of Fasih al-Dín Muhammad al-Qá'ini's *Nasab Námeh* of the vizier Táj al-Dín 'Alí. [From the Br. Mus. Ms. No. Or. 3587] — 153

Dīwāns and other authorities. These I have left as they were. Thus it is probable that my vocalization may not have been very perfect so far as such places are concerned.

A List of the more celebrated philologists and lexicographbists quoted by Abul Qāsim.

Abu 'Amr b al-'Ala, lived 151—159 A. H.
Abul Yaqzān, Suḥaim b Hafṣ, d. 190 A. H.
Ash-Shaibānī, Abu 'Amr Isḥāq b. Mirār, d. 206 A. H.
Al-Farrā, Abu Zakariyyā, Yahya b. Ziyād, d 207 A. H.
Abu 'Ubaidā, Ma'mar b. Muthannā, d. 210 A. H.
al-Aṣma'ī, 'Abdul Malik b. Quraib, d. 213 A. H.
Abu Zaid Sa'īd b. Aus, d. 215 A. H.
Ibn Sallām, Abu 'Ubaid, al-Qāsim b. Sallām, d. 224 A. H.
al-Athram, 'Alī b. Mugīra, d 230 A H.
Ibn-ul-A rābī, Abū 'Abdullah Muḥ b. Ziyād, d 231 A. H.
Ibn Sikkīt, Abu Yūsuf, Ya'qūb d. 244 A. H.
as Sijistānī, Abu Ḥātim, Sahl b. Muḥammad, d 255 A. H
ar Riyāshī, Abul Faḍl, al-'Abbās b. al-Faraj, d. circa, 257 A. H.
Ibn Qutaiba, 'Abdullah, b. Muslim b. Qutaibah, d. 270 A. H.
Abu Ḥanīfa, Ahmad b. Dā'ud Dīnawarī, d. 282 A. H.
Mubarrad, Muḥ b. Yazīd, d. 285 A. H.
Ibn Abil Azhar, Abū Bakr, d. after 310 A H.
az-Zajjāj. Abu Isḥāq, Ibrāhīm b. Muḥammad, d. 310, 311 A. H.
al-Akhfash, 'Alī b. Sulaimān, Abul Ḥasan, d. 315 A H.
Ibn Duraid, Abū Bakr Muḥ b. al-Ḥasan, d. 321 A. H.
Ibn Wallād, Abul-'Abbās, Aḥmad b Muḥammad al-Miṣrī, d. 332 A. H.
Ibn Durustwaih, 'Alī b. Muḥ 'Abdullah b. Ja'far b. Muḥ b. Durustwaih, d. 347 A. H.
as-Sīrāfī, Abu Sa'id, al-Ḥasan b. 'Abdullah b. al-Marzubān, d. 368 A. H.

THE ORIGINAL

This MS., a rotographed copy of which has been used by me, belongs to the British Museum, London (*vide* Rieus' Arabic Supplement, No. 841). The whole volume, as it has already been remarked, consists of eight sections. It is thus described there: ff. 115 : lines, 23 : size 9¼″ × 6¼″: each line 4⅓″: cursive Naskhī dated 3rd Jumādā 1295 A. H. (1878 A. D.). It is stated in the colophon that the MS. was transcribed from an old and slightly mutilated copy in the Khadevial Library (Vol 4, 221). The copyist is عبدالعزيز اسمعيل الانصاری الخزرجی 'Abdul-'Azīz Ismāīl al-Ansāri.al-Khazraji who seems to be very careless and at places, does not appear to have understood the text. This is the reason why several doubtful passages occur on almost every page. There are some marginal amendations and improvements too, which may have been added by a later hand. We also find, on the margin, names of the poets and the dates occuring in the book, in English, probably written by some European Scholar.

I have been able to trace out only a few MSS. of the book preserved in different libraries of Europe and Egypt. Nöldeke writing on Spittas' Arabic MSS. describes the present work and also makes mention of another copy besides that of Spitta, which he says, is preserved in Vice Königischen Bibliothek.

A fragment of the same work is noticed in the Leyden Catalogue i, 61: 2nd ed., i, 34, which has been published by De Goeje in his Introduction to Wright's edition of the *Kāmil* (*vide*, iii, critical Notes, 158).

A copy of it is also noticed in Von Kremer's Catalogue, No. 91.

Unfortunately none of these copies is available to me except a short note, contained in the Kāmil. The difficulty of establishing a correct text from a single copy can never be exaggerated. With no other copy to collate with, frequent references had to be made to lexicographical works, though not always with success. The scribe of this copy had apparently very little knowledge of Arabic, who has badly mutilated the text in several places, which I had to establish with great trouble. There are some verses, which I could not trace out despite my extensive search in the

CRITICISM OF AL-AKHFASH

Some criticism of an-Naḥḥās and al-Akhfash has also been embodied in this book by Abul-Qāsim. Only a few have been selected out of the mass of the comments and glosses found in Wright's edition of *al-Kāmil* which are incorported there within square brackets. I must remark that Abul-Qāsim borrows much from al-Akhfash whose authority he acknowledges at times but omits to mention at others

VALUE OF THE TANBIHAT

The utility and value of the *Tanbīhāt* can never be over-estimated 'Abdul Qādir Bagdādi has utilized its material in his monumental work the Khizāna, in which he quotes our author more than once.[1] The *Tanbīhāt* is quoted only twice in the *Mu'jamal Buldān* of Yaqūt so far as it could be traced from Wüstenfeld's index to the work. I learn from the Iqlīd-ul-Khizana, that Brönnle[2] was contemplating the preparation of a critical edition of the work as early as 1899 Most probably the plan has not yet been fulfilled. A fine edition of the work was also considered necessary by Nöldeke, who regarded the book as very useful, especially that part of it which deals with The Kitāb-un-Nabāt of Abū Ḥanīfa Dīnawarī though, in his opinion, Abul-Qāsim's objections were scarcely original and sound. This estimate, would give the reader a fairly clear idea of the place which this treatise occupies and the purpose which it will serve in connection with the study of the Kāmil.

Before concluding these remarks, I must say that there are two passages in the book which could not be traced out in the *Kāmil*. I have looked up for this purpose very minutely all the editions available in the Panjab University Library, Lahore. These passages occur in Notes 14 and 39. The former is about the explanation of a verse of Ka'b b. Mālik al-Anṣārī and the second is on الجهد والجهد. It is probable that these passages might have formed a part of an older copy of the Kāmil (See Notes 14 and 39).

---

[1] Iqlid-ul-Khizāna, 36.

[2] *Ibid*. He also wrote an article on the book which will be found in the Proceedings of the Orientalist Conference, Rome, 1899.

version while Abul-Qāsim's criticism is based on more authentic records. (Note 60.)

The murder of Laqīṭ b. Zurāra (Note 25) and 'Urwa b. Murra (Note 56), the identity of al-Jannān (Note 56) and al-Ridfān (Note 95) and numerous other points are such topics as represent al-Mubarrad to have chosen the wrong side and in which he lacks trustworthy authority for his assertions.

THE DISCUSSION OF البارح AND السانح

The discussion of السانح and البارح has received much space and attention from Abul-Qāsim. al-Mubarrad's statement that و العرب تزجر على السانح و تبرك به و تكره البارح و تتشاءم به is general while those who are more intimately acquainted with the customs and beliefs of the Arabs of different regions hold different views about both السانح and البارح. Abul-Qāsim has proved himself a better master of Arab modes of life and customs than al-Mubarrad. (For discussion see Note 37.)

The subject of الدبور and الشمال has been fully discussed in Note 91. This forms an interesting study about الرياح and their influences on the climate of various regions. Al-Mubarrad's view that ان غلبة الشمال علامة الجدب is refuted strongly by Abul Qāsim on an authoritative basis with copious illustrations from the Dīwāns of the poets, although there is no gainsaying the fact that if Mubarrad errs, he errs in good company because he has got al-Aṣma'ī on his side. (For such mistakes see notes 2, 15, 16, 24, 25, 26, 37, 45, 48, 49, 51, 56, 60, 91, 95.)

There is a small number of critical remarks to which the oft-repeated phrase 'much can be said on both sides' can be applied In lexicons, one is confronted with authorities differing very widely on almost every matter. Such a phenomenon is exhibited from the very beginning of the Baṣra-Kūfa controversy—the fountain-head of Arabic Philology and Grammar.

The later scholars according to their traditions and environments imbibed the same spirit which determined their sympathies with one school or the other. The errors of this nature ascribed to al-Mubarrad are only pardonable.

On occasions, Abul-Qāsim attributes such readings to al-Mubarrad as are to be found in none of the editions of the *Kāmil* available here. This apparently indicates that the readings were found in the earlier copies of the book but in course of time were corrected.

(*ii*) LEXICOGRAPHICAL MISTAKES

Abul-Qāsim's criticism on the score of *Luga* or Lexicography is in most cases sound, although, one has to remark that in some places, the matter has been treated in a pendantic fashion and is contrary to the general view of the lexicographists, *e. g.*, in Note I where الفزع is discussed. According to al-Mubarrad, الفزع is one of the *Aḍdād* or homonyms, meaning both الإغاثة and الاستغاثة. Abul Qāsim's contention in this matter is that the word simply means الاغاثة و الاصراخ and not الاستنجاد و الاستصراخ. This view has not been supported by the lexicographists in general as الفزع is universally treated as one of the *Aḍdād*. The reasons given by Abul-Qāsim for his explanation are curious and far from satisfactory. Similarly his criticism on the word رزأ (Note 52) is not well-founded and the explanation offered is too subtle and far-fetched. Here, again, we see that Abul Qāsim is not on solid ground and is unfair in his remarks.

(*iii*) HISTORICAL MISTAKES

Abul-Qāsim is seen at his best when he criticises al-Mubarrad for his errors relating to history and *riwāyā*. As a specimen of this kind of mistakes, we must see the account of the war of *Shi'b* Jabalah in the *Kāmil* which is very defective and confused. It appears that al-Mubarrad had a knack of preferring the weaker and less trustworthy versions and committed extremely objectionable blunders sometimes. He relates, for instance, that al-Farazdaq avowed his contrition in the matter of composing satirical verses in the last years of his life, whereas this incident belongs to a much earlier part of his life, because even after his banishment from Mecca, he never spared Ba'ith, Zul-Ahdām and Jarīr.

(Note 15 where authorities have been quoted.)

Al-Mubarrad's account of al-Huṭai'a and Zibriqān is similarly full of flaws and misstatements. Here again he adopts the weaker

ABUL QASIM'S CRITICISM OF THE KAMIL

This is a collection of 100 critical observations on the solecisms, anachronisms and other historical errors of al-Mubarrad in the Kāmil. These include the criticisms of Abū Ja'far-an-Naḥḥās and Abul-Ḥasan al-Akhfash.

(Notes: 96—100.)

This material can be grouped under four main heads:—

(*i*) Textual interpretation of verses.

(*ii*) Grammatical and Lexicographical errors.

(*iii*) Historical errors and defective transmission of Riwāya.

(*iv*) Wrong explanation of verses.

(*i*) ALTERATION OF VERSES

The gravest charge which Abul Qāsim levels against al-Mubarrad is his deliberate alteration of verses to suit his own explanations. We come across several stories in books on literature which accuse al-Mubarrad of fabrication. It is said he forged quotations and assigned the words a sense quite alien to the true signification.[1] This may partly be due to the chronic feud between the contending literary groups at Baṣra and Kūfa, especially between the parties of Abul-'Abbās Tha'lab and Abul-'Abbās al-Mubarrad. This view-point is supported by Sir Charles Lyall in the introduction of *Mufaḍḍaliyāt* by propounding that a bulk of allegations pertaining to forgery of ancient poetry were false and had their root in the rivalry of these two distinct camps which always devised ingenious means to cast a slur on the name of one another.

But from the point of view of the *Tanbīhāt* one feels rather inclined to accept, though only partially, the validity of the charges, levelled against Abul-Qāsim. No doubt, there are cases, where Abul-Qāsim does not seem to have understood the verses as Nöldeke[2] has remarked, and his criticisms are too weak to be accepted, yet in a majority of cases al-Mubarrad's reading of verses is incorrect and the explanations[3] thereof spoil the case even more.

---

[1] Margoliouth, *Arab Historians*, 112, *seq*.

[2] Z. D. M. G., 1886, p. 313.

[3] For this see Notes of my MS. 13, 20, 41, 42, 55, 61, 74, 89, 92, 93 and 100.

that deal exclusively with the present subject, eminent writers like Ibn-'Abd-Rabbihī (in the 'Iqd iv, 12, 13) have criticized al-Mubarrad in their books.

THE BAṢRA-KUFA CONTROVERSY

I should remark in passing that these criticisms and literary contests are somehow or other connected with the old controversy and rivalry between the Schools of Baṣra and Kūfa, in which almost all the luminaries of the age took part. A history of the development of these two schools of grammar seems to be *uncalled-for* for the purpose of this introduction and is too well-known to be repeated here. Still some remarks with particular reference to Mubarrad, may not be considered as irrelevant, for during the life time of al-Mubarrad, we also perceive the same spirit influencing and moulding the thoughts and the activities of these literary men. Al-Mubarrad in an early work of his, the Kitāb u-Masā'il-il Aglat كتاب مسائل الاغلاط criticized vehemently the Kitāb of *Sibawaih* who desired to bring about a rapproachment between the contending parties, with the consequence, that he tried to find out a *via media* in several controversial points. Suyūṭī remarks (Muẕhir, ii, 188, 132) that only a small number of Mubarrad's criticisms were well-founded and of these only a minority were original This struggle did not end here because we see several others joining in this literary battle in a still latter period. For example, Ibn Durustwaih, (d. 330 A H.) wrote a book[1] كتاب مناظرة سيبويه للمبرد in which he takes the side of his teacher Mubarrad as against Sībawaih. We cannot omit the name of Ibn Hā'il who was a great opponent of Mubarrad and also that of Ibn Wallād of Égypt[2] (d. 332 A. H.) who wrote a book in defence of Sibawaih, known as الانتصار لسيبويه على المبرد Abul-Qāsim also joined this fray but with a brilliance, high critical sense and originality which distinguished him from a majority of those who took part in this feud. A description of the contents of the *Tanbīhāt* will help us further to judge the truth of the above remark for ourselves

[1] Fihrist, i, 63.

[2] Rieus, Arabic Supplement No. 838.

students of Arabic—which fact is explained by the number of books that have been written, in support and refutation of the views expressed by him in that great compilation, as also by the number of its commentaries and recensions, some of which have been enumerated by the author of the article on al-Mubarrad in the *Encyclopaedia of Islam*.

CRITICAL STUDY OF AL-KAMIL

From the point of view of the *Tanbīhāt*, it would be interesting to note that the final shape was given to the Kāmil by Abul-Ḥasan 'Ali b. Sulimān al-Akhfash (d. 318 A. H.), surnamed al-Aṣgar, *i. e.*, (the youngest), for, out of the eleven Akhfash's he was the last in point of time. Al-Akhfash added several notes and glosses of his own which may be regarded as the beginning of critical study and examination of the vast historical and lexicographical material, embodied in the Kāmil."[1] Baṭalyūsī wrote a commentary on it which has not survived (Muzhir, i, 182 : 223). There is an anonymous commentary in the possession of Ismāil Effindī in Stambul. Sayyid b. 'Alī al-Marsafī (a Professor at al-Azhar) is the author of another commentary in eight volumes, the full title of which is رغبة الآمل من كتاب الكامل Ragbatul-'Āmil min Kitāb-il-Kāmil (1927-28).

After al-Akhfash, Ibn-un-Naḥḥās (d. 337 or 338 A. H.) was the second great critical student of *al-Kāmil*. Unfortunately, we could not find his criticism in the form of a book which would have enabled us to form an accurate idea of the objections that have been raised by him against al-Mubarrad. One of them has been incorporated by Abul-Qāsim, however, in the *Tanbīhāt* (See Note 96).

The next in order of time is our author who has given his criticisms a regular shape in the form of the present work. The commentary Ragbatul-'Āmil also contains a number of objections against al-Mubarrad's explanations of various grammatical and lexicographical points. This work, however, borrows a great deal from earlier works of a similar nature. Apart from these works

---

[1]All these glosses and comments are to be found in Wright's edition of the Kamil.

at Basra and Kūfa during the early centuries of Islam. We see him engaged in literary contests with his eminent contemporary Abul-'Abbās Tha'lab, to whom he was far superior in ability and erudition. According to Ibn Khallikān, Abū Bakr b. Abil Azhar composed the following verses about the two Abul 'Abbās's showing their extraordinary talents and vast knowledge[1] :—

ايا طالب العلم لا تجهلن ... وعذ بالمبرد او ثعلب
تجد عند هذين علم الورى ... فلا تك كالجمل الاجرب
علوم الخلائق مقرونة ... بهذين في الشرق والمغرب

"Turn to Mubarrad or to Tha'lab, thou
That seekest with learning to improve thy mind! O
Be not a fool, like mangy camel shunned:
All human knowledge thou with them wilt find
The science of the whole world, East and West
In these two single doctors is combined."

His principal work Al-Kāmil fil-Adab الكامل في الادب is a "typical example of the work of the old philologists as developed from their technique"[2]

Ibn Khaldūn speaks very highly of this monumental work of Arabic Literature, which is a mine of information—both historical and philological. He says in his Prolegomenna :

وسمعنا من شيوخنا في مجالس التعليم ان اصول هذا الفن واركانه اربعة دواوين
وهي كتاب الكامل للمبرد و ادب الكاتب لابن قتيبة و كتاب البيان والتبيين للجاحظ
و كتاب النوادر لابي علي القالي البغدادي و ما سوى هذه الاربعة فتبع لها وفروع منها۔

Paris, i (pt iii), 296 مقدمة تاريخ ابن خلدون

"(I have heard my great teachers say during their lectures that the source books of Adab are four, namely, the Kāmil of al-Mubarrad, the Adab-ul-Kātib of Ibn Qutaiba, the Bayān wat-Tabyīn of al-Jāhiz and the Nawādir of Abū 'Ali Kālī'al Bagdādī. Others besides these are subsidiary to and derived from them)"

Al-Mubarrad breathed his last in 285 A. H Henceforward the Kāmil has received a very great amount of attention from the

---

[1] *Nicholson's Hist.* 344 : de Slane, Ibn Khallikan, iii, 31.

[2] *Encyclopaedia of Islam*, "Mubarrad".

as the more appropriate title of the work :—

هذا كتاب التنبيهات على اغلاط الرواة فى كتب اللغة المصنفات

لم نعدل...من سبيلهم و لم نعجز عن سننهم فى رد بعضهم على بعض الغلط. الخ

The complete volume from which this section (pertaining to *the Kāmil*) has been taken consists of eight parts[1] in the following order :—

(*i*) Criticism of the Nawādir of Abū *Z*iyād al-Kilābī

(*ii*) Criticism on the Nawādir of Abū 'Amr al-Shaibānī, (d. 210 A. H.)

(*iii*) Criticism of the Kitāb al-Nabāt of al-Dinawarī, (d. 282 A H.)

(*iv*) Criticism of the Kāmil of al-Mubarrad, (d. 285 A. H.)

(*v*) Criticism of the Ikhtiyār-u-Fasīḥ-il-Kalām of Th'alab, (d. 291 A. H.).

(*vi*) Criticism of the Kitāb-ul-Garīb of Abu 'Ubaid al-Qāsim b Sallām, (d. 224 A. H.).

(*vii*) Criticism of the Iṣlāh-ul-Manṭiq of Ibn-us-Sikkīt, (d. 244 A. H.).

(*viii*) Criticism of the Kitāb-ul-Maqṣūr-wal-Mamdūd of Ibn Wallād al-Miṣrī, (d. 332 A H)

It is very strange, however, that both the Bugya as well as the Udabā omit the name of the section on al-Kāmil and include the Ḥayawān of al-Jāḥiẓ instead. Yāqūt also mentions certain other Rudūd, of which I could find no trace elsewhere, *viz.*, he says :—

"وله ردود على جماعة من ائمة اللغة كابن دريد والاصمعى و ابن الاعرابى و غيرهم"

AL-MUBARRAD AND HIS MAGNUM OPUS AL-KAMIL

Before proceeding further to give a fuller description of this part of the *Tanbīhāt* of Abul-Qāsim dealing with the mistakes of al-Kāmil, it will not be out of place to say a few words about that great philologist and grammarian al-Mubarrad with special reference to his masterpiece the Kāmil. Muḥammad b. Yazīd al-Mubarrad was a pupil of al-Māzinī, al-Sijistānī and al-Jarmī and is regarded to be the last of the great grammarians who flourished

[1] Rieu l. c.

THE AUTHOR

Abu'l Qāsim[1] 'Alī b Ḥamza al-Baṣrī an Naḥwī was a native of Bagdād. Our information about his life is very scanty. We are totally in dark about his early life, education and other circumstances under which he studied Philology and Grammar. One of the known facts of his life is his reception of the poet Abu't-Ṭayyib, al-Mutanabbī[2] as a guest at Bagdād when the latter visited that place. The poet is said to have lived with him till he finally left the city. 'Alī b Hamza was instrumental in popularizing the poetry of al-Mutanabbī in Sicily and also wrote glosses on his Dīwān which fact furnishes us with a further proof of their mutual friendship Abu'l Qāsim died in Sicily in 375 A.H. and according to Ibn ul-Khazzāz the prayers at his funeral were conducted by al-Qāḍī Ibrāhīm b. Mālik.[3]

Besides the present work, 'Alī b. Hamza is the author of the following books dealing mainly with Philology and Grammar :—

(i) كتاب الآباء والامهات Kitāb-ul Āba-i-wal-'Ummahāt[4]
(ii) كتاب العشرات Kitāb-ul-'Asharāt[5]
(iii) كتاب المناكحات Kitāb-ul-Munākahāt[6]
(iv) His glosses on the Dīwān of al-Mutanabbī[7]
(v) His edition of the Dīwān of 'Alī b. Abī Tālib.[8]

By far the most important of our author's books is the Tanbīhāt It is also entitled as الردود "ar-Rudūd", for instance in *Bugya*[9] and *Udabā* we find this reference : —

وله ردود على جماعة من أئمة اللغة

but the beginning of this MS. would only suggest the name التنبيهات

---

[1] Abu Nu'aim in Bugya, 337, but that may be a misreading.
[2] Yaqūt, Udabā, V. 202.
[3] Udabā, V. 202.
[4] Mentioned in the Tanbīhāt, Note 19 : also Udabā, V. 202.
[5] Note 39.
[6] Note 48.
[7] Note 43.
[8] Note 70.
[9] Rieu l. c.

TANBIHAT OF ABULQASIM

INTRODUCTION

The كتاب التنبيهات على اغلاط (or اغاليط) الرواة of Abdul-Qāsim,[1] also described as الردود by Hāji Khalifah in the Kashf-uz-zunūn in connection with several treatises, which have been criticized by the author of the present work, consist of eight parts, of which one relates to the *Kāmil* of al-'Mubarrad. The original MS. is preserved in the British Museum, London (*vide*, Rieu's Arabic Supplement, No 841), the rotographs of which have been obtained by the Panjab University Library—only 28 folios (ff. 41*b*—70*a*) and which has been critically edited for the first time

[1] System of transliteration :—

أ آ إ ای أو	a, ā, i ī, u ū	ض	ḍ
ب	b	ط	ṭ
ت	t	ظ	ẓ
ث	th	ع	'a
ج	j	غ	g
ح	ḥ	ف	f
خ	kh	ق	q
د	d	ک	k
ذ	ẕ	ل	l
ر	r	م	m
ز	z	ن	n
س	s	و	w
ش	sh	ہ	h
ص	ṣ	ی	y

THE TANBIHAT

OF

Ali Bin Hamza Abulqasim Al-Basri

BY

Syed **MUHAMMAD ABDULLA, M.A., M.O.L.**

([illegible] Patiala Scholar, University of the Panjab).

BIBLIOGRAPHY

Qiṣaṣ-ul 'Ulamā, p. 43 ; *Nāsikh ut-Tawārikh* Vol. III (*Tārikh Qājāriya*) p. 526 and pp 534-552 ; ***Kawkab-i-Hind***, Vol. XI, dated February and March, 1933, Browne, ***The New History of the Bāb*** ; *Journal of Royal Asiastic Society*, New Series Vol XXI, p 881 ; Andreas, *Die Bābi's in Persia* (1896) ; Baron Rosen, *Collections Scientifiques de l' Institute des Langues Orientalis*, Vol. I (1877) pp. 179-212, Vol. III (1886) pp. 1-51 ; Browne, "*A Year Amongst the Persians*", "*Materials for the Study of Bābi Religion,*" ; and " *Personal Reminiscences of the Bābi Insurrection at Zanjān* in 1850 (*J Royal A. S.* 1897, p. 761.)

having conspired with other Bābis against the life of the Shāh of Persia and sentenced to her execution. But as Ṭāhira had been in strict confinement for a long time she could not possibly have had any concern with the conspiracy. She therefore gave up her life only for the sake of her faith.

The end[1] came on Wednesday, September 15, 1852 Just before her execution she dressed herself decently and applied scent to her body. She was then taken to a garden. As the executioner hesitated to use his fatal axe, a negro slave rushed forward, thrust a kerchief down into her throat and strangled her to death. Her body was thrown into a well in the garden and it was filled up with dust, earth and stone. Ṭāhira looked very cheerful till the very end.

" The appearance of sucha woman " says E. G. Browne (in his Episode of the Bab" page 309), " as Qurrat-ul-'Ain is in any country and any age a rare phenomenon, but in such a country as Persia it is a prodigy nay, almost a miracle. Alike in virtue of her marvellous beauty, her rare intellectual gifts, her fervid eloquence, her fearless devotion, and her glorious martyrdom, she stands forth incomparable and immortal amidst her countrywomen. Had the Bābi religion no other claim to greatness, this were sufficient that it produced a heroine like Qurrat-ul-'Ain."

Qurrat-ul-'Ain was a great poetess. The specimens of her poems given by Browne (Travellers Narrative p. 315) will serve to indicate her great poetic talent

Calcutta Madrasah — M. HIDAYAT HOSAIN.

20-3-1933

[1]On that fateful day 28 (twenty-eight) Bābis along with Qurrat-ul-'Ain expiated their faith with their lives. Among these was one Qasim of Niriz who bore his tortures with wonderful fortitude. It is related that even at the time of his execution when he was under terrible bodily torture he did not cease to testify to his joy in suffering martyrdom for his Master's cause. This is one of the verses which he recited at the time:

یکدست جام باده و یک دست زلف یار   رقص چنین میانهٔ میدانم آرزو است

" Weighing of Sin and Virtue," etc. One day it so happened that the father of 'Allāma Ibn Alūsī came to Ṭāhira and talked with her harshly which put the 'Allāma to shame. She was later on told that she was ordered to leave the Turkish borders. Consequently Ṭāhira with other ladies left Baghdād for Persia. She however continued to preach during her journey and had then the following dignitaries converted to the Babī faith: Shaikh Ṣāliḥ the Arab, Shaikh Ṭāhir, Mullā Ibrāhīm of Maḥallāt and Shaikh Sulṭan the Arab. At length she entered Kirmānshāh with these personages The ladies were lodged in one house and the rest in another. The people of this place also flocked around her which provoked the local 'Ulamā and they ordered them to leave the city. The leader of the locality collected his men, looted their articles and forced them out of the town unveiled. The helpless group had to pass their days in jungle, from where they sumitted to the Governor of the place a petition mentioning their helplessness and the tyrannies perpetrated on them. The Governor of Kirmānshāh who had no information about this act of tyranny, asked his men to see that the articles of which they had been robbed were restored to them. This order was carried out, and Ṭāhira with her party went to Hamadān. Here she was well received by the royal ladies who embraced her new faith. Ṭāhira then went to Qazvīn and preached her religion. In the meantime Mullā Taqī of Qazvīn was murdered, for which many persons professing the Bābī religion were arrested, Ṭāhira being one of them. But Agha Hādī managed the flight of Ṭāhira to Teherān where she stayed in the house of Bahā'ullāh and from where she went to Badasht in Khurāsān Here a great meeting took place. After this meeting the Government sent her back to Teherān and interned her in the house of the *Kalāntar*. But she never ceased to preach her religious tenents which were very closely listened to even by aristocratic ladies. Some time later a marriage ceremony took placed at the house of *Kalāntar* On this occasion Ṭāhira preached her religion. The preaching damped the merriment of the occasion and ladies of different ranks listened to her with rapture. This was too much for the authorities. They again had her arrested and this time she was tried on a charge of

was astonished to find the same verse in this book. She then believed in the validity of Bāb's "Imambood" and henceforward she devoted herself to the preaching of Bābism. She now began to write notes and exposition of " Aḥsan-ul-Qiṣaṣ." She also poured forth her feelings and prayers in verses and odes which are still very popular. She was so much given to piety and prayer that she never ignored even the minute rituals.

The 'Ulamā' of Karbalā heard about Ṭāhira's preaching a new faith which was gaining ground every day, and wrote to the Government. As a result various obstacles were put in her way and in the end she offered herself for arrest to relieve another lady of the Bābī faith, Shams-uḍ-ḍuḥā, who was put under Police custody by mistake. The house of Ṭāhira was surrounded by the police and her communication with people outside the house was stopped. This continued for about three months, but on her petition to Government she was allowed to proceed to Constantinople *via* Baghdād. Ṭāhira along with Shams-uḍ-ḍuḥā and her mother, Waraqat-ul-Firdaus, went to Baghdād and put up in the house of Āghā Muḥammad Shibl. People began to flock there to have an interview with her. She therefore changed the house and set herself to preaching and soon became known to one and all at Baghdād. One day she sent words to the Shī'a 'Ulamā to take recourse to '*Mubāhila*', that is, to establish a belief by which two parties curse each other with the hope that the weaker will go to the wall, if arguments were of no avail. This upset the whole group of 'Ulamā and the Government had to send her and her campanions to the house of the Muftī of Baghdād, 'Allāma Ibn Alūsī, where she for three months awaited the orders of the Turkish Government. During this period of internment Ibn Alūsī talked with her on different topics and was simply astonished at her smart replies. Once he said to her that he had dreamt that the Shī'as were removing the corpse of Imām Ḥusain out of his grave, and he stopped them from doing so by throwing himself on the body of Imām Ḥusain. She said that the dream meant that he would very soon rescue her from the troubles caused to her by the Shī'a 'Ulamā. The Allāma spent most of his time in discussing with her various religious topics, *viz* : "Life after Death,"

not by force but by persuasion. He therefore held with her prolonged discussions on such topics as " The Day of Resurrection," " Prophethood of Muḥammad of Arabia," "Mi'rāj," (Ascension of the Prophet to Heaven), " Hell and Heaven," and the "Advent of the 12th Imām" Once Ṭāhira quoted an authority from Imām Ja'far Ṣādiq,[1] which was laughed away by her father ; and she retorted that such an authority should not have been set aside so abruptly and after this incident she never spoke to him on any doctrinal question

Now she commenced to receive light on various points from Saiyid Kāẓim[2] of Risht by correspondence, who gave her the title of " Qurrat-ul-'Ain" which title was approved of by Bāb also. Her thirst for knowledge now increased and she went to Karbalā to see Saiyid Kāẓim in person, who however unluckily died a week prior to her arrival.

Just before his death Saiyid Kāẓim had spoken to his disciples that the advent of the promised Imām (12th Imām) was very near So his disciples waited for the advent of the Imām in the mosque at Kūfa, and others did so at Karbalā. At this time Ṭāhira fasted at day time and used to keep awake at night for prayer and meditation. One night she dreamt that a youth with a green turban and black mantle was offering his prayers while he was standing on the air He was *muttering a verse* which Ṭāhira learnt by heart and *noted down in a book. When* Bāb appeared and his book " Aḥsan-ul-Qiṣaṣ[3] was out, Ṭāhira

---

[1]Imām Ja'far Ṣādiq was the sixth Imam of the Shi'a sect. He died in A.H. 148=A D 765. See *Safinat-ul-Auliyā*. p 25.

[2]Shaikh Aḥmad Aḥsā'i was succeeded at his death by his disciple Saiyid Kāẓim of Risht. His family were merchants of repute. His father was named Āqā Saiyid Qāsim. When 12 years old he was living at Ardabīl near the tomb of Shaikh Ṣafī ud-Dīn Isḥāq, the descendant of the seventh Imām Mūsā Kāẓim and the ancestor of the Ṣafavī kings. One night in a dream it was signified to him by one of the illustrious progenitors of the buried saint that he should put himself under the spiritual guidance of Shaikh Aḥmad Aḥsā'ī, who was at this time residing at Yezd He accordingly proceeded thither and enrolled himself among the disciples of Shaikh Aḥmad, in whose doctrine he attained such eminance that on the Shaikh's death he was unanimously recognised as the leader of the Shaikhī school. He died at Baghdad ere he had attained his fiftieth year A.H. 1259=A.D. 1843-1844. His works are said to exceed 300 volumes.

[3]It is a commentary on the Sūra of Joseph. It is so named in allusion to the Qur'ān (XII, 3) where the history of Joseph is thus characterised. For detail of works by Bāb see Browne, " The Episode of the Bāb ", p. 335.

the Shī'ites' 'Shahīd Thālith'—the third martyr Ṭāhira was married[1] to her cousin, Mullā Muḥammad, son of Mullā Taqi, and bore a daughter and two sons A very erudite scholar was appointed to educate Ṭāhira when she was young. She attained such a very high degree of proficiency in literature that her father wished she were his son so that he might nominate her as his successor.

One day Ṭāhira was a guest of her cousin (son of an aunt), Mullā Jawād In the library of her host she chanced to notice some books written by Shaikh Aḥmad Aḥsā'ī[2] which appealed to her very much. She felt inclined to get possession of them. Mullā Jawād warned her saying that if she would read the books her father would try to kill him as he was against the views mentioned in those books. Far from being dissuaded by the warning Ṭāhira prevailed on Mullā Jawād to make over the books to her. When she had thoroughly grasped the contents of the books, Ṭāhira spoke of the views and religious belief of Shaikh Aḥmad Aḥsā'ī to her father. He thought that some of the religious views of Shaikh Aḥmad had been put into her head by Jawād and he therefore told her that she had been misled by Mullā Jawād. She replied that she had read the works of Shaikh Aḥmad Aḥsā'ī and that there were the edicts of Imāms to prove the validity of the Shaikh's doctrines. She then expressed her doubts as to the justice of the claims of her father and uncle to be God-knowing men Her father naturally desired to bring the erring child back to the fold of the faithful

---

but also his niece and daughter-in-law Zarrīn Tāj or better known as Qarrat-ul-'Ain, had embraced the doctrines which he so abhorred, must have greatly conduced to an intensification of this hatred, which rose to such a pitch that he was during the last year of his life chiefly engaged in violent public denunciation of the Bāb and his religion This cost him his life; for at length certain Bābīs, stung by his words into uncontrollable anger, fell upon him early one morning as he was praying in the mosque, and with knives and daggers inflicted on him eight wounds, from the effects of which he expired two days later He was buried at Qazvīn in the precincts of Shāhzada Ḥusain.

[1]This marriage after her adoption of the Bābī religion proved a most unhappy one and she refused to reconcile herself to her husband on the ground that he (husband) was unclean as he rejected God's religion while she was pure. "Between us there can be naught in common nor any equality." she said.

[2]Shaikh Aḥmad Aḥsā'i was the son of Shaikh Zain-ud Dīn Aḥsā'ī and was born in A.H. 1166=A. D. 1752 and died in A. H 1242=A.D. 1826. He is the author of a large number of books. For details see "Nujūm as-Samā", p. 307, and Browne "The Episode of the Bāb" p. 234.

A Female Martyr of the Babi Faith

Many noblemen have sacrificed their precious lives for the sake of the religion that they held to be true. The annals of the civilized world abound with such instances In "Tārikh-ul Islām" there is the record of many such heroes of imperishable fame but few among them belong to the fair sex Whatever may be the reason for this dearth of the names of female martyrs in our history it is not a fact that Moslem ladies have been behindhand in championing the cause of religion Below is given a short sketch of the life and deeds of a most cultured lady of wide reputation who gave up her life for the sake of the Bābī[1] faith which she believed with her whole heart and preached with great fervour.

The name of this illustrious lady is Umm-i-Salima, better known as "Ṭāhira" or "Qurrat-ul 'Ain." Zarrīn Tāj is another name which is attributed to her. Her father was Ḥājī[2] Mullā Ṣāliḥ of Qazvīn who was a brother of Mullā Taqī,[3] called by

---

[1]The Bābī religion has its own beliefs, dogmas, and conceptions of a new state of society. The founder of this new faith is Saiyid Alī Muhammad of Shīrāz who called himself Bāb, or the gateway to knowledge of Divine truth. Born on the 1st Muharram, 1236 (26th March 1821) the son of a merchant, he became an orphan and early occupied himself with religious questions. At the the age of 25 he began to preach his new doctrine as a result of which he and his disciples were put to severe persecution by the Government of Persia. After a brief career of 6 (six) years Alī Muḥammad was executed on July 8, 1850, but his disciples—the Babis who spread in different parts could not all be suppressed. One of them Bahā'ullāh founded a new sect which has made besides Persians some converts among Americans and Europeans.

According to the Bābī doctrine God is one and 'Alī Muḥammad is the mirror in which He is reflected and in which every one can regard Him. "You ought to make mirrors of yourselves and your deeds so that you shall only see in these mirrors the sun which you love" says the *Bayan*.

The Babis do not consider as we do Muḥammad, the Prophet of Islam, peace be on him, as the last prophet, nor the Qur'ān as the final revelation from God.

[2]He was an erudite doctor and the sage of Qazvīn.

[3]Ḥājī Mullā Taqī was the eldest of three brothers, of whom the second, Ḥājī Mullā Ṣāliḥ was also a divine and jurisconsult, while the third, Ḥājī Mullā 'Ali, was at first a disciple of Shaikh Aḥmad Aḥsā'ī and afterwards a partisan of the Bāb. Ḥājī Mullā Taqī detested Shaikh Aḥmad and his doctrines, and was indeed the first among the Shī'ite clergy to denounce him as a dangerous heretic; but if [illegible] detestation of the Shaikhis was great, much bitterer and more violent was his [illegible] the Babis. The fact that not only his youngest brother, Ḥājī Mullā 'Ali

A Female Martyr of the Babi Faith

BY

M. Hidayat Hosain

PRINCIPAL, CALCUTTA MADRASAH

psychologists who seem willing to turn to all kinds of material except the one which is really capable of leading them from darkness to light. What I suggest is that these problems must be submitted for possible solutions to the available and authenticated records of religious founders, and as no such records are so easily accessible and so truly authenticated as those of the Holy Founder of Islam, the value of ransacking Islamic records for the purpose of illuminating the systematic problems of religion can hardly be exaggerated. If, therefore, modern students of psychology were armed with a sound knowledge of the Islamic records, it would be to the immense advantage of their science.

came to the Holy Prophet and asked him, among other things, what the essence of virtue consisted in. To this the Holy Prophet is reported to have replied:

"To worship God as though you are seeing *Him*, or, at least, as though *He* is seeing you."[1]

We are bound to regard this spontaneous description as the most important description of religious experience by one who not only believed in religion but lived it throughout his life, and to whom religion was the first and last thing worth living for. If we put this description alongside that of Dr. Flower we would find that the latter description is much too sophisticated. It is, if I may say, a reproduction of the modern man's attitude towards religion, not a description of the religious response as it takes place in a religious person. It describes a religious reponse as it takes place in persons who are not typically religious. Hence it confuses a truly religious response with what is only a quasi-religious response. A typical religious act, for instance, would be impossible in a situation which is a mere "beyond" and which contains no positive reality or being in reference to which or to whom the religious act is or may be performed. It seems to follow therefore that a religious response instead of being a response to a "beyond", is a response to a real presence, or at least to, what is believed to be a real presence, may be, either transcending or permeating the world of sensuous experience. The problem of the analytic description of religious experience, dark and dim otherwise, brightens up as soon as it is submitted to the attention and notice of an original religious leader like the Holy Founder of Islam.

V

Besides the problem of the analysis of religious experience there is, as I have said, the problem of the origin of religion. In regard to this other problem as in regard to the first, there is an enormous amount of confusion in the minds of modern

---

[1] *Bukhari* Vol. I, Kitab-ul-Iman (Cairo).

say, we see religion not only in its simplest, but also in its most typical and richest form. He might have turned to the recorded experiences and sayings of the Holy Founder of Islam in his analysis of religion as a human response. In so doing he would have only carried a step further his own plan of studying special cultures for the purpose of understanding a given social phenomenon. On the other hand, in doing so he would have seized the only material that is worth seizing in such an investigation.

IV

To say that Dr. Flower has argued from inadequate data, however, is to make only a superficial criticism of his analysis. It is further necessary to point out what, if anything at all, is intrinsically wrong with the description of religious response that he has offered. We have seen that Dr. Flower describes religious response as a response to a "beyond". The difficulty I have about it is that if this description is true, we can hardly account for a typical religious act such as the act of worship. Nobody, I suggest, would hazard an act of worship on a mere "beyond". What a "beyond" would produce is hesitancy and doubt, experiences which are typical of the scientist and the philosopher, not of the religious man engaged in a religious act. Dr. Flower perhaps has had far too much in mind the experiences of modern men who in their religious responses have somewhat fallen away from the original purity and strength of those experiences, experiences as they were had by the founders of religious traditions and their companions. But to take stock only of the experiences of modern adherents would not be to take stock of the most typical forms of religious response. If Dr. Flower had turned to the records of so typical a religious personality as the Founder of Islam he would have given a substantially different description of religious response.

I can only suggest what he might have done. I think that the recorded traditions of the Holy Prophet contain innumerable descriptions of religious experience which the modern psychologist can explore to the immense advantage of his subject. As an example of such a description I would quote a portion of a tradition attributed to Abu Huraira. It is said that a person

religion. But we must remember that just as any ostensibly religious response in any given individual may not be typical of his own truly religious responses, no more may religious responses manifested in any given age be typical of religious response as such. A description of the essential constituents of a class of responses which are liable to vary individually, and from age to age, can never be possible unless we look out for the most typical, that is, the least diluted forms of those responses. Everybody would recognize that religious responses express themselves in their typical and purest forms in the lives of certain persons who appear now and again in human history, and who lay in their respective times the foundations of religious traditions. The traditions once founded continue to evoke their typical responses in generations of followers, by the sheer force of their own momentum. They are something born of the impulse which owes itself entirely to the original experiences of their founders: though it is true that as time separates more and more the followers from the founders, the responses become more and more faint, and tend steadily to lose their typical character, until they are resuscitated by the advent of a new founder, whose fresh and original experience gives a new lease of life to truly religious reactions in ordinary human beings. The religious experience of any given individual or of any given age are therefore only faint reproductions of the religious experiences of religious founders. The experiences of the founders act as a type, a pattern, or a norm to which in varying degrees, the experiences of the followers tend to conform. Anybody therefore who seeks an adequate description of the essential ingredients of religious response would turn to the records of those religious personalities who may be regarded as the founders rather than the followers of religious traditions. Dr. Flower whom I take to be a typical modern psychologist has interpreted his task satisfactorily, in so far as he has turned to a study of two special types of culture—one primitive, the other modern as the data of his investigation. But he might have done more. In selecting special cultures as his data he might have turned to those cultures in which we find a determinate religious tradition in the process of laying its first foundations, in which, that is to

Winnebago Indians, an authenticated account of which is to be found in a detailed monograph prepared by the American anthropologist, Dr. Paul Radin[1], as well as a study of the Journal of George Fox, the founder of Quakerism. That is to say, he has faithfully followed the advice of Professor F. C. Bartlett in turning to a study of special groups for the purpose of understanding a socio-psychological phenomenon. He has in addition, drawn on answers to a questionnaire which he prepared specially for this purpose. The result of an inquiry as systematic as Dr. Flower's should be as satisfactory as modern psychology can possibly achieve. It is interesting therefore to know what conclusion in the main Dr. Flower ultimately derived from his study. What is the essential element in religious reactions which, according to Dr. Flower, could be regarded as the differentia of religious experience and religious behaviour? Let us state the conclusion in his own words:—

> " Response to a situation by means of imaginative interpretations which, however, does not reduce the situation to certainty and calculability, and allow the adequate discharge of affect, so that there is always an element of 'beyondness' and mystery, and an unanalysed remainder, an unsolved problem, is religion ".[2]

Stripped of its technical language this description of religion amounts to saying that a religious response is a response to a 'beyond', something that is left over, something that bids us to be uncertain and hesitant, before a situation that we do not and perhaps cannot completely comprehend.

As it is, this description of the religious response is a plausible one. There are many who would readily subscribe themselves to it. Perhaps most modern men whose adherence to religion has become traditional, and who continue to hold to religion not so much as a positive reality, but rather as something that helps them to fill a gap in their mental horizon, would think that this is the fairest description of

1 See his *The Winnebago Tribe* (New York)
2 See *The Psychology of Religion* (pages 54—56).

of reactions, with distinctive marks of their own, which it should be possible by systematic investigation to bring out and describe. The explanation of those reactions, that is, the process of setting forth their causal conditions would be a further step in the scientific study of religion. But this further step would be of no avail unless it is preceded by an adequate description of the essential positive characteristics of the reactions themselves. The problem of the analysis of religious experience though a problem only of description is really basic to all further study of religion and must be accorded its due share of importance in the scientific study of religion.

III

The data which the modern psychology of religion largely employs are the recorded experiences of mystics, and the systematic studies of certain relatively determinate types of culture. Time was when the psychologist was content with observations derived casually from a general study of religious and pseudo-religious records. In modern times, largely under the influence of the Cambridge psychologists W. H. R Rivers and F C. Bartlett,[1] it is being recognized that the systematic study of religion, or for that matter the study of any social phenomenon must be based on a study of one special group or another. The modern psychologist therefore turns more and more to a study of special groups for his data. The best example to my mind, of this growing attitude in so far as the psychology of religion is concerned, is to be found in the study presented by Dr. J Cyril Flower, Upton Lecturer in the Psychology of Religion, at Manchester College, Oxford, and Minister in the Unitarian Church, Cambridge. Dr. Flower has devoted himself to a systematic study of the content of religious reactions, and has offered a plausible analysis of this very interesting and very important class of human reactions.[2] He has pressed into the service of his analytic investigation, a careful study of the religion of a primitive trib ecalled the

1. See for instance, Bartlett's *Psychology and Primitive Culture* (C. U. P.) Chapter IX.

2. See his *An Approach to the Psychology of Religion* (Kegan Paul.

A Note on the Psychological Analysis of Religious Experience in the Light of a Tradition of the Holy Founder of Islam

I

In what follows I propose to give an example of how very important and useful it may be to explore the recorded sayings of the Holy Founder of Islam, for the purpose of illuminating certain problems which arise in the course of the scientific study of religion.

The scientific study of religion embraces many different problems If we picked out of these problems, those which are primarily psychological in character, we would find ourselves dealing broadly with two :

(1) How is religious experience to be *analysed?*

(2) What are the psychological *roots* which determine the emergence of a religious view of the world in the human mind ?

Modern psychology addresses itself to both these problems. I propose to describe the first of these problems along with a solution of it which has been proposed by a modern psychologist, and which apparently is the most satisfactory that modern psychology seems to have discovered. I then propose to criticize the solution in order to show that if the modern psychology of religion had submitted itself to some of the available records of the Holy Founder of Islam, it could quite possibly have hit upon a better solution than the one it has found.

II

The problem of the analysis of religious experience is the problem of picking out the most distinctive elements in the religious experience and behaviour of man. It is well-known that religious experience and religious behaviour express themselves in all kinds of different ways. But the very fact that they can be classed together shows that they are a determinate set

A Note on the Psychological Analysis of Religious Experience in the Light of a Tradition of the Holy Founder of Islam

BY

Qazi Muhmmad Aslam

B.A. (Cantab.)

Lecturer in Psychology, Government College, Lahore

author in Chapter 7 (p. 195) of the same book says "such reports show that the Aṣḥabul-Ḥadíth, do not reject the theory that the sayings of the Prophet were written down in the earliest times. In fact we have been able to observe a series of statements on the existence of Tradition—Saḥifas of some of the companions."

These numerous facts taken from some of the early authentic Arabic books, and the observations made by some of the most eminent European Orientalists who had made a thorough, close and critical study of Ḥadíth literature and of the various problems connected with it, should suffice to convince even the most incredulous persons of the truth of the proposition that Aḥadith were recorded during the lifetime of Muḥammad, and the large number of the Saḥífás should show what a large number of Aḥádíth must have been recorded during a very early period of the history of Islam.

historical facts" published in the 25th[1] volume of the Journal of the Asiatic Society of Bengal while discussing the pros and cons of the problem says:

"There were nevertheless some men even among the theologists and traditionists who from the the *earliest* time wrote down the information which they wished to preserve. The most important among these are Abdullah b. 'Amr, Anas b. Málik, and Ibnul 'Abbás who were companions of the Prophet and preserved more records of him than any one else. The Hadíth of 'Abdulláh, and Ibn 'Abbás were preserved by their family in writing."

Ignaz Goldziher' one of the most distinguished orientalists and a thorough critic of Hadíth, in his "Muhammadnische, Studien" which like all his other works is extraordinarily rich in facts and is destined to remain a classical work on the history and criticism of Hadíth literature, says:

"The choice of the word 'Matn (text) for the text of a Hadíth as opposed to Isnád (the chain of authorities) can also serve as a proof of the falsity of the assumption that according to the opinion of the Muslims, originally the writing of Hadíth was prohibited and it had been reduced to oral traditions only. It may be assumed that the writing of Hadíth was a very old method of its preservation. The aversion for writing them is the result of ideas which came into being at later times Such of them (Ahádíth) as are said to have been preserved in writing already in the first century may be thought to constitute the oldest ingredient of Hadíth materials. There is nothing against the assump ion that the companions and students wanted to guard the saying, and the decrees of Muhammad against forgetfulness by writing them down. How then, in a society in which the wise sayings of ordinary men were preserved in writing, the preservation of the sayings of the Prophet would be left to the mere chance of oral tradition? Very many 'companions' carried their Sahífas with themselves and out of them they conveyed their teachings and culture to their students. The contents of these Sahifás were called 'matnul-Hadith."[2] The same

---

[1] P. 380.
[2] Muh. St. vol 2, pp. 8-9.

Hadíth are later in date than the prohibitive ones, and therefore cancel them. The dictation of certain laws already referred to, also supports this theory. The attitude of 'Umar I towards the collection of Hadíth, also shows that the prohibitive sayings of Muhammad were not in force at that time.

It is reported that 'Umar I thought of collecting Aḥádíth. He consulted the other companions about it. They unanimously advised him in the affirmative. He considered the matter for a whole month and invoked the help of God in this decision. But in the end he decided in the negative because he feared that it would cause the negligence of the Qur'án by the Muslims. It is extremely improbable that in spite of the prohibition by Muhammad, 'Umar would have considered the matter seriously for a whole month, that all the 'companions' unanimously would have advised him in favour of collecting the Aḥádíṭḥ, and 'Umar himself while giving his own decision contrary to their unanimous advice, would have come forward with his fear of the negligence of the Quran instead of quoting the sayings of Muḥammad in favour of his decision.

Such European orientalists also as have made a serious critical study of the subject, as I have already said, hold that some Hadíth were written down during the very lifetime of Muḥammad. Dr. A. Spenger, the late Principal of the Calcutta Madrasa, Says:

"It is generally believed that the traditions were preserved, during the first century of the Hijra, solely by memory. European scholars under the erroneous impression that 'Ḥaddathaná (I have been informed by), the term by which the traditions are usually introduced, are of opinion, that none of the traditons, contained in the collection of Bukharí had been written down before him. This, however, appears to be an error. Ibn 'Amr and other companions of Muhammad committed his sayings to writing and their example was followed by many of Tabi'is."[1]

The same laborious and learned orientalist, in his instructive article on "the origin and progress of writing down

[1]Life of Muhammad, pp. 66-67.

'Alí, 'Abdulláh 'Amr b. al-'Áṣ, and 'Abdulláh b 'Abbás, learnt the art of writing He asked 'Abdulláh b. Śáid b al-'Aṣi, the Meccan, to teach the art of writing to the people of Medina.[1] He ordered Shifá', the daughter of 'Abdulláh to teach this art to Ḥafṣa one of his wives.[2] He declared after the battle of Badr, that each of such prisoners of war as was too poor to pay the required ransom, and knew the art of writing could gain his liberty by teaching the art to ten Muslim children[3] It was from one of these prisoners of war that Zayd b. Thábit, the trusted scribe of the Qurán had learnt this art. It could not have been without the suggestion of Muḥammad, however, that 'Ubáda b. al-Ṣámit taught the Qurán and also the art of writing to some of the Aṣḥábul-Ṣuffa one of whom presented him with a bow.[4]

Indirectly also, Muḥammad played an important part in making the art of writing popular among the Arabs, by establishing among them a more or less regular state which necessitated the writing of treaties with the various tribes, letters to the various chiefs, orders to the state officials, and laws for conducting the affairs of the state We have received reports stating that his immediate successors made the knowledge of writing compulsory in the schools established by them.

Muhammad, therefore, cannot be said to have " an aversion towards the scribes ". His sayings prohibiting the writing of Ḥadíth, particularly, or of any thing other than the Qurán generally, which are weaker and fewer than the permissive Ḥadith must have been either based on the general unfavourable public opinion prevailing in Arabia at the beginning of his prophetical career or on the possibility of their being mixed up with the Qurán about the purity of which he had been so careful. As soon as he found that these dangers were over he permitted that Ḥadíth and things other than the Qurán also might be written. The date of one of the Ḥadíth reported in the Ṣaḥíh of al-Bukhárí *i. e.* the permission to write the oration of Muhammad for Abu Shah, in the year of the conquest of Mecca, favours the view that the permissive

---

[1] Usdul-Ghaba. 'Abdullá b. Sa'id b. al-'Aṣí (vol. 3. p. 175)
[2] Futuhul-Buldán p. 477.
[3] T. b. Sad vol. 2 pt. 1 p. 14.
[4] Abú Da'ud Buyu', Kasbúl-'Ilm.

The Muslim doctors have tried to explain this apparent contradiction between these various Aḥádíth, in various ways. Ibn Qutayba in his Táwil-u-Mukhtalifil-Ḥadith (pp. 365-366 says that either the prohibitive Aḥádíth belong to the earlier period of the life of Muḥammad and are cancelled by the later permissive ones, or the prohibition was meant only for such 'companions' as were not well-trained in the art of writing, and such of the 'companions' as could be relied upon to write correctly were allowed to write Ḥadíth also. Al-Nawawi in his commentary on the Ṣaḥiḥ of Muslim (kitabul-Zuhd) has offered many other explanations.

We know, however, that though the art of writing was introduced into Arabia sometimes earlier than the birth of Muḥammad and Arabic prose works were not entirely unknown to the Arabs before him,[1] yet neither the art of writing nor Arabic prose work had been popular in that peninsula, before the advent of Islam. Before Islam in the whole of Mecca, the most advanced town in Arabia only seventeen persons knew how to write.[2] In Medina where the influence of the Jews, who are said to be the teachers of the Arabs in this art, had been considerable, the number of the Arabs who knew the art of writing was less than a dozen, only nine being mentioned by Ibn-i-Sad in his Ṭabaqát.[3] He also says that writing was rare in Arabia before Islam and that it was considered a great distinction among the Arabs to know it ; that such of them as combined the knowledge of the arts of writing, of swimming, and of archery was known as Al-Kamil, the perfect.[4] It is also stated that Dhul-Ruma, the last Mukhaḍrim poet of Arabia concealed his knowledge of this art on account of the fear of public opinion against it [5] "The Beduines", says Goldziher " despise reading, and writing even to-day.[6]"

Muḥammad did a good deal towards making this art popular among the Arabs. It could not have been without his efforts that such Muslims as came under his control at an early age, like

[1] Muh. Stu. vol. 2, pp. 204-5 ; J. A. S. B. vol. 25, pp. 375 *et seq.*

[2] Futuhul-Buldán pp. 477-80.

[3] These nine are : —1. Abú 'Abs, 2. Ubayy b. Ka'b, 3. 'Abdulláh b Rawáḥa, 4. Aus b. al-Khauli, 5. Mundhir b. 'Amr, 6. Usayd b. al-Huḍayr, 7. and his father, 8. Sa'd b. 'Ubáda, and 9. Rafi' b. Malik.

[4] T b. Sád Vol. 3, pt. 2, p. 91.

[5] Kitabul-Aghání, vol. 16, p. 121.

[6] Muḥ Stu. vol. 1, p. 112.

and his request was granted.[1] 'Utban Ibn Mâlik, an Anṣári liked a Ḥadith so much that he wrote it down.[2]

Apart from these Ṣaḥífas and books a few more of which may be added to the above list by further research and over and above the astray Hadith which are reported to have been written by the companions at their own sweet will, some of which may not be genuine and some of which may be proved to be indentical with one another, Muhammad himself had dictated laws with regard to the poor-tax[3] the prayers and fasts,[4] alms and blood-money,[5] etc. One document containing laws with regard to the alms which had not been sent to the officials was, found after his death, attached to his sword, and came in possession of his successors.[6]

There are of course traditions which forbid the writing of anything other than the the Qurán generally, and of the Ḥadíth particularly. Abu Sa'id Sa'd Ibn Málik al-Khudrí, Zaid, the son of Thábit, the scribe of Muḥammad, and Abú Hurayra, have related such traditions.[7] Many other 'companions' and many Tábi'un are reported to have disliked and discouraged the writing of Hadíth the names of 'Umar, 'Alī. 'Abdulláh b. Mas'úd. 'Abdulláh b. 'Abbás, 'Abdulláh b. 'Umar, Abú Músa, Ibn Sirín, Ḍaḥḥāk, 'Abída, Ibráhím, Ibnul-Mu'tamar, Auzá'i, 'Alqama, Ubaydullah b. 'Abdillah, al-Uyayna have been particularly mentioned in this connection.[8]

Some of them, *e. g.* 'Alí and Ibn-i-'Abbás are, as we have already seen, also reported to have written some Ḥadíth and possessed Ṣaḥífas and books ; some of them like Daḥḥák, Ibráhīm and 'Alqama are said to have objected to the writing of Ḥadíth in the form of a book and not to making such notes of them as might serve as help to the memory, and some like 'Abdulláh Ibn Mas'ud and Ibn-i-Sirín are said to have been against their writing it in every form.[9]

---

[1] Bukhárī, Ilm.
[2] J. A. S. B. vol 25.
[3] al-Dārqutni pp. 204, 209, 485.
[4] Tibrani, p. 217.
[5] Kanzul-'Ummāl, vol. 3. pp. 186-7, T. b. Sad ; vol. i, part 2, p. 19, al-Darmī, p. 293.
[6] Abu Dāūd, Zakat-ul-Saima.
[7] Musnad of A. b. H vol. 2, p. 403, vol. 3, p. 13 ; vol. 5, p. 183 al-Dārmī p. 64, *et seq* ; Muslim, Zuhd.
[8] Jami'u Bayan-al-Ilm pp 63—68 ; J A. S. B., vol. 25
[9] alDārmi, p 64, *et seq*

Sa'd had another Ṣahífa out of which his son reported certain practices of Muhammad.[1] Bukhárí has reported in his Ṣaḥíḥ a Ḥadíth which according to him had been originally related from a book of 'Abdulláh b. Abí Aufa.[2] 'Abdulláh b. 'Abbás appears to have collected Aḥádith in more than one book, for al-Tirmidhí reports in his Sunan, that some one from al-Ṭáif brought one of his books and read it with him.[3] He is also reported by Ibn ' Abdil-Barr to have left after his death so many books as might suffice as a load for a camel.[4]

These books were used later on by his son 'Alí [5] It is from these books of Ibni 'Abbás that al-Wáqidi must have drawn some of his materials as it is shown by a passage quoted in the Mawáhib.[6] Abú Hurayra also, however, is reported to have written down some Ḥadith probably at a later stage of his life. These written Ḥadíth, he showed to Ibn Wahb[7] and to Umayya-al-Ḍumarí.[8] The Ṣaḥífa of Humām which is based on the reports of Abú Hurayra is well-known.[9]

Over and above the reports that we have received with regard to the Ṣhaífas and books written by the companions of Muhammad and their students we have also received many reports of the writing down of astray Ḥadíth by them. One of the Anṣárs, according to a report in the Sunan of al-Tirmidhí, complained to Muḥammad of his weak memory and was advised by him to take the help of his right hand (*i. e.* writing).[10] Al-Ráfi' (also called abú Ráfi') another companion, also secured the permission of Muḥammad to write down the Ḥadíth.[11] One Abú Sháh hearing Muḥammad's orations in the year of the conquest of Mecca, requested him that it might be written down for him

---

1 al-Tirmidhi Ahkam, Babul-Yamin-i-Maal-Sháhid.
2 Jihad, al-Ṣabr'alal-qital.
3 al-Tirmidhi, 'Ilal.
4 Jamiu Bayan al-Ilm part i, p. ?
5 T. b. Sa'd vol. 5, p. 216.
6 J A. S B, vol. 25, P. 380.
7 Fathul-Bári, vol. 1, p. 184.
8 Jami'u Baiyánal-'Ilm part i, p. 74.
9 Tahdhibul-Tahdhib vol. I, No. 574. Cf. Musnad of b. H. vol. 2, pp. 312—318.
10 al-Tirmidhī Ilm.
11 Tahdhibul-Tahdhib, vol. 3, p. 440.

Baghdādí,[1] Ibn 'Abdil-Barr[2] and others, who have collected together a large amount of materials on the subject, have failed to pronounce any definite opinion. And the later Muslim scholars seem to have made no difference between recording of Aḥādíth and their collection.

Among the European scholars, Sprenger, who rightly claims to be the first to make a critical study of Ḥadíth during the modern times, is of opinion that Aḥādíth were recorded during the lifetime of Muḥammad. Goldziher who followed Sprenger, with a rich treasure of Knowledge, has proved it to the hilt that Traditions were written down during the lifetime of the Prophet.

A close study of Ḥadíth-literature and of the subjects connected with it, clearly shows that many of the companions had their Ṣaḥífas in which they had collected the reports of the sayings and of the doings of their master. 'Abdulláh b 'Amr b. al-'Āṣ wrote down all that he heard from Muḥammad[3] and collected a thousand of his sayings in a Ṣaḥífa which he called al-Ṣádiqa[4] It had been seen with him by al-Mujáhid[5] and came in possession of Shu'ayb, a great-grandson of 'Abdulláh, after his death.[6] Abú Bakr the first Caliph is reported to have in his possession a collection of five hundred Aḥádith which he is said to have destroyed because he feared that he might have accepted some Ḥadíth from some unreliable persons.[7] 'Alí, the son-in-law of Muḥammad, had in his possession another Ṣaḥīfa which contained certain laws.[8] Another Ṣaḥífa is reported to have been in possession of Samura b. Jundab which, according to Goldziher, is identical with his Risala to his son, which contained many Aḥádíth[9] Jábir b. 'Abdullah had another Ṣaḥífa the contents of which had been related at a later period, by Qatada.[10] 'Ubāda b.

---

[1] J. A. S. B. vol. 25, pp. 303—329 ; 375—381
[2] Jāmiu Bayan al-'Ilm, part, i, pp. 63—77.
[3] Ṭabaqāt b. Sad vol. 4, part ii, p 7 ; Bukhari. Ilm, Kitābat, Tirmidhi, 'Ilm ; Musnad of A b. H. vol ii ; pp. 164, 207, 215, 248.
[4] Usudul-Ghāba, 'Amr b. al-'Āṣ.
[5] Ṭabaqāt b. Sād, vol. 4 part ii. p. 8.
[6] Muh. St. vol. ii, p. 10.
[7] Ṭ. Ḥuffāẓ vol. ii, p. 5.
[8] Bukhāri. Diyat 'A'qila.
[9] Muh. St. vol. 2, p. 10.
[10] *Ibid.*

Ahadith were recorded during the lifetime of Muhammad

The science of Ḥadīth is one of the most important Islamic sciences. It is one of the most important sources of Islamic theology and of Islamic law. It has influenced, a great deal, the development of the dogmas of Islam, and its study had been one of the most important causes of the origin and development of many branches of Arabic literature, like History, Biography, Geography, Lexicography, the collection of the ancient Arabian poetry, etc. Many of the 'foreign sciences' also like Medicine and Philosophy, etc. could not escape the influence of Ḥadíth As a matter of fact Hadíth together with the Qurán, as Wüstenfeld has observed, had been the basis of all the scientific activities of the Arabs under the Abbasides[1].

With regard to the science of Ḥadíth, one of the most important problems is to determine the period when they had been, first, recorded. Were any appreciable number of them recorded during the lifetime of Muhammad, or all of them had been preserved, for one hundred years, by memory only, and very few of them, if any, had been recorded before a century after the death of the Prophet of Islam ?

On the solution of this problem depends, to a great extent, the reliability of a large number of Aḥádíth and the authenticity of many of the important theological, legal, social and political principles of Islam. A large part of the structure of the various Islamic sciences would stumble down, if the mass of Aḥádíth on which they are based, are proved to depend on the mere memory of the Muslims for about a century.

The solution of the problem, however, is extremely difficult. The Aḥádíth, closely relating to the subject, appear to be contradictory. The early Muslim divines like al-Dármi[2] al-Khatíb al-

---

[1] Arabischen Academien, pp. 1-2.
[2] The Sunan, Int.

Ahadith were recorded during the lifetime of Muhammad

BY

Dr. M. Z. Siddiqi,
H.A., M.A., B.L., Ph.D.
Sir Asutosh Professor of Islamic Studies
CALCUTTA UNIVERSITY

BIBLIOGRAPHY

(1) *Ab-i-Hayat* : Delhi, 1896.

(2) *The 'Ashiqa of Khusrau* : School of Oriental Studies Ms. and India Office Ms.

(3) *Ghurrat-ul-Kamal* : Khusrau.

(4) *History of Hindi Literature*: Misra Brothers (1913).

(5) *Jawahir-i-Khusravi.*

(6) *Khusrau ki Hindi Kwita* : (Benares, 1921).

(7) *Litterature Hindui et Hindoustani* : G. DeTassy.

(8) *Notices of Persian Poets* : Sir Gore Ousley, 1846.

(9) *Nuh Sipihr* : Khusrau (India Office Ms., Nos. 1187 and 1218.)

(10) *Tarikh-i-Firishta* : (Lucknow Text, 1864).

(11) *History of India* : Sir John Elliot, Vol. III.

The author of the *Jawahir-i-Khusravi* tried to prove that it really belonged to Khusrau. He was supported in his conclusions by my able friend and colleague Syed Masud Hasan Rizvi of the Lucknow University. Their arguments briefly are as follows :

(1) Khusrau's age was the time when such a work was urgently needed, and a man of his versatile genius was sure to turn his attention to it.

(2) It has always been considered to be Khusrau's composition ; the author of the *Allah Khudai* for instance seeks help from the soul of Khusrau in the opening verses of his work which is an imitation of the *Khaliq Bari*.

(3) It contains certain words (*e. g.*, *jital*) common in Khusrau's time, but unfamiliar to later writers.

(4) The last verse contains Khusrau's name so aptly and naturally.

But another scholar, who has made a special study of the development of Urdu, particularly in the Punjab, is disinclined to agree with this view, and thinks it is a shame to ascribe to a great poet like Khusrau a work that is of no literary value, corrupt in its arrangement, full of repetitions, defects of rhyme and irregularities of metre[1].

The essentially discursive and matter-of-fact nature of the work, giving but few opportunities for the display of poetic talent, makes it all the more difficult to come to any definite conclusion about the authorship of the *Khaliq Bari* It may or may not be from Khusrau's pen. But even if it be, it can hardly add much to the glory of the "Parrot of India". What would a little feather of a sober hue signify in a plumage glittering with gold and silver and the brightest colours of the rainbow ? It is, I think, idle to discuss the question any more, unless we can get fresh material for coming to a decision. The work is hardly of sufficient merit or importance for hot controversies to be waged over its origin.

---

[1] See *Punjab men Urdu* by Hafiz Mahmud Khan Sherani.

Boli, can easily be answered. In the first place it should be borne in mind that Khusrau wrote in the language with which he was familiar -- the Hindui that, as he says, was spoken in and about Delhi, while the High Hindi that had its home in Muttra must have been strange to him. Not only that, but my contention is that Brij Bhasha came into prominence only in later times when it became a recognized literary language and eclipsed the old Hindui of Delhi, of which the modern successor is Urdu or Hindustani. Even if we admit the antiquity of Brij Bhasha as a literary language it does not necessarily follow that Khusrau should have written in that language. He had no ambition to leave behind him a lasting monument of Hindi poetry. He wrote this poetry only to amuse himself and his friends and he could, naturally, do that more successfully through the ordinary, familar langnage of every-day talk.

Secondly, Khusrau's greatest passion was originality. He always wanted to do something new, to break away from the trammels of custom and tradition and to tread paths hitherto untouched by human feet. His Persian prose and poetry provide ample proof of the existence in him of this dominant passion, and it can be easily conceived that the same love of innovation must have goaded him to write Hindi verse in a style different from the classic, conceding for a moment that such a style existed in his times. In my opinion, therefore, most of the songs, etc., such as those given in *Khusrau's Hindi Kwita*, should be taken to be genuine products of Khusrau's prolific pen, especially as we have no proofs to the contrary.

I would like to say in conclusion just a few words about the versified Persian Hindi vocabulary, the *Khaliq Bari*, popularly ascribed to Khusrau. The work, a small one in its present form, but said to have been written originally in several volumes, possesses very little of literary interest, although a linguist may find it instructive. It is divided into parts of unequal lengths, each in a different metre, giving Hindi equivalents for familiar Arabic and Persian words

The authorship of this work has been a subject of dispute.

that the dialect has changed a good deal since Khusrau's time— that the spoken Hindi of those days was materially different from that of to-day ?

A language, once it has crystallized into a definite form, would not change very much with the lapse of time, least of all in India where things move so slowly and where there have really been few influxes of foreign linguistic elements. Why can we not believe that a peasant or Bania of Delhi in the 13th century spoke almost the same language as his descendants do to-day, when we know that the latter has almost the same physique and physiognomy, the same dress, and the same habits as his ancestors had ? One can well imagine a Delhi Jat, driving out his team of bullocks in the early morning with a 'chaddar' wrapped round his sturdy limbs, to be the exact image of his great-great-grandfather. Why can't we imagine his words to be the exact echo of that distant ancestor's ?

It would, therefore, seem to me to be unreasonable to declare this poetry apocryphal on linguistic grounds. There may be portions of it which are later compositions tacked on to the genuine ones ; that has happened in every country and in every age [1]. But there must have been an original foundation, a real prototype, and that prototype could not necessarily have been very different from the additions. It is possible, again, that succeeding copyists have made slight modifications, according to the idiom of the time, in the forms of the words used by Khusrau. Yet the intrinsic excellence of some of these poems, the originality of their style and the wit and humour pervading them mark them out clearly as the work of a great master like Khusrau, and we have no reason to disbelieve the popular tradition when it says that Khusrau himself wrote them. Their meagre volume, moreover, would preclude the probability of any whole-sale grafting. The objection that when the oldest extant Hindi compositions are in 'High Hindi' (or Brij Bhasha) which was the recognized literary language of early times, why should Khusrau's poems be in Khari

[1] The "Ruba'iyat of Omar Khyyam are an eloquent instance of this tendency.

made immediately after his death. All, then, that we could expect to inherit from him through long and troubled centuries would be odds and ends, scrappy poems and isolated verses that caught the fancy of the populace and were transmitted orally or through private collections or 'byads' to the succeeding generations. And such is exactly the nature of what to-day is alleged to be Khusrau's poetry.[1]

This poetry consists mostly of small songs, 'dohas' (couplets), riddles and conundrums, a 'ghazel' with alternate Hindi and Persian lines, a 'Mukhammas' with every fifth line in Persian, some quartrains and the small tract known as the *Khaliq Bari*, a poem of mixed vocabulary. Grave doubts have been raised, as we have said, about the authorship of this poetry on linquistic grounds. The language, say the critics, of this poetry is the language of to-day. How could Khusrau, in the thirteenth century know that Hindi which is now spoken round and about Delhi? Why has no other Hindi writer used that language?

The questions are pertinent and it is not easy to answer them. We do not know what exactly was the Hindi of Khusrau's age, for there is no specimen of it except what we find in these disputed verses But we know that Hindui was the name given in his time to a dialect *spoken in and about Delhi*,[2] that the dialect had fairly developed by that time and served as the literary medium for all and sundry and that poems were composed in it. What reason, we may ask, is there to suppose

---

[1] See *Khusrau ki Hindi Kwita*; Misra Brothers "History of Hindi Lit." (V. I, pp. 233-280); *Ab-i-Hayat* (Delhi 1896 pp. 65—71); and DeTassy (I., p. 301).

[2] This is a very important point, and demands special attention. Khusrau, while speaking of the various languages of India in the third Sipihr of his work *Nuh Sipihr* says :—

دهلی و پیرامنش اندر همه حد

این همه هندیست ز ایام کهن   عامه بکار است بهر گونه سخن

(*Cf.* Elliot (III) who has missed the sense altogether) Languages of all other provinces he designates with different names, so that Hindi was the language proper of Delhi and the surrounding country.

believe Firishta and Nizamuddin, Hindi poetry was composed as early as the time of Mahmud of Ghazna.[1]

We have, however, no records whereby to judge the probable volume of Khusrau's Hindi poetry. His own laconic statement, quoted above, would show that there was not much of it, and the assertion that it exceeded in bulk his Persian poetry would seem to be not a little exaggerated. Nor, on the other hand, could the "few chapters," referred to by Khusrau, be all that he produced, for he lived many years after he wrote the preface to the *Ghurrat-ul-Kamal*, and must have made numerous additions.[2]

Unfortunately Khusrau seems to have had but scant regard for his Hindi verses. He probably scribbled them on bits of paper and 'scattered' them as he says himself, among his friends and thought no more about them. The writing of Hindi poetry was to him a mere pastime, a diversion from his more serious efforts in Persian, which could not be equalled in importance by the language of Hindustan whatever the poet's sentimental regard for it might have been. We can easily understand Khusrau's neglect of his Hindi verses when we consider that even in comparatively modern times Persian was considered to be the literary language *par excellence* by the Muhammadans of India. Ghalib, the great poet of Delhi, whose fame to day rests almost entirely on his small Urdu Diwan, attached himself a much greater importance to his Persian poetry which few Indians read to day. "Look at my Persian verse" he says, "if you want to see multi coloured images, and leave alone my Urdu collection for it is devoid of my (true) colour"[3].

It is certain, therefore, that Khusrau never collected his Hindi verses in his lifetime and probably no collections were

---

[1] Nanda, the Rajah of Kalanjar is said to have addressed a panegyric in Hindi verse to Mahmud in 413 H. (Firishta text. Vol. I. p. 31.)

[2] This incidentally also contradicts DeTassy's statement (Lit. Hind. I. 301) that Khusrau did not write any Hindi poetry except at the end of his life. He was only 37 when he wrote the *Dibacha* of the *Ghurra*.

[3] فارسی بین تابہ بینی نقشہائی رنگ رنگ   بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

too many foreign words into a language that had already been losing some of its pristine purity in its new home. "It is not very pleasant," he remarks, "to introduce Hindui words into Persian, except when unavoidable. I have used them only where abs lutely necessary."[1] His own statements would, indeed, show that he knew Hindi better than Arabic and that he was quite proud of this. " I am an Indian Turk," he declares, " and can reply to you in Hindui. I have no Egyptian sugar to talk of Arabic and Arabia.[2] " As I am, in fact," he says again, " the Parrot of India, speak to me in Hindui that I may talk sweetly.'"[3]

But did Khusrau write any poetry in the language which he professes to know so well ? A man of his genius and temper ament, one would think, could not help doing so, and he actually did so according to his own statement made in words quite unequivocal. When speaking of his own works in the preface to his third Diwan he says :—" I have scattered among my friends a few chapters of Hindui poetry also, but I would be content here with a mere mention of that fact "[4] Moreover, he gives a few specimens of verses capable of being interpretend both in Persian and Hindi[5] It is no wonder, indeed, that he wrote Hindi poetry, for according to his own testimony, supported by other authorities, earlier poets of foreign origin had done so Mas'ud-i-Sa'd bin Salman, who lived years before Khusrau was born, is said to have composed a whole Diwan in that language, and if we

---

[1] *Dibacha* to the *Ghurrat-ul-Kamal*.

[2] *Ibid*.

ترک هندوستانیم من هندوئی گویم جواب   شکری مصری ندارم کز عرب گویم سخن

[3] *Ibid*.

چو من طوطی هندیم زاست پرسی   زمن هندوی پرسی و نغز گویم

[4] *Dibacha* to the *Ghurrat-ul-Kamal*.

"جزوی چند نظم هندی نیز نذر دوستان کرده شده است. اینجاهم بذکری بسنده کردم......"

[5] Thus :—

اری اری همه بیاری آئی ماری ماری بره که ماری آئی

(*Ghurra*) and the well-known quatrain ending in هر در موئی
(Ousley's Notices. p. 15.)

KHUSRAU'S HINDI POETRY

Amir Khusrau, the poet-laureate of the Turkish period of Indian history, is too familiar a figure to need any introduction, and his achievements in the domain of Persian poetry are universally recognized and appreciated. But whether he wrote any Hindi poetry has recently been the subject of controversy.

The old biographers and anthologists, both eastern and western, generally took it for granted that he did, and quoted 'ghazels,' conundrums, verses, etc. given out to be Khusrau's, without apparently the least hesitation as to their genuineness. But modern scholars, especially those who have made a special study of the development of Hindi in India, are inclined to be sceptical. The language of these compositions, they point out, is very modern, almost identical, in fact, with the 'Khari Boli' or spoken dialect of to-day, and very different from other specimens of Hindi found in prose and poetry of undoubted antiquity and established authorship.

That Khusrau knew Hindi (or Hindui, as it was called in his time) we have no reason to doubt. He was born in India, which had been his ancestors' home for some time, and his mother was of Indian origin.[1] He must, then, have been thoroughly conversant with the spoken Hindi of his native place. We have, moreover, ample proof of his proficiency in this language in his own writings. He uses Hindi words in several of his works, moderately and sparingly, it is true, but very aptly. That he does not employ them more often is not due to a limited vocabulary at his command but to his sensible dislike for introducing

---

[1] This is clear from what he says about his grandfather Imad-ul-Mulk, the 'Arid of the armies :—

ز نسل عارض اسود مدم آن نسخه معنی   کز اصل خویشتن یک یک نشانی باز دادم من
سوادی بودن بازلتریں دیباچه دولت   زنوک کلک تجدید بیان آن سوادم من
جهانرا میکنم غرق و گهررا میدهم عبره   ازان ابر سیه بین طرفه دریائی که زادم من

KHUSRAU'S HINDI POETRY

BY

Dr. M. Wahid Mirza, M.A., Ph.D.

Reader in Arabic
Lucknow University

within and secure protection from without. Being settled, they are much more amenable to discipline and control than the mobile nomads. In short, the conditions of settled life are much more favourable to ordered political development and the growth of centralized unified states

The province of Yaman furnishes the most notable example of a favoured area in Arabia, which has embodied considerable political power Here there has existed from early times some sort of established government. The sceptre of power has passed from one hand to another and even the seat of government has shifted from place to place, but there has generally been a more or less powerful government—thanks to the sedentary agricultural population that has served as the basic foundation of the state. Similarly, in modern times the Wahhabi power originated in the Haisiyah-Hanifa valley, the heart of 'Arid, the central district of Najd. Here in one town or another has resided the chief political power controlling Najd. Further, the establishment of Ikhwan settlements, which is an important part of the political programme of Ibn Sa'oud, shows what weight the rulers attach to settled communities as an element of stability and solidarity in the state. The now defunct Emirate of Shammar was, likewise, centered in the cultivated territory between the mountains Aja and Salma.

It will thus be seen that geography not only makes clear to us facts and events of history by giving us topographical and other information about the places, with which they are connected; but geographical conditions, taken as a whole, reflect themselves, among other things, in the political activity of man. Such considerations of a physico-geograpical character do not, of course, explain the variable element of human personality and initiative, but they certainly underly the stage on which the drama of human history unfolds itself and consequently help us to understand better the general trend of the historical process.

since the early days of Islam; but it can hardly be said to have passed beyond the experimental stage, when we consider the reverses it has met in the past and the comparatively short term of its present existence.

The explanation of this political instability and disunion of the Arabian society is to be ultimately found in the physical features of their land and the conditions of life that have thereby been imposed on them. About three-fourths of the Peninsula is desert or semi-desert, the home of wandering nomads, incapable of economic and political development beyond the rude Bedouin status of life. Settled life, which alone is favourable for political growth is possible only in a few favoured parts, which are isolated and separated from each other by vast stretches of forbidding deserts. In a land, where the camel has been from times immemorial, the sole means of military transport, considerations of water and pasture are of supreme importance. Communications between the various parts of the country are therefore difficult so that the maintenance of a general control by one authority over the whole land is an extremely arduous, nay well-nigh impossible task. Geographical conditions thus lend every aid to the forces of separatism and particularism; and hinder the growth and expansion of a state that should cover the whole Peninsula and unite all its scattered people in its embrace.

Such states as exist or have existed in Arabia have been generally of limited extent and influence and confined to one part of the Peninsula or another It will furthermore be observed that they have always had some settled territory as their basis. The migratory Bedouins are incapable of forming a state, so long as they lead a nomadic life. Although they have a simple political organization of their own based on their tribal system, the affairs of each tribe being regulated by its head, called the Shaikh, they lack that stability that is necessary for the establishment of a state. States have always originated in settled territories. In the sedentary life of agriculture, permanent residence in larger or more complex units leads to a closer integration of social units, for whom land becomes the dominant cohesive force. They feel a growing necessity for an organized government, to reduce friction

with attaining its political objects by friendly alliances with, and monetary subsidies to the tribal shaikhs and local rulers, rather than by any extensive occupation of the land itself, which would give unnecessary offence to the religious sentiments of its Muslim subjects in other parts of the world.

Another notable feature of the political life of Arabia is the absence of political unity among its people. Although the Peninsula is fairly well defined geographically, racially and linguistically—a fact which might reasonally be considered eminently favourable to the growth of plitical unity—history does not know of an organized and centralized stable state, co-terminus with the natural boundaries of the land. It is true that the Arabs have a clear notion as to their being distinct from other peoples and nations of the world, but the Arab society in Arabia has never been able to weld itself into one homogeneous and permanent state. Only here and there in certain parts of the Peninsula have arisen in a sporadic manner at various epochs of history dominions of varying extant and power. The South-West of the Peninsula has been the seat of some ancient kingdoms, whose history, however obscure, goes back to a fairly remote antiquity; but so far as we can see, they did not exercise any effective control beyond the agricultural settled territories over which they held sway, for we know that they kept camels not only for their carrying trade but also for the purpose of pursuing their nomad enemies, against whose depredations they had to guard their fields as well as their trade-caravans. The rise of Islam and the theocratic government of the orthodox Caliphs gave for a short time a semblance of political unity to the vast Peninsula, which in later times continued to give a doubtful allegiance to the Umayyad and Abbaside rulers. Coming down to modern times, we find that the phantom of a united Arab kingdom, which foreign aid and personal ambition raised before the late king Husain of the Hedjaz, vanished even before the eyes of the dethroned and disillusioned old monarch were closed in death. The present-day Wahhabi power of Central Arabia is based on a more solid ground and the remarkable success it has already attained, remains without a parallel in the history of Arabia

has often been dependent on the Muslim rulers of Egypt or Syria. Yet these exceptions are temporary or local. Upon the whole, the Arabs in general and the nomads in particular have escaped the foreign yoke. Arabia never formed a part of the great empires of antiquity, that embraced the adjacent lands of Western Asia and the Mediterranean region. Even under the Arab Caliphs, *viz.*, the Umayyads and the Abbasides, who might be expected to know the ways of the Arabs better and to be able to control them more effectively, Arabia was only under a nominal subjection and was always a favourite and safe resort for all kinds of refugees who found other parts of the Empire, for one reason or another, too hot for them. The nomad tribes, sometimes, actually raided the cultivated territories of the Empire. The chief causes of their freedom and insubordination are to be found in their mobility and in the physical character of their country, which give them a decided advantage over their opponents. Aided by a strong animal of transport like the camel, and in exclusive possession of the knowledge of secret waters of their deserts, they can always be sure of a safe retreat and can thus elude the pursuit of their enemy, for whom it is no easy task to follow them in their forbidding solitudes. Even if the nomad tribes are temporarily subdued by an alien foe, they can always reassert their independence, since the physical conditions of their land, which make an effective control impossible, are decidedly in their favour.

Another reason of the independence of Arabia is its economic poverty and unattractiveness. The natural resources of the land are so meagre that the native population itself has a precarious living. An alien power has very slight prospects of deriving any substantial material gain from the occupation of the country. It was a complaint of the Turks that the province of the Hedjaz was a burden, rather than a source of revenue, to the Imperial exchequer. Despite the economic unattractiveness of Arabia, some foreign powers would fain get control of some parts of it for strategic reasons, if not for economic exploitation. The British Government, made wise by the lessons of the past history of Arabia, has been content

soon as that purpose is fulfilled. Even within a single group, the social bond may be strained till broken under pressure of circumstances In such a case, when its local unity is broken, its community of interest also gradually disappears. At first, every effort is made to maintain the old tribal system and the separated branches regard themselves as parts of one community. For instance, they continue to pay or receive, as the case may be, their share of blood-money. But gradually, the distance between the scattered groups makes itself felt; they lose touch with each other, till any useful and effective cohesion among them is scarcely feasible Since they can no longer live and move and act together, the sentiment of common blood, which was kept alive principally for the purpose of common defence, ceases to operate and gradually fades away. It will, thus, be seen that the factor of scattered location ultimately gets the upper-hand in nomad life.

To sum up, the Bedouin social and political group is fundamentally an economic group; its primary object being food-quest. The same quest, carried on in the thinly-pastured steppe-lands, determines its size; it lives and moves together only so long as it can find food together. The integrative or unifying force of the land being weak or absent, the natural sentiment of common blood serves as a principle of social unity and cohesion within a group The limited vegetation of the land necessitates a sparce distribution of the pastoralists, and is thus responsible for introducing the factor of scattered location in bedouin life. This factor powerfully militates against co-operation among the nomads, and prevents them from rising, as organized communities, above the tribal standard.

I shall now take up for brief consideration such aspects of the political life of the Arabs as seem to have been influenced directly or indirectly, by the physical conditions of their land.

The national independence of the Arabs has often been made the subject of animated remarks. There are, however, some exceptions, which should be noted. The province of Yaman, for instance, has been subdued successively by the Abyssinians, the Persians and in modern times by the Turks; while the Hedjaz, with its holy cities of Mecca and Medina

intrusion of some more powerful neighbour. Even in normal and comparatively peaceful times a nomad tribe makes only a transitory and intermittent use of its territory, with the result that the cementing or integrating force of the land is almost non-existent in their case, or at least, remains very weak. In these circumstances, the need for cohesion makes appeal to the primary and natural feeling of kinship. The sentiment of common blood serves as a bond of social solidarity and is emphasized for its usefulness as such. It is adopted, fostered and perpetuated, as far as possible, as a principle of social unity, with the object of engendering in the associted individuals a sense of mutual duties and rights as against other groups

As a basis of social unity, the idea of blood relationship plays a very large part in the social and political life of the Arabs in general and the nomad tribes in particular. A bedouin belongs not to any town or territory, but to such or such a tribe. He bears a relative name (*Nisba* نسبة) which refers to the fact of his being a member of some tribal group, irrespective of the locality occupied by that group. The military organization of the early Islamic times and the settlement of the Arabs in military stations closely followed the old tribal division. Although the factions in their civil wars were really due to local interests, the very fact that appeal was almost always made to the sentiment of kinship, shows the great importance that was traditionally and habitually *attached in the Arab mind to kinship as a bond of union and* solidarity.

How is it—it may be asked—that the feeling of kinship obligation is not universal in its operation, but works effectively only within a certain group of families, while beyond this group kinship obligations disappear. In explanation of this phenomenon, I would refer to what I have said before regarding the dissociating effects of the scattered distribution of the pastotal population. Though the nomad groups may be nearly or distantly related by common blood, they are usually separated by vast distances, living exclusive and independent of each other. *The interests are, of* necessity, separately localized The alliances, which they occasionally form for purposes of common defence or offence, are dissolved as

cannot find subsistence in one and the same place. The natural increase of population beyond the limited resources of its territory puts a strain on the social bond; the tribe must split up, a part separating and migrating elsewhere, either forming a new independent group or losing its identity by merging itself into some other powerful group. Thus seems to have taken place the repeated division and ramification of the Arab population into tribes and clans, with their innumerable genealogies, the traditional scheme of which has been recorded by Wustenfeld in his *Genealogische Tabellen.* It will thus be seen that the geographical conditions of Arabia necessitate a sparse and discontinuous distribution of the nomad population.

On the other hand, aggregation of individuals with a view to joint concerted action is required by at least two considerations. Firstly, there is the need of economic co-operation. This need, however, is not so compelling, because of the extreme simplicity of pastoral economy. Joint or social action is chiefly dictated by considerations of internal peace and security and of common defence against external enemies. The larger and more closely united a group is, the better able it would be to defend itself against the outside enemy. Here are, then, two contending forces in nomad life, each acting in a contrary direction: the strong dissociative tendencies inherent in the pastoral population, scattered over thinly pastured deserts and steppe lands; and the imperious necessity of aggregation and joint social action, demanded by considerations of co-operation and common defence. The size of the Bedouin nomad group, thus, represents the measure of the balance reached by these two conflicting tendencies.

In order that a number of human beings may be collected into a group, capable of concerted action, they must have some tie, some bond to hold them together. In the case of pastoral nomads, community of interest in pastures and waters should lead to the principle of local contiguity as a basis of tribal cohesion, but for the fact that the hold of the nomad society over the land is weak and its association with it consequently slight. It is seldom that a tribe lives for long in one and the same circuit; migration is often forced upon it by persistent drought or by the

The Social and Political Organization of the Arabs in Relation to their Land.

It is now generally recognized that climatic and other geographical factors exercise a potent and profound influence on the various aspects of human life. In the case of the Arabs, likewise, the conditions of climate and physical environment have been the chief basic factors in their evolution. They have influenced more or less, their economic activity, their social and political organization, their physical and mental development and the general character and status of their civilization. The problem of environmental influence thus resolves itself into a number of special problems.

In the present paper, I propose to treat of the social and political conditions of nomad Arabia in particular.

The social organization of the Arabs stands in close relation to their economic organization, on which it is mainly built. Social groups in Arabia, as elsewhere, are at the bottom economic groups; their genesis, growth and size being determined or modified by their economic needs and the way, in which they satisfy them in their peculiar environment. I shall presently notice certain aspects of the social and political life of the Arabs, which seem to be influenced by the peculiar characteristics of their land, either directly or through the intermediation of their economic life.

Environmental influences are specially significant in determining the size of the nomad social group, which is the tribe. This must be for ever small in a country like Arabia, where the natural resources are not only limited but are exploited in a primitively rude fashion. The meagre vegetable resources necessitate a sparse distribution of herds and of the population that lives on them. The food-supply of a given area is limited; the nomad cannot increase it at will, being helplessly dependent upon what nature doles out to him with a niggardly hand. The size of the nomad social group is thus rigorously kept small, because a large horde

The Social and Political Organization of the Arabs in Relation to their Land

BY

Dr. Sh. Inayatullah, M.A., Ph.D.
Professor of Arabic
Government College, Shahpur

is observed by the angles of refraction. When through two transparent media, whose transparency is different, two rays are propagated, and these two rays make two similar angles with the normals drawn at the points of refraction to the common surface at which both the media meet together, they make with their normals two different angles, and one of these angles which is in the denser medium is smaller and that the medium which has the smaller angle in it has the greater transparency.

These are all the points, which we have described in this Discourse, and now is the time to bring the Discourse to a close.

May God help us : the Discourse on light comes to an end.

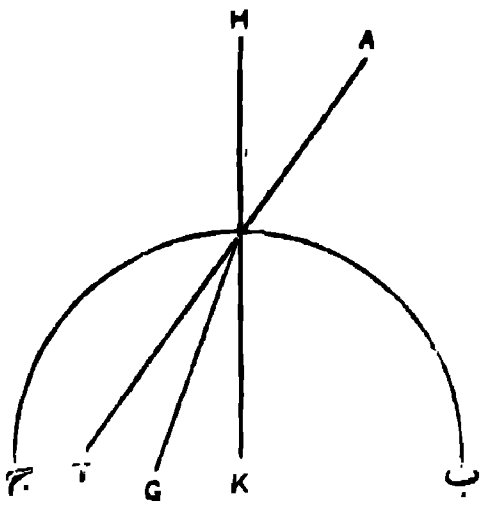
body in reality for he takes it for granted that all kinds of substances whose existence is conceivable, are really in existence.

To my mind both these doctrines are correct, that the transparency in imagination is indefinite, it is, however, definite in the material bodies, and the transparency of the celestial body forms their extreme limit. What, however, we have said so far about the transparency and the transparent bodies, is all what is necessary to know of their nature (condition).

Now we bring to an end the description of all the conceptions, whose explanation we had undertaken to give in this Discourse, and now we would recapitulate what we have described in this Discourse, so that it would be easy to comprehend these ideas without enquiring into (investigating) their causes and (giving) proofs. And we state that what we have described in this Discourse is this that according to the philosophers (1) the light in every self-luminous body is fundamental characteristic of their nature, the dispersed, (accidental) light, however, is an acquired characteristic, which is visible on the opaque bodies on which it radiates. (2) According to Mathematicians, the light is in its nature a heat energy (fire-heat); the dispersed light, however, is an acquired characteristic, which is visible on the opaque bodies on which it radiates. The dispersed light in the luminous bodies is just as visible as the fire is visible on those bodies which hold it. (3) Light propagated in a straight line through a transparent body is called the 'ray', be it the light of the sun, or the light of the moon, or the light of the stars, or the light of the fire or be it the ray of 'vision' (visual ray). (4) Transparent bodies are all those through which light is transmitted, and which allow the eye to perceive what is behind them. One can divide them into two classes, one of the two is that through which light penetrates wholly, and the other is that through which the light traverses only partly. (5) One can further divide into two classes those through which the light traverses wholly, namely the celestial and the sub-celestial which, however, may ultimately be divided into three classes; the air, the water, and those which are similar to transparent fluids, and the transparent minerals, as the glass and the transparent precious stones. (6) The transparency of the transparent bodies is a characteristic which transmits the light. (7) There is difference in the transparencies, and this difference

does not change (go beyond) indefinitely; the angles, however, which may be divided indefinitely, are only imaginary, formed (enclosed) by the imaginary lines. But the angles which are really a part of material bodies, and exist only partly in imagination, could not be divided indefinitely, while at the same time the body in which they lie retains its form For the body in which the imaginary angles are actually in existence can not be divided indefinitely. Every material body is, no doubt, known to be divided to an extreme degree, while in spite of this it retains its form; if, however, it be further sub-divided, it gives up its original form and takes up another. An example of this is furnished by water. When this is divided to an extreme limit, it arrives at a degree of division that is possible for the smallest particle of water to exist; if however, it is further sub-divided, it gives up the form of water and takes up that of air. So that, if air, likewise be divided into its smallest possible parts, and if it be further sub-divided, it gives up the form of air and takes up that of fire. If, now the fire be likewise divided into its smallest possible parts, beyond which it is not possible to proceed with the division, then in rarity there is no other form except that of the fire. The form of celestial body, however, is still finer than that of the fire, and it is possible to suppose that the fire is of the same genus as celestial body, so the fire may be divided into the smallest possible parts, it turns into the celestial form. The celestial body, therefore, is not divisible; one can, however, suppose it to be divisible in imagination, so if its division, likewise, were to go to its smallest possible parts it would not be sub-divided any fruther, and there is in reality no finer form than that of the celestial body. If one were to imagine it, however, to be further divisible, after its division to its smallest possible parts were proceeded with—if this were generally possible—so one could not imagine, with the help of imagination only, the divisibility still further of the celestial substance into smaller dimensions any further. Thus when one imagines the celestial substance as divisible, this division is only in imagination and not in reality. That 'the celestial body is transparent to the highest degree', states the Master of Logic (Aristotle), only in the sense that there is none amongst the material bodies, more transparent than the celestial body, and that consequently it is also not conceivable, that there could be any such

whose centre is at K, the denser medium being towards the centre, and the rarer medium towards the outer side of the convexity of the arc The point A lies in the rarer medium, and the ray AE drawn from it, falls inclined on the spherical surface, and is refracted along the direction EG. Draw KE and produce it to H, then EH is the normal to the upper surface of the spherical body If a ray be now drawn along the line GE, it will be refracted in the direction EA. If, however, the medium which contains A is strongly transparent, the ray which is propagated along the line AE, is refracted along a line which lies nearer to the normal KH. Similar is the case with (proof for) other rays (st. lines). The angle, however, which lies between the refracted ray and the normal KH, is smaller than the angle GEK. The angle GEK can now be divided and reduced indefinitely, and one can imagine that the transparency of the rarer medium, in which A lies, can be reduced indefinitely. If now the rarer celestial medium and the sun is towards the point A, and the rays of the sun are propogated along the line AE and are refracted along the line EG, while the ray AE would be refracted, when the transparency of the space is finer and rarer, along a line which lies between the lines GE and EK. An indefinitely large number of lines could be supposed to lie between GE and EK, and consequently one can imagine that the transparency of the celestial space could possibly be imagined to be indefinitely finer and rarer than what it really is.



What we have described so far is the opinion of the Mathematicians; my opinion is that the transparency of a body may be indefinitely reduced in rarity and fineness, *i. e.* one can imagine a rarer transparency than (with respect to) the one present in a transparent body. Naturalists, however, state that every property of the material bodies can be brought (go) to a definite limit and

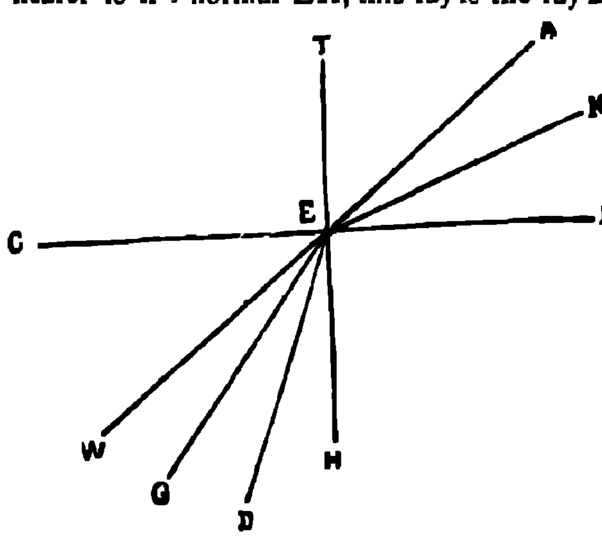
the point A lies, is still more transparent than the (previous) thinner medium, in which the ray which is propagated through the denser medium, is refracted in the direction EA, and this transparent rarer medium is still more rarer, it is refracted in the direction of a line that lies still nearer to the same normal than the line ED. Similar is the case with water; the finer and more transparent this finer medium is, the nearer lies the line to the normal EH, in the direction in which the ray is refracted; and the nearer the refracted ray comes to the line EH, the smaller would be the angle HED, and it is the angle which lies between the refracted ray and the normal and is in proportion to the transparency of the rarer medium. It follows necessarily that the degree (كيفية) of the transparency is proportional to the angle at the point of refraction.

There is no difference ot opinion between either the Mathematicians or the naturalists in this that every angle is divisible to an indefinite extent. For when with the point at which the angle lies as centre, and at a *certain distance from it an arc of a* circle be drawn, which subtends the angle and the circle be divided into very small parts which have no limit, the arc which subtends the angle may be divided into indefinitely small parts. If now from these points of division lines are drawn to the point at which the angle lies, the angle would be divided into a number of small parts. There can then be an angle, which is smaller than any one of these. If now the transparency of the medium is quite proportional to the angle of refraction, and if there be found no angle which is smaller than this, there would be no transparency imaginable, which would be rarer than this. However all what could be supposed to be rarer than this is not the limit of the transparency. Thus there exists *no limit to the* transparency that can be imagined.

Ptolemy (بطليموس) has already shown that the visual ray is refracted at the convex side of the celestial sphere and that the celestial sphere is more transparent than the air, and necessarily it follows from this, that the light of the sun and the light of the stars is refracted at the convex surface of the celestial sphere—this is made clear by the example. The denser medium is supposed to be spherical, and the arc BEC is the intersection of the plane passing through the point A, and the spherical surface,

smaller than the transparency of the first medium, it is refracted in the second medium, and the refraction in the second medium occurs in proportion to the rarity (with respect to the transparency) of the second medium.

We give now an example of this which would make this problem (phenomenon) clearer. Two transparent media, with different transparencies are given, and the point A lies in the rarer medium, and a plane surface passes through the point A, and stands at right angles to the upper surface of the denser medium, and let the line BC which is straight be the intersection of both the surfaces, the plane and the upper surface of the denser medium. From the point A we draw the line (ray) AE, which falls on BC inclined, and is refracted in the direction EG; erect at the point E a normal to the surface of the senser medium that is EH, and produce AE to W. This shows the angle E, which evidently is the angle of Refraction. Now if a ray is transmitted along the line GE, it is refracted along the line EA. We now draw the normal TE, the ray GE when it enters into the rarer medium, in which A lies, it is refracted in a direction which lies away from the normal ET, and the refraction in the medium whose transparency is stronger, takes place towards the direction EK. The ray which is propogated, however, through the denser medium, and is refracted in the direction EA, is nearer to the normal EH, this ray is the ray DE, which is refracted



along the direction EA. If now, a ray is propagated in the direction of EA through another thinner medium, which is stronger in transparency, it would be refracted in the direction ED. When, however, the thinner medium, in which

denser medium, it makes an angle at the point of refraction ; if, however, it is at first propagated in the denser medium and is then refracted into the rarer medium, the light which is propagated through the denser medium along bent lines, is refracted at just the same angle, which lies between the incident and the refracted ray (in the previous case). When, further, the light from a transparent rarer medium is refracted into two other media, which are denser than the first medium, and both the denser media are different in density, the refraction of light in the medium, which has the greater density, is greater ; I think that when the light is refracted in the medium, whose density is greater, it lies nearer to the normal drawn at the point of refraction ; when, however, light is refracted from a transparent denser medium into two rare media, and both the rarer media are different in rarity, it is bent away from the normal erected at the point of refraction in the medium which has the greater rarity. Ptolemy (بطليموس) has similarly (explained) proved this problem in the case of the ray of light (visual ray), in the V Chapter of his Book on Optics. In my opinion, he has stated that when the visual ray is propagated in a transparent medium, and meets another transparent medium, whose transparency is different from the transparency of the first, and falls in an inclined direction on the common surface of the two media, it is refracted and is not transmitted in a straight line. He has further stated that the refraction of the visual ray from air to glass is greater than the refraction of the visual ray from air to water—glass being denser than water—and he has, likewise, further shown that when the eye is placed in the rarer medium, its ray is refracted into a denser medium at a certain angle, and when the eye is placed in the denser medium in the direction of the refracted ray, the ray is refracted at the same angle. From all this it is evident that every ray, which is propagated in a transparent medium, and then meets another transparent medium, when the transparency of the second medium is greater than the transparency of the first, through which it has propagated, it is refracted in the second medium, and the refraction in the second medium takes place in proportion to the density (with respect to the transparency) of the second medium and that every ray which is propagated in a transparent medium ; and then meets an other transparent medium, when the transparency of the second medium is

as the transparency in these transparent bodies is different, and as already explained there is some opacity in all of these bodies, similarly the amount of transparency in these bodies is a consequence of the opacity in it. The stronger is the opacity in them, the less (weaker) is their transparency, and the weaker the opacity in them the stronger is their transparency.

As regards the transparency of the heavens, the opinion of the Logician (Aristotle) is, that its transparency is finer than the transparency of all other bodies. Its transparency is of the highest degree, and it is impossible, that a body can have a stronger trasparency than that of the heavens. The Mathematicians, however, think that the transparency has no limits, and that as far as the transparent bodies are concerned, it is possible to have a body with a transparency greater than that of any of them. One of the later Mathematicians, namely Abu Sa'd al 'Ala ibn Suhail has explained this (phenomenon) problem. He has written a discourse in which he has described a geometrical proof of the same problem. We would also reproduce proof of the same problem, but would bring out his main points in a much better way than done by him ('Ala ibn Suhail), and would give a clearer exposition than his. We assert, that experience has shown that every light which falls on a transparent body, is transmitted through the transparent body along straight lines. When light is propagated in a transparent body and passes on to another whose transparency is different from that of the first in which it is propagated, and falls on the inter surface of the second body in an inclined direction, it bends and is not transmitted in a straight line. This (phenomenon) problem we have described in the VII Chapter of our Book on Optics, and have advised there how to verify it by experiment, in the case of every one of the transparent bodies separately, and there we have also proved that the bending takes place in definite angles. Now, when the bending takes place from a rarer medium to a denser one, it occurs to the side of the normal, which is erected at the point where the bending takes place, at right angles to the surface of the denser medium. If, however, the bending takes place from the denser medium to the rare one, it occurs towards the side away from the normal. If now, the light is propagated in the rarer medium and is refracted into the

this much of *it* will suffice. From every transparent sub-celestial body, proceeds a secondary light, when the light of the sun falls on it, just as it proceeds from the opaque bodies, as the light of the sun falls on them ; only the secondary light which proceeds from the transparent bodies is found to be weaker than that coming from the opaque bodies. We have already shown clearly, that in the opaque bodies there is a power to receive light, and in the transparent bodies there is likewise a power to receive light, and we have also shown that in the transparent bodies, there remains a light, while at the same time light penetrates into them *(from outside)* *We now assert, that the radiation of the secondary* light from the transparent body is not the radiation of the transmitted light. For the light which has penetrated the transparent body is transmitted through it in a direction opposite to that of the body from which the light is being radiated, and is not transmitted in any other direction ; the secondary light, however, which proceeds from the bodies, is found to be transmitted in directions opposite to these directions. Consequently, the radiation of secondary light from the transparent body is not the radiation of the light which has penetrated it. Now in the transparent body there is no light except that which has penetrated into it and that which remain in it ; also the secondary light which goes out from the transparent body, comes out only from the light which remains in it. The opacity, however, is the cause of the remaining of light in the material body, which (the opacity) is in contrast with the transparency ; because when there is no opacity in the body, it is transparent. When it is transparent, light penetrates into it, and when the body is transparent to the highest degree, there is no opacity of whatever kind in it, and light penetrates into it, wholly and does not remain in it ; the transparency, therefore, is the cause of the penetration and not of the light which remains in it. Then, however, the light remains in every opaque body, and light penetrates into every transparent body, this remaining of light is due to no other reason except the opacity. Now, further that in every transparent sub-celestial body, there is a stationary light while the outside light falls on them. So in every transparent celestial body there is also some opacity along with the transparency. It has also been explained that the transparency in these transparent bodies is different. Just

secondary light passing out of the transparent bodies is weaker. This subject we have described in detail in the first chapter of our Book on Optics, and have therein discussed the methods by which it is proved for all the light proceeding from the opaque bodies and found in the transparent bodies; at this place we would reproduce only some portion of this discussion. A secondary light proceeds from the air, that is visible in the morning light. The surface of the earth is enlightened early in the morning just before sunrise, and as perceived by the senses, the upper surface is brighter than what it was during the night, and even when the sun in the early morning, is not opposite to the earth, becomes visible to the eyes. The light from the luminous bodies, however, proceeds only in straight lines; this subject, we have made clear by inference and observation in the Book on Optics There are, however, no rays now propagated along straight lines from the sun to the earth, upon which the sun has not yet shone, nor are these intercepted by other earthly bodies. Consequently, the light which is visible on the surface of the earth, is not a light which is radiated (directly) from the body of the sun itself. There stands possibly, however, no other luminous body opposite to the surface of the earth, which were capable of radiating to its surface the light, except the upper regions of the air which lie between the heavens and the surface of the earth, and which is enlightened by the light of the sun. This air, now, stands opposite to the body of the sun, and there is no obstacle between it and the sun; this is the air which becomes bright at dawn, and the light in it is perceptible by the senses. Consequently, the light which is visible at dawn on the surface of the earth, is one which proceeds from the light of the air found opposite to the surface of the earth It is true of the water, the glass, and of the transparent minerals, when the light of the sun radiates on them a secondary light proceeds from them, while at the same time light penetrates into them. This light is perceptible by the senses, when a white substance is brought near water or the transparent minerals, from the side other than that from which the transmitted light reaches it. For one notices, then, a new light on the white body that was not visible on it before; this light, however, is weak. The method of the experimental proof of this phenomenon (subject) we have explained in detail in the Book on Optics; at this place

stars, or the light of the fire, or the light of the eye. This is the definition of the rays, the physicists, however, have no scientifically based hypothesis for the ray.

Now that this has become clear, we would now return to the discussion of the transparent bodies. We assert that the transparency is a quality (mode) of transparent bodies and of course one that transmits light onwards. Transparent bodies may be divided into two classes, the celestial and the sub-celestial. Out of these, celestials are of one kind, because they are made of the same substance. The sub-celestial transparent bodies are divided into three classes : the first of them is the air, the other water and transparent fluids, as the white of the egg and the humour (transparent layers) of the eye, and bodies similar to these ; and the third the transparent minerals, as the glass, the crystal, and the transparent precious stones. These are the different kinds of the transparent bodies. These transparent bodies are different with respect to their transparency, and in every one of these kinds the transparency is different, except in the celestial bodies. Thus the air has different transparency, it is partly dense and partly rare. The dense air is, for example, the smoke and the mist, and the air mixed with dust or smoke ; and the other is rare as the layers of the air lying in the enclosure between the sky and the air near the sky, and the air unmixed with other bodies ; the rarer air, however, has the stronger transparency. Similarly some transparent fluids have stronger transparency than that of others, for example the flowing water in comparison with the water in which some colouring matter is dissolved, and as the crystal is more transparent than the hyacinth. All these are percieved by the sense preception As for the celestial bodies no difference is visible in their transparency, that they are, however, transparent, is self-evident because the stars are at different distances from the earth, and in spite of this the eye perceives them all, notwithstanding their different heights (positions) in the space.

In all the transparent sub-celestial bodies, however, there is also some opacity ; for from every one of them proceeds a secondary light, when the sunlight falls on them, just as it proceeds from the opaque bodies when the sunlight falls on them ; only the

opinion, that the vision takes place by means of a ray which starts from the eye, and comes back to the eye, and it is due to such a ray that vision takes place, and such a ray is an illuminating power belonging to the genus of light, and it starts from the eye along straight paths, whose beginning is at the middle point of the eye, and when this illuminating power returns to the eye, the eye is able to perceive its object. This illuminating power spreads out from the centre of the eye along straight lines and together with the straight lines is called by the Mathematicians a 'visual' ray. Who, however, mean that the sense of vision takes place through a picture which is reflected from the perceived object to the eye, and in their opinion, the ray is the light transmitted from the visible object and which converges along straight lines to the middle point of the eye. They, whose opinion is this, also think that light travels from a point source of light in the direction of all straight lines that can be drawn from it. If, now, the eye sees any visible object placed before it, which sends out light either its own or acquired by it, along lines that can be drawn from every point on the object to the eye. Now the light from the eye goes to the visible objects and spreads out along innumerable straight lines in innumerable different directions. The imaginary lines, however, that may be drawn between the middle point of the eye and the visible object are the lines along which the light travels, and the eye perceives the picture of the visible object in the light which is reflected to it along the paths of these lines. For those, whose opinion is this, believe that the eye is so constructed by nature, that it only perceives the phenomenon of light, which is reflected to it along the paths of these lines, and does not, however, perceive that, which is reflected to it along paths other than those of these lines. One calls the light, which travels along paths of these straight lines, and which converges to the middle point of the eye, together with these lines a 'ray'. Thus the ray of light, accordidg to all Mathematicians, is any light which travels in straight line, and converges to the middle point of the eye, and these lines, as such, - and these are imaginary lines— are called by the Mathematicians 'lines of rays'. According to the earlier general explanation, however, the ray is a light, that travels along straight paths, and that may be the light of the sun, or the light of the moon, or the light of the

the light rays, which start from two different points lying in the luminous body, intersect one another; I mean that the lines drawn from one of these points in all directions, intersect those drawn in all directions from the other point. If now, a number of luminous bodies are placed at a time side by side and light spreads out from each of them, the position of these lines along which the rays propagate are different. It, therefore, incidentally occurs that the transmission of light ensues in opposite directions, if the luminous bodies (transmitting light) lie on opposite sides of the transparent body. Consequently, the hypothesis according to which light is transmitted onwards, along particular paths is null and void and no such particular paths are fixed in the transparent bodies along which light is propagated. Moreover physical movements cannot take place (at the same time) along directions opposite to one another. If now the phenomena of propagation of light were a characteristic of the transparent body, which allow the propagation only along its characteristic paths, the same light could not have been propagated (at the same time) along paths that are uniform in their nature in opposite directions. Now if the light travels in a transparent body in directions opposite to one another. the propagation of light in transparent bodies along straight paths is not a property of the transparent body. When, however, light is propagated in the transparent body only along straight paths, and the propagation along straight lines is not a property of the transparent body, it is the property of the light. It is, therefore, the property of the light that it is propogated along straight paths, and the characteristic of the transparency is to allow the transmission of the light in the transparent body.

The light propagated in a transparent body in straight lines is, what is called a 'ray'; the ray is the light propagated from a luminous body in a transparent body along straight paths the straight lines, however, along which the light travels are imaginary lines imperceptible by the senses. The imaginary lines together with the light transmitted along them, is what is called a 'ray'. So the ray is the characteristic phenomenon which spreads out in straight lines. The Mathematicians, however, call the ray of the eye a ray only by virtue of its similarity to the rays of the sun and the rays of the fire The early Mathematicians are of

the light entering through the orifice, would be visible quite clearly on the dust particles suspended in the air ; and it would be visible on the floor, or on the wall of the room, standing opposite to the orifice. And one finds the light from the orifice to the floor or to the wall, standing opposite to the orifice, propagated in straight lines. And if one holds a straight rod in the direction of this visible light, one finds the light propagated in the staight direction of this rod. If, however, there is no dust in the room and the light shines on the floor, or on the wall standing opposite to the orifice, and a straight rod be placed between the visible light and the orifice, or a thread is stretched fast between them and an opaque body is held between the light and the orifice the light would be visible on this opaque body, and the body shines at the place at which it is visible and disappears from the places at which it was visible (at first). If, then, one moves the opaque body up and down in the surrounding space, which lies along the straight direction of the rod, one always finds the light visible on the opaque body. It is clear from this that the light from the orifice to the spot at which it is visible, travels forward in straight lines. We have explained in the book on Optics, how the propagation of light in all kinds of transparent bodies is verified by experiment (is investigated) ; what we have spoken of about this here is sufficient.

The transmission of light in the transparent body is a physical characteristic of all kinds of light. It is of course, sometimes asserted, that the propagation of light in the transparent bodies along straight paths is a characteristic of the transparent body. But this view is contrary to experiment and observation and the first hypothesis is the right one. If the transmission of light in the transparent body were a characteristic of the transparent body, the transmission of light would have taken place only along particular paths ; this fact, however, is not so found, but one finds the light propagating in the transparent body in the direction of the lines which intersect one another, or are parallel, or are convergent and divergent at the same time, and spread out from the same lighted body ; and no doubt it so takes place, because light travels from every point of the luminous body along every straight line that can be drawn from these points. And so must

(onwards) of light. We would explain all these after we have spoken of the light completely. We have already remarked that light radiates from every luminous object, to every body placed opposite to it, and on bodies in its neighbourhood, it still remains for us to explain, how the light radiates on the oppositely placed bodies, and penetrates into the transparent bodies in its neighbourhood. In this connection we assert, first of all, that the light radiates from every luminous body, and penetrates into every transparent body in the neighbourhood of the luminous body, and is visible on the whole of the opaque body placed opposite to the luminous body. The meaning of this is clear, it requires no explanation, and no doubt because, the light of the sun, of the moon, and of the stars, penetrates into the heavenly space which is a transparent body and the atmosphere, which likewise is transparent, and is visible on the upper surface of the earth, and on the earthly bodies, and penetrates into water, and when the water is in a transparent vessel is visible on every opaque body which is placed behind the vessel. And in the same way, when the light falls on the transparent minerals, like glass, crystal, and on bodies similar to both of these, it is visible on an opaque body placed under them. From the description of these examples it is quite clear that the light penetrates into the transparent bodies.

As regards the way in which the light penetrates into the transparent bodies, it occurs in this way that the light is transmitted in the transparent bodies in straight lines, and no doubt it is transmitted only in straight lines, and it radiates from every point of the luminous body, along straight lines, which could be drawn from every point of the luminous body, in the transparent body placed in the neighbourhood of the luminous body. We have also already described this in detail in our work on Optics; but we would like to describe something of that now which would suffice for what we have spoken of here. In this respect we state that the propagation of light in straight lines would be quite clear by the light which enters into a dark room through an orifice. Because when the light of the sun, the moon, or of the fire enters a dark room through an orifice of moderate size, and there are dust particles in the room, or they are spread in the room,

opaque body, radiates from the luminous body, and enters into the transparent bodies and is transmitted towards the opaque body, it remains in the transparent body so long as it continues to fall on the opaque body. That the light remains in the transparent body when it is transmitted through it is evident from the fact that when the transparent body is intercepted by an opaque body, wherever this interception may take place, the light (present) in the transparent body would be visible on the opaque body. This is clear when the transparent body is air or water. Thus the visibility of light on the opaque body, which intercepts the transparent body wherever we like, is an evident proof of this that the light is present in the transparent body. If, however, light is present in the transparent body, there must be in the transparent body a power to receive light as has already been explained. It is evident from what we have described so far that in every body, the rarer transparent as well as the opaque one, there is a power to receive light

That in the transparent body there is a power to transmit light further, which is not present in the opaque body, is self-evident: because light penetrates every transparent body and it does not penetrate every opaque body. And so it is clear from this, that in the transparent body, there is a property, which is not (present) in the opaque body, and because light penetrates every transparent body, and it does not penetrate into opaque body, in which there is no transparency; so it is this transparency which transmits the light onwards; and as the transparency is one of the characteristics inherent in the nature of the transparent body—hence the transparency is the essential feature of the transparent body.

It is also clear from all that we have described that in every material body, there is a power to receive light, and in the transparent bodies from amongst them along with the power to receive light there is at the same time the property to transmit light onwards, and it is at the same time clear, that the transparency a characteristic property, which constitutes the nature of the transparent body. Now transparent bodies are (all) different; as different is their transparency and the reception and transmission

rays which are stopped and reflected, on account of the fineness of the holes and of the threads, are not differentiated one from the other by the eye, for the eye cannot apprehend what is extremely fine. Also the transparency in the air, the water, and the glass, etc. is not the same transparency as in the thin cloths. The truth about the transparency (of bodies) is this that the light passes through the whole of them, as in the air, the water, and the glass etc.; the thin cloths, however, are called transparent, only because of this similarity to these (bodies) with regard to the passage of light.

After we have differentiated the transparent bodies from the others we assert that in the transparent bodies, through which the light wholly penetrates, there is a power to receive light, just as it is (present) in the opaque bodies. This, I think, must be true both for the opaque as well as transparent bodies, through the whole of which light penetrates. The reason for the fact that in all the opaque bodies there is a power to receive light, is that the light proceeds from every opaque body when it stands opposite to a luminous body, and there is no obstacle between them, and the light in the luminous body is not extremely weak ; and so long as the luminous body remains opposite to the opaque body for a perceptible length of time, the observer apprehends the light falling on the opaque body, in case the opaque body is not very far from the eye, and is not too far from the body in whose light it is placed. The reason for the fact that the eye perceives for a perceptible length of time the light on the surface of the opaque body that the light falls steadily on its surface, and (that no light appears on the surface of any one of these opaque bodies except when in these bodies there is a power to receive the light ; while these bodies cannot receive light unless the light is steadily falling on them). Thus the visibility of light on the surface of the opaque body is an evident proof of this that in the opaque bodies there is a power to receive light.

It is still easier to make clear the nature of the transparent body. The light penetrates into the transparent bodies and the light which penetrates into them is visible on the opaque bodies placed behind them *i. e*, when the transparent body is between the luminous and the opaque body. If now the light, visible on the

visual perception are of two kinds; namely the stars and the fire. The light of these bodies falls on all others in the neighbourhood, and this phenomenon is perceived by the sense of sight Now in the first Chapter of our Book "The Optics" (المناظر) we have explained that light in every luminous body, whether it may be a characteristic or accidental property of it, spreads out from it and falls on an object placed opposite to it, and we have explained this phenomenon there in detail. It is evident that the explanation of this phenomenon is already fully understood, then one finds no opaque object placed opposite to the luminous body, except at the time when the light from this luminous body falling on the opaque object, makes it visible, if between both of these there is no obstacle or there is not a great distance, or if the light in the luminous body is not too weak. In all material bodies both transparent and opaque, there is a capacity to receive light in consequence of which they receive the light from the luminous bodies. But in the transparent bodies there is besides the capacity to receive the light, yet another capacity to transmit it onwards, this is called transparency; and the bodies which are called transparent are those which transmit the light on and which allow the eye to perceive things placed behind them. One can divide these bodies into two classes, as they allow the light to pass through them in two ways One class of these bodies is that through the whole of which light passes while the other class is that which allows the light to pass only through some parts of it and does not allow it to pass through the other parts. To the class of bodies which allow the light to pass through the whole of them belong the air, the water, the glass, and what is similar to these, and to the class which allow the light to pass through them only partially, belong thin cloth and things similar to it In the case of thin cloth, the light passes through the holes, which are between the threads but it does not pass through the threads, for the threads are opaque through which light cannot pass. But since the fine threads of the thin cloth are extremely fine, the light divides itself into different parts which pass through the holes of the cloth, for the eye cannot receive those rays which are stopped by the threads and are reflected back, so that the eye perceives only those rays of light which from the other side of the cloth pass through the holes in it It is obvious that the light

As regards the Mathematicians, they consider the light, which is propagated from the self-luminous bodies, and which is the essential property of those bodies, as a form of heat-energy, which is found in these self-luminous bodies; and no doubt it is found that if the sunlight is reflected back from a concave mirror, and it is converged (concentrated in) to a point, and if at this point a combustib'e body is placed, it at once catches fire, and further it is found that if the sunlight passes through the air, the air is warmed, and if sunlight falls on an opaque body, and it continues to fall on it for a while, this body is noticeably warmed, the conclusion we draw from this phenomenon is that the sunlight is a form of heat-energy.

Thus they are of the view, that all lights are of one kind, *i. e.* all are of one kind, only they are different with respect to their being stronger or weaker. And if anything catches fire by the light, it does so on account of its very strength, and if anything does not catch fire, it is on account of its weakness, just as one finds in the case of heat-energy Namely the fire warms that part of the air, which is near it; and all the air which is near the burning body, is more strongly heated than that part which is farther off. And if in the air surrounding the fire, whose distance from the fire is considerably great, a combustible body be placed, it does not burn; but if the body be brought near the fire and be placed in the air adjoining the burning body, it (combustible body) burns. Now there is no other difference between the air adjacent to the burning body, and the air at a distance from the fire, which is warmed on account of the heat energy, except that the air adjacent to the burning body has a stronger heat So the difference between both the air spaces filled with the heat energy is that the one is able to burn and its heat is strong, but the other is not able to burn and its heat is weak. Even so the light is a form of fire-energy; that which is strong burns, but that which is weak does not burn. Accordingly, every light in the opinion of Mathematicians is a fire energy, and it is visible in the luminous body quite in the same way as in the fire on the fire carrying body.

The self-luminous bodies, comprehended by our sense of

Journal of the German Oriental Society
Vol. 36, pp. 197—237

In the name of God All-Merciful

"THE WORK ON LIGHT OF HASAN IBN AL HUSSAIN IBN AL-HAITHAM"

The discussion of 'What is light?' belongs to the natural sciences, but the discussion 'How is light radiated?' because of the lines in which light spreads out, demands the knowledge of mathematical sciences. Similarly the discussion of 'what is a ray?' belongs to the natural sciences, but the treatment of its form and appearances to the mathematical sciences And similar is the case of the transparent bodies into which light penetrates; the question of 'What is the transparency?' belongs to the natural sciences, and the discussion of 'how light spreads out in them?' comes under the heading of the mathematical sciences. Thus the discussion of the light, the ray and the transparency must necessarily be put together under the category of the Natural and the Mathematical Sciences.

Now that we have established this, we wish to enter into the discussion of these conceptions and assert as a general proposition, that every property, which is found in any of the natural bodies and belongs to those properties, which constitute the essence of the body, is called an essential property, because the nature of every body consists solely in the totality of those existing properties which, so long as its nature itself does not change, are inseparable from it. Now in every self-luminous body light is one of the characteristics through which the nature of that body is determined, and thus light in every self-luminous body is an essential property of this body, and the accidental light, which is visible on the opaque bodies, on which it radiates from others, is an accidental property (quality) This is the view of those who are well-versed in the science of philosophy.

Al Hakim (reigned 996—1021 A. D.), with the commission so to regulate the innundations of the Nile as to enable them to dispense with the necessity of depending on the rains (the weather). He claimed to be able to carry on this project but realized its impossibility, when he reached the falls of the Nile, near Syene. To escape the wrath of the king he pretended to go mad and took shelter in the Mosque of Al-Azhar. Later he busied himself chiefly with Ptolemy and Euclid, on the elements of which he wrote a commentary. During his stay in Egypt a rich collection of his writings seem to have emerged. Ibn abi Usiabia names about one hundred titles of his discourses on Mathematics and Astronomy. According to Caussin (Memoirs de'l 'cad desineer, IV. 1822), who relies on a manuscript (Sur l'optique de ptolemie) found in the Leyden Library—this is also supported by Casiri, Ibn al-Haitham died in 430 A. H. (1038 A. D. or 1039 or soon after). Ibn abi Usaibia mentions the same year of his death.

Ibn abi Usaibia says of him that no one at any time with respect to the knowledge of the sciences of Mathematics and Physics even approached him. Chasler says, "We must consider Al-Hazen as the source of our optical knowledge." And the great Arab deserves this praise. I know only two of a large number of his writings in translation, one on Geometry (1) "The two books of the given things" and the above-mentioned book on Optics (2) Kitab ul Manazir" (كتاب المناظر). Both, however, show sufficiently what value we are to attach to the great scholar.

My attention was drawn to the manuscript, whose translation I have attempted here, by Dr. Steinschneider of Berlin, and I take this opportunity to express my heartfelt thanks to him. The reading and translation of the Text, in which Professor Deiterici of Berlin had the kindness to help me, was made more difficult by the circumstance that I had no second copy to hand, with which I could have compared those portions that were indistinctly written, and the parts which evidently, were wrongly written. The manuscript of the same contents mentioned in Loth's Catalogue under 734, IV fol. I 2—7 was not accessible to me.

Discourse on 'Light', by Ibn-ul Haitham Published and Translated by Dr. J. Baarmann.

INTRODUCTION.

With the beginning of the 10th Century A. D., the translations of the Arabs, which had chiefly extended to the Indian and Greek works, came to an end, and they began now, speaking more exactly, to work upon the rich material which chiefly related to the mathematical, physical, medical, and philosophical writings, and on the ground so prepared to base their further structure. Through the munificence of the Caliphs, chiefly in Persia, developed an important movement to study Mathematics and Astronomy. I only remember the names of Al-Karkhi (الكرخى) and Al Khayyami (الخيامى) and of the former Kafi-fi-Alhisab (كافى فى الحساب), (translated by Hochheim) and his algebraical work Al Fakhri (الفخرى) while of the latter "Solutions of Cubical Equations", and his "Binomial Theorem for positive whole number exponents", have become known to us through the translations of F. Woepcke.

In physics also excellent work was done. Of the greatest importance were Al-Biruni, the first Arab from whom accurate *determinations* of specific gravity are handed down to us. Al-Khazini (الخازنى), whose "Book of the Balance of Wisdom" (كتاب ميزان الحكمة), forms a continuation of Al-Biruni's works, and finally Ibn ul-Haitham, the great Optician. For long were people doubtful, whether they were to identify the latter with Al-Hazen, the author of the famous Optics, which was published in 1572 by Risner from an old Latin translation. That the same man is mentioned under both names is definitely established by Narducci in "Bulletino di Bibliographia, etc." IV, Pages 1—48, 1871. This Ibn ul Haitham with his full name as given by Ibn Abi Usaibia, Abu Ali Mohammad Ibn-ul-Hasan Ibn-ul-Haitham, and according to Haji Khalifa, Abu Ali Al-Hasan Ibn-al-Hussain Ibn-al-Haitham, was according to his own statement, born in Basra in the year 354 A. H. (965 A. D.), and was called only in later manhood to Egypt by Caliph

take the help of its German translation, for which I have to acknowledge the deep gratitude, under which I have been placed by my colleague and teacher, Dr. B. A. Quraishi. I have also to thank Dr. Saidullah of the Islamia College, who helped a great deal in elucidating the difficult portions and Dr. Rashid Athar, who was kind enough to go through with me in the revision of the translation. In the end I have also to acknowledge the valuable help given to me by my colleague Maulana Muhammad Umar Khan who very kindly gave me the exact explanation of some old scientific terms in use in Arabic, whose equivalents in German did not adequately express their import.

Dated, 15th April 1933. M. F. Quraishi.

3. Light is propogated in straight lines. This is the characteristic property of light and not of the transparent media through which it is transmitted.

4. Light is dispersed from the surface of opaque bodies and is visible on the atmosphere at dawn.

5 He correctly defines a 'ray' of light and considers that the vision takes place due to the rays starting from the visible object and impinging upon the eye, and not due to the 'visual rays' starting from the eye in a cone and embracing the object, an hypothesis which held the field for no less than fifteen centuries before him.

6. He differentiates between transparent and translucent bodies.

7. He understands the reflection of light from the surface of a concave mirror.

8. He knows correctly the Law of refraction—the incident ray, the normal and the refracted ray lie in the same plane and the two rays lie on opposite sides of the normal.

9. When a ray of light strikes the inter-surface of two transparent media, having different refractive indices, the ray is refracted and the angle of refraction is proportional to the transparency of the first medium.

10. He considers the heavens and space to be the rarest medium known.

My attention was first drawn to this treatise by Professor Mohammad Shafi of the Oriental College, Lahore, for which I am deeply indebted to him. It is published in Vol. 36, " Zeitschrift der Deutchen Morgenlandischen Gassellschaft" pp. 197—237, 1882. It was extremely difficult for me to translate the 'Discourse' from the original text, for I could come accross no Arabic scholar, who might be equally well-versed in scientific technicalities, and I had to

INTRODUCTION

Ibn-al-Haitham, the translation of whose 'Discourse on Light', I have here attempted, was considered by the Christian Europe as the greatest authority on Optics in the Middle Ages. The influence of his writings was felt in Europe for no less than six centuries, right upto the middle of the seventeenth. His most famous work was his 'Book on Optics' (كتاب المناظر), whose translation in Latin was first published from Basle in 1572. The original text is said to be lost to the West, but a copy of it in Arabic has, sometime ago, been traced to be in the late Imad-ul-Mulk, Syed Hussain Bilgirami's Library, Hyderabad (now the State Library, Hyderabad). Another of his books, a treatise on twilight (شفق), was also published in Latin translation, earlier in Europe in 1542, from Lisbon. Kitab-al-Manazir is said to be based on the works of Euclid and Ptolemy on optics, but he made many valuable contributions in it on the subject. He relies on experiment and observation, and can safely be said to be the forerunner of Roger Bacon and Francis Bacon who are claimed to be the originators of the scientific method in the investigation of natural phenomena. Many of his discoveries of Laws of optics have been erroneously attributed to other contemporary Christian writers or those who lived much after him.

In this 'Discourse', he successfully discusses the following problems :

1. Light is a form of the heat of the fire Or in other words light is accompanied by heat.

2. Luminous bodies are sources of light. In this respect he considers the moon as a luminous body, with light of its own.

Discourse on Light

BY

IBN-AL-HAITHAM

TRANSLATED FROM

The Arabic Text and German Translation

PUBLISHED BY

Dr. J. BAARMANN

in the

"Zeitschrift der Deutchen Morgenländischen Gassellschaft"

1882

BERLIN, Vol. 36, pp. 197—237

"نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک" (Nihiayat al-Idrak fi Dirayat al-Aflak)[1]. This is a very comprehensive account not only of Astronomy but many related subjects, such as Geodesy, Meteorology, Mechanics and Optics. It is based chiefly on the Tadhkira of Nasir-ud-Din, but is more elaborate and contains novelties *e g.*, a fuller discussion of the cosmological views of Ibn-al-Haitham. In this he discusses questions of geometrical optics, the nature of vision, and finally the rainbow He was the first to give a satisfactory account of the rainbow[2] (excepting the colours). He explained it by the study of the passage of a ray of light through a transparent sphere (drop of water) the ray is refracted twice and reflected once (or twice in the case of the secondary rainbow). This explanation is essentially similar to that of Descarte (1621).

Kamal-ud-Din Al-Farisi (d. 1320). - Qutub-ud-Din was an important link in the transmission of Ibn-al-Haitham's Optics to his most famous disciple, Kamal-ud-Din al-Farisi, who wrote a commentary on it, entitled "تنقیح المناظر لذوی الابصار والبصائر" (Tanqih al-Manazir li-ulil-Absar wal Basair). He was a scholar equal in calibre to Ibn-al-Haitham and indeed, perhaps, surpassed him in originality. He added a series of brilliant treatises to his commentary, dealing with the reflection and refraction of a sphere, the rainbow, the halo, camera obscura, etc. The book is now published in Arabic text by دائرۃ المعارف Hyderabad, and is available in the Punjab University Library.

---

[1] A copy of this is in Khuda Bakhsh Library, Bankipur

[2] This is attributed to Antonio de Dominis (1611) by Christian writers.

Note :—The dates given are of Christian Era.

15-4-1933.

astronomy of "Tadhkira-fi-ilm Al-haia" "(التذكرة في علم الهيئة) or often called "Tadhkira-i-Nasiriya" (التذكرة الناصرية). He knew the Greek mathematicians through the Arabic translations and commentaries, he prepared translations of some of the Greek texts from Arabic into Persian, and edited a large collection of the Arabic versions and elaborations. The last is the work called (كتاب المتوسطات بين الهندسة والهيئة) (the Middle Book between Geometry and Astronomy). Together with the "Almagest" and the "Elements", the "Mutawassitat" constituted the bulk of ancient classics available to the Muslims. There is a Manuscript of the whole collection in Constantinople (Aya Sophia 2760) entitled "مجموعة في الهيئة والهندسة" (Astronomical and Geometrical Collection).[1]

In Physics, as an astronomer he was primarily interested in the question of Optics, both geometrical and physiological. To this field belongs his (1) "تحرير كتاب المناظر" (Tahrir Kitab al-Manazir), a version of Euclid's Optics, probably a part of the 'Mutawassitat'. In the preface he says that we perceive objects because of the light rays emanating from them but that everything happens as if the rays emanated from our eyes. He is the author of a treatise (2) "مباحث في انعكاس الشعاعات وانعطافها" (Research on the Reflection and Refraction of Rays). It contains a proof of the equality of the angles of incidence and reflection.

3. Answer to 'Ali Ibn'Umar al-Qazwini (d. 1277) concerning Ibn Sina's theory on the influence of heat and cold upon the colour of dry and moist bodies. He wrote a few other optical texts containing original ideas. Some time ago (1929) I saw a small treatise on Optics in Arabic (رسالة في الضوء) by him in the Subhan-Ullah Library at Aligarh.

Qutub-ud-Din al-Shirazi (1286—1311).—One of the greatest Persian scientists of all times, Mahmud Ibn Masud Ibn Muslih Qutub-ud-Din al-Shirazi. Born in Shiraz 1236. He sat at the feet of Nasir-ud-Din al-Tusi and became his most famous pupil. He lived in Egypt for some time, travelled extensively in Khurasan, Iraq, Persia and Rum (Asia Minor), and settled down at Tabriz, where he died in 1311.

By far the most important of his astronomical works is

[1]There is a photograph copy of this book in the Punjab University library.

" Meteorologica' and his writings on heavens and the universe ; wrote original works on Substance, Time, space, space and measurement – the three fundamentals of mass, space and time.

(4) Brethren of Purity (983) (اخوان الصفاء) a secret school established in Basra. They wrote a series of 52 treatises of which 17 deal with natural sciences, in some of which they discuss " Eclipses ".

(5) Al-Biruni (d. 1048) made a profound study of light ; heat and especially the speed of light.

(6) Ibn Sina (d. 1037) " شیخ الرئیس " asserted that speed of light as compared with that of sound is finite.

WORKERS OF THE LATER PERIOD

But the Arabic tradition of Ibn-al-Haitham was gradually improved upon by a series of disciples Nasir-ud-Din Al-Tusi, Qutab-ud-Din Al-Shirazi and Kamal-ud-Din Al-Farisi- (نصیرالدین طوسی۔ قطب الدین شیرازی۔ کمال الدین فارسی)

Nasir-ud-Din al-Tusi (1201 – 1274) was a Persian, philosopher, mathematician, astronomer, physician and scientist. He wrote both in Arabic and Persian. One of the greatest mathematicians and scientists of Islam. Born 1201 in Sarah or Tus in Khurasan. He entered the service of Halagu Khan (Il-Khan of Persia 1256—1265) who rescued him from the virtual captivity of Abi Mansur the Ismaili Governor of Kohistan and raised him to the post of Vizier. He was probably in Halagu's train when the latter sacked Baghdad in 1258. He wielded great influence on Halagu due to his astrological knowledge and it is said that Halagu did not dare to undertake anything without his astrologer's advice. He built an Observatory and Library at Maragha and was the founder of an Institute of Science.

A large number of writings on many subjects are ascribed to him. A writer discusses 64 of his most important works under 23 scientific topics with one under poetry. He is the author of of well-known astronomical tables " Al-Ziji Al-Ilkhani " and on

Arabic and more in Latin translations, many of them by Gherardo de Cremona. Enough survives to enable us to estimate his position in Science and Philosophy.

Al-Kindi dealt very fully with Optics. His principal work, which was much used both in the East and West, next to the work of his great successor Ibn-al-Haitham is based mainly on the Optics of Euclid, Heron and Ptolemy. It appeared in Latin under the title " De Aspictibus " which deals with the geomatrical and physiological Optics *e. g.*, the passage of light in straight lines, the direct process of vision, the process of vision by a looking glass and the influence of distance and angle of vision on sight along with optical illusions. According to him, light takes no time to travel and vision takes place through a bundle of rays, which sent out from the eye, expanding in the form of a cone, embrace the object ; while the other four senses receive impressions from things the sense of sight grasps its object in an active and instantaneous manner.

We also possess in Latin, a little work by him on the *cause of the blue colour of the sky*, in which it is explained that this colour is not really special to the heavens, but arises from the mixture of the darkness of the sky with the light of the atoms of dust, vapour, etc., suspended in the air illuminated by the light of the sun. This wonderfully correct explanation of the phenomena forms the basis of the discovery of the " Raman Effect " by the well-known Indian Physicist Sir C. V. Raman for which he was awarded the Nobel Prize for Physics in 1928. It has come to my knowledge that one of his works in Arabic text, "A Treatise on rays" (رسا له فی الشعاعات) is present in the Khuda Bakhsh Library, Bankipur.

WORKERS OF THE 10th & 11th CENTURIES.

1. Some of the other workers in the field were :

(1) Al-Nairizi (d. 922)—wrote on atmospheric phenomena.

(2) Al-Razi (d. 923-24)—dealt with ophthalmology.

(3) Al-Farabi (d. 950) " معلم الثانی " (The Second Teacher) wrote commentaries on Aristotle's (The First Teacher)

in Catoptrics ; Spherical and Parabolic Mirrors ; Spherical aberration ; in Dioptrics ; Ratio between the angle of incidence and refraction changes with different pairs of media ; magnifying power of a lens. Study of atmospheric phenomena. The twilight only ceases and begins when the sun is 19° below the horizon ; attempt to measure the height of the atmosphere on this basis (about 56 miles the value computed until recent times). Better description of eye and better understanding of vision, though Ibn-al-Haitham considered the lens as the sensitive part ; the rays originate in the object seen and not in the eye. Attempt to explain binocular vision. Correct explanation of the apparent increase in size of the sun and the moon when near the horizon. Earliest use of the "Camera Obscura". The Catoptrics انعكاس (Reflection) contain the following problem, known as Al-Hazen's problem ; from two points in the plane of a circle to draw lines meeting at a point on the circumference and making equal angles, with the normal at that point. It leads to an Equation of the fourth degree, Al-Hazen solved it by the aid of an hyperbola intersecting a circle.[1]

Al-Kindi (d. 873).—Anu Yusaf, Yaqub ibn Ishaq ibn Sabbah al-Kindi, flourished in Baghdad in the beginning of the 9th century. He died in 873 A. D. He is said to have acquired with tolerable understanding a knowledge of the so-called "ancients" *i. e.*, mainly Greek learning as far as accessible to him, and all his life he furthered its dissemination in Islam by an industrious literary activity.

He is called " فيلسوف العرب " (The philosopher of the Arabs) so called probably because he was the first and only great philosopher of the Arab race His influence was long felt and he is considered to be one of the twelve greatest minds. His knowledge of Greek science and philosophy was considerable. He was an encyclopædic scientist. Relatively few of his numerous works, probably 270[2] in number are extent. Little survives in

---

[1] I have translated into English from the Arabic text with the help of its German translation by Baarmann his مقالة في الضوء which appeared in 1882, in Vol. 36, pp. 197--237 of the Z. D. M. G.

[2] Ibn-i-Nadim (p. 995) mentions 256 of his books.

age. The main origin of his knowledge of optics was, according to Christian writers, Ibn-al-Haitham. One of these writers says, "The first real progress in the Mathematical theory of Optics was made by Al-Hazen. Although his work may have been founded on that of Ptolemy, yet he made such a decided advance in the theory, that for five hundred years or more he was recognized in Europe as the chief authority on the subject. Notwithstanding the pains Bacon took with the subject of Optics, he does not appear to have made any advance in the theory which Al-Hazan had already laid down before him. Great as Bacon undoubtedly was, he was far from being free from the prejudices of his predecessors and contemporaries. Some of the wildest and most absurd of the speculations of the ancients had the sanction of his approbation and authority."

His Works : Ibn-abi-Usaibia (1203—1270) in his well-known book كتاب عيون الانباء فى طبقات الاطباء (Sources of information on the classes of Physicians) quotes the names of 200 of his books on medicine. The first writing of Al-Hazen published in Europe was his book on "Twilight" (شفق). It was translated into Latin by Gherardo of Cremona and appeared in Lisbon as late as 1542 A. D But by far the most important of his works was his "Book on Optics" (كتاب المناظر) Its first translation in Latin, probably by the same translator, was published by Risner from Basle in 1572 A. D. under the title. "Thesaurus Opticæ". From the date of its first publication in Europe, it is evident that it was still the main source of Optical knowledge up to the end of the 16th century. Christian writers of the early 17th century, attribute this through their ignorance, to the early Christians who wrote on the subject. The persistency of Vitellio's fame, and his popularity extended to the time of Kepler, (1571—1630), and is provided by the title of his earlier great work (Ad Vitellionem paralegomena) published from Frankort in 1604 A. D. Peckham's "Perspective Communis" was reprinted as late as 1627 a few years before the time of Newton. This valuable book is said to be lost to us in original.[1] It showed a great progress in experimental method, Research

[1] There was a copy of this with Imad-ul-Mulk, Syed Hussain Bilgrami, who, it is said, presented it to the British Museum in 1911.
Since the above was in point, the Book has been traced to be with M Inayat Ullah of Badaun.

Prior to the time of the Muslims, with regard to optics, little of merit was known to the Greeks. They knew that light travels in straight lines, but its first experimental demonstration was given by Ibn-al-Haitham, whose classical experiment is still the subject of study in the class-room. They were aware of the first Law of Reflection—The Equality of the angles of incidence and reflection,—but the second Law—the incident ray, the normal and the reflected ray are in the same plane,—was established by him. The phenomena of Rainbow, Mirage and the Halo did not escape their notice, but their correct explanation was later given, by the Arabs. Euclid's treatise on Optics is so imperfect and so inaccurate that it is difficult to attribute it to such a great mind. The most famous of ancient writers is Ptolemy (بطليموس). He treats of atmospheric refraction and apparent increase in sizes of heavenly bodies when near the horizon. But it was satisfactorily explained by Ibn-al-Haitham. For a ray of light passing from one medium to another of different refrangibility, he had drawn up tables of angles of incidence and refraction but failed to discover the Law of Refraction. The apparent rise of an object placed at the bottom of more refractive medium was known to them, but they could not explain it. There is a mention of burning glasses in the early writings but they do not seem to be aware of the laws governing the refraction through lenses.

THE DAWN OF MUSLIM OPTICS

Ibn-al-Haitham (965 – 1039).—The first Arab who studied optics was Al-Kindi, who lived in the first half of the 9th century but the greatest Arab optician of all times was Ibn-al-Haitham, (Abu' Ali Muhammad Ibn-al-Hasan Ibn-al-Haitham or Abu Ali al-Hasan, Ibn-al-Hussain Ibn-al-Haitham) known to the Christians as Al-Hazen. He was born in Basra in 965 A. D. and died in 1039 A. D. Ibn-abi-Usaibia (1203-4 1270) says of him that no one at any time, with respect to the knowledge of Mathematics, and Physics ever approached him. His writings mainly influenced the works of Vitellio, Peckham and Rodger Bacon, Christian writers of the 13th century on the subject. Bacon is said to be the greatest optician of Christendom of that

its allied branch Ophthalmology. The first and the third were studied at length by the early Muslims.

CHRONOLOGICAL DEVELOPMENT

It took full three centuries, 7th, 8th and 9th for the early Muslims to complete their translations from the Greek and other sources. And it was only towards the end of the 10th or the beginning of the 11th century that real advance was made in the subject. Valuable additions were also made in the 13th and the 14th centuries.

KNOWLEDGE OF OPTICS PRIOR TO MUSLIMS

Aristotle's work had such a strong hold on human minds for centuries that it required almost superhuman effort to shake off the influence of his erroneous theories. The contents of mediæval "Meteorology" were largely identical with those of the "Meteorologica." During the later period, the 13th and the 14th centuries, the subject was studied under "Perspective" and "Meteorology". He believed that the vision takes place due to rays emanating from the eye, which he called the "Visual Rays", in the form of a cone and striking the visible object. Ibn-al-Haitham although conclusively repudiated this hypothesis on the basis that the apparent sizes of the objects seen depend upon their distance from the eye, yet he still talks of the "Visual Rays". The idea was still current amongst the Christian writers upto the 17th century. His addition to the four elements of the Quintessence called the Arther continued to disturb the minds of the West until Decarte's time. The idea of the instantaneous transmission of light continued to prevail in Christian Europe, for centuries, and discovery of the finite velocity of light has been attributed by them to the Danish Astronomer Römer, who lived in the later half of the 17th century, although as early as the 11th century, Al-Biruni stated that compared with the speed of sound that of light is immense, and Ibn Sina observed that if the perception of light is due to the emission of some sort of particles (*compare with Newton's corpuscular theory or modern Electron theory*) by the luminous source, the speed of light must be finite.

hand, nor can I encompass in a paper like this even a brief history of the development of the subject in the palmy days of Islam. I would only attempt to give you an insight into the great task they undertook to do I have chosen Optics as the subject of my paper for the reason that this was the branch of Physics which attracted most attention from them and in which I have had a glimpse of their original work.

THE DIFFICULTY OF THE TASK

The difficulty of the task is not only due to the lack of original material at hand, but is enhanced due to several other causes. The original texts of the older writers on the subject are lost to us for ever, and the only sources of information are their Latin and Hebrew translations. The religious prejudices of the early translators, and their ignorance of the subject have so entangled the subject that it is difficult to distinguish between the real and the spurious, or to draw a line of demarcation between the work done by the Muslims or that done earlier. To add to these is the difficulty that in the earlier stages of the development of scientific knowledge, its different branches were not studied separately as they are done at present. There was no specialisation in those days. Most of the learned men had encyclopædic knowledge and one finds the discussion of the subject in works where one should least expect them. There are then the difficulties of the language and terminology. The technicalities and the terms used in those days, when translations were made from the Greek and Hindu sources, are not known in the present day, and one has to rely on their translations in the modern languages of Europe.

DIVISION OF THE SUBJECT

Optics (علم المناظر) in its early stages, was divided into Catoptrics and Dioptrics, which dealt with the phenomena now studied under Reflection and Refraction. These terms have now fallen under disuse, and the phenomena have been developed under Geometrical and Physical Optics. Another branch of the subject studied, is what is now known as Physiological Optics or

" Study of Optics among the early Muslims with special reference to Ibn-al-Haitham."

INTRODUCTION

It is only in recent times that the Western people have begun to recognize and appreciate in true perspective the value of the work done in Physics and other branches of the sciences by the early Muslims. The Carnegie Institute in America, the School of Oriental Studies in London and Cairo, the edition of *Encyclopædi of Islam* in Europe, and the attention recently devoted to the learning of the Orient in Spain, are a few signs of this change of outlook. The monumental work of the early Muslims, in the pursuit of knowledge alone, shines forth in contrast, at a time when the whole of Europe was steeped in what are called the 'Dark Ages', when religious animosities, prejudices and ignorance reigned supreme for centuries, when under the Inquisition learned men and free thinkers were persecuted in the name of religion; and is grand enough to stagger the world for all time. Under such adverse circumstances, they kept the torch of learning alight and their writings influenced human thought for centuries. We Muslims are not surprised by what they achieved during the short space of time, by their religious fervour to acquire knowledge, their resourcefulness, ingenuity and application so much, as by the fact how sufficient still survives to this day to pass judgment on their greatness. East is poor in this respect and India is still poorer, as our Philosopher poet has said:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ
(اقبال)

OBJECT

In the absence of original resources, it is not possible for me to give a first hand knowledge of the subject I have taken in

Study of Optics among the early Muslims with special reference to Ibn-al-Haitham

BY

M. F. Quraishi, M. Sc.
Professor of Physics
ISLAMIA COLLEGE, LAHORE

CONTENTS

1. STUDY OF OPTICS AMONG THE EARLY MUSLIMS WITH SPECIAL REFERENCE TO IBN-AL-HAITHAM
   — M. F. Quraishi ... 1

2. THE SOCIAL AND POLITICAL ORGANIZATION OF THE ARABS IN RELATION TO THEIR LAND
   —Dr. Shaikh Inayatullah .. 41

3. KHUSRAU'S HINDI POETRY
   --Dr. M. Wahid Mirza ... 51

4. AHADITH WERE RECORDED DURING THE LIFETIME OF MUHAMMAD
   —Dr. M. Z. Siddiqi ... 61

5. A NOTE ON THE PSYCHOLOGICAL ANALYSIS OF RELIGIOUS EXPERIENCE IN THE LIGHT OF A TRADITION OF THE HOLY FOUNDER OF ISLAM
   —Qazi Muhammad Aslam ... 73

6. A FEMALE MARTYR OF THE BABI FAITH
   —M. Hidayat Hosain ... 83

7. THE TANBIHAT OF ALI BIN HAMZA ABUL-QASIM AL-BASRI
   —Syed Muhammd Abdulla ... 93

8. AL-I-MIKAL
   —Prof. Muhammad Shafi ... 107

THIS VOLUME

OF

THE PROCEEDINGS OF THE FIRST SESSION

OF THE

IDARA-I-MAARIF-I-ISLAMIA

IS

PRESENTED WITH PROFOUND RESPECT

TO

His Exalted Highness, Rustum-i-Dawran,
Arastu-i-Zaman, Muzaffar'ul Mulk wa'l Mamalik,
NAWAB SIR MIR OSMAN ALI KHAN BAHADUR.
Fateh Jang, Sipah Salar, Nizam'uddowlah,
Nizam'ul Mulk Asaf Jah, G. C. S. I., G. C. B.,
Nizam of Hyderabad,
without whose royal generosity it would not have seen the light of day.



BACK ROW.—Prof. H. M. Shairani, M. A. Chaghatai; Dr. Husain F. Al Hamdani, Dr. Inayatullah, Prof. Tabassum, Dr. Azhar Ali (**Delhi University**); Prof. Dr. Saidullah; S. Mumtaz Husain; S. M. Abdullah; Prof. S. Abdul Qadir; Prof. B. D. Salik

THIRD ROW.—Maulvi Murtaza Husain; Shamsu'l 'Ulama M. Abdul Rahman (**Delhi University**); Dr. M. Siddiq; Dr. Abdul Alim (**Jamia Millia**), Prof. A. L. Tapish, Prof. Zafar Iqbal; M. Mohd. Husain, K. S. Qazi Fazl Haq, Dr. M. D. Taseer, M. Nazir Ahmad

SECOND ROW.—Prof. M. Shafi; M. Aslam; Sh. Azimullah, M. U. Q. Shirwani; Dr. Mansur Ahmad, M. Ghulam Mohyeddin Malik Barkat Ali, M. Ghulam Mohd., Prof. A. Hamid, Dr. P. A. Qureshi

FRONT ROW.—K. B. Syed Maqbool Shah, Prof. Dr. Mohd. [illegible] (**Secretary**), K. B. [illegible] Zaman Mahdi Khan [illegible] Abbas in Shuja-ud-Din

PROCEEDINGS

OF THE

IDARA - I - MAARIF - I - ISLAMIA

FIRST SESSION

HELD AT

LAHORE

15th and 16th April, 1933

PUBLISHED BY

THE WORKING COMMITTEE

OF THE

IDARA-I-MAARIF-I-ISLAMIA

LAHORE

1935

Printed at the Ripon Press, Bull Road, Lahore by Mirza Muhammad Sadiq

PROCEEDINGS

OF THE

IDARA-I-MAARIF-I-ISLAMIA

FIRST SESSION

HELD AT

LAHORE

15th and 16th April, 1933

PUBLISHED BY

THE WORKING COMMITTEE

OF THE

IDARA-I-MAARIF-I-ISLAMIA

LAHORE

1935

Printed at the Ripon Printing Press, Bull Road, Lahore by Mirza Muhammad Sadiq.